



پہلے بچے کا
حق
تین سال تک
مکمل پیار
مالا ڈی اپنائیں
Mala·D
نع حمل گولیاں
روپے فی پیکٹ
صرف
ایک گولی
davp 53/250

سہیل گیا

ماہنامہ

مجلس مشاورت

▲ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
▲ ڈاکٹر قمر رئیس
▲ اصغر علی انجینئر
▲ قیصر عثمانی
▲ شاہد احمد شعیب
▲ ڈاکٹر محمد مشتاق
▲ ڈاکٹر علیم اللہ حالی
▲ سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
▲ ایڈیٹر :- جمیل منظر
▲ اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی
معاونین :- شکیل احمد جمال، عبدالقیوم ابدالی، فیضان حزینی
▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

شمارہ ۱ جلد ۲

— بدل اشتراک —

▲ فی شمارہ .... ۸/ روپے
▲ زر سالانہ .... ۹۰/ روپے
▲ [illegible] .... ۱۰۰/ روپے

" فہرست "

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل

میلور سلائی روڈ، گیا

[illegible]

درخت لگائیں ـــــ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے اہم جان ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

(۲) یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے مہیا وسائل کا استعمال پورے ویوک سے کریں

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں

(۴) ہوا اقتصادی زندگی کا بہتر اثر حاصل ہے۔ اس سے فرار نقصان دہ ہوگی

(۵) ہوا اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہو جائیں گے کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) سرزمین کا وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوئی تھی

انھوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے۔ جس سے انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی

آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔

(۸) درخت لگائیں ـــ جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں۔

جاری کردہ ـــ محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار

184 21.([illegible]-72)93-94

ہندوستانی معاشیات پر شب خوں

ہمارا باشعور طبقہ یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہندوستان کو تہذیبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیت سے کمزور اور معطل کرنے کی ایک زبردست سازش نہ صرف یہ کہ بعض بیرونی طاقتیں کر رہی ہیں بلکہ ان طاقتوں کے آلۂ کار خود ہمارے ملک میں بھی موجود ہیں ــــ اور یہ فریضہ مرکز میں برسر اقتدار جماعت بڑی دانشمندی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کا چہرہ بگاڑنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اور ان میں برسر اقتدار سیاسی جماعت کے جو منفی اقدامات ادھر دو سال میں سامنے آئے ہیں ان سے اب ہمارا باشعور طبقہ اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہے۔ مذہبی عصبیت کو ہوا دے کر کے بلکہ اسے بڑھاوا دے کر ملک میں عدم استحکام کی فضا تیار کی جا چکی ہے۔ ملک کی ہم آہنگی کو ختم کرنے میں کانگریس کے نظریات نے جو کارستانیاں کی ہیں ان سے ہم خبردار ہو چکے ہیں۔ بابری مسجد کے تنازعہ کو بہت پہلے پر امن طور پر حل کیا جا سکتا تھا مگر حکومت نے اس کو بڑھانے میں ہی اپنی کامیابی سمجھی اور ملک کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا کہ اتحاد اور ہم آہنگی نام کی کوئی چیز برقرار نہیں رہی۔ کانگریس کی عنان اور اس کی پالیسی عملی سعین کرنے والوں میں اور یک سطح پر ایسے افراد ہیں جو سراسر رجعت پسند اور فسطائی ذہنیت کے ہوا خواہ ہیں اور مسلسل ایسے فیصلے کر رہے ہیں جن سے انتشار بڑھتا جا رہا ہے۔

اب کھلے طور پر ہماری معیشت کو بگاڑنے کی سازش سامنے آ رہی ہے ایک بڑی عالمی طاقت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر ہمارے قائدین اب ہماری معاشیات پر شب خوں مارنے کے در پے ہیں۔ اندرون ملک صنعت و حرفت، زراعت اور ٹکنولوجی کو بیرونی ذرائع اور ایجادات کے ذریعہ ترقی یافتہ بنا لینے کے بجائے یہ قائدین ایک ایسے تجارتی مسودے پر دستخط ثبت کرنا چاہتے ہیں جس کے عمل در آمد ہونے کے بعد ہم اپنی ترقیوں کی جانب قدم بڑھانے کے بجائے ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار اور ایجادات کے صارفین بن کر رہ جائیں گے ــ ظاہر ہے کہ عالمی بازار کی کڑی شرائط سے ذرائع پیداوار کے حصول کے لئے ہماری غریبی و ناداری مانع بن جائے گی ــ تو گویا ہم اپنی صنعتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور عالمی بازار کی مہنگی اشیاء کے حصول میں بھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس طرح ڈنکل تجاویز کو منظور کر کے ہم ایک کھلے بھکاری کی طرح عالمی بازار میں بے پناہ ہو جائیں گے ــــ یہ سب کچھ ایک بڑی طاقت کی سازش کا حصہ ہو رہا ہے کہ ہم اپنی اقتصادی اور سائنسی ترقی کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکیں اور ایک طفیلی کی طرح دوسروں کے محتاج ہو کر [illegible]

گیان چند

اُردو زبان واَدب کو بابائے اُردو مولوی عبُدالحق کی دین

فاصلوں کی نشاندہی کے لئے ایک ترکیب "سنگ میل" رائج ہے۔ لیکن طویل مسافتوں میں کبھی کبھی کوہستانی چوٹیوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اردو کے عرصۂ حیات میں ایسے دو کوہستان سرسید اور مولوی عبدالحق ہوئے ہیں۔ سرسید اگر اردو کے ہمالہ تھے تو مولوی عبدالحق وندھیاچل، جو شمال و جنوب کو ملاتا ہے۔ اردو ادب کی تین شاخیں تخلیق، تنقید اور تحقیق کہی جاتی ہیں۔ لیکن اتنی ہی اہم تعلیم اور تحریک بھی ہیں۔ اردو کی تاریخ میں تنہا مولوی صاحب کی ذات ہے جو ان پانچوں شعبوں میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ بعضوں کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرد نہیں، ایک انجمن تھے۔ مولوی صاحب انجمن ہی نہیں، انجمن ساز تھے۔

وہ ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو پیدا اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو فوت ہوئے۔ اردو کی خاطر وہ اہل و عیال کے جھنجھٹ سے دور رہے تاکہ اپنے شب و روز کا ہر لمحہ اردو کی خدمت کو دے سکیں۔ اردو کے لئے ایسا دیوانہ کوئی دوسرا نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی تصانیف کو زیادہ اہمیت دوں کہ اردو تحریک کو لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں اور کوئی ذات ایسی نظر نہیں آتی جو دونوں میدانوں میں اتنی تاریخ ساز رہی ہو۔

ان کی زندگی کا محور "اردو کی بقا" ترویج اور ترقی تھا۔ علی گڑھ میں بی۔ اے کرنے کے بعد وہ چار سال تک سرسید کے اسٹاف میں رہے۔ شاید وہیں ان کے دل میں اردو تحریک میں کھو جانے کا انکر پھوٹا ہو۔ ان کی تصانیف، تحریک دونوں انجمن ترقی اردو کے وسیلے سے ابھریں۔ وہ ۱۹۱۲ء میں انجمن کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ اس وقت انجمن کی کل کائنات ایک پرانا صندوق، ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات اور ایک قلم دوات تھی۔ یہی انجمن جب ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد سے دہلی منتقل کی گئی تو صرف انجمن کی مطبوعات مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادی گئیں

جن کی قیمت کا اندازہ کم و بیش ایک لاکھ روپیہ لگایا گیا تھا۔ (رسالہ اردو، بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۲۱)

انجمن نے ایک طرف اردو کی قدیم کتابوں کو شائع کرنے پر توجہ کی، دوسری طرف اردو تحریک کی جانب۔ اس کے لئے کئی رسالے جاری کئے جن میں اردو اور ہماری زبان ممتاز ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان نے ہماری زبان کے بجائے قومی زبان نکالا۔ رسالہ اردو میں بادۂ کہن کے عنوان کے تحت جولائی ۲۸ء سے جولائی ۳۶ء تک قدیم شعراء کے بارے میں تعارفی مضامین لکھتے رہے۔ افکار و واقعات کے عنوان کے تحت ۱۹۳۶ء سے ۳۸ء تک اردو کی لڑائی کی روداد شائع کرتے رہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس لڑائی کے لئے اورنگ آباد مرکزی مقام نہیں یہ کام ملک کی راجدھانی میں کرنا چاہئے۔ اس لئے ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر دہلی منتقل کر دیا اور پورے ملک میں انجمن کی شاخوں کا جال بچھا دیا۔ آخر میں انجمن کے تحت دہلی میں شبینہ اسکول کھولے اور اردو کے امتحانات بھی منعقد کرنے لگے۔ تقسیم ملک کے بعد اسی زور و شور سے انجمن ترقی اردو پاکستان قائم کی۔

تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات کا نقطۂ عروج عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدارت ہے۔ انھوں نے اپنی نگرانی میں شیخ چاند سے سودا پر مقالہ لکھا کر یونیورسٹیوں میں معیاری تحقیقی مقالوں کا انداز متعین کیا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری دلچسپی مولوی صاحب کی علمی فتوحات سے ہے۔ جس طرح سورج کے گرد نظام شمسی گھومتا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب کا یہ وصف تھا کہ انھوں نے اپنے گرد کام کرنے والوں کا بڑا حلقہ بنا لیا۔ خود کام کیا اور دوسروں سے بھی کام کرایا۔ ان کی تصانیف کم ہیں۔ تالیف زیادہ کیونکہ انہوں نے اردو کے قدیم سرمائے کی تدوین کی اہمیت کو پہچانا۔ اس کے ذریعہ اردو ادب کی تاریخ میں کئی صدیوں کا اضافہ کر دیا۔ یہ کام تدوینات اور مضامین دونوں کے ذریعے کیا۔ ان کی تدوینات یہ ہیں۔

تذکرے:۔ شفیق کا چمنستانِ شعرا ۱۹۲۸ء، قائم کا مخزنِ نکات ۱۹۲۹ء، گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں ۱۹۳۳ء، فائق کا مخزنِ شعرا ۱۹۳۳ء، مصحفی کا تذکرۂ ہندی ۱۹۳۳ء، عقد ثریا اور ریاض الفصحا ۳۴ء، نکات الشعرا کی نئی تدوین ۱۹۳۵ء، تمنا کا گلِ عجائب ۱۹۳۶ء انہیں میں رکھئے ذکرِ میر کو جو رسالے میں اپریل ۲۶ میں اور کتابی صورت میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔

مثنویاں:۔ میر اثر کی خواب و خیال ۲۹ء، غضنفر کی جنگ نامۂ عالم علی خاں ۳۲ء اور وجہی کی قطب مشتری ۳۹ء، نصرتی کی گلشنِ عشق کا دوسرا ایڈیشن ۵۲ء میں مرتب کیا۔ دواوین میں انتخاب کلام میر ۱۹۲۱ء میں، دیوان اثر ۱۹۳۰ء میں اور دیوانِ تاباں ۱۹۳۵ء میں شائع کئے۔ غیر افسانوی نثر میں انشا و قتیل کی دریائے لطافت ۱۹۱۶ء میں اور خواجہ بندہ نواز سے منسوب معراج العاشقین ۱۹۴۳ء یعنی ۲۵-۲۴ء میں شائع کیں۔ افسانوی نثر میں انشا کی، داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، اول رسالہ اردو اپریل ۲۶ء میں اور پھر کتابی شکل میں ۱۹۳۳ء منظر عام پر لائے۔ اس کے علاوہ باغ و بہار ۱۹۳۱ء میں اور وجہی کی سب رس ۱۹۳۲ء میں شائع کیں۔ تینوں کتابیں اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔

ان کی تحقیقی کتابوں میں اہم ترین اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ (۱۹۳۳ء) ہے۔ یہ کتابچہ بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا اطلاق ایسی ہی کتابوں پر ہوتا ہے۔ انھوں نے کئی طویل مضامین ایک یا کئی قسطوں میں رسالہ اردو میں شائع کئے جو بعد میں کتابی روپ میں رونما ہوئے۔ چند نام ہیں۔

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر اردو اپریل ۲۱ء؛ کتابی شکل ۱۹۳۳ء، مرحوم دلی کالج رسالے میں ۱۹۳۳ء میں کتابی شکل میں طبع دوم ۱۹۴۵ء، نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور رسالے میں ۱۹۳۳ء میں کتابی شکل میں ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں۔ سرسید پر لکھے ہوئے مختلف مضامین "سر سید، حالات و افکار" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں۔ متفرق مضامین کا مجموعہ قدیم اردو (۱۹۶۱ء) تاریخ ادب کا اتنا ہی بیش بہا مواد لئے ہوئے ہے جتنا "اردو کی ابتدائی نشوونما" کا رسالہ۔ تخلیقی نثر میں ان کی واحد کتاب "چند ہم عصر" مرتبہ شیخ چاند ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی بعد کے ایڈیشنوں میں کئی سیرتوں کی تخفیف و اضافہ ہوا۔ مجموعے کی جان دو خاکے نام دیو مالی اور گدڑی کا لعل نور خاں ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور خاکہ نگار نے کسی عام انسان کو اس طرح حیاتِ جاوید بخشی ہے۔

مزید چار موضوعات: خطبات، مقدمات، تنقیدیں اور تبصرے بھی مجموعوں میں ملتے ہیں۔ خطبات عبدالحق کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں اور دوسری ۴۴ء میں آئی۔ ۱۹۵۲ء میں عبادت بریلوی نے ضخیم مجموعہ "خطبات عبدالحق" شائع کیا۔ مقدمات عبدالحق مرزا محمد بیگ نے دو جلدوں میں ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد میں شائع کی۔

عبادت بریلوی کراچی سے اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا۔ جس کے مقدمے پر اکتوبر ۱۹۶۲ء کی تاریخ درج ہے۔ مولوی عبدالحق کے مقدمے اپنی کتابوں پر بھی ہیں۔ دوسروں کی کتابوں پر بھی۔ ان مقدموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق کرکے موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کر دیتے ہیں۔

تراب علی خاں ناز نے حیدرآباد سے تنقیدات عبدالحق شائع کی جس میں ۱۹۳۳ء تک کی ۲۳ تنقیدیں ہیں۔ دوسرا مجموعہ "چند تنقیدات عبدالحق" ۱۹۳۹ء میں آیا۔ جس میں پہلے مجموعے کی دو شستہ تنقیدیں ہیں۔ تنقید میں وہ حالی سے متاثر ہیں۔ تخلیق کے سماجی حالات کا عکس قرار دیتے ہیں اور سادگی، جوش اور اصلیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے تبصروں کا ایک مجموعہ "ادبی تبصرے" کے نام سے شائع ہوا۔ تبصرے میں وہ بڑی جگرداری کے ساتھ کتاب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور اس کی کمیوں کے اظہار میں بھی تامل نہیں کرتے۔

قواعد اور لغت کے باب میں بھی ان کے کارنامے وقیع ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کی کوئی اردو قواعد دہلی سے شائع ہوئی۔ بعد میں قواعد اردو کے نام سے ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ سے معرضِ اشاعت میں آئی۔ یہ ایک تاریخ ساز قواعد ہے کہ اس میں اردو قواعد کو انگریزی قواعد کے اصولوں پر پیش کیا ہے۔ ان کی ایک اور قواعد "اردو صرف و نحو" ۴۲ء میں دہلی سے شائع ہوئی لیکن وہ اتنی اہم نہیں۔ انھوں نے ایک جماعت کے ساتھ کنائز اکسفورڈ ڈکشنری کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ انگریزی اردو لغت ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۹۳۱ء ایک جامع اردو لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ لغت آٹھ جلدوں

ئیا ہوئی تھی۔ شاید پہلی جلد تقسیم ملک سے پہلے زیر طبع تھی لیکن تقسیم کی آندھی میں ورق در ورق ہو کر ہوا میں اُڑ گئی۔ رسالہ اردو جنوری اپریل ۱۹۵۹ء میں، مقدمہ جدید اُردو لغت، شاید اس کے پہلے لکھا گیا ہو۔ اس کے کچھ اجزا لغت کبیر اُردو کے نام سے اردو کراچی ۱۹۶۰ء اور بعد کے شماروں میں شائع ہوئے۔

قواعد لغت کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب نے اردو کی مطبوعہ کتابوں کی ڈائرکٹری کا منصوبہ بھی بنایا۔ اس سلسلے میں مذہبی کتب پر مشتمل قاموس الکتب حصہ اول ان کی زندگی میں اور مزید دو حصے ان کے بعد شائع ہوئے۔

آخر آخر میں وہ انجمن کے حالات سے بد دل ہو گئے تھے۔ ان کی بہت مخالفت ہوئی جس کی وجہ سے انہوں نے سیاہ ورق کا ایک کتابچہ "پاکستان میں اردو کا المیہ" شائع کیا۔ افسوس کہ اردو کے ایسے بے لوث خادم کو بھی زوال عمر میں یہ دن دیکھنا پڑا۔

وہ صاحب طرز ادیب تھے۔ رشید احمد صدیقی نے ان کے اسلوب کو اردو کا بنیادی اسلوب کہا ہے۔ وہ اپنے علمی خاکوں، تبصروں اور تنقیدوں میں حسب توقع زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ خود کو بھی نہیں بخشتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے جلسے کا خطبۂ صدارت ان الفاظ سے شروع کیا۔

"آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا، چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اُٹھ کر اِدھر اُدھر [illegible] اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں تو کہنے لگا، جوانی میں کون سے تیر مارے تھے، جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے۔"

(آمنہ صدیقی: افکار عبدالحق۔ کراچی ۶۲ء ص ۶۵-۶۲)

ان کے آثار قلم کا تنوع دیکھ کر ہوش اڑ جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تحقیق و تدوین میں خامیاں ہیں لیکن کوئی یہ تو دیکھے کہ انھوں نے جس زمانے میں یہ کام پیش کئے اس وقت وسائل کتنے محدود تھے۔ پھر ان کے کاموں کی مقدار بھی تو دیکھئے۔

مجھے فخر ہے کہ میں دسمبر ۱۹۴۵ء میں دہلی میں ان سے ملا ہوں۔ ملازمت میں آنے سے قبل ہی میری ان سے مراسلت شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے اپنا مقالہ "اردو کی نثری داستانیں" اشاعت کے لئے ان کے پاس بھیجا۔ انھوں نے کھٹ سے مجھ گم نام کی کتاب کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے شائع کرنے کی ہامی بھر لی۔ پندرہ سال کے عرصے میں ان کے کئی ہمت افزا خطوط میرے پاس آئے۔ اپنی ناسمجھی کے سبب میں نے انھیں محفوظ نہیں رکھا — افسوس۔ شاید ان کی نقل انجمن کراچی میں موجود ہو کہ انھیں کے ذریعے خاک کی نسبت عالم پاک سے ہوتی ہے۔

اُردو لکھئے، پڑھئے اور بولئے

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن

ہر اک سفر سے ہے دشوار، ذات کا یہ سفر
مجھی پہ ختم ہوا، کائنات کا یہ سفر

ترا سراغ، نہ اپنا ہی کچھ نشان ملا
عجیب اب کے رہا شبہات کا یہ سفر

نفس سے تا بہ نفس ہے، جراحتوں کا غبار
یہ زندگی کے قدم، حادثات کا یہ سفر

ہمارے پاؤں سے الجھا ہوا ہے چاند کوئی
چلا ہے، سنکے کدھر ہم کو، رات کا یہ سفر

کسے خبر، کہ کھلیں کیسے موڑ پر، آنکھیں
ہے خواب خواب ابھی تو، حیات کا یہ سفر

میں، رائگاں نفس موج تلخ کا ہی ہوں
عذاب ہے مجھے، شہد و نبات کا یہ سفر

میں خوش ہوں، تو کبھی دوزخ میں قید کر دے مجھے
کہ تنگ میرے لئے ہے، نجات کا یہ سفر

نہ جانے کون سی منزل کا استعارہ ہے
تغیرات کی جانب، ثبات کا یہ سفر

میں ایک دشت محالات ہوں، مجھے طے کر
کہاں تو، اور کہاں ممکنات کا یہ سفر

غزل

مانک ٹالا
(بمبئی)

نیلا پاگل کیوں ہوئی

★ نیلا کے پاگل ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ وہ
ن نہ ہوتی تو شاید مجھے حیرت ہوتی ——!

نیلا کے ڈیڈی مدن موہن میرے بزرگ دوست
یا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ جس شخص نے ہمارا تعارف
یا تھا وہ تو زندگی کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا لیکن ہمارے
ملاقات کو پائندہ بنا گیا ——

مدن موہن باتیں بڑی لچھے دار اور دلچسپ کرتے
۔ ان کی صحبت میں کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا ——
نے حسن سلوک سے وہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔
ا جس قدر کم آمیز تھا وہ اتنا ہی آگے بڑھ کر دوسروں
ے تعلقات استوار کرنے میں ماہر تھے۔

ہماری ذہنی ہم آہنگی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی
ہمارے مشاغل ایک ہی طرح کے تھے۔ ہم دونوں کو علم و
ب سے لگاؤ تھا ہم گھنٹوں ادب اور ادیبوں کے بارے
گفتگو کرتے۔ ان کا ادب کا مطالعہ بہت گہرا نہیں
ھا۔ لیکن انداز گفتگو ایسا تھا کہ ہر کسی پر حاوی ہو جاتے۔
مجلسوں ہو ... [illegible]

لے جا سکتے تھے۔ لیکن ان مباحثوں میں وہ کبھی متانت
کا دامن نہیں چھوڑتے تھے —— اگر مباحثے میں کبھی تلخی پیدا
ہو جانے کا احتمال ہو جاتا تو وہ کمال دانش مندی
سے گفتگو کا رخ پھیر دیتے۔ میری طرح ان کے اور بھی
کئی مداح پیدا ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا اپنا ایک خاص
حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ہر اتوار شام کو ان کے گھر پر ہی
ایک مجلس جمتی، جس میں شاعر اپنی نظمیں اور غزلیں
سناتے۔ اور کہانی کار اپنی کہانیاں۔ کبھی ادب کی
رفتار ترقی پر بھی مضامین پڑھے جاتے۔ اس طرح سب
ادیبوں اور شاعروں کے دو تین گھنٹے بہت اچھی طرح
گزر جاتے اور تشنگان ادب ان مجالس سے ذہنی تسکین
حاصل کر کے جاتے۔ وہ میزبان بھی بہت اچھے تھے۔ ان
مجلسوں میں شامل ہونے والے ادیبوں اور شائقین
ادب کی خوب خاطر مدارت کی جاتی ——

نیلا ان کی بڑی بیٹی ہے۔ چھوٹی کا نام بھا
ہے۔ نیلا سے دو تین سال چھوٹی۔ لڑکا منو دونوں
[illegible] اور شما [illegible] سنا اور

اسکول میں پڑھتا تھا۔

میں اکثر ان کے گھر آنے جانے لگا۔ دونوں لڑکیاں خوش شکل اور خوش اخلاق تھیں۔ اور میرے ساتھ بہت جلد ہی مل گئیں۔ ان کی بیوی سر تا پا نیک سیرتی کا نمونہ تھیں ـــ سونے پر سہاگا کہ خوبصورت بھی تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ اور آواز میں مٹھاس تھی۔ چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں کسی مہذب شاہی خاندان کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ کم گو اور کم آمیز لیکن جسے پسند کرتیں اس پر اپنی ممتا نچھاور کر دیتیں۔ گھر کے کام کاج میں یکتا۔ کھانا بہت اچھا بناتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بڑی مہمان نواز تھیں۔ اور میں ان کی مہمان نوازی سے اکثر لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اچھا کھانا میری کمزوری ہے اور میں کسی نہ کسی بہانے کھانے کے وقت ان کے گھر پر جا موجود ہوتا۔ میرے وقت بے وقت ٹپکنے پر انہوں نے کبھی ماتھے پر شکن نہیں ڈالی۔ فوراً میرے سامنے کھانا پروس کر رکھ دیتیں۔ وہ کھانا سب کے بعد کھاتی تھیں۔ اور کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا کہ اپنے حصے کا کھانا انہوں نے میرے سامنے پروس کر رکھ دیا ہے

میری شادی کی بات چلی تو بھابی سب سے زیادہ خوش تھیں۔ لڑکی دیکھنے کے لئے میری رشتہ دار عورتوں کے ساتھ وہ بھی گئیں۔ ان ہی کے ہاں کرنے پر میری بات پکی ہوئی۔ بارات کے ساتھ بھائی صاحب (مدن موہن) سارا راستہ بھانگڑا ڈالتے ہوئے گئے۔

ایک اور خاص بات جو ان کے گھر میں تھی، ان سب کا موسیقی اور نغمہ سے لگاؤ۔ بھابی بہت اچھا گا لیتی تھیں۔ لیکن گھر گرہستی کے چکر میں ان کا گانا بجانا چھوٹ چکا تھا۔ دونوں بیٹیاں ماں کی روایت کو آگے بڑھا رہی تھیں۔ خاص کر نیلا بہت اچھی مغنیہ تھی۔ کچھ سازوں میں بھی اچھی مہارت رکھتی تھی۔ ریڈیو پر پروگرام بھی دیتی تھی۔ بھائی صاحب اگرچہ خود بہت اچھے مغنی نہیں تھے لیکن بے سرا بھی نہیں گاتے تھے۔ ستار اور طبلے پر خاص مہارت حاصل تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز شام کے وقت ان کے گھر پر موسیقی اور نغمے کا ریاض ہوتا۔ نیلا کے پڑوس کی دو ایک سہیلیاں بھی اس میں شامل ہو جاتی تھیں

ان کا گھر علم و ادب اور موسیقی و نغمہ کا ایک سنگم تھا۔

کچھ سال پہلے ممبئی میں میری تبدیلی ہو گئی تھی۔ کام کے سلسلے میں دہلی میں سال بھر میں دو تین چکر لگ جاتے تھے۔ میرا قیام اپنے بھائی کے گھر پر ہوتا لیکن میری شامیں اکثر ان کے گھر پر ہی گزرتیں۔

ایک مرتبہ اسی سلسلے میں میں ایک شام دہلی پہنچا۔ اگلے روز صبح میں مدن موہن بھائی صاحب کے گھر پر ٹیلی فون کیا۔ اس روز ان کی طبعیت میں کسلمندی سی تھی اس لئے انہوں نے دفتر سے چھٹی لی ہوئی تھی۔ اس دن راکھی کا تہوار بھی تھا لیکن کئی ادارے اور دفتر کھلے تھے۔ مجھے جہاں جانا تھا وہ ادارہ بھی کھلا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا کام تین اور چار بجے کے درمیان ختم ہو جائے گا۔ اور میں وہاں سے سیدھا ان کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی بیوی بھی صبح راکھی باندھنے اپنے بھائی کے گھر جائے گی۔ کالج سے چھٹی کے بعد شیلا اور پربھا دونوں سیدھا ماموں کے گھر جائیں گی اور شام پانچ بجے کے لگ بھگ سبھی گھر واپس آ جائیں گے چنانچہ میں نے بھی کہہ دیا کہ میں چار اور پانچ بجے کے درمیان تک

کے گھر پہنچ جاؤں گا۔

خلاف توقع میرا کام دو اڑھائی بجے کے درمیان ختم ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ میں دو اڑھائی گھنٹے ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا میں سیدھا ان کے گھر کی طرف چل دیا۔ سوچا کہ بھائی صاحب کے ساتھ طویل گپ شپ رہے گی۔ ہمارے بے تکلفانہ تعلقات کے باعث یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پہلے بھی اکثر ایسا ہوا کرتا تھا اور میں اپنے کام سے فارغ ہو کر کبھی ان کے دفتر اور کبھی سیدھا ان کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔

میں ان کے گھر کے قریبی بس اسٹاپ پر اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نیلا بھی کسی دوسری بس سے اتر کر گھر جا رہی تھی۔ ہم اکٹھے ہو لئے۔ ان کا گھر بس اسٹاپ سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ نیلا نے بتایا کہ اس نے ماموں کے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا کہ شام کو اسے ریکارڈنگ کے لئے ریڈیو اسٹیشن جانا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ وہ جانے سے پہلے کچھ دیر آرام اور ریاض کر لے۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے ہم ان کے گھر کے قریب پہنچ گئے۔ نیلا نے اپنے پرس سے اپنی چابی نکالی گھر کے سبھی افراد کے پاس باہر کے دروازے کی اپنی اپنی چابی تھی۔ تاکہ وقت بے وقت آنے پر گھر کے اندر کے لوگ خواہ مخواہ ڈسٹرب نہ ہوں۔

ان کا دروازہ سیدھا ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ وہاں ایک طرف گانے بجانے کا سامان سجا رہتا تھا۔ صوفہ سیٹ اور دیوان دروازہ کھولنے پر سامنے ہی نظر آجاتے تھے۔ ان کا دروازہ پرانی طرز کا دو پٹ کا دروازہ تھا۔ حفاظت کے خیال سے اس پر گودریج کا تالا تھا۔ اس لئے ایک پٹ پر اندر سے اوپر نیچے دو چٹخنیاں چڑھی رہتی تھیں۔

میں نیلا کے مقابل بند پٹ کی طرف کھڑا تھا۔ نیلا چابی لگا کر دوسرے پٹ سے اندر داخل ہوئی اور ایک دلدوز چیخ مار کر دھڑام سے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر اندر جھانکا۔

سامنے دیوان پر بھائی صاحب اور نیلا کی پڑوس کی سہیلی دونوں باہمی اختلاط کی حالت میں ایک دوسرے میں سمائے ہوئے تھے۔

میں الٹے پاؤں واپس چلا آیا۔

ہندوستان کا پہلا
سائنسی اور معلوماتی
اردو ماہنامہ
سائنس
قیمت :- صرف ۸ روپے
—— رابطہ ——
ایڈیٹر سائنس
۶۶۵/۱۲ - ذاکر نگر - نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور
ارسال کریں

ایلاف خیری
گولکنڈہ، حیدرآباد

نوجوان قلم کاروں سے

ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا کا کوئی کام یا کوئی چیز بے مقصد اور بے کار نہیں۔ ہر چیز بجائے خود اہم اور ہر کام ناگزیر محسوس ہوتا ہے۔ پہاڑ کی اہمیت بھی مسلمہ ہے تو گلہری بھی تو چھالیہ توڑ کر دکھاتی ہے۔ جب ہر چیز اپنی اپنی جگہ اپنی زندگی کا جواز اور اپنے کام کی دلیل رکھتی ہے تو قلم کیسے بے کار ہو سکتا ہے۔ قلم نہ صرف یہ کہ خود بادشاہ ہے بادشاہ گر بھی ہے۔ قلم کی بادشاہت تو یہ ہے کہ وہی بات لکھتا ہے جو حق ہے۔ اس کی گردن پر خون ناحق کا الزام نہیں ہوتا۔ اور جو قلم "باطل قلم" ہو اس کو ناحق قلم کہا جاتا ہے۔ یہی باطل قلم اخبار کے صفحات سیاہ کرتا ہے تو زرد صحافت وجود میں آتی ہے اور اپنی سرخیوں سے آگ لگا دیتی ہے۔ قلم بہکنے لگتا ہے تو خود تو ٹھوکر کھاتا ہی ہے ساتھ ساتھ کئی ناخن اکھڑ جاتے ہیں اور پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل جاتے ہیں۔ یہ خون انسانیت کا خون ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا خون ہو سکتا ہے اور ادب کا خون کہلاتا ہے۔

اس لئے میری پہلی گزارش قلم کاروں سے یہ ہے کہ وہ پہلے قلم پکڑنا سیکھیں۔ پہلے اس میدان سے پوری پوری واقفیت حاصل کر لیں جس میں انھیں دوڑنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر لگے اور ہمت پست کر دے۔ اگر افسانہ نگاری کا میدان اپنے لئے اپنے مزاج کی مناسبت سے چنا ہے تو نووارد قلم کاروں کو چاہئے کہ وہ میدان افسانہ نگاری کے جو اہم نام ہیں ان سے آشنا ہوں۔ ان کے کارناموں سے واقف ہوں اور ادب میں ان کی اہمیت کو جانتے ہوں۔ اس کے لئے انھیں کسی نقاد یا استاد سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ خود ان نوجوان قلم کاروں کے اندر جو فن کار چھپا ہوتا ہے وہی ان کی وجدانی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح اگر کسی نوجوان قلم کار کو شعر گوئی سے دلچسپی ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ اساتذہ کا کلام گہری نظر سے پڑھے [illegible]

شعرا کا کلام یاد رکھے۔ ان سے الفاظ برتنے کا سلیقہ ملے گا اور خود اس کا وجدان اچھے شعر کا لطف لے گا اور برے شعر پر بے مزہ بھی ہوگا۔ اچھے اور برے فن پارے کی جو پہچان ہے وہی ایک ایسی لطیف کیفیت ہے جس کی تعریف (DEFINITION) پوری طرح نہیں کی جا سکتی اور یوں بھی شعر کہنے کی صلاحیت ایک وہبی صلاحیت ہے۔ محض فن عروض یعنی فاعلاتن فاعلات کے قاعدے اور اصول سیکھ کر کوئی شاعر نہیں ہو سکتا۔ شعر گوئی سیکھنے کے لئے اسے اپنے مزاج ہی کو شعری مزاج بنانا ہوگا۔ اس کے لئے اچھے اور کامیاب شعرا کی کتابیں چھاننی ہوں گی۔ لفظ کا مزاج شناس ہونا پڑے گا اور زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل کرنی ہوگی کیونکہ شعر الفاظ کی معمولی سی اعراب کی غلطی کا بھی متحمل نہیں ہوتا۔ زیر زبر پیش کی غلطی بھی شعر کو بے بحر اور شاعر کو "بے بہرہ" ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ افسانہ نگار، نقاد، مضمون نگار، ڈرامہ نگار یعنی مختلف نثر کے لکھنے والے کوئی بھی لفظ کسی بھی طرح لکھ سکتے ہیں کیونکہ انھیں کسی بھی لفظ کو بطور قافیہ استعمال کرنا نہیں ہوتا اور نہ پڑھنا یا گانا ہوتا ہے جبکہ شاعر کا ہر لفظ شعر میں اپنے تمام تر صحیح اعراب و ادائیگی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سامعین اور قارئین کو بے مزہ اور شاعر کو بے وقار کر کے رکھ دیتی ہے۔ شعر کہنا ہو تو الفاظ کے صحیح خدوخال سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آج شاعر اپنے لغوی معنوں کا اسیر ہو کے نہیں رہ گیا ہے۔ اس میں صرف عورتوں کی باتیں نہیں کی جاتیں بلکہ اس میں دنیا کا ہر مسئلہ، ہر خیال، ہر احساس اور ہر مضمون باندھا جانے لگا ہے۔ شعر گوئی آسان نہیں [illegible]

قد آور شاعروں کے درمیان اپنی پہچان بنانی ہو تو جدید ترین اظہار کا پیرایہ اختیار کرنا ہوگا اور اپنے گرد و پیش کے واقعات، مشاہدات اور تجربات کو شعر کی زبان عطا کرنی ہوگی۔ تب کہیں کوئی بات بنے گی ورنہ شاعر بھیڑ میں گم ہو کے رہ جائے گا۔

مضمون لکھنا شعر کہنے سے زیادہ مشکل کام ہے

ہر جملہ کا مکمل اور مدلل ہونا ضروری ہے۔ جس موضوع پر مضمون لکھا جا رہا ہو اس سے پورا پورا انصاف کرنا ہی مضمون نگار کا مقصد ہوتا ہے۔ مضمون نگار کو اپنی بات سمجھانے کے لئے جواز پیش کرنا ہوتا ہے، کتابوں کے حوالے دینے ہوتے ہیں۔ اور ان سب حوالوں کے ساتھ ایک نئی فکر پیش کرنی ہوتی ہے۔ جبکہ شاعر قافیہ و ردیف کا ہاتھ تھام کر بہت دور تک جا سکتا ہے۔ اس کے اشعار میں ایمائیت، رمزیت، علامت وغیرہ کے نام پر کچھ مفہوم اور معنے فرض کر لئے بھی جا سکتے ہیں جبکہ مضمون نگار کا ہر جملہ دو ٹوک اور اکہرے معنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ شعر میں ذو معنویت حسن ہے مگر نثر میں یہ عیب شمار ہوتی ہے۔ ہر جملے سے منفرد مفہوم کا ادا ہونا ہے [illegible] دوسرے معنے نہیں نکالے جا سکتے جبکہ ایک ایک شعر کی کئی شرحیں لکھی جا سکتی ہیں۔ نوجوان قلم کاروں کو چاہئے کہ مضمون لکھیں تو پورے اعتماد کے ساتھ اپنی بات دو ٹوک انداز میں پیش کریں۔ مجتہد ادیبوں اور قلم کاروں کے حوالوں سے اپنی بات میں وزن پیدا کریں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نئے لکھنے والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک مضمون کو کم از کم چودہ بار لکھیں۔ بار بار لکھنے سے جملوں کو حسین سے حسین تر اور زیادہ مدلل بنانے کا جذبہ جاگتا ہے جو مضمون کو [illegible]

[illegible]

نوجوان قلم کاروں سے ایک اور گزارش ہے
کہ وہ اپنے قلم سے اپنی بات لکھیں حق گوئی و بے باکی
اختیار کریں۔ اپنے قلم سے کوئی بات دوسروں کو خوش
کرنے کی نیت سے نہ لکھیں بلکہ بے نیازی سے قلم کو برتیں
قلم برتنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی پہلے کچھ سیکھ لے
پھر دوسروں کو بھی سکھائے۔ قلم تو ایک امانت ہے۔
قلم کی امانت ایک نسل سے دوسری نسل بلکہ نسل
در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا قلم کار کے لئے
ضروری ہے کہ وہ قلم کی امانت سلیقے سے منتقل کرتے
رہیں اور یہ سلیقہ یوں ہی حاصل نہیں ہوتا۔ بڑی محنت
بڑا ریاض چاہتا ہے۔ تب کہیں بات کہنے کا سلیقہ
آتا ہے تو سب سے پہلے بات کہنے کا سلیقہ سیکھنا
چاہئے۔ کوئی یہ نہ کہے ؎

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اور ممکن ہے کوئی یہ بھی کہے ؎

بات کرنی بھی نہ آتی تھی انھیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

خود اس شعر میں یہ اعتراف چھپا ہوا ہے کہ بات
کرنی اب آگئی ہے۔

بات علمیت سے خالی ہو تو وہ بات ہی کہاں
ہوئی۔ نوجوان قلم کار پہلے اپنی علمیت پہ زور دیں
علمیت اور بات دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بات کے بغیر
علمیت اور علمیت سے خالی بات ادھوری شمار ہوگی۔
بے دلیل اور بے جواز بات، دیوانے کی بڑ سے زیادہ
نہیں۔ اپنی بات کی دلیل دینے کے لئے علمیت
ضروری ہے۔ اسی لئے نوجوان قلم کار کچھ بات کرنے
سے پہلے کچھ لکھنے سے پہلے اپنی علمیت پر توجہ دیں
تو ان کی بات باوزن و پُر اثر ہوگی۔ اس
وزن و وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ
نوجوان قلم کاروں کا علم حاضر ہو۔ دانش حاضر ہی
سے آدمی ـــ آدمی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کل ہر چیز کا حساب
لیا جائے گا۔ مال و دولت کے ساتھ ساتھ ہاتھ
پاؤں، آنکھ کان، زبان ـــ بلکہ بدن کے ایک
ایک حصے کا حساب ہوگا کہ ان صلاحیتوں کو کہاں
صرف کیا گیا۔ اس طرح میرا ایمان ہے کہ قلم کی بھی
پوچھ ہوگی۔ اللہ نے قلم کو لکھنا سکھایا تو یہ سوال
تو ہوگا ہی کہ قلم کی صلاحیت کو کہاں برتا گیا؟ ـــ
قلم بے مقصد نہیں برتا جاسکتا اسے کسی کام آنا چاہئے
لوگ اپنے آوزار و آلات سے تاریخ میں انمٹ
نقوش چھوڑ گئے۔ جو آج بھی قطب مینار، تاج محل،
اجنتا ایلورا، گول گنبد، چار مینار وغیرہ کے روپ
میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اسی طرح
قلم کاروں نے اپنے قلم کی یادگاریں چھوڑی ہیں
وہ غالب کا دیوان ہو کہ ڈپٹی نذیر احمد کی "توبۃ النصوح"
عبدالحلیم شرر کی فردوس بریں ہو کہ علامہ اقبال
کا "جاوید نامہ" یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا "تفہیم
القرآن" (چھ جلدیں) ہر شاہکار اپنی جگہ اپنے اپنے
قلم کاروں کی زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اسی
لئے نوجوان قلم کاروں سے توقع ہے کہ وہ کوئی بڑا
اہم کارنامہ پیش کرنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیں گے۔
یہ قلم ان کے ہاتھ میں وہ تیشہ بھی ہے جس سے وہ
اپنے آگے کھڑی ہوئی تمام دیواریں گراتے ہوئے آگے
آئیں گے اور ایک نئی دیوار اٹھادیں گے جس کو کسی اور

آنے والے کے ہاتھوں گر جاتا ہے۔ ادب میں ہر لکیر چھوٹی ہوتی جا رہی ہے کیونکہ زندگی کے ہر میدان میں بھی ہر لکیر اک بڑی لکیر کے ہاتھوں اپنا قد قامت کھو رہی ہے۔ یہی ارتقا کی علامت ہے اور یہی زندگی کی پہچان ہے۔ بقول مجروح سلطانپوری ؎

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

قلم کاروں کے سامنے کلاسیکی ادب کی بڑی بڑی چٹانیں ہیں، ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے پہاڑ ہیں اور جدیدیت کے آسمان بھی ہیں مگر نئے قلم کاروں کو نئے حوصلوں کے ساتھ نئی توانائیاں لئے ہوئے اپنا ہنر دکھانا ہے کہ ؎ بقول رؤف خیر

یہ آسمان تو کچھ بھی نہیں ہے میرے لئے
لہو کا زور مرے بال و پر میں اتنا ہے

اور یہ ؎

الٰہی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قناعت پسندی اچھی چیز ہے مگر زندگی اور ادب ہل من مزید سے عبارت ہے۔ یہ تڑپ یہ لو جہاں مدھم پڑ جائے وہیں سے صلاحیتوں کو زنگ لگنا شروع ہوتا ہے۔ نوجوان قلم کار اپنے آپ کو زنگ لگنے سے بچائے رکھیں اور یہ کارنامہ خود میں بھی انجام دینا چاہتی ہوں۔

ان دنوں چھپنے چھپانے کی بڑی سہولتیں حاصل ہیں۔ نوجوان قلم کاروں کی تخلیقات چھپ جائیں تو انھیں اس کامیابی پر پھولنا نہیں چاہئے بلکہ بہتر سے بہتر تخلیق کی تلاش میں لگے رہنا چاہئے۔ [illegible]

پریم چند سے جب پوچھا گیا کہ ان کی بہترین کہانی کون سی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا تھا۔

" بہترین کہانی ابھی تو میں نے لکھی ہی نہیں۔"

"یادوں کا سفر" کی شاندار
مقبولیت کے بعد
قیصر عثمانی
کی ایک اور تصنیف منظرِ عام پر
یادوں کے سائے
(مصور)
نرگس، مینا کماری، مدھوبالا، موتی لال، چندرموہن
سہراب مودی اور دیوندر گوئل وغیرہ
کی یادیں۔
صفحات:- ۱۲۸۔ طباعت آفسیٹ۔
سرورق رنگین
پتہ:- قیصر عثمانی، جمیلہ بلڈنگ، پیپا پارک
ملاڈ، ایسٹ بمبئی۔

براہ کرم توجہ دیں

اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں تاکہ کتابت کرنے میں آسانی ہو اور غلطیوں کا امکان کم ہو۔ فوٹو اسٹیٹ اور کاربن کاپی قبول نہیں کی جائیگی۔ تخلیقات غیر مطبوعہ ہوں اور صفحہ کے ایک جانب لکھی ہوں

نئی قتل گاہ — بوسنیا

حنیف ترین
سعودی عربیہ

یہ کون لوگ ہیں جو
ہیں منحرف ہجوم سے
صلیب کے جنون سے
قدم قدم پہ خون سے
کہانی لکھ رہے ہیں وہ
مکمل ہو گی داستاں جو
وہ مثل جوئے جنت کے پھولوں کو کھلائے گی
جو طرزِ درندگی زمانے کو دکھائے گی
یہ کیسے لوگ ہیں کہ جو
حیا کے برف گھاس کو
جلا کے بھوک پیاس کو
سمیٹے درد آس کو
اٹھائے اپنے ہاتھ پر
خودی کی سرد لاش کو
لگے ہیں کوششوں میں اس میں پھر سے سانسیں ڈال دیں
تھکی زمیں پہ حق کی کوئی کہکشاں اچھال دیں
حقیقت کی ڈھال کو نئے سروں کی تال دیں
تباہ ہیں جن کی عصمتیں
وہ روحیں بلبلاتی ہیں
چٹک گئے جو بھوک سے
وہ پیٹ، تلملاتے ہیں
ٹھٹھر کے ٹھنڈ سے جہاں پہ گرم سانسیں جم گئیں
ستم کے معصوم شکل سیپ کی ساز سے
جواں بڑھے سو نفس بے علاج پھر کہیں سہم گئیں

جہاں پہ ہجرتوں میں کتنی بستیاں اجڑ گئیں
مدد کے واسطے جہان بھر یہ بلاتی ہیں
اور سارا جگ خموش ہے
یہاں بھی ہر سو ہر جگہ
نئے نظام کے خدا/ یہودیوں کے ہم نوا
ہیں متحد اسی طرح
کہ جس طرح عراق پہ
ڈھلے ہوئے فرات پہ
گرے تھے بن کے بجلیاں
مٹا دیں ان کے سب نشاں
وہ پھر نہ ہو سکیں جواں
کہ ان کے دل میں اپنی عظمتوں کا سبز خواب تھا
حصار جس کا ٹوٹنے کا کاسہ بھرا، سراب تھا۔
یہ سرفروش سربلند
ہیں نسبتوں کی یہ کمند
یہ دینِ حق کے ہیں سمند
جری، نڈر دار جمند
سلام کر انہیں کہ یہ جہاد کے امین ہیں
جو جھک سکی نہ جبر سے وہ سرخ رو زمیں ہیں
یہ کون لوگ ہیں کہ جو مثال بن گئے ہیں آج
جو پھر پاشنوں پر کمال بن گئے ہیں آج

جاری

سخنور حسن فتحپوری

ماهیا
نظمیں

(۱)
بستر کی شکن بولی
اب نیند ضروری ہے
دن بھر کی تھکن بولی

(۲)
جب نیند نہیں آتی
بستر کی شکن بھی تب
کیا ظلم نہیں ڈھاتی

(۳)
کانٹے سے چبھوتا ہے
تنہائی کا اک اک پل
بس خون ہی روتا ہے

(۴)
مر مر کے جئے سجنی
ساجن کی جدائی میں
ہر زہر پئے سجنی

(۵)
دامن کو بچا سجنی
یہ پریم کی اگنی ہے
خود کو نہ جلا سجنی

(۶)
مرتوں کو جلا سجنی
گرمی کا یہ موسم ہے
پنکھا تو جھلا سجنی

(۷)
مندھنی میں بندھی سجنی
اگنی کے توسط سے
ساجن کی ہوئی سجنی

(۸)
ملہار سناتی ہے
کوئل کی مدھر بانی
ساجن کو بلاتی ہے

(۹)
یاد اس کی دلاتی ہے
ہر رات پپیہے کی
آواز ستاتی ہے

(۱۰)
زخموں پہ بہاریں ہیں
برسات کا موسم ہے
کیا غم کی پھواریں ہیں

(۱۱)
بارش میں یہ ہوتا ہے
سیلاب ہے سڑکوں پر
دل آگ میں جلتا ہے

(۱۲)
اندر سے امڈتے ہیں
جذبات کے بادل ہیں
باہر کو برستے ہیں

فیروز نظامی، لکھنؤ

چھینٹے مرے لہو کے بھی بار ہو گئے
طغروں کی طرح رونقِ دیوار ہو گئے

ان کے اصول جب سے دل آزار ہو گئے
رشتے تمام لاغر و بیمار ہو گئے

ہم تو قدم قدم پہ گنہگار ہو گئے
کیا لوگ تھے جو صاحبِ کردار ہو گئے

اک شخص نے کل اس طرح پوچھا فراغِ دل
دو چار زخم اور بھی خونبار ہو گئے

کیا جانے ہم کو بیچتی قسمت کہاں کہاں
اچھا ہوا کہ آپ خریدار ہو گئے

اپنی زباں کو جلد جھکاؤ کہ لوگ اب
با واقفِ نزاکتِ گفتار ہو گئے

اتنا غزل نواز ہے یہ دل کہ ان سے آج
دورانِ گفتگو کئی اشعار ہو گئے

کل جن کو میری تیز مزاجی کا تھا گلا
میں شاخِ گل ہوا تو وہ تلوار ہو گئے

اب ہم کو انتظار کسی کا نہیں رہا
اب ہم خود اپنے قافلہ سالار ہو گئے

تم ہی سے کچھ امیدِ کرم تھی سو تم بھی اب
منجملۂ روایتِ اغیار ہو گئے

فیروز لطف سہہ گیا آؤ گھر چلیں
سہرے سجا کے بر سرِ بیکار ہو گئے

بی پی سریواستو رند ساغری
نوئیڈا (یو۔پی)

اوڑھ کر حادثوں نے تاج مرا
زندگی سے لیا خراج مرا

یہ رُتیں کیوں بدلتی رہتی ہیں
صرف اتنا ہے احتجاج مرا

میں تو تنہائیوں کی محفل ہوں
مجھ میں پلتا ہے اک سماج مرا

کرب کی اک لپٹ بھی مرا وجود
اور سکونِ لمس بھی مزاج مرا

دکھتے لمحوں پہ پٹیاں رکھ کر
موسموں نے کیا علاج مرا

دودھیا صبح کا حسین سورج
راستہ دیکھتا ہے آج مرا

حال کا کیا ہے حال تو اے رند
کل یہ کب ہوگا جو ہے آج مرا

غزلیں

دلوں سے حوصلوں کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے
مری تہذیب اب تہذیب ماتم ہوتی جاتی ہے
خوشی بھی سامنے آتی ہے غم کا پیرہن پہنے
ہماری عید بھی اب تو محرم ہوتی جاتی ہے
یہ اپنا عہد کیسا عہد ہے آہستہ آہستہ
ضمیروں کی ہر اک آواز مدھم ہوتی جاتی ہے
اتاری میں نے جب کشتی مخالف تھیں سبھی موجیں
اب آندھی بھی شریک خیر مقدم ہوتی جاتی ہے
جنم لیتی ہے ہر تہذیب سے تکفیر کی صورت
یہ دنیا روز مشق روز قائم ہوتی جاتی ہے
زمیں پہ دور تک شعلے، دھماکے اور چیخیں ہیں
ادھر ہر امن کی امید بے دم ہوتی جاتی ہے
ہزاروں کام ادھورے ہیں نیازؔ اب بھی یہ عالم ہے
ادھر ترتیب اجزا ہے کہ برہم ہوتی جاتی ہے

مستین نیازؔ
بھوپال



بجھے گی پیاس تب ہی جب کہ پیاسا جام تک پہنچے
رہی ہے داستاں، جو داستاں انجام تک پہنچے
ہماری فتح اس میں ہے کہ خود کو پا لیا ہم نے
نکل کر تیری جنت سے دل ناکام تک پہنچے
وہ اک دن ہو گئے مفلوج یہ تاریخ شاہد ہے
جو دست بے ادب بھی دامن اسلام تک پہنچے
بھروسہ کیا ہے ہستی کا نہ جانے کب دغا دے دے
ضروری تو نہیں ہر دن چراغ شام تک پہنچے
یہ معیار سخن بھی ہے، یہ معراج سخن بھی ہے
کہ بزم خاص میں مہکے، زبان عام تک پہنچے
پرندوں کی کہانی کا نتیجہ یہ ہوا آخر
تلاش رزق میں نکلے تھے، لیکن دام تک پہنچے
نیازؔ اب تک چلا ہے عشق اپنی اس روایت پر
اسی کو عشق کہتے ہیں کہ جو الزام تک پہنچے

نشتر اکبرآبادی

— پونہ —

دو گھروں کے درمیاں پہچان روشن کر گئی
تتلیوں کی روشنی دالان روشن کر گئی

اس کی اک اک بات میرے ذہن میں محفوظ ہے
تربیت اس کی مرا ایمان روشن کر گئی

حسن کی معجز نمائی عشق کے دربار میں۔
ظلِ سبحانی کے سب فرمان روشن کر گئی

فکر کی گہرائی غالب کا مقدر بن گئی
عشق کی لو میر کا دیوان روشن کر گئی

تشنگی ٹیگور کی لے آئی ساحل پر مجھے
علم کی کم مائیگی ارمان روشن کر گئی

سچ کا آئینہ دکھا کر داستانِ کربلا!
بزدلوں پر موت کا عنوان روشن کر گئی

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

اٹاوہ (یو پی)

چاندنی جب بھی کسی گھر میں نظر آتی ہے
لاش لپٹی ہوئی چادر میں نظر آتی ہے

موم زادوں کے سفینوں سے اٹھے ہیں شعلے
آگ ہی آگ سمندر میں نظر آتی ہے

فائلیں ڈوب گئیں وقت کے سناٹے میں
خامشی ان دنوں دفتر میں نظر آتی ہے

سر زمیں پھر کسی مشکل میں نہ پڑ جائے کہیں
دلکشی چرخِ ستمگر میں نظر آتی ہے

جگمگاتا ہے عجب شان سے شبنم کا شباب
شعلگی حسنِ گلِ تر میں نظر آتی ہے

ظلمت وادیٔ اوہام، الٰہی توبہ
تیرگی نور کے لشکر میں نظر آتی ہے

راز یہ پوچھتے آئے ہیں زمانے والے
کس کی تصویر مرے گھر میں نظر آتی ہے

غزلیں

غزلیں

مدہوش بلگرامی

— ہردوئی —

یوم سعید بھی ہے مسرت بھی پاس ہے
پھر بھی تو دیکھیے دل مضطر اداس ہے
یہ موسم بہار ہے یا ہے خزاں کا دور
جس کے بدن پہ دیکھو دریدہ لباس ہے
قصہ سنا رہا ہے جو پریوں کے دیس کا
وہ شخص میرے غم سے کہاں روشناس ہے
برسات میں گرے گا یقیناً وہ ایک دن
کمزور جس مکان کی یارو اساس ہے
گزرا ہے میرا بھائی یوں میرے قریب سے
دشمن ہے غیر ہے کہ کوئی ناشناس ہے
کھلتے ہی کوئی ان کو مسل ڈالے گا ضرور
کلیوں کو پھر بھی دیکھیے کھلنے کی آس ہے
مدہوش کیسا غم ہے مجھے بھی بتا ذرا
معصوم سا یہ چہرا ترا کیوں اداس ہے

وسیم مینائی شاہجہاں پوری

شاہجہاں پور (یو۔پی)

وہ بحر حوادث میں اکیلا بھی نہیں ہے
حاصل جسے تنکے کا سہارا بھی نہیں ہے
اس شخص کے بارے میں ہی خوش فہمیاں کیا کیا
میں جس سے ملا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں ہے
بچے بھی ہیں حالات کے مارے ہوئے شاید
دل ان کا کھلونوں سے بہلتا بھی نہیں ہے
بیٹھا ہوں اسی سے میں بڑی آس لگائے
جس پیڑ پہ پھل کیا کوئی پتا بھی نہیں ہے
اس پردہ نشیں کی ہے عجب پردہ نشینی
چھپتا بھی نہیں سامنے آتا بھی نہیں ہے
کیا اردو ادب میں ہیں وسیم اپنے مراتب
ہم نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں ہے

مشرف عالم ذوقی

ترجمہ:۔ تبسّم فاطمہ

مسلمان
قسط ۱۵

۹۰ ــ ۶/۸۶ دہلی

★ تھانوی جی نے تصویر کو غور سے دیکھا ــ پھر بولے ــ "تجزیہ کافی نہیں ہے۔ تم جی مت جتنا کہاں سکی"

"لیکن سر؟"

اس کا لہجہ ایکدم سے کھوکھلا تھا ــ ایسے لوگوں کے خلاف لکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ لوگ طاقت بنتے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ماجیہ سبھا کی پرتشٹھا کا خون کیا ہے۔ جہانگیرا کل تک ایک معمولی سا دلال تھا ــ طوائفیں تک اس بات کی گواہ ہیں کہ دنگوں میں اس نے کافی مال کمایا ــ اور مال ہی نہیں کمایا، بلکہ سیاست کے اکھاڑہ میں بھی کود پڑا۔ دو برسوں کی سیاسی اٹھاپٹک میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ــ"

تھانوی جی نے اسے غور سے دیکھا پھر اپنا فیصلہ سنادیا ــ "مجھ میں اپنا اخبار بند کرانے کی ہمت نہیں ہے۔"

رہی۔۔۔ اس کے اندر جیسے زبردست آگ دہک رہی ہو۔۔۔

ہاں اس نے سچ کا انکشاف کیا تھا۔۔۔ تلخ سچ کا۔۔۔۔۔

پتہ نہیں رات کے کتنے پہر گذر گئے ہوں گے ــ بیتی یادوں نے جیسے اسے لہولہان کرنا شروع کر دیا۔۔ وہ لکھتی گئی۔۔۔ لکھتی چلی گئی ــ اسے لگا، بڑی ماما کی بھٹکتی روح کو سکون مل گیا ہے ــ اسے لگا، کسی گوشہ سے نکل کر اچانک بائی اماں اس کے سامنے کھڑی ہوگئی ہوں ــ اور کہہ رہی ہوں ــ

"ہمارا کیا ہے۔۔۔ لیکن تو اس ماحول سے نکل جا۔ ــ ہمیشہ سچ بولنا افروز ــــ"

اس کی آنکھیں گیلی ہوتی چلی گئیں ــ

دوپہر میں وہ دفتر میں ہی تھی کہ شعیب کا فون

"شام میں مجھ سے ملو۔"

"لیکن آج تو میں کافی بزی ہوں۔"

"لیکن تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں۔ کچھ ایسا ہی سمجھو۔"

ادھر وہ کچھ اس قدر مصروف رہی کہ شعیب سے ملنے کا وقت ہی نہیں نکال سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روز روز کی خبروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

اتنے مسلمان مارے گئے۔

اتنے ہندو مارے گئے۔

دنگے فساد کی خبروں کو اس نے پڑھنا ہی بند کر دیا تھا... یہ ساری خبریں جیسے باسی ہو گئی تھیں۔ ... یہ ملک کہاں جا رہا ہے... لوگوں کو یہ کیا ہوتا جا رہا ہے...

اسے لگا، موجودہ سیاست نے ذہنوں کی جیسی تقسیم اب کی ہے، پہلے کبھی نہیں کی۔ اب وہ دوستوں سے ملتی تو ان کے چہروں پر بھی فرقہ وارانہ رنگ دیکھتی ہاں اسی دن وہ ونئے کی بات پر چونکی تھی۔

"مسلمان زیادہ کمیونل ہیں۔ ان کے مذہب میں تو...؟"

کتنا مذہب جانتے ہو تم؟ وہ چیخی تھی۔

"چیخو مت۔"

ونئے کے لہجہ میں تلخی بھری تھی۔ یہ تمہارا دوغلاپن ہے جو جاننے کی ان سیڑھیوں تک سمٹ آتا ہے جو تم سے الگ گھر کی سیڑھیوں پہ ہم کیا ہیں؟ ہم ہندو ہیں یا مسلمان۔ تمہارے مذہب میں تو کافروں کو جان سے مارنا بھی کار ثواب ہے۔"

"تھوڑا بہت مذہب میں بھی جانتی ہوں ونئے۔ اسلام میں چھوٹے سے چھوٹے ذی روح تک کو تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔"

اسی لئے قربانی تمہارے یہاں جائز قرار دی گئی ہے۔ تمہارے مذہب کی پیاس جانوروں کو مار کر بجھتی ہے۔"

"ونئے!"

وہ ہکا بکا اُسے دیکھ رہی تھی۔

ونئے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کیا بول رہا ہے۔ وہ جس پتے پر تکیہ کر سکتی تھی، وہ پتہ بھی ڈالا کا ساتھ چھوڑ رہا ہے... اُسے تو ونئے پر بھروسہ تھا۔ ونئے جیسوں پر۔ کہ جب تک اس جیسے لوگ باقی ہیں، یہ ملک باقی ہے۔ اس لئے جب ملک سالم ہے تو ذہنیت کو بھی صحیح سوچ کے دائرے میں قید کیا جا سکتا ہے۔

اس نے سُنا تھا، ونئے کا بھائی گونڈہ کے فساد میں مارا گیا۔ ونئے یہ خبر سُن کر گھر بھی گیا تھا اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی ہے۔ لیکن وہاں فساد میں اکیلے ونئے کا بھائی ہی تو نہیں مارا گیا۔ ہندو بھی مارے گئے۔ مسلمان بھی۔

پھر اچانک ونئے کے خیالات اتنے بدل کیسے گئے نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ کبھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اس واقعہ سے ٹھیک دو روز بعد ونئے نے اس کے دفتر فون کر کے اس سے معافی مانگی تھی۔ مگر معافی مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔

دلوں میں غبار جیسی کوئی شئے جم جائے تو... ؟

شام میں وہ شعیب سے ملی تو وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا ـــــ داڑھی بڑھی ہوئی تھی ـــ چہرے پر الجھن کے آثار تھے ـ

وہ ڈر گئی ۔" کیا بات ہے شعیب ؟"

" آؤ وہاں بیٹھتے ہیں ـ"

شعیب نے میدان کے خالی حصے کی طرف اشارہ کیا ـــــ وہاں کی ہری ہری گھاس پر دونوں بیٹھ گئے ـ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ـــــ

" سمجھ میں نہیں آتا کیسے کہوں ؟"

" ماجرا کیا ہے ؟"

" مجھے لگتا ہے وہ مجھے قتل کر دے گا" اس کے لہجے میں خوف اتر آیا تھا ـــــ

" کون ؟"

انجو کا دل دھک دھک کر رہا تھا ـ

" ونئے "

یہ اس سے بھی بڑا دھماکہ تھا ـ

" ونئے ـــ" انجو حیرت سے چیخی ـــ پاگل تو نہیں ہو گئے ـ ہوش میں تو ہو تم ـــ تم دونوں اتنے اچھے دوست ہو ـــ ایک ساتھ رہتے ہو ـ'

یہی تو عجیب بات ہے ـ اس نے مجھ سے معافی بھی مانگ لی ـــ لیکن ہم دونوں ـــ کہنا چاہئے ، ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں ـ کیا جانے کون کس پر حملہ کر دے ـ

" یہ کیا بک رہے ہو ـ"

" اس دن وہ اپنے بھائی کی لاش دیکھ کر آیا تھا ـ کافی غصے میں بھرا ـــــ میں چپ رہا ـ جانتا تھا ـــ اس کا بھائی دنگے میں مارا گیا ہے ـ زخم تازہ ہے ـ وہ جو بھی بولتا ہے ، بولنے دو ـــ اس لئے کہ میرا بھائی بھی مرتا تو میں دو لفظ کم از کم ہندوؤں کے خلاف ضرور بولتا ـــ نہ بولتا جب بھی دل میں یہ بات رہتی کہ میرے بھائی کو ہندوؤں نے مارا ہے ـــ یہ زہر پینا تھوڑا مشکل ہوتا میرے لئے بھی ـــ نفسیات کی اتنی پکڑ تو میں رکھتا ہی ہوں ـــ مگر کیا معلوم تھا کہ اچانک .... ؟

شعیب کی آنکھیں خوفزدہ نظر آنے لگیں ـ

" اس رات اچانک میری نیند کھل گئی ـــ کہنا چاہئے مری چھٹی حس نے مجھے جگا دیا ـ کیا دیکھتا ہوں ، ونئے سبزی کاٹنے والا ہنسوا لے کر مجھ پر حملہ کرنے والا ہے ـ میرے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی ـــ میں نے اسے دھکا دیا ـــ ونئے لڑکھڑا کر گر پڑا ـــ ہنسوا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ـ میں نے اسے پوری طاقت سے جھنجھوڑا .... ونئے تم .... تم مجھے مارنا چاہتے ہو ـــ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــ شعیب مجھے معاف کر دو ـــ میں نے اپنے بھائی کی خوفناک لاش دیکھی ہے ـــ ایسی کہ اچھے بھلے کی تمیز بھول بیٹھا ـــ اس وقت .... مجھے صرف اتنا لگا کہ تم ایک مسلمان ہو ـ تم ان لوگوں میں سے ہی ایک ہو جنہوں نے گونڈہ میں میرے بھائی کا قتل کیا ہے .... تمہیں مار ڈالنا چاہئے ـــ

شعیب کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی ـــ عجیب بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ بھی رہنا چاہتے ہیں ـ ہم دونوں میں سے کوئی کمرہ چھوڑنے کو تیار نہیں ـــ اس رات ونئے نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگ لی ـ لیکن اس رات بھی خوف کے مارے ہم دونوں میں سے کوئی بھی سو نہ سکا ـــ پتہ نہیں کب کس کی آنکھ لگ جائے اور دوسرا ہنسوا چلا دے ـــــ

شہاب ڈائری

(بہار شریف)

خاموش نگاہیں

★ بیرونِ ملک میں جراثیم پر قابو پانے کے لئے کون کون سے طریقے اپنائے گئے ہیں اس کی واقفیت حاصل کرکے جب میں ایک ماہ بعد وطن واپس آیا تو میری غیر موجودگی میں آئے ہوئے خطوط کے انبار میں مجھے وہ تار بھی ملا جس کو پڑھتے ہی میرا دماغ گردش میں آگیا ——
یکایک آنکھوں میں تیرگی چھیلی —— دل میں اٹھتی ہوئی یادوں کی یورش اس قدر طوفان خیز تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا ہر بندش کو توڑتا ہوا بہنے لگا۔ نہ جانے کب تک میں خود پر قابو نہ پا سکا تھا —— مجھے معلوم نہیں، کیونکہ اچانک جو کچھ مجھ پر گذرا تھا —— اس نے میرے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا —— رشتہ کا مضبوط بندھن ہم دونوں کے درمیان یقیناً قائم تھا —— لیکن ان میں جذباتی لگاؤ کہیں بھی چھپا نہ تھا —— بستر پر بیٹھے بیٹھے

جب ذہن میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو سکون نے میرے دل و دماغ پر اپنے جذب شدہ اثرات کا دباؤ ڈالنا شروع کیا اور لاشعوری طور پر میرا دماغ یادوں کے ہچکولوں میں ڈولنے لگا۔
برسوں پرانی بات ہے جب میں اسکول کی تعلیم مکمل کرکے گاؤں کی مٹی سے نکلتی ہوئی سوندھی سی خوشبو کے ماحول سے باہر شہر میں اپنے بڑے ابا کے سرکاری رہائش گاہ میں آیا تھا۔ میرے گاؤں کے گھر کے ماحول سے یہاں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں غربت کا حال پوری طرح نمایاں تھا کیونکہ ابا مرحوم کی وفات کے بعد ہم دو بھائیوں اور بیوہ ماں کے رزق کا ذریعہ چند بیگہ زمین کی کاشت تھی اور بڑے ابا کی شفقتوں کا سہارا تھا —— اس کے برعکس ان کی طرزِ زندگی معیاری تھی۔ اچھے عہدے پر وہ فائز تھے۔ تسکینِ دل کے لئے ان کے قیام گاہ پر پسند کی چیزیں خدا نے انہیں بخشی

تھیں اور قدرت ان پر اتنی مہربان تھی کہ دولت کا انبار عطا کرنے کے بعد بھی صرف ایک لڑکی کی پرورش ان کے سپرد کی تھی۔ جہاں ان کی پوسٹنگ تھی وہ ڈویژن کی سطح کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اسکول اگرچہ وہاں کئی تھے لیکن کالج صرف ایک تھا۔ اسی سال ان کی لڑکی ثنا نے بھی میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں امتیازی شان سے پاس کیا تھا۔ کالج میں جب اس کے داخلہ کا سوال اٹھا تو بڑے ابا نے اسی کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے علی گڈھ یا دلی کا انتخاب کیا۔ لیکن بڑی امی اپنی بیٹی کو دل میں اٹھتی ہوئی چاہت کے دباؤ سے اپنی نگاہوں سے دور کرنے پر رضامند نہ ہوئیں کئی دنوں تک گھر کچھ خوشگوار ماحول میں کھینچاؤ نے سکوت کا پردہ ڈال دیا ___ میرا داخلہ تو میرے آنے کے بعد دوسرے ہی دن اس واحد کالج میں ہو گیا تھا لیکن ثنا کے داخلے کا مسئلہ بڑی امی اور بڑے ابا کے فیصلے کے درمیان پوری طرح اٹکا ہوا تھا ___ بڑے ابا مخلوط تعلیم کے بڑھتے اثرات قبول کر لینے کے خدشات سے ذہنی الجھنوں میں جکڑے تھے ___ تعطل کے جال میں کہیں شگاف پڑتے ہوئے نہ دیکھ کر بڑی امی نے اپنے پختہ ارادہ کا اظہار کرتے ہوئے صاف صاف میرے ابا سے کہہ دیا کہ ثنا خواہ آگے تعلیم حاصل کرے یا نہ کرے میں اپنی رضا سے ثنا کو اپنی نگاہوں سے کہیں دور جانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گی، ویسے آپ مالک ہیں میں آپ کی کنیز ہوں۔ آپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ ثنا اگر چلی جائے گی تو بہت ممکن ہے کہ میرے دل کا مرض ابھر آئے۔ اور میں زندہ نہ رہ سکوں ___ بڑے ابا چند منٹوں تک چپ رہے پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے ___ ثنا کو کالج لے جانے، لانے اور کالج کے حدود میں اس کی دیکھ ریکھ کی تمام ذمے داریاں تم قبول کر لو تو آج ہی اس کا داخلہ کرا دوں۔

کئی دنوں سے گھر کے ماحول میں جو سوناپن برقرار تھا وہ بڑی امی کے ہونٹوں پر بے اختیار ہو کر آتی ہوئی مسکراہٹوں نے نیا رنگ پھیلا دیا ___ ثنا کی بھی گرچہ اپنی خواہش تھی، لیکن والد کے احترام نے لب کشائی کی ہمت اس کو بخشش نہ پائی تھی اور میرا وجود تو بڑے ابا کے کرم کا محتاج تھا ___ اس وجہ سے میرے دل کے آنگن میں نہ کوئی چھاؤں تھی ___ نہ دھوپ ___ گوشت کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا جس کی دھڑکن زندگی کی علامت ہوتی ہے اور جس میں وقتی اور لمحاتی تقاضوں سے ہزاروں خواہش ابھرتی اور فنا ہوتی ہیں ___ وہ پوری طرح تمام جذبوں اور خواہشوں سے خالی تھا۔

ایام تعلیم کے طویل سفر کے دوران ہم دونوں کے درمیان حجاب کا دبیز پردہ حائل رہا۔ وہ بے حد کم سخن سنجیدہ مزاج اور غیر موضوع باتیں کرنے سے گریز کرتی تھی ___ اس وجہ سے ہم دونوں جو باتیں کرتے تھے وہ بھی درس و تدریس کے متعلق ہوتی تھیں ___ گھر میں بھی وہ بے تکلفی پر کبھی آمادہ خاطر نہ ہوتی تھی۔ کالج اور گھر کے علاوہ ہم دونوں نہ کبھی ساتھ شاپنگ، سینما اور نہ سیر و تفریح کے لئے کہیں گئے تھے ___ کبھی کبھار ایسا ضرور ہوا تھا جب کبھی وہ کوئی منطق کی گرہ سلجھا نہ پاتی تھی تو میرے کمرے میں آ کر پہروں اس گتھی کو سلجھانے میں میرے دماغ کی چولیں ہلا دیا کرتی تھی ___ اس کا کوئی رویہ ___ طرز تعلیم کا کوئی انداز ___ اٹھنے بیٹھنے کا کوئی ڈھنگ مجھے کبھی ایسا نظر نہیں آیا جس سے میں اپنے لئے کوئی خوش فہم معنی اخذ کرتا ___ اور اس کے رویہ کا رد عمل تھا کہ میرا کردار بھی اپنی عظمت سے لڑھک کر اس کی غزالی آنکھوں میں چھا جانے پر آمادہ نہ ہوا تھا ___ لیکن اس حقیقت سے

بھی میرا ضمیر انحراف کرنے کے لئے تیار نہیں کی اس کی
عادت کی پاکیزگی ـــ جیسے رہنے کے سلیقے کے تقدس نے
تر مجھے اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن سمندر
کے اتھاہ گہرائیوں سے موتی پالینا ہر کے مقدر کی بات نہیں
ہوتی۔ اور یہ سچائی اتنی ٹھوس تھی کہ میرے دل میں اٹھتے
ہوئے ولولوں کی یورشیں خود بخود سرد ہو کر دل کے خانوں
یں منجمد ہو جاتی تھیں ـــ میں نے اکثر راتوں کی تنہائی
یں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے تنکوں کی طرح جوڑ جوڑ کر اپنے
حوصلوں کو مضبوط بنایا تھا کہ اگلی صبح جب ثنا چائے
نے آئے گی تو تہذیب کے دائرہ میں رہ کر کوئی ایسی
ت کا اظہار کر دوں گا جس سے بے ساختہ ہو کر وہ اپنے
ل میں چھپے ہوئے جذبوں کو دبا نہیں پائے گی ـــ لیکن
جب بھی وہ میرے سامنے آتی تھی ہمیشہ اس کی نگاہیں
جھکی رہتی تھیں اور اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے حجاب
پاکیزگی کو دیکھ کر میری قوت گویائی سلب ہو جاتی
تھی اور ہم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کیلئے کوئی
ظاہری جھکاؤ پیدا نہ ہو سکا تھا۔ ممکن ہے کہ میرے
ل کی چاہت کی طرح اس کے دل کی بھی کچھ آرزو ہو یا
یہ صرف میری چاہت کے وہم کی ایک کڑی ہو کیونکہ ظاہری
حالات میں کئی سالوں کے بعد بھی کوئی ایسا تغیر ابھر کر
سامنے نہیں آیا تھا جس سے کہ حسین سپنے خود جاگ
اٹھتے ـــ اور آرزوئیں جگمگانے لگتیں ـــ یعنی
بتدائی دور میں میرے اور ثنا کے درمیان جو فاصلہ تھا
ہ کئی برسوں کے گذر جانے کے بعد بھی جوں کا توں برقرار
تھا ـــ ندی کے دو پاٹ کی طرح ہم دونوں دو کنارے
تھے اور بیچ میں ساکت پانی تھا۔ جس کے اندر چھپی ہوئی

جب بی۔ اے کا امتحان امتیازی شان سے پاس کر گئے
تو ثنا کی ہتھیلیوں کو مہندی سے سرخ کرنے کی باتیں گھر
میں زور و شور سے ہونے لگیں ـــ بڑے ابا کا نظر انتخاب
میری طرف تھا مگر بڑی امی میرے گھر کے افلاس سے
پوری طرح واقف تھیں ـــ ان سے یہ راز بھی پوشیدہ
نہ تھا کہ بڑے ابا وقتاً فوقتاً میری گھر کی عزت سنبھالتے
رہتے ہیں۔ اس وجہ سے بڑی امی ثنا کے لئے ایسے گھرانے
کی تلاش میں سرگرداں تھیں جہاں ثنا کو مالی تنگی پیش
آنے کا امکان نہ ہو ـــ دولت کی کشش سے دولت
کھنچتی ہے ـــ یہ کہاوت عام ہے۔ سچائی کا اس کہاوت
سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ بڑے ابا نے بڑی امی کی
خواہشات سے مجبور ہو کر اپنی آرزو کا گلا دبا دیا۔ اور
میرے دل کے اندر کی چنگاری حالات کی راکھ میں دب
گئی۔ ثنا کی شادی کے موقع پر میرے دل کا کرب میرے
وجود کو گرچہ اپنے حصار میں لئے تھا پھر بھی میں نے وہ تمام
احکامات انجام دیئے جو میرے سپرد کئے گئے تھے۔ میرے قہقہے
قہقہے کی روشنی میں میرے دل کے اندر کا اندھیرا جذب تھا۔
لیکن میرے ظاہری رویہ سے میرے دل کے اندر چھپا
کرب کوئی سمجھ نہیں پایا ہوگا ـــ اس کی رخصتی کے
چند دنوں بعد بڑے ابا کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ
کر کے میں دلی پہنچ گیا اور آئی اے ایس (IAS) کے
امتحان میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ افلاس
کے جرم میں جو سزا مجھے ملی تھی اس کی پاداش میں ثنا کو
کھو چکا تھا ـــ یہ سوچ میرے لئے اتنی تکلیف دہ تھی
جس نے میرے وجود میں ایسا شعلہ بھڑکا دیا تھا جو مجھے
اونچا سے اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے ہر پل اکساتا

ارادے کی پختگی کے ساتھ کچھ حاصل کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ نانت دن کی میری کاوش رنگ لائی اور آئی اے ایس (ی ه ا ر) کے نتیجے کی فہرست جو اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئی ان میں میرا نام سر فہرست تھا۔ تقرری کے چند مہینوں بعد مجھے مزید ٹریننگ کے لئے بیرون ملک بھیج دیا گیا۔ وہاں میرے قیام کے دوران تقریباً ہر دو چار دن بعد مجھے ماں کا پیار بھرا خط ملنے لگا۔ کہ کب میں وطن لوٹ رہا ہوں۔ میری شادی کے لئے ایک سے ایک صاحب ضرورت اور عزت دار گھرانوں سے رشتے آرہے ہیں۔ خوبصورت، تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تصویروں کا ایک انبار سا میرے پاس جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے ہر خط کے جواب میں اسی اہم نکتہ کے متعلق کچھ لکھتا ہی نہیں تھا۔ لکھتا بھی کیا۔ میرے دل پر لگی گہری چوٹ کا درد اکثر میرے ذہن پر چھیں کر میری آنکھوں کو بھگا دیتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی کہ ماں نے اتنی اہم خبر مجھ سے چھپائی کیوں تھی۔ ان کا خط برابر مجھے ملتا رہا تھا۔ یقیناً اس حادثے کا انہیں بھی علم ہوا ہوگا۔ لیکن جب میں نے اس بات کی وجہ کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح سنجیدگی سے غور کیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماں نے سوچا ہوگا کہ اس خبر سے لازمی طور پر میرے دل و دماغ پر شدید جھٹکا لگتا اور اس کا ردعمل پریشان کن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ سوچ کی اس گہرائی تک پہنچتے ہی ماں کی دور اندیشی مجھے حق پر مبنی نظر آئی۔ بڑے ابا کے طویل خط کے ہر لفظ سے ان کے دل سے رستا ہوا لہو ٹپک رہا تھا۔ ثنا کا شوہر وقار اپنی کوئی بھی جیتی جاگتی ہوئی نشانی اس کی گود کو بخشے بغیر ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اور ثنا جو سرخ جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی تھی، عدت کے ایام گزار کر سفید لباس میں گھر واپس لوٹ آئی تھی۔

اسی دن میں شام کی فلائٹ سے تعزیت کے لئے روانہ ہو گیا۔ ساری رات ثنا کے ساتھ گزرے دلنوں کی باتیں میرے ذہن کے پردے پر طرح طرح کی تصویریں ابھارتی رہیں۔ اور نقش کا تاثر دل جذب کرتا رہا۔ میں بے چین اور مضطرب ہوتا رہا۔

اگلی صبح جیسے ہی میں بڑے ابا کے قیام گاہ پر پہنچا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی لپک کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا اور بے اختیار ہو کر وہ رو پڑے۔ ظاہر ہے کہ ان کے درد کو سمجھ رہا تھا۔ میرے دل میں ان کی محبت کا بہاؤ اتنا تیز ہوا کہ میں بھی سسکنے لگا۔ انہیں اپنے تجربوں سے وقت کے تقاضوں کا احساس تھا۔ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے بولے۔

"خدا کی رضا کے آگے انسان بے بس ہے اور اس کی مصلحت، اس کے علاوہ کوئی جان نہیں سکتا بیٹا۔"

اس وقت تک بڑی امی بھی ہمارے قریب آچکی تھیں ان کی آنکھیں بھی ساون کی طرح برس رہی تھیں۔ لیکن ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہو یا کوئی غلط اقدام کا پچھتاوا ان کے وجود کو پگھلا رہا ہو۔

میں نے چھائی ہوئی سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"میں آپ دونوں کی موجودگی میں ثنا سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔"

ہم تینوں جب ثنا کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پلنگ پر اکڑوں اپنے گھٹنوں پر سر ڈالے بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑے ابا نے کہا۔

"ثنا۔ سر اٹھاؤ۔ دیکھو کون آیا ہے۔"

ملنے آیا ہے۔

اس نے جوں ہی گھٹنوں سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا میری نگاہیں تاڑ گئیں کہ اس کے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے نظر آئی جس طرح میں نے اس کو دیکھا تھا۔ میرے جذبات کا باندھ جو کئی سالوں سے اخلاقی قدروں کے چٹانوں سے دبا ہوا تھا یکایک ٹوٹ گیا۔ اپنے اس عمل کے بعد جب پلٹ کر میں نے بڑے ابا کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا قطرہ ٹپک رہا تھا۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر دل کی دبی دبی خوشی ہلکی سی ابھر آئی تھی۔

بقیہ سلمان

اسی کشمکش میں اس رات ہم دونوں میں سے کوئی بھی سو نہ سکا — آج چار دن ہو گئے ہیں افروز۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں تو کر لیتے ہیں مگر ڈرے ڈرے رہتے ہیں — اور کہنا چاہئے، ساری رات ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں سو پاتا۔

وہ چپ ہو گیا —

انجو نے اس کی آنکھیں دیکھیں — آنکھیں سوجی ہوئی تھیں — جیسے کئی رات مسلسل جاگی ہوں —

بتاؤ میں کیا کروں افروز ؟

انجو کو لگا، وہ مجبور ہو گئی ہے۔ پاپی تو کمبختوں نے سر سے اتنا اونچا کر دیا ہے کہ انسانی شناخت کی جگہ صرف مذہب کے جھنڈے رہ گئے ہیں اور رہ گئی ہے ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کرنے والی ناپاک سیاست

— اسے لگا، وہ کہے — تم دونوں ہی مجبور و بے بس کر دیئے گئے ہو شعیب — تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم ساتھ ساتھ رہنا بھی چاہتے ہو اور ایک دوسرے سے ڈرتے بھی ہو.....

لیکن اس نے کہا کچھ نہیں —

ذہن بوجھل ہو گیا تھا —

اسے لگا، تقسیم کے اتنے برسوں بعد یہاں کے سیاستداں دلوں کو بانٹنے میں کامیاب ہو گئے ہیں —

بقیہ تبصرہ —

ہے یہ اب تک ان کی شائع شدہ تصانیف میں اپنے موضوع، مواد، انداز بیان اور پیش کش ہر لحاظ سے سب سے اہم ہے۔ اس کا مطالعہ ہر محب وطن کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے دوسرے ادیبوں افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لکھا جائے تاکہ وطن عزیز موجودہ حالات سے چھٹکارا پا سکے۔

طباعت اچھی اور قابل تعریف ہے۔ قیمت کچھ زیادہ لگتی ہے مگر اردو چھپائی کی قیمت یوں بھی زیادہ ہے

▲ سید ابو الفیض سیدابادی، گیا

— پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا۔ —

بھرپور حوصلے ، اُمنگ اور غیر معمولی تیاریوں کے ساتھ

ماھنامہ سہیل گیا

کلام حیدری کے فکر و فن اور ان کی متنوع شخصیت سے متعلق

ایک ضخیم اور وقیع خصوصی شمارے

— کا اعلان کرتا ھے —

تیاریاں شروع ہو چکی ہیں — اہل قلم حضرات سے تعاون کی اپیل ہے

کلام حیدری نمبر —

ہمارے مضبوط ارادے کا حسین و جمیل مرقع ہوگا

رابطہ قائم کیجئے :— مسعود منظر

ایڈیٹر ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو
جلدوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب :۔ انتخاب واقعات و اشعارِ غالب
پیش کش و ترتیب :۔ کالی داس گپتا رضا
ضخامت :۔ ۱۷۲ صفحات ، قیمت :۔ ۸۰ روپے
پتہ :۔ ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
۱۰۷ اجول بھون ۔ ۱، نیپئین سی لائنز ، بمبئی ۔ ۴۰۰۰۲۰

"انتخاب واقعات و اشعارِ غالب" کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے جناب کالیداس گپتا رضا نے لکھا ہے کہ :۔

اول :۔ یہ انتخاب جس کا پہلا باب دو بیاضوں ، ۱۲ خطوں ، ایک لطیفہ ، ۲ نقلوں ، ۲ دوسری تحریروں کا ہے اور دوسرا باب ۱۳۱ شعروں کا ہے ۔ خود غالب کیا ہوا ہے ۔

دوم :۔ جس مخطوطے کی بنا پر اسے شائع کیا جا رہا ہے اس میں اصلاح غالب کے قلم سے ہے

سوم :۔ (۱) اس کی تحریروں کا بڑا حصہ ، اغلباً یہی مخطوطہ ہے [illegible]

(۲) اس مخطوطے کی [illegible] میکلوڈ صاحب بہادر فنانشیل کمشنر پنجاب کی شان میں تین شعر کی نظم ـــــ

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اور غالبیات کی تحقیق کے سلسلے میں یہ کتنی اہم دستاویز ہے جناب کالی داس گپتا رضا نے یہ قیمتی دستاویز کیوں کر حاصل کی ـــ اس کی ایک لمبی کہانی ہے ۔ ساری تفصیلیں وہ خود کتاب کے ابتدائی صفحات میں بیان کر چکے ہیں یہاں صرف یہ واضح کر دینا چاہیے کہ زیر بحث مخطوطہ اس سے قبل ناقص طور پر دو بار شائع ہو چکا ہے اس وقت اس کا نام "انتخاب غالب" تھا ۔ لیکن اشاعتیں ہر دل عزیز نہ ہو سکیں ۔ جناب رضا ایماندارانہ طور پر ساری باتوں کو تسلیم کیا ہے ۔ اب وہ جس شکل میں اور جس قیمتی تعارفی تحریر کے ساتھ اسے منظر عام پر لائے ہیں اس سے یقیناً جناب غالب اور جناب رضا دونوں کا بھلا ہوگا ۔

اس مخطوطے اور مسودے کے سفر اور [illegible]
اشاعت کے سلسلے میں رضا صاحب سے [illegible]

[illegible]

اس حقیقت سے [illegible]

[illegible] اور [illegible] کا [illegible]

[illegible] کا حسن [illegible]

پرستش ہو جاتی ہے اس طرح [illegible]

لوازمات کے مناسب طریقے سے [illegible]

[illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible] آپ

کے جس طرح پرستش ہوتا تھا اسی طرح تمام [illegible]

[illegible]

[illegible] شخصیت [illegible]

[illegible]

کو نیا معنی و مفہوم عطا کیا ہے۔ یہ بھلے ممکن ہو کہ ان کے نئے استعارے اشارے اور کنایے ابھی تک ایک عام قاری کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوں۔ ہمارے کچھ فنکاروں اور قاریوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فن کے پرانے اصول و ضوابط سے مکمل انحراف ہی جدیدیت ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ فن کے پرانے اصول و ضوابط اور قدماء کے ذریعہ استعمال شدہ استعارات و کنایات کو نیا رنگ و آہنگ دینا نئے فنی اور عروضی بحور و ارکان اور قواعد کی ایجاد اور الفاظ کو نیا معنی و مفہوم عطا کرنا ہی اصل جدت و جدیدیت ہے۔ رؤف خیر نے بڑی گہری تنقیدی نظر سے جدیدیت کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اسے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں فن میں برتا۔ رؤف خیر کے یہاں نہ تو لہجہ کی گھن گرج ہے اور نہ ہی نعرۂ انقلاب زندہ باد بلکہ ان کا پرسکون لہجہ اور سپاٹ انداز بیان بڑا ہی حکیمانہ اور موثر ہے۔

رؤف نے زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے ان کی غزلوں میں قاری کی نجی زندگی کے گوناگوں مسائل، اس کا اتار چڑھاؤ، حالات حاضرہ کی عکاسی، کیفیت ہجر و وصال انا، انجام انا، عشق کی کیفیات، معرفت، ذاتی اصلاح، تعلیم صبر و ضبط، اور تعلیم اتحاد و اتفاق سب کچھ ملتا ہے۔

اس بحر بیکراں سے چند در نایاب پیش خدمت ہیں۔

تم تو انا کا ایک جزیرہ ہو سوچ لو
ایسے کئی جزیرے سمندر میں رہ گئے

اسے خرید لیا خود کو بیچ کر ہم نے
کرے اس سے بڑی تجارت کیا

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے اندنوں
اب ہم ہیں اور آگے بکھرنے کے مرحلے

حالانکہ کسی طرح کی بھی تجدید مت کرو
کیا دوست دشمنوں پہ بھی تنقید مت کرو

وہ شام جس نے سنبھالے ہوئے رکھا ہے ہمیں
کبھی کبھی تو ترا ذکر بہت کرتی ہے

پہلے خود اپنی آنکھ کا تنکا تو دور کر
پھر دست خوش حنا میں کوئی چوڑ دیکھنا

ہم نے سب اپنا درد ہنسی میں اڑا دیا
اچھا نہیں لگا اسے رنجیدہ دیکھنا

حیات جبر سے اے دوست موت بہتر ہے
گذار زندگی لیکن ترس ترس کے نہیں

مقتل سجے ہیں کوچہ بازار کی طرح
اس شہر میں فساد ہے تہوار کی طرح

خرید لیتے ہیں دنیا خریدنے والے
یہ تم سے کس نے کہا دردیاں نہیں بکتیں

رؤف خیر کی غزلوں میں چند ایسی خامیاں ہیں جو کانٹا بن کر آنکھ میں چبھتی ہیں۔ جیسے بعض اشعار کا اوزان و بحور کی قید سے اس درجہ آزاد ہونا کہ قاری کو الجھن محسوس ہو۔ کلام میں تنافر، ابتذال اور ابہام کا احساس ہونا۔ فاصلہ بعید یا ایسے الفاظ کا استعمال جو آج بھی اہل زبان کے یہاں متروک ہیں یا فنی خامی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے محاوروں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار کا شامل کیا ہے جس سے ان اشعار کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ساخت اور تراکیب بھی خوب ہیں۔

رؤف خیر نے حمد و نعت کے علاوہ اچھی اور خوبصورت آزاد و پابند نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں جدید فکری تہ نظر ہے۔ ان نظموں میں چند استعاراتی نظمیں بھی ہیں یک مصرعی نظمیں تو غضب کی ہیں۔ معنوی، صنفی، موضوعاتی

اور ہیئتی اعتبار سے یہ اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ شاعر کی
یہ کاوش نظم نگاری پر اس کے مکمل دسترس کی ثبوت
ہے۔ ان نظموں میں "بین السطور" "صبح کاذب" "ایک
پرچم تلے" "ویڈیو گھر" "قابیل" اور "آنچل" قابل ذکر ہیں۔
اوپر کی چند خامیوں کے باوجود میں شاعر کے اس بیباکانہ
خیال سے متفق ہوں

کوچۂ فن میں ہو نہیں سکتا
کوئی فنکار آخری قبلہ

بحیثیت مجموعی رؤف خیر کا یہ مجموعہ اپنے مواد، انداز بیان، اور دیگر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔ سرورق خوبصورت ہے۔ طباعت اچھی ہے۔ اغلاط سے پاک ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کو آسودگی بخشے گا۔ قیمت بھی مناسب ہے اس لئے اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جانی چاہیے۔ جدیدیت کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ کافی سودمند ہوگا۔

▲ سید ابوالفیض سید آبادی، گیا

نام کتاب :- سپنے بکھر گئے (ناولٹ)
مصنف :- ایس۔ شمس الحسن گیاوی
صفحات :- ۳۲ ▲ قیمت دس روپے
پتہ :- کوثر سینما، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

"سپنے بکھر گئے" ایس شمس الحسن گیاوی کا ناولٹ ہے۔ یہ ناولٹ قومی یک جہتی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس پر آشوب دور میں قومی یک جہتی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ملک وقوم کا شیرازہ جس طرح بکھر رہا ہے اور اس کے جو تباہ کن اثرات سامنے آرہے ہیں اس سے ہم سبھی اچھی طرح واقف ہیں۔ ایسے پر آشوب دور میں ہمارے ادبا شعراء کا یہ اخلاقی اور منصبی فرض بنتا ہے کہ وہ قومی، ملی اور ملکی اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے سامنے آئیں اور اپنے قلم کے زور سے لوگوں کے دل و دماغ کو پلٹ دیں۔ شاعر یا ادیب ایک مسلح سپاہی، عظیم جادوگر، بلند پایہ حکیم و ناصح، مفکر اعظم اور مصلح قوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریر کے ذریعہ عوام و خواص کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا ہے انہیں جدھر چاہے موڑ سکتا ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ ادب نہ تو محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے نہ کوئی سیاسی منشور نہ ہی کسی ازم کا نقیب۔ یہ زندگی اس میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور اپنے ماحول، وقت، اور عہد کا عکاس ہے یہ ایک بحر بیکراں ہے اسے نہ تو کسی کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی خانے میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ادب اپنے ادبی پیرایہ میں تمام نکہتوں، رعنائیوں، لطافتوں، نزاکتوں اور دیگر ہیئتوں اور صنفی خوبیوں کے ساتھ کسی بھی موضوع کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ یہ ایک فنے متحرک ہے اس سے ایک باشعور اور اپنے قلم پر مکمل دسترس رکھنے والا ادیب و شاعر اپنے ذوق اور وقت کے تقاضے کے لحاظ سے بڑا سے بڑا کام لے سکتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ شمس الحسن صاحب نے وقت کی نزاکت اور ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی ناولیٹس اور افسانوں کو اس نزاکت و ضرورت کے تحت پیش کیا ہے۔ "ہماری آواز" "ہو بکھرے موتی" "سپنے بکھر گئے" یا افسانوی مجموعہ "لڑکی پسند ہے" ہر جگہ آپ کو اپنی نجی اور سماجی زندگی کے واقعات و حادثات ہی ملیں گے۔ ان میں بے پناہ خلوص و اپنائیت پائیں گے۔ تحریر بڑی صاف ستھری ہے۔ زبان و بیان میں شگفتگی ان کا خاصہ ہے۔

جہاں تک ان کے ناولٹ "سپنے بکھر گئے" کا تعلق

شہ خیال

سہیل اردو ادبیات کا وہ ماہنامہ ہے جو ۲۵ سال سے ترقی پسند رجحان و میلان کو پروان چڑھانے میں مصروف رہا ہے۔ ہریانہ کے سابق گورنر، اقلیتی کمیشن کے سابق چیرمین جناب سید مظفر حسین برنی نے اپنے مراسلے میں درست فرمایا ہے کہ سہیل نے دبستانِ عظیم آباد کی شمع ادب اردو کو روشن رکھا ہے۔ یہ ایسے صاحب تصنیفات کی رائے ہے جن کی شاہکار تصنیف "محب وطن اقبال" کے موضوعات پر سیمیناروں کے لئے مقالے لکھے جاتے ہیں مگر کوئی مقالہ نگار حیرت و تاسف کا مقام ہے برنی صاحب کا حوالہ کبھی نہیں دیتا۔ ہم کتنے کم ظرف واقع ہوئے ہیں کہ برنی صاحب کی قاموسانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہی نہیں کرتے۔

دہلی کے چار شعراء پر جو میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کو شمس کنول مدیر گگن بمبئی نے اپنے مراسلے میں سراہا ہے۔ جب کہ ایک دوسرا مراسلہ نگار پریشان کن انداز اظہار خیال پر اتر آئے۔ ناقد کی نظر شخصیت پر نہیں دیکھتی وہ تصنیف پر ارتکاز کرتی ہے۔ مخاصمت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ پاکستان کے معروف شاعر جناب صغیر احمد صدیقی نے حقی صاحب (ستارۂ پاکستان یافتہ) کی غزلیات پر میرے اعتراضات کو خاصا پسند کیا اور موصوف کے دو مراسلے، ایک طلوع افکار کراچی میں اور دوسرا کتاب نمائی دہلی میں شائع ہوئے۔ حقی صاحب پر میرا مضمون "طلوع افکار" کراچی ہی کی ایک اشاعت میں شامل ہوا تھا۔

آمد بر سر مطلب، ایک صاحب نے مندرجہ ذیل شعر میں تلمیح کا ذکر کرتے ہوئے سراہا ہے اور ایک دوسرا ادیب نے ان سے اتفاق رائے کرتے ہوئے سراہا ہے اور ایک دوسرا ادیب نے ان سے اتفاق رائے کرتے ہوئے میرے مضمون کو مخاصمانہ بتایا ہے۔ ابلہی گفت و دیوانہ باور کرد

آئی صدائے کوہ ندا اور چل پڑے
ہم نے کسی سے کچھ نہ کہا اور چل پڑے

پہلے مصرع میں دراصل نحوی سقم ہے۔ "کوہ ندا سے" آواز آنے کی جگہ "کوہ ندا" کی "آواز" کہا گیا ہے۔ اگر چہ پہلے مصرع کو یوں بنا دیا جاتا۔

کوہ ندا سے آئی صدا اور چل پڑے

تو کچھ بات بن جاتی مگر اس سے بھی معنویت طلوع نہیں ہوتی۔ بہر کیف مراسلہ نگاروں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہر تلمیح، تلمیح نہیں ہوتی۔ تلمیح کا مادہ "ملح" ہے، یعنی نفاست، بانکپن، ملاحت وغیرہ کے مفاہیم کو محیط کرتے ہوئے تلمیح کو صحیح معنوں میں تلمیح سمجھا جا سکتا ہے۔

پروفیسر منوان چشتی کی بے داغ غزل سہیل شمارہ میں شامل ہوئی ہے۔ ایک دو شعر بہت اچھے ہیں مگر مطلع

روایت زدہ ہے ؎

خوبصورت ہے بہت، پھر بھی بلا کہتے ہیں
لوگ اک شخص کو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

عنوان چشتی کی ایک غزل جو شہود کلکتہ کے حالیہ نمبر میں شامل ہے اسی نوعیت کی ہے ؎

یہ سچ کہنے میں رسوائی نہیں ہے
وہ دشمن ہے مرا بھائی نہیں ہے

اس میں کیا معنویت طلوع ہوئی ہے؟ نثریت میں شرابور ہے۔

بہرکیف، ایک بات اور عرض کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ میں نے اپنے مضمون میں جن شعرا کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے ان پر میرے اعتراضات شاعر بمبئی کے شماروں میں کئی مراسلوں میں پیش کئے گئے تھے۔ چوں کہ ان شاعروں پر گوشے اسی میں شائع ہوئے تھے۔ بالعموم سخن شناسوں نے مجھ سے اتفاق ہی کیا تھا۔ مجھے کسی سے مخاصمت بالآخر کیوں ہو سکتی ہے۔ پیشہ وران اردو میں مجھے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ تمام عمر انگریزی ادبیات کا پروفیسر رہا۔ مزید برآں، اردو تو میں نے صرف پانچویں جماعت تک پڑھی تھی۔ البتہ فارسی ادبیات اور لاطینی زبان وادب کے ساتھ کیمبرج امتحانات ضرور پاس کئے تھے۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ میرے ذوق وشوق نے اردو ناقدین کی صفِ اول میں لا کھڑا کر دیا ہے۔

آج کل صف اول کے شعرا میں دیپک قمرؔ، ساجدہ زیدی، مظہر امام، سحر شاہجہاں پوری، گوہر شیخپوروی، کرشن موہن، ڈاکٹر کرامت، صابر دت، رضا حیرتؔ، فضا ابن فیضی، مہدی پرتاپ گڑھی، اختر بستوی، وغیرہ میں۔ یہ فہرست نامکمل ہے۔ دیپک قمر کو فراق ثانی کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہیں وہ دو غزلیں جو سہیل شمارہ ۵ میں شامل ہیں ؎

انجام سے بے پروا، آغاز سے بہکے ہو
اس دل کی کہانی کو کچھ اور ہی سمجھے ہو

پانی رکا ہوا ہے ابھی بھی رواں نہیں
باتوں کا سلسلہ ہے مگر داستاں نہیں

حیرتؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مرا ہر سفر ہی تھا شاید تھکاوٹوں کا سفر
قدم قدم پہ لیا میں نے دم مگر پھر بھی

(غزل میں ردیف ہے "مگر پھر بھی" جس کو نبھانا آسان نہیں ہے)

ساجدہ زیدی نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

اک ذرا صفحۂ دوراں سے ہٹالی تھی نظر
مڑ کے دیکھا تو وہ منظر، وہ سماں کچھ بھی نہ تھا

فضا ابن فیضی جن کا شمار میں صفِ اول کے شاعروں میں کرتا ہوں۔ خوب کہتے ہیں۔ ان پر میرا مضمون بھی شائع ہو چکا ہے۔ فضا کی وہ غزل جو سہیل شمارہ ۹ میں شائع ہوئی ہے بہت اچھی ہے مگر جی کرتا ہے کہ مطلع کو ذرا التصرف سے... مطلع ہے ؎

نہ سمندر، نہ صدف اور گہر میں دیکھو
جھانک کر میرے گریبانِ نظر میں دیکھو

دل کرتا ہے کہ "میرے" کو "اپنے" سے بدل کر پڑھوں۔

مراسلہ طویل ہوتا جا رہا ہے، جو میں نہیں چاہتا۔ مراسلہ بازی کا ادبیات میں کوئی مقام نہیں ہے۔ شاعر بمبئی کے خصوصی نمبر میں میرا مضمون "مراسلات بنام مدیر"

شائع ہوگا امید ہے کہ میری کاوش کا جائزہ لیا جائے گا۔

ایک مراسلہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ "موت تعاقب میں ہے" درست ہے مگر میں اس تعاقب سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ ادبیاتی ریاضی و ریاضت ہی میرا معبد رہا ہے۔ بقول چکبست

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

موت سب کا مقدر ہے، ناگزیر حقیقت ہے۔ مراسلہ نگار کو مزید برآں میرے مضمون میں کچھ بے ربطی بھی نظر آئی جو غالباً ان کی اپنی پریشان کارانہ مطالعہ سے عبارت ہے۔ میں اپنی تحریروں پر نگاہ تلطف کا خواہاں نہیں رہا ہوں بلکہ میں یہی پسند کرتا ہوں کہ میری تحریروں کو دشمنوں کی نظر سے دیکھا جائے۔ مگر پیش اصرار نیز تعصبات سے بالاتر ہو کر، اور ایسا موقف اختیار کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ بالخصوص جب جذباتی تعلق خاطر بیچ میں آجائے۔ مثال کے لئے، اقبال کے کلام کا استدلالی جائزہ پیش کرتے ہی کچھ لوگ بھڑک اٹھتے ہیں، یا ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ شاعر بمبئی کا اقبال خصوصی نمبر ۹-۷۸ ۱۹ء اقبالیات میں سنگ میل ہے، اقبال شکنی کی جانب اس اقدام کا تبصرہ تک بھی شائع کرنے میں بخل و تاخیر سے کام لیا گیا۔ اگر آپ اقبال کو علامہ اقبال کہتے ہیں، علامہ کی منظومات و منثورات کو ادبیات کا دیوان خاص و دیوان عام بتلاتے ہیں، کلام اقبال کو کلام مجید کی تفسیر گردانتے ہیں (بنگلور کے سمینار میں یہی کہا گیا ہے) تو آپ ماہر اقبال ہیں اور آپ کا نظریہ مثبت و صالح ہے ورنہ آپ پر فرقہ واریت کا الزام بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر، میں نے انگریزی میں کتاب لکھی IQBAL IN FINAL COUNTDOWN ( ) بات سے بات نکلتی ہے، ورنہ یہ سب کچھ لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اکبر گنوری کو میں نے ۴۸ء یا ۴۹ء میں پہلی بار بریلی نمائش کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند مشاعرہ میں دیکھا۔ مشاعرہ شروع ہی ان کے کلام سے ہوا۔ جیسے ہی مطلع کا پہلا مصرع

دنیا کے حسینوں نے دیوانہ مجھے سمجھا

پڑھا گیا ایک جانب سے آواز آئی

استغفراللہ، کمبخت نے آپ کی ریش مبارک کی بھی پروا نہ کی۔ اس آواز سے قہقہے بلند ہونا شروع ہوئے مگر اکبر صاحب لگے کہ پوری غزل سنا کر ہی اسٹیج سے اترے۔ غزل پٹ گئی، بالخصوص اس لئے بھی کہ مطلع کا پہلا مصرع مشاعرے کو قہقہہ زار بنائے ہی رہا۔ اس کے بعد گنوری ہی کے ایک مزاحیہ شاعر کو دعوت شعر خوانی دی گئی۔ نام ذہن سے اتر گیا ہے مگر ان کی نظم کا عنوان "مولوی صاحب" اور اس نظم کا ایک شعر ہنوز دل پر نقش ہے ؎

سینما ہال کی سیڑھی پہ پائے ارتقا رکھیے
مجھے تو خوف ہے بام ثریا پہ نہ چڑھ جائیں

انہوں نے ایک طرح سے مشاعرہ لوٹ لیا تھا، نظم واقعی اچھی تھی، زعفران زار تھی، ملحوظ رہے، ثریا اس دور کی مشہور گلوکار و اداکارہ تھی اور اس زمانے میں گلوکار اور اداکار نوجوان لڑکیوں کو سماج میں گرا ہوا تصور کیا جاتا تھا۔ بہرکیف، اکبر صاحب کے نام سے واقف اسی مشاعرے کے توسط سے ہوا۔ غالباً یاد محو ہوگئی ہوتی اگر

میرے مرحوم دوست حکیم صدیق احمد صاحب ناتی جو چندوسی میں مطب کرتے تھے میرا تعارف اپنے مطب میں نہ کرایا ہوتا، میں ۱۹۴۴ء کے دوران بریلی سے چندوسی چلا گیا تھا اور ایک کالج میں انگریزی ادبیات کا درس دیا کرتا تھا۔ چندوسی پہنچتے ہی حکیم صاحب سے مجھے تعلق خاطر پیدا ہوگیا تھا اور میں شام میں اکثر و بیشتر مطب ہی میں گذارتا تھا۔ ایک دن حکیم صاحب نے کالج کو فون کرکے مجھے مطلع کیا کہ آبر گنوری صاحب آئے ہوئے ہیں لہذا میں کالج سے راست مطب ہی آجاؤں۔ پہنچ گیا۔ تعارف کراتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ ابر صاحب آج کل رام پور سے رسالہ "احسن" نکالتے ہیں اور رسالے کا نام "احسن" اس لئے ہے کیونکہ ابر صاحب احسن مارہروی کے شاگرد رشید ہیں۔ میری استدعا پر ابر صاحب نے دو غزلیں، دو قطعات اور دو رباعیات سے نوازا مگر مجھے اور حکیم صاحب ہی نہیں بلکہ جناب ابرار حسن مرحوم (ایڈوکیٹ) کو بھی کلام ابر یوں ہی سا نظر آیا ویسے ہم سب واہ واہ ضرور کہہ دیتے تھے۔ اس کے بعد ایک کتاب کے مشمولات پر گفتگو کا دور شروع ہوا۔ کتاب ابر صاحب نے سپرد قلم کی تھی۔ جس میں سیماب اکبر آبادی کی اصلاح کے موضوع پر تصنیف زیر بحث لایا گیا تھا۔ ابرار حسین مرحوم، حکیم صاحب مرحوم اور میں نے ابر صاحب کے بہتیرے نکات پر استدلال کئے اور ابر صاحب خاموش ہوکر رہ گئے۔

زمانہ گذر گیا اور میں آسام آگیا۔ جب میں سوالکچی ڈگری کالج سوالکچی (کامروپ، آسام) کا پرنسپل تھا دہلی سے شائع ہونے والے ایک ماہنامہ "شان ہند" (مدیر سرور تونسوی) کے ایک شمارے میں آبر گنوری کا ایک مضمون پڑھا جس میں میرے ایک دوست جناب محکم سنگھ سونی، ایڈوکیٹ کی ایک غزل پر بیجا اعتراضات کئے گئے تھے جبکہ کلام محکم میں قابل تعریف تغزل پایا جاتا ہے، نیز زبان و بیان کی خوبیاں سموئی ہوتی ہیں۔ میں نے محکم کی غزل کا دفاع کیا اور ایک بھرپور استدلالی مضمون شان ہند کو دیا۔ جس کا لرزتا ہوا سا جواب آبر گنوری نے دیا۔ پوری بحث کو سمیٹتے ہوئے میں نے ایک اور مضمون پیش کیا اور آبر صاحب جواب مسکت سے خاموش ہوگئے گئے۔ اس واقعہ کے بہت بعد قبلہ آبر سے مجھے ایک خط موصول ہوا جس سے ہمارے مابین مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے دو تین سال بعد معلوم ہوا کہ امرت لال عشرت اور آبر گنوری دونوں بھائی بہائی مذہب کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ اول الذکر کی بیوی بھی ایرانی بہائی تھی لہذا عشرت صاحب کا بہائی ہوجانا سمجھ میں آتا ہے مگر آبر صاحب نے غالباً اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے ترک اسلام کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے آبر صاحب کے اسم گرامی کے ساتھ "مرحوم" کا لفظ کہیں نہیں لکھا ہے۔ آبر صاحب کو کسی نے بہ وجوہ قتل کیا تھا جس کی تفصیل ساکنان گنور سے معلوم کی جاسکتی ہے نیز شان ہند دہلی کی فائلوں سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مصدقہ بات ہے مگر میں لکھنا نہیں چاہتا۔ یہ سب کچھ برطرف، آبر صاحب اور سورگیہ جوش ملسیانی صاحب دونوں کے بے شمار تلامذہ ہیں۔ آبر صاحب کے شاگردوں میں دو شاعر واقعی اچھے شاعر ہیں۔ گوہر شیخپوروی اور شہود عالم آفاقی اور لیسا۔ جوش ملسیانی کے شاگرد کالی داس گپتا رضا جو

شاعر بھی ہیں اور قد آور محقق بھی۔ حالی صاحب نے جو تبصرہ سہیل کے ایک شمارے کو دیا ہے فی الواقع بہت اچھا تبصرہ ہے۔ راقم الحروف نے رضا صاحب پر پوری کتاب سپرد قلم کی ہے نام ہے "نازش ادب کالی داس گپتا رضا"۔

سہیل خوب سے خوب ترین ہونے کی ساعیٔ جمیلہ میں کامیابی سے گامزن ہے۔ اصغر علی انجینیئر، ڈاکٹر علیم اللہ حالی ایسے قد آور قلم کاروں کا تعاون سہیل کی شہرت و معیار کا ضامن ہے۔

▲ تاراچرن رستوگی، ببروباڑی، گوہاٹی

گرامی نامہ کے ساتھ سہیل ۸ بھی دستیاب ہوا۔ بہت بہت شکریہ! اس کے پہلے ۹ اور ۱۰ بھی مل گئے تھے۔

سہیل کی حیثیت اب تاریخ ساز کی ہو گئی ہے اور یہ سراپا مشعل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے فنون لطیفہ کا مظہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج سے پہلے سہیل بانگار رنگین انداز سے شائع ہوئے تھے، اب وہ دور نہیں رہا۔ فنون لطیفہ کی تزئین کے لئے بہت ساری سہولیتیں پیدا ہو گئیں ہیں۔ ان سہولتوں سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے اور پھر سہیل کی بہتر ترقی کے لئے کیوں نہ نئی راہیں ڈھونڈی جائیں۔ شعور و حکمت اور [illegible] جدید جیسے رسائل خریداروں کے بل پر تابناک ہیں اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہم یہ راستہ کیوں نہیں اپنائیں۔ اچھی تقلید بری نہیں ہوتی۔ سہیل ان سے بہت قدیم ہے۔ اس میں سرکاری اشتہارات بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ اشتہارات کے لئے ایک سیل قائم کر لیں اور اس پر توجہ دیں اور سالانہ خریدار بنانے پر بطور خاص دھیان دیں تو بلاشبہ سہیل کو نیا روپ مل جائے گا۔ اور اس کے کارن جیب خالی نہ ہو گی۔ بس ان ہی سب کے پیش نظر غرض یہ تھا کہ اب سہیل کو آفسیٹ پر شائع ہونا چاہئے۔

ان دنوں ایک پبلشر کے آرڈر پر ایک درسی کتاب کی تالیف میں مصروف ہوں۔ اس وجہ سے تامل تحریر کو فی الحال نہیں کر سکا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی بھجواؤں گا۔

▲ نشاط الایمان، کلکتہ

سہیل شمارہ ۸ زیر مطالعہ ہے۔

جناب جوگندر پال اپنے مکتوب میں مجھ سے کافی خفا نظر آ رہے ہیں۔ جوگندر پال ایک عظیم افسانہ نگار ہیں۔ میں گزشتہ بیس برسوں سے ان کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ الفاظ کو نئے انداز سے برتنے اور ان سے نئے نئے معانی پیدا کرنا صرف انہیں کا حصہ ہے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے لہٰذا ان کے بارے میں کوئی بھی ناگوار بات کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہی بات ان کی کہانی "انتقال" کی۔ بات دراصل یہ ہے کہ عزیزی طارق متین نئے نئے مدیر بنے ہیں۔ انہوں نے ایک دن بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ "علم و ادب" کے لئے جوگندر پال کی کہانی آئی ہے۔ خوشی مجھے بھی ہوئی کیونکہ جوگندر پال کی کہانی شائع ہونے سے "علم و ادب" کی حیثیت بلند ہی ہوتی لیکن جب شمارہ چھپ کر آیا اور اس میں میں نے جوگندر پال کی کہانی "انتقال" پڑھی تو مجھے بہت افسوس ہوا [illegible]

میں شائع ہو چکی تھی۔ میں نے طارق سے کہا کہ "میاں! جوگندر جی کی یہ کہانی شب خون میں چھپ چکی ہے" میری بات سن کر طارق کا چہرہ اتر گیا اور انہوں نے کہا ـــــ

"لیکن جوگندر پال نے تو یہ لکھا تھا کہ یہ کہانی صرف ایک پاکستانی رسالے میں شائع ہوئی ہے اور کہیں نہیں۔" اس کے بعد انہوں نے مجھ سے گزارش کی کہ میں اس پر ایک تبصرہ لکھ دوں اور اسے کئی جگہ شائع کرا دوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک "علم و ادب" کا نام پہنچ جائے چنانچہ میں نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس پر تبصرہ لکھا جو نہ صرف سہیل اور تعمیر ہریانہ میں بلکہ "آج کل" میں بھی شائع ہوا۔ بیشک کسی تبصرے کا دو یا دس جگہ چھپنا معیوب نہیں کیونکہ اس کی حیثیت اشتہار کی سی ہوتی ہے تخلیق کی نہیں۔ جبکہ کسی تخلیقی شہ پارے کا ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ جگہوں پر شائع ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔

سہیل کے مذکورہ شمارے میں صفحہ ۲۳ پر آپ نے بھی لکھا ہے کہ "سہیل" میں جو تخلیقات ارسال کی جائیں وہ غیر مطبوعہ ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی مدیر شائع شدہ تخلیقات کو شائع کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میرا مقصد جوگندر پال جی کی دل شکنی کرنا نہیں تھا بلکہ میں ہر اس ادیب کے بارے میں، جو اپنی ایک ہی تخلیق کو بیک وقت مختلف رسالوں میں چھپوا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ متعلقہ مدیر کو خط لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ وہ ایسی تخلیقات کے انتخاب میں زیادہ ہوشیاری برتے۔ میرا یہ عمل سراسر خلوص پر مبنی ہے اس سے کسی کی تضحیک میرا مقصود نہیں۔

امید کہ میرا یہ خط شائع فرمائیں تاکہ جوگندر جی کی غلط فہمی دور ہو جائے اور میری طرف سے ان کا دل صاف ہو جائے۔

▲ اقبال حسن آزاد، مونگھیر

جمشید مسرور
کی نئی کتاب
"دیوار ہوا پر آئینہ"
ایک خوبصورت تخلیق
ہم عصر نارویجین شاعر لارش سوبیلے کرسٹنسن
کی نظموں کی اردو میں تخلیق نو

صرف ایک سو روپے بھیج کر
ماہنامہ سہیل گیا کے یہ تین خصوصی شمارے
قیصر عثمانی نمبر، رضا اشک نمبر اور
فن اور فنکار نمبر کے علاوہ ایک سال
تک ماہنامہ سہیل حاصل کریں۔
ـــــ منیجر ماہنامہ سہیل، ریلوے سائڈ روڈ، گیا ـــــ

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سہسرامی ٥ بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سہسرامی

ماہنامہ سُہیل گیا

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر محمد یونس
- اصغر علی انجینیئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر حکیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ [illegible] جلد [illegible]

بدل اشتراک

- فی شمارہ ۵/ روپے
- سالانہ ۵۰/ روپے
- [illegible]

فہرست

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل
ریلوے سائڈ روڈ، گیا
فون نمبر ۲۱۵۷۳

ترقی اردو بیورو کی مرتبہ فرہنگ اصطلاحات (انگریزی اردو)

نمبر	نام کتاب	مرتب	صفحات	قیمت
(۱)	فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، نفسیات اور تعلیم		364	30/=
(۲)	فرہنگ اصطلاحات کیمیا		56	8/=
(۳)	فرہنگ اصطلاحات لسانیات		212	20/=
(۴)	فرہنگ اصطلاحات معاشیات		141	10/=
(۵)	فرہنگ اصطلاحات نباتیات		171	15/=
(۶)	فرہنگ اصطلاحات حیوانیات		86	12/=
(۷)	فرہنگ اصطلاحات ریاضیات		76	5/=
(۸)	فرہنگ اصطلاحات انسانیات		36	4/50
(۹)	فرہنگ ادبی اصطلاحات	کلیم الدین	206	27/=
(۱۰)	فرہنگ سیاسیات	محمد محمود فیض، حسن علی جعفری	474	38/=
(۱۱)	فرہنگ آصفیہ (تین جلدوں میں)	سید احمد دہلوی		156/=
(۱۲)	اردو تصویری لغت	سی آئی ایل میسور ترقی اردو بیورو		
(۱۳)	مجموعہ اصطلاحات موضوعہ	مرتبہ :- مجلس وضع اصطلاحات جامعہ عثمانیہ		

ملنے کے پتے

شعبۂ فروخت ونمائش، ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک - 8
آر۔ کے پورم، نئی دہلی - 110066

اور

ترقی اردو بیورو (ساؤتھ ریجن برانچ)
5-4-435/20 - گرین ہاؤس اسٹیشن روڈ
نام پلی حیدرآباد - 500001

نمود

ادب کے قارئین سے !

ادب   اگر آپ ادب کے جینوئن قاری ہیں تو پھر آپ کو کئی اہم
سوالات کے جواب کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ادب کا مطالعہ کرنے
والا عام پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ باشعور ہوتا ہے، اسے اپنی صلاحیت
پر اعتماد بھی کرنا چاہئے۔ اسے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کی کچھ غرض و غایت بھی ہے۔
بے مقصد، پیچیدہ اور ادھ کچرے افکار و اظہار کے ضرر و نقصان سے بھی ادب
کا قاری واقف ہوتا ہے۔ ادب کا قاری یہ جانتا ہے کہ ہمارا تمام ادبی سرمایہ
صرف تفریح و تفنن اور وقت گزاری کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے کسی قوم و ملک
کی تہذیبی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ گمراہ کن تاریخ آئندہ آنے والی نسلوں کو
بھی بدنہاد بنا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب کا قاری SELECTIVE ہوتا ہے۔ وہ خوب و
زشت کی تمیز رکھتا ہے اور غیر اصیل فن پاروں کو اپنی مملکت سے باہر نکال دیتا
ہے۔

اس کلیے کی روشنی میں آج ادب کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اس
کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان ہندوستان
میں کسمپرسی کے عالم میں ہے، یہ مر رہی ہے لیکن دوسری طرف آپ یہ بھی دیکھتے ہیں

لگے کہ ادبی رسائل تیزی کے ساتھ شائع ہورہے ہیں — یہ اور بات ہے کہ یہ رسائل چند شماروں کے بعد بند ہوجاتے ہیں مگر نئے نئے رسائل کی اشاعت کا سلسلہ قائم ہے۔

ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ادب کے نام پر ان رسائل کے مشتملات کہاں تک واقعی ادب کے منصب کی تکمیل کرتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہتا ہے لکھ دیتا ہے اور اسے ادب کا نام دے دیتا ہے اور یہ نام نہاد ادبی رسائل بڑے کروفر کے ساتھ ایسی تخلیقات شائع کر دیتے ہیں ادب کا لیبل لگا کر ناپختہ، بے معنی اور گمراہ کن تحریروں کے خلاف سب سے زیادہ موثر احتجاج ادب کا سچا قاری ہی کرسکتا ہے۔ تنقید کا حق ایسے ہی پہنچتا ہے۔ خس و خاشاک کے اس ریلے کو نہ روکا گیا تو ہماری زبان مستقبل میں اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لائق نہیں رہے گی۔

مسعود منظر

اردو کے ایک اہم اور مشہور شاعر

" فرحت قادری "

کی شخصیت اور فن پر —

ماہنامہ سہیل گیا کی جانب سے

— ایک پر وقار پیش کش

" فرحت قادری نمبر "

— عنقریب ملاحظہ فرمائیں —

ایڈیٹر:- ماہنامہ سہیل گیا

صرف ایک سو روپے بھیج کر

ماہنامہ سہیل گیا کے یہ تین خصوصی شمارے

★ قیصر عثمانی نمبر

★ رضا اشک نمبر

★ فن اور فنکار نمبر

کے علاوہ ایک سال تک

ماہنامہ سہیل حاصل کریں

منیجر:- ماہنامہ سہیل

— ریور سائڈ روڈ، گیا —

پھیل گیا

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

بیروباڑی ، گوہاٹی

وہ حقیقت جو اب فسانہ ہے

۷ مشاھیر ادب کے خود نوشت خاکے
ں زندگی کے کچھ نادر و نایاب لمحوں کو محفوظ کرنے کا
ر بغایت کار آگہانہ ادبیاتی صحافت کا آئینہ دار تو
یں کے لئے مجلس ادارت تشکر و تحسین کی مستحق رہے
مگر یہ خیال و تصور ابتکار آگیں نیز ابتہاج و بصیرت
تو ہے لیکن لکھنے والے کو ایک کھلے چیلنج سے دوچار کرتا
یونکہ ہر ادیب یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوگا کہ وہ اپنی بابت
تو کیا لکھے ؟ کیا بھولے کیا یاد کرے ؟ معروضیت سے
ہ کا خیال بھی منطقی نقطۂ نظر سے بذاتہٖ ہی موضوعیت میں
در ہو جاتا ہے ۔ بہرکیف ، معروضات ملاحظہ ہوں ۔
اپنی بابت لکھتے ہوئے سب سے بیشتر یہ عرض کرنا
۔ میں صرف پانچویں جماعت تک اردو کا طالب علم رہا ۔
نے دلوں میں ا و ب پ ت نیز دوسرے حروف سے
سائی کے بعد آمدنامہ ، کریما ، بوستاں ، گلستاں وغیرہ
ع کی ابتدا (آ) کھتی ۔ بریلی ۔ آئی ۔ ایچ ۔ اسکول ۳۴

پانچویں جماعت تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ مکتب میں جو علم
کو صرف ۲ گھنٹوں کے لئے لگتا تھا میں ختم ہونے تک
جا پہنچا تھا کہ کیمبرج بضابات کے لئے بھیج دیا گیا ۔ جہاں دو
کلاسیکل زبانیں لینا لازمی تھا ۔ میں نے لاطینی اور فارسی
پسند کیں ، جو ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اس
پس منظر میں بچے کے ذہن کی پرداخت و پرورش ادبیات کے
کوہسارؤں سے گذرنے میں حضر سامانی سے بھرپور ہوتی
ہے ۔ جہاں تک اردو کا سوال ہے ، پرائمری اسکول میں درجہ
الف سے درجہ سوم تک اُردو پڑھی ، شام کو فارسی مگر لے دے
کر پانچویں جماعت ہی تک اُردو پڑھ سکا اور مجھے اپنی کم مائگی
کا احساس ابھی تک رہتا ہے ۔ اردو میں دلچسپی عشق میں
تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی اور غالباً میرا اُردو سے دلی
لگاؤ اس دور کے ماحول سے بھی عبارت تھا لہٰذا اس
ماحول پر تذکرے سے روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔
بریلی کا محلہ ملوکپور ، محلہ آبادی ... تھا ۔

بیشتر مکانات کا لُستعوں (سکینہ اور بھنگ) اور مسلمانوں
کے تھے۔ مزید براں، رستوگیوں میں ہمارا خاندان اور برہمنوں
میں ٹھاکر مہاراج جو ہاتھی نشین صاحب املاک تھے ملوک پور
میں آباد تھے۔ اردو اپنے پورے شباب پر تھی اور فضا میں
اس سے مترنم و متزلزل رہتی تھی۔ آئے دن مشاعروں
محفل نظم خوانی وغیرہ کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں
سکولر کی اصطلاح سے کون واقف ہو سکتا تھا۔ مگر ہندو
مسلمانوں میں رواداری، وضعداری، حسن سلوک سکہ رائج
تھے۔ ہندوؤں مسلمانوں کے مابین تعلقات کے ذکر سے
۱۹۲۱ء کی فضا یاد آنے لگی۔ وہ فضا جس نے تمام تر اختلافات و
متحاربات ذہنی و قلبی کو مٹا ڈالا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر سیاق
کا مطالبہ معلوم ہوتا ہے۔ بریلی کے محلہ کوا ٹولہ میں ایک مندر
ہے جس کا نام ہے سیتارام مندر۔ اس مندر کا دالان اور
چبوترا وسیع و کشادہ ہیں اور پیڑھیوں سے اترتے ہوئے
مندر کا صحن ہے جو اتنا وسیع و عریض ہے کہ ۸-۱۰ ہزار
آدمی بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ دالان اور چبوترے سے قالینوں
اور دریوں سے ڈھاک دیا جاتا تھا تو پلیٹ فارم میں تبدیل
ہو جاتا تھا۔ وہیں میں نے علی برادران مولانا محمد علی، مولانا
شوکت علی نیز ان کی والدہ ماجدہ کی تقاریر سنیں ـــــ
عطاء اللہ شاہ بخاری کی لغایت متحاربانہ اور ڈرامائی
انداز سے تقریر دیتے تھے۔ جوش میں آکر میان میں پڑی
ہوئی تلوار نکال کر تولنے لگتے تھے۔ ان کی تقریر بھی وہیں
سنی۔ ایک اور میٹنگ کا ذکر غالباً غیر ضروری نہ ہوگا۔
مولانا احمد حسین مدنی دیوبندی مخاطب ہونے کے بیشتر نعرۂ
تکبیر بلند کرتے تھے اور حاضرین ہدایت کے مطابق اللہ اکبر
بہت بلند تر آواز میں کہتے تھے۔ مندر کے صحن میں نعرۂ تکبیر
بلند ہونا، ہندو مسلمانوں کے مجمع کا اللہ اکبر کہنا کیا
حسن سلوک پر روشنی نہیں ڈالتا۔ ان تقاریر کا مجھ پر
جو اثر مرتب ہوا اس سے وطن پرستی کا جذبہ ابھرا وہ آج
تک متزلزل نہیں ہوا ہے۔

وطن پرستی کے محور پر گردش کرتی ہوئی ایک داستان
اور پیش ہے۔ جس کی بابت ایک مصرعہ سا ہو رہا ہے۔

وہ حقیقت جو اب فسانہ ہے
یا
وہ فسانہ جو کل حقیقت تھا

۱۹۴۲ء میں انگریز بھارت چھوڑو (QUIT INDIA)
تحریک ملک کے گوشہ گوشہ میں جوش و خروش سے پھیلائی
جا رہی تھی اور اس کی قیادت و سیادت صرف نوجوان ہاتھوں
میں رہی۔ بالخصوص، اس تحریک و سیاسیات میں وہ طلبہ
جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن ـــ (STUDENTS'
FEDERATION) ـــ کے سرگرم رکن تھے۔ کبھی کبھی
جے نرائن، اچیوت پٹوردھن، اور ارونا آصف علی پر مشتمل
روپوش قیادت سے احکامات موصول ہو جاتے تھے مگر
چونکہ تمام تر انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے
اخبارات نے حکومت کی پالیسی سے احتجاج کے بہ طور
اشاعت بند کر دی تھی اور صرف حکومت نواز اخبارات
ہی شائع ہوتے تھے لہذا پارٹی کے احکامات ملنا قریب
قریب منقطع ہو گیا تھا۔ بریلی شہر میں تین چار حلقوں
میں منقسم طلبہ ہی تحریک کو چلا رہے تھے۔ آج تک کسی
کو نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ بریلی کے محافظ خانہ کو جو
ڈسٹرکٹ عدالت ہی کے احاطہ میں تھا کس نے خاکستر
میں بدل دیا؟ عدالت اور امپیریل بینک (جو آزادی
کے بعد سے سٹیٹ بینک ہو گیا ہے) کے مابین [illegible]
کو جاتی ہوئی سڑک پر تین فوجی آفیسروں پر کس نے حملہ

کیا تھا؟ دہلی سے مغل سرائے ہو کر کلکتہ جانے والی اس ٹرین کو جس میں انگریز سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ جا رہا تھا کسی نے پٹری سے اتار کر گرا دیا؟

متذکرہ بالا واقعات میں ہم تین نوجوان دوست تھے۔ راقم الحروف اکرام حسین اور بشیشر دیال مصرا۔ دل چاہتا ہے پوری داستانوں پر روشنی ڈالوں۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانی را

ان واقعات کو بالتفصیل ذکر کرنے کو جی کرتا ہے مگر میں قلم پر گرفت رکھتے ہوئے اختصار ہی سے کام لوں گا۔ محافظ خانے پر رات کو گورکھا سپاہی کا پہرا لگا رہتا تھا۔ بشیشر دیال مصر نے داستہ بھول کر ادھر آ نکلنے کا بات کرتے ہوئے سپاہی کو سگریٹ پیش کیا اور دوسرا سگریٹ خود سلگا لیا۔ ہمارے پاس خاصا لمبا رسّا تھا۔ اکرام نے پٹرول کا گیلن مجھ سے لے کر اس کو پٹرول میں تر کر لیا۔ دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر اکرام نے مجھ سے کہا کہ تم میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر روشن دان سے رسّا اندر ڈال دو۔ پٹرول میں تر رسّا اندر گذار دیا گیا مگر گیلن میں پٹرول ہنوز باقی تھا۔ بقیہ پٹرول کو اکرام نے پاس کے کنوئیں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اور مزہ آئے گا"۔ رسّے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ سیٹی بجاتے ہوئے بشیشر پرساد مصر کو اشارہ کیا گیا کہ وہ سڑک پر چلے جائیں۔ اس کے بعد، جیسے ہی اکرام نے رسّے کے سرے میں دیا سلائی لگائی کہ دیکھتے دیکھتے پورا رسّا جلنے لگا اور محافظ خانے میں آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ کا دستہ آیا تو کنوئیں میں پائپ اُتار کر آگ بجھانا شروع کیا مگر اس میں پٹرول بھی تھا لہٰذا فائر بریگیڈ نے آگ کے شعلوں کو مزید بلند کر دیا۔ بریلی کے محافظ خانے میں لگی آگ کئی دن میں بجھائی جا سکی غالباً پورے چار دنوں میں آگ پر قابو پایا جا سکا۔

اس واقعہ کے پورے گیارہ دن بعد ایک اور واقعہ ہو گیا۔ ان دنوں دیسی ساخت کے تمنچے ہی تک رسائی ہو سکتی تھی۔ آج کل کے دہشتناک عناصر کے پاس موجودہ تکنیکی ساخت کا اسلحہ جات ہوتے ہیں، ایسے جن کا خواب و خیال میں بھی گذر نہ ہو سکتا تھا۔ امپیریل بینک کے بائیں جانب سڑک کچہری روڈ سے کنٹونمنٹ (CANT-ONMENT) کو جاتی تھی لہٰذا اس سڑک پر بالعموم ٹریفک بہت ہی کم ہوا کرتا تھا۔ سڑک قریب قریب سنسان تھی اور ہم کنٹونمنٹ کے صدر بازار کے ساتھیوں کو لینے جا رہے تھے کہ تین آفیسر آتے ہوئے معلوم ہوئے دو انگریز لفٹیننٹ اور ایک ہندوستانی سکنڈ لفٹیننٹ (LIETENANT) کوئی بنی بنائی اسکیم نہ تھی مگر اکرم نے دونوں انگریزی افسران کو گولی سے اڑا دیا۔ تیسرا ہندوستانی آفیسر نے مورچہ سنبھال لیا۔ ایک پیڑ کی اوٹ سے اس نے گولیاں برسانا شروع کر دیا۔ ہندوستانی آفیسر کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا مگر اکرم نے عمداً گریز کیا اور ہم تینوں پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے اس کی زد سے باہر ہو کر فرار ہو سکے۔ اس نوعیت کی دوسری سرگرمیاں یعنی سیاسی نوعیت کی سرگرمیوں میں ہم تین دوست ہی کیا بے شمار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی حصہ لیتے ہوئے آزادی کے لئے جدوجہد میں مشغول تھے اور اس میں توجہ طلب وہ اشتراکِ عمل ہے جو بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو ایک محاذ پر لے آیا تھا۔

پولیٹیکل کفت میں آجانے میرے اکثر و بیشتر نوجوان اپنا صحیح موقع بھی نہیں دیتے تھے۔ حصولِ آزادی کے بعد بھی میں نے اور میرے بے شمار دوستوں نے سیاسی مظلومین (POLITICAL SUFFERERS) میں اپنا اندراج اہانت آمیز سمجھا کیونکہ ہم اپنی وطن پرستی اقتصادی ملوثات سے بالاتر سمجھتے تھے اور ہنوز سمجھتے ہیں۔ ایسی کسی ملنے والی پنشن (PENSION) وطن پرستی کو بازار کی جنس (COMMODITY) بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اقدار سے وابستگی کردار سازی میں بلغایت اہم رول ادا کرتی ہے۔ ۱۴ راگست ۱۹۸۱ء کی حشر آگیں رات کو لینڈ سلائڈز (LAND-SLIDES) نے میرا گھر تباہ کر دیا۔ اور میری شریکِ حیات (جو ڈاکٹر تھی اور خاص کامیاب سمجھی جاتی تھی) مع تین بچے (لڑکا اور دو بیٹیوں) لقمۂ اجل ہوگئے اور نتیجتہً میری زندگی کے سارے مقاصد فنا ہو گئے بایں ہمہ میں نے پولیٹیکل پنشن کے لئے عرض داشت ارسال کرنا غلط اقدام سمجھتے ہوئے ریاستی یا مرکزی سرکار کسی سے رجوع نہیں کیا۔ حسِ وابستگی SENSE OF COMMITMENT۔ آج کل کی گرانی کے دور میں بھی عزیز جان رکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ مگر اصولوں کی پاسداری بھی کوئی چیز ہے... ؎

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دلِ دُکھا ہوا
(فانی بدایونی)

سیلِ شعور STREAM OF CONSCIOUSNESS نے کیا کچھ لکھا دیا ہے۔ باقیات

ہٹ کر جو ادبیات سے متعلق ناقابلِ فراموش باتیں ذہن میں محفوظ ہیں وہ کم دلچسپ نہیں ہیں۔ محلہ مکوکپور میں ہمارے گھر کے سامنے ہی ٹھاکر برتی سنگھ وکیل حسرت کا مکان تھا پنڈت برج نرائن چکبست کو میں نے ٹھاکر صاحب کے یہاں دو دفعہ دیکھا۔ حسرت اور چکبست شکل و صورت میں بھی خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء کے دوران ایک بار دونوں کے مابین جو گفتگو ہو رہی تھی خاصی دلچسپ ہے۔ ٹھاکر صاحب کا بڑا لڑکا میرا دوست ہے میں اس کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ چکبست کی نظم "رامائن کا ایک سین" شائع ہو چکی تھی جو درج ذیل بند کے شعر سے شروع ہوتی ہے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام

ٹھاکر صاحب نے خاطر خواہ داد دیتے ہوئے متذکرہ شعر کو قدرے ترمیم سے پڑھتے ہوئے داد دی تھی یعنی یوں ؎

رخصت ہوا وہ باپ کو کرتا ہوا پرنام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

چکبست زور سے ہنس پڑے اور ٹھاکر صاحب کے ادبیاتی دروں بینی کی داد دینے لگے۔ "بالکل صحیح اصلاح فرمائی ہے حسرت صاحب آپ نے۔ ہندو بہرکیف "خدا" کا استعمال کیوں کرے گا۔ واہ حضرت لفظ "پرنام" کو بھی آپ نے صحیح تلفظ میں استعمال کیا ہے۔ خوب" ایسے ہی چکبست نے جواب دیا تھا۔

استاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی (مرحوم) کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا بالخصوص اس لئے بھی کہ ہمارے تعلقات ۱۹۱۲ء سے مرحوم کی رحلت تک کے عرصے کو محیط

مرحوم خوبی ہائے دل و دماغ کے حامل ہونے کے
ساتھ ایک دبستانِ دانش و بینش تھے۔ کیننگ
لکھنؤ سے بی اے کیا۔ ملحوظ رہے کہ کیننگ کالج
سے بھیجوٹ ہونے والے پہلے دستے (BATCH) میں
تھے۔ انگریزی اچھی لکھتے تھے اور انگریزی بولتے
تلفظ میں بغایت محتاط رہتے تھے۔ جب مجھے تنگ
کا شوق ہوا اور میں ان سے رجوع ہوا آخر مرحوم
میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ انہوں نے شرف
سے مجھے نوازنا منظور فرمایا جو میرے لئے موجب
ناز و تفوق ہے۔ سبکدوش ہو کر ریاست جموں و
کشمیر میں دیوان ہو گئے اور وہاں سے واپس آکر لکھنؤ
رہا رہے۔ کشمیری محلے میں استاذی کا گھر، اس
بھرپور نقشہ میرے تصور میں ممتاز جگہ رکھتا ہے،
"یادوں کی بارات" میں جوش ملیح آبادی نے جو کچھ لکھا
با [illegible] ل غلط ہے۔ آخر مرحوم اپنا کلام سنانے سے
و بیشتر احتراز کیا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۴۳ء کے دوران
ب میں سوالکچی (آسام) جہاں کے ڈگری کالج کا میں
پرنسپل تھا استاذی کے گھر پہنچا تو کوئی پاکستان سے
ہوا ادیب بھی وہاں تھا۔ اس کے [illegible] اصرار پر انہوں
ایک غزل کے چند اشعار سنائے جن میں درج ذیل
سنانے کے ایک دم بعد مجھ سے کہا کہ "انگریزی کے پروفیسر
بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور وہ بالعموم ماخذ کی نشاندہی
کر سکتے ہیں۔ بتاؤ ارسطو کی یہ خیال [illegible] کہاں سے لیا
؟ شعر تھا ؎

[illegible] پہ بیٹھے شوق سے جو مائل فریاد ہوں
ان سے ڈریئے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

دریافت نہ کر سکا ہوتا تو میرے تصور کے [illegible]

دریافت پر میرا تصور شکسپیئر کے معروف ڈرامے جولیس
سیزر (JULIUS CAESAR) پر گیا جہاں [illegible]
کیسیوس سے متعلق سیزر نے کہا ہے کہ یہ شخص ہنستا نہیں
ہے، خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں نے یہی بتا دیا جس کو
سن کر بہت خوش ہوئے۔ آخر مرحوم ایک دبستان
تھے مگر ہم ہیں کہ ابھی تک اس دبستان سے فیضیاب
نہیں ہوئے ہیں۔ انتقادیاتی العباد کو روشنی میں لانے
کی کوشش نہ کرنا ادبیاتی گناہ کے مترادف سمجھنا چاہیئے۔
الغرض میری کاوشات میں مرحوم کے افکار کی نشاندہی
کی جا سکتی ہے۔ ان کی دو تین ہدایات حامل توجہ و
عمل ہیں۔

(۱) اگر کسی شعر میں خاص نکتہ پیش کیا گیا ہو [illegible]
جاذب اثر و نفوذ معلوم نہ ہوتا ہو یعنی [illegible]
"از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت سے
لبریز و سرشار نہ ہوا ہو تو استفہامیہ یا
استعجابیہ کے ذریعہ اس کو دلکش بنایا جا
سکتا ہے۔

(۲) شعر میں اگر ابہام ہو تو اس نوعیت کا ہو کہ
اس کی "شنیدہ موسیقی" میں [illegible] ناشنیدہ موسیقی
کے ذہنی و قلبی متعلقات کو اپنے جلو میں لا سکے
اگر یہ خوبی نہ ہو تو وہ ابہام، ابہام نہیں بلکہ
اہمال ہے۔

(۳) تنقید بڑی دشوار و مشکل تنظیم ہے۔ ناقد کو تقابلی
ادبیات سے گہری شناسائی ضروری ہے [illegible] شعر کو
[illegible] نہیں کیا جا سکتا

[illegible] کارآمد رموز و نکات ہیں مگر یہ مضمون ان سب
پر روشنی ڈالنے سے بہت طویل ہو جائے گا۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم جن کو میں بھائی جان کہا کرتا تھا بڑی وضع قطع کی شخصیت تھے۔ اگر وہ میری سرپرستی نہ فرماتے اور وقتاً فوقتاً ہدایات سے نہ نوازتے تو میری ادبیاتی شگفتگی غالباً قدرے جلال و جمال آگیں نہ ہوتی۔ ایک مثال، تنقید میں خلوص و تلاش بنیادی ملتزمات ہیں اور ان کے ساتھ ناقد میں اپنی تلاش کو پیش کرنے کا حوصلہ بھی بہت ضروری ہے۔ اقبال پر میری تنقید نے یہی ثابت کیا کہ وہ برہمن نژاد (برہمن زاد میں ذم کا پہلو مضمر ہے) نہیں تھے۔ بھائی جان کو ایک خط میں اس کی بابت جب لکھا تو انہوں نے فرمایا کہ جرأتمندانہ طور پر اس مسئلہ کو برائے بحث و مباحثہ پیش کروں۔ بھائی جان۔ قطع کلام معاف فرمائیں، مجھے روز خط لکھتے تھے لہٰذا ہفتہ میں ایک دن ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجھے ان کے دو مکاتیب ملتے۔ یعنی ایک وہ بھی جو اتوار کو لکھا جاتا۔ اتوار ہی کو لکھے گئے خط میں مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا اور اس کی ایک کاپی بھی طلب فرمائی۔ "اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور" جو ہماری زبان کو دیا گیا تھا اس کی ایک کاپی بھائی جان کو پوسٹ کر دی گئی۔ بھائی جان نے شیرازہ کے کشمیری شمارے میں اس مضمون کا کشمیری زبان میں ترجمہ نکلوا دیا۔ کہا جاتا تھا کہ وادی میں اقبال کے خاندانی سلسلے ہنوز ہندو ہیں مگر ایک بھی

محلہ ملوکپور شعر گفتار محلہ تھا۔ جہاں اردو، فارسی زبانوں کے ادبیات کا بالخصوص تذکرہ چلتا ہی ... بدایونی، ... بدایونی، دل شاہجہاں پوری ... خصوصاً ... میں از حد متاثر ہوا۔ ایک نشست میں دل صاحب نے ایک شعر پیش کیا تھا جو ایک ... ہو گیا ہے

جاتے جاتے کس نظر سے اس نے دیکھا کیا کہ
دل کے افسانے میں اک ٹکڑا نیا شامل ہو

لفظ "ٹکڑا" کو کیسی فصاحت سے آراستہ کیا گیا۔ محل نظر ہے۔

تعلیمی اکتسابات میں چار مضامین (انگریزی، تاریخ، اقتصادیات، فارسی) میں ماسٹرز ڈگریاں، انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ نیز متعدد مضامین وغیرہ شامل ہونے کی وجہ سے بے شمار شخصیات کا مجھ پر اثر پڑا۔ چونکہ پورا ذکر مضمون کو طول طویل بنا دے، آخر میں ایک ہلکی پھلکی بات کہتا چلوں، ایسی بات جو مجھ پر خاصا اثر پڑا ہے۔ ایسا اثر کہ ہنوز اس کی یاد میں تبدیل ہو جاتی ہے اور غالباً جس کو دیکھنے والا کم بوڑھے کھوسٹ کو ابلہی ہی سمجھ سکتا ہے۔ بات معمولی اور اس کا تعلق "تکیہ کلام" سے ہے۔ سمجھے صاحب نے کیا کہا، حضرت توجہ کا طالب ہوں۔ وغیرہ وغیرہ تکیہ کلام کا واسطہ قارئین کرام کو ضرور پڑا ہوگا۔ مجھے ایک صاحب ملے ان کا تکیہ کلام حسن کلام پر پہنچ چکا تھا۔ مرتبہ جب شرف ملاقات حاصل ہوا تو دوران گفتگو لگے "آپ ادھر کھسک آئیے" تین دفعہ تو میں نے کی تعمیل کی مگر جب چوتھی بار اس کے دُر و دِ وُرو مجھے خبردار بھی کر دیا اور میں قہقہوں میں محصور ہو اور مزہ یہ ہے کہ آں حضرت ... ہے کہ باتوں نے خاصا تاثر دیا ہے۔

چونکہ انگریزی زبان کا پروفیسر اور بعد پوسٹ گریجویٹ کالجوں کا پرنسپل ہو جانے کو

قیصر عثمانی
پشپا پارک، میلاڈ، بمبئی

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی مرحوم

صوبہ بہار کے مقدس شہر گیا میں پھلگو ندی کے کنارے ایک خوبصورت مکان تھا جو حضرت انجم مانپوری کی رہائش گاہ ہونے کے علاوہ ماہنامہ "ندیم" کا دفتر بھی تھا — وہی "ندیم" جس نے اپنے پہلے دور میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۷ء تک اردو کے بہاری ادیبوں اور شاعروں کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ "ندیم" کے دو ضخیم "بہار نمبر" خاص طور پر اس بات کے شاہد ہیں —— حضرت انجم اس رسالے کے بانی بھی تھے اور ایڈیٹر بھی۔ اس زمانے میں انہوں نے مانپوری کے فرضی نام سے مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا اور دنیائے ادب میں مشہور ہو گئے تھے۔ "میر کلّو کی گواہی" ان کا شاہکار مانا جاتا ہے۔

ایک دن میں اپنے والد صاحب مرحوم کے ساتھ "ندیم" کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ حضرت انجم نے اس دن کی ڈاک سے آئے ہوئے ایک خط کو بغور پڑھا اور کہا کہ یہ خط بمبئی سے آیا ہے جس کے ذریعہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے اس بات پر اپنی خفگی کا اظہار کیا ہے کہ ان کے مضمون کے عنوان کے نیچے نام کے ساتھ "مولانا" کیوں تحریر کیا گیا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ندوۃ العلما لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے کے باوجود ندوی صاحب کے دل و دماغ پر مشرقیت سے زیادہ مغربیت طاری تھی۔ چنانچہ میرے عہد طفلیت کا یہ چھوٹا سا واقعہ میرے ذہن میں اب تک موجود ہے۔

وقت گذرتا گیا اور ۱۹۴۲ء کے اواخر میں جب کلکتہ سے فضلی برادران کے ساتھ بمبئی آ گیا تو ایک دن میں اپنے مخلص دوست جناب احسن رضوی مرحوم کے ساتھ لوکل ٹرین میں بیٹھ کر دادر سے پہلی مرتبہ اندھیری پہنچ گیا۔ ان مولانا سید سلیمان ندوی، "معارف" اور دار المصنفین سے کبھی تعلق رکھنے والے اور اسماعیل یوسف کالج - جوگیشوری بمبئی کے ہر دل عزیز پروفیسر

سید نجیب اشرف ندوی ان دنوں کمائے کے ایک وسیع وعریض بنگلے میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ندوی صاحب کے بارے میں ان کے لائق و فائق بھانجے جناب سید شہاب الدین دسنوی اپنے ایک گراں قدر مضمون میں رقم طراز ہیں۔

" ماموں جان کا خاص تحقیقی مضمون "گجرات میں اردو کی ابتدا" تھا۔ انہوں نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ ثابت کیا کہ جنہیں تاریخ اردو میں ولی دکنی کہا جاتا ہے۔ وہ واقعتاً احمد آبادی (گجراتی) تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر عبدالحق (مدراس) وغیرہ سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "مقدمہ رقعات عالمگیر" ہے جس کے ساتھ انہوں نے "رقعات عالمگیر" بھی مرتب کئے۔ ان کے بزرگ مولانا سلیمان ندوی نے بڑی مسرت کے ساتھ کہا تھا کہ نجیب اشرف ندوی کی اٹھان غضب کی تھی۔ افسوس، بمبئی جاکر ان کی علمی موت ہوگئی"

اندھیری اسٹیشن پہنچ کر حبیب احسن صاحب مرحوم کے ساتھ خراماں خراماں ندوی صاحب کے بنگلہ میں داخل ہوا تو یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ گھر میں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد حبیب احسن صاحب نے میرا تعارف کرایا اور انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں پٹنہ میں بی۔ این کالج کا متعلم تھا تو وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولے۔ " تو پھر تو عزیزم آپ میرے سالے ہوئے۔

" وہ کس طرح؟" میں نے دریافت کیا

" وہ اس طرح کہ بی۔ این کالج کے پرنسپل

جناب معین الحق صاحب میرے خسر ہیں یعنی ان کی دختر نیک اختر سو فیصد میری شریک حیات ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے اعتقادی اور شاگردی کے رشتے سے آپ میری بیوی کے بھائی ہوئے یا نہیں؟"

ندوی صاحب نے یہ کہہ کر اپنی غیر معمولی زندہ دلی کا ثبوت دیا۔ میں اس پہلی ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہوچکا تھا اور میرا یہ معمول ہوچکا تھا کہ ہفتہ میں دو تین بار ان سے ملنے کے لئے اندھیری ضرور جاتا تھا۔ ان کا مکان کیا تھا اچھا خاصہ کتب خانہ تھا۔ الماریز میں کتابیں، شیلف میں کتابیں۔ فرش پر کتابیں، پلنگ پر کتابیں، کرسیوں پر کتابیں، بنچوں پر کتابیں، غرض کہ مکان کے کونے کونے میں کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ جب میں ان سے کہتا کہ میں یہ کتاب کچھ دنوں کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو وہ سختی سے کہتے۔ "یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم چاہو تو۔ یہیں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرو۔ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔ چائے، ناشتہ اور کھانے کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ اپنے سالے کے لئے میں یہ سب برداشت کرلوں گا لیکن کتاب لے جانے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔"

ندوی صاحب کو صحیح معنوں میں کتابوں سے بے انتہا عشق تھا۔ ان کے ہاتھ میں کوئی بھی کتاب یا رسالہ آجاتا تو اسے وہ اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ اس کا ایک ایک لفظ ان کی نظر سے گذر نہ جاتا ہو۔ اشتہارات تک وہ غور سے پڑھنے کے عادی تھے۔

ندوی صاحب بہت ہی سادہ مزاج کے آدمی تھے اور بذلہ سنجی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جب وہ گھر سے باہر جاتے تو باضابطہ سوٹ بوٹ

میں لیکن گھر پر ململ کا کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ میں ملبوس ہوتے، رات کے وقت حقہ بڑی پابندی سے گڑگڑایا کرتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے شام کے وقت چائے ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں بنگلے سے نکل کر اندھیری کی سنسان سڑک پر چہل قدمی کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک حسین و جمیل دوشیزہ آتی ہوئی دکھائی دی — معاً ندوی صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "یہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ" اور اس طرح کہا کہ لڑکی بھی اچھی طرح سن لے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس نے برا نہیں مانا اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں نے یہ واقعہ جب ایک دن کسی ادبی مجلس کے اختتام کے بعد ندوی صاحب کے ایک ہونہار شاگرد پروفیسر عبدالستار دلوی کو سنایا تو انہوں نے کہا — "یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ان کا ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ مجھ سے سنئے۔

" ندوی صاحب ایک دن کسی شاپنگ سنٹر میں گھومتے گھومتے ایک لیڈیز اسٹال کے سامنے یکا یک رک گئے تو سیلز گرل نے بڑے ادب کے ساتھ پوچھا۔

" کیا چاہئے آپ کو —؟"

" بریزیئر — ندوی صاحب نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا —

" بریزیئر ؟" لڑکی نے قدرے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

" جی ہاں بریزیئر۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے ؟"

ندوی صاحب نے لہجہ بدل کر کہا۔

" لیکن سائز ؟" لڑکی نے شرما کر دریافت کیا

" سائز تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بس ایسا کیجئے آپ اپنے سائز کا دے دیجئے، شاید کام چل جائے۔" ندوی صاحب نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ لڑکی ہکا بکا ہو کر ندوی صاحب کا منہ تکتی رہ گئی۔

ندوی صاحب کو مجھ سے بے حد لگاؤ تھا۔ اگر کسی مہینے میں ان کے پاس نہیں پہنچتا تو وہ خود مجھ سے ملنے کے لئے کبھی میری قیام گاہ پر آجاتے تو کبھی فضلی بر... کے دفتر میں۔ غرض کہ ہم دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ برسوں اسی طرح چلتا رہا۔

اپنی ہی بلڈنگ میں میرے کمرے کے بالکل سامنے والے کمرے میں میرا ایک نہایت بے تکلف دوست رہا کرتا تھا۔ جس کا فلمی دنیا سے تعلق تھا۔ ایک دو فلم میں ہیرو کی حیثیت سے بھی آچکا تھا۔ بڑی ہی جاذب شخصیت کا مالک تھا۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جوانی میں لڑکے لڑکیوں کو پھانستے ہیں لیکن میرے دوست کو عموماً لڑکیاں ہی پھانسا کرتی تھیں۔ انہیں میں بدقسمتی سے میرے دوست کی زندگی میں ایک خطرناک لڑکی آگئی تو اس کا جینا حرام ہو گیا۔ وہ ہمیشہ اپنے پاس ایک رام پوری چاقو رکھتی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کا محبوب دل نواز اس سے کبھی بیوفائی کرنے پر آجائے تو وہ اس کا فوراً استعمال کر سکے۔ میرا دوست شادی شدہ تھا اور ایک بچے کا باپ۔ رہنے والا تو پٹنہ کا تھا لیکن شادی کشمیر میں ہوئی تھی اور اس کی بیوی اپنے بچے کے ساتھ وہیں رہتی تھی۔ شاید یہ میری متواتر نصیحتوں کا اثر تھا کہ ایک دن وہ اپنی بیوی بچے کو پہلی مرتبہ بمبئی لانے کے لئے سرینگر چلا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس خطرناک لڑکی کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ میرا دوست چند ہی دن بعد اپنی بیوی اور بچے کے

ساتھ اس کمرے میں رہنے والا ہے، وہ وہیں ڈٹی رہی ٹلنے کا نام نہیں لیا۔

ایک دن جب میں ندوی صاحب کے بنگلے میں گپ شپ کر رہا تھا میں نے اپنے دوست کی ساری داستان سنا ڈالی اور یہ درخواست کی وہ اسے آنے والی مصیبت سے بچنے کے لئے میری مدد کریں۔ چنانچہ ایک دن میری درخواست کے مطابق وقت مقررہ پر ندوی صاحب عنایۃ کوٹ پینٹ اور ٹائی میں ملبوس بلڈنگ کے دوسرے منزلہ پر آکر میرے دوست کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہی خطرناک لڑکی دروازہ کھول کر سامنے آئی اور ترش لہجے میں بولی۔

"کون ہیں آپ ؟"

"میں اس نامعقول، ناہنجار اور نالائق بیٹے کا باپ ہوں جو اس کمرے میں رہتا ہے۔ میں ایک مدت کے بعد اسے پٹنہ لے جانے کے لئے بمبئی آیا ہوں۔ کیا تم مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دوگی ؟" ندوی صاحب نے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں کیوں کہ آپ جس کی بات کر رہے ہیں وہ آجکل یہاں نہیں ہے۔" لڑکی نے جواب دیا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر بھی ندوی صاحب وہاں سے نہیں ٹلے اور ایک بار پھر پہلے سے بھی زیادہ زوردار طریقے سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد، جو دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ لڑکی مجسم کھل نائکہ بن کر اس مرتبہ اپنے ہاتھ میں رامپوری چاقو لئے کھڑی تھی اور آنکھیں لال پیلی کئے کہہ رہی تھی۔ "جاتے ہو۔ یہاں سے یا . . . ."

اس کے بعد ندوی صاحب نے موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور تیزی کے ساتھ بلڈنگ سے نکل کر اسٹیشن کی راہ لینے ہی میں اپنی عافیت دیکھی۔

ایک لمبے وقفے کے بعد غالباً ۱۹۶۷ء میں ایک دن لوکل ٹرین سے کہیں جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ کمپارٹمنٹ کے سامنے والے کنارے سے ایک معمر شخص اپنی سیٹ سے اٹھ کر مسکراتا ہوا میری طرف چلا آرہا ہے۔ میں نے دماغ پر بہت زور دیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ جب وہ بالکل میرے قریب آگیا تو اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "تعجب ہے تم اپنے ندوی صاحب کو بھول گئے۔ بڑے بے وفا ہو۔"

"ارے ندوی صاحب" میں نے فوراً حیرت کا اظہار کیا۔ — "آپ کتنے بدل گئے۔"

"ہاں بھئی قدرت جو چاہتی ہے وہی ہوتا ہے نہ ؟ انسان کے بس میں ہے ہی کیا ؟" ندوی صاحب نے بڑے درد بھرے لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان کے مزاج میں نہ وہ اگلی سی بے تکلفی والی ادا ہی رہی تھی اور نہ چہرے پر وہ شگفتگی ہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہیں نہ ہو یہ ندوی صاحب کی صاحبزادی کی ایک غیر مسلم سے محبت اور میرج کا نتیجہ ہے لیکن مجھے اس بات پر حد درجہ حیرت تھی کہ وہی پروفیسر نجیب اشرف ندوی جنہیں کسی زمانے میں اپنے نام کے ساتھ محض "مولانا" کی شمولیت پر غصہ آگیا تھا اپنی لاڈلی بیٹی کے سلسلے میں اتنے کٹر کیسے ہو گئے ؟ اتنے روایاتی کیسے بن گئے ؟؟؟ کاش ندوی صاحب کی زندگی میں یہ افسوس ناک موڑ نہ آتا۔

سید بشارت علی

موریہ پیٹ، آندھرا پردیش

نیا جنم

نصف شب گزری
بستر پہ پھر آ پڑو
نیند تمام ہے
ذہن پر سے کثافت کے دھبے اتر جائیں گے
خالی کیسہ لئے گھر کو جو لوٹ آیا
کوئی اور تھا
خواب آنکھوں پہ اوڑھو
جو آنکھوں سے لپٹے چلے آئے
ان سب مناظر سے کہہ دو کہ وہ لوٹ جائیں

صبح بالیں پہ سورج جگانے کو آئے
تو کچھ ایسے حیرت زدہ سے اٹھو
جیسے پہلے پہل آنکھ کھولی ہے تم نے

صابر فخر الدین یادگیر

۳ نظمیں

کھلی فضاؤں میں
اڑتے ہوئے
پرندوں کو
زمیں پہ ٹوٹ کے
گرنے کا
ڈر نہیں ہوتا

٥

نگہ کے سامنے
کچھ بھی نہیں
مگر پیچھے
سمندروں کے تلاطم میں
تیز طوفاں ہیں !!

٥

نہ جانے
منزلوں نے کون سا
جادو کیا ہے
فاصلے
گھٹتے نہیں ہیں !!

ساز اعظمی

حوادث

(۱)

زمانے کے حوادث نے ہر اک جانب سے گھیرا ہے
نئے انداز سے حالات نے رُخ اپنا پھیرا ہے
کہیں بجلی کا مسکن ہے کہیں طوفاں کا ڈیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(۲)

لگی ہے آگ گلشن میں، دھواں اٹھتا ہے گلشن سے
جدا ہونے لگی ہیں تتلیاں پھولوں کی چلمن سے
مصیبت کی یہ سب چنگاریاں لپٹی ہیں دامن سے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(۳)

کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی پتھر لگاتا ہے
[illegible] ہر موڑ پہ تقدیر کا دھارا ستاتا ہے
غریبی کا اندھیرا سانپ بن کر دل ہلاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(۴)

کہانی کہہ رہا ہے درد کی اُترا ہوا چہرا
مرے دل پر مصیبت کا بہت ہی زخم ہے گہرا
نظر کے سامنے بیٹھا ہوا ہے موت کا پہرا
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(۵)

نہیں ہے زور کوئی رآد اشکوں کی روانی
نظر کہتی رہے گی رآد غربت کی کہانی
غریبی کے سبب سے آنچ آتی ہے جوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا

ممتاز شکیب

دو نظمیں ـــ راجستھان کے پس

(۱)
کب سے اس خاموش گُپھا میں
دھوپ کے پیڑ سناٹوں میں
ٹوٹی پھوٹی چٹانوں سا
دبلے پتلے دہقانوں سا
کال کی اس بنجر دھرتی میں
قطرہ قطرہ خون سے اپنے
پیاسی فصلیں سینچ رہا ہوں
تار سنہرے کھینچ رہا ہوں

(۲)
دھوپ سے تپتے سونے
اونچے سے ایک پیڑ
شاخوں پر سورج کو
مدّت سے یہ سوچ
لمحوں کی شدّت کا
بدلے تو سبزہ

[illegible]

(۱) [illegible] سب سے زیادہ اشرف المخلوقات [illegible]
ہے اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض اولین ہے۔

(۲) [illegible] کا پہلا فرض [illegible] کو اس کے حاصل شدہ ذرائع کا استعمال [illegible]

(۳) اس لئے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے ختم کرنے سے پہلے اس کی حفاظت
[illegible] کرلیں

(۴) [illegible] کا بہتر [illegible] حاصل ہے۔ اس سے [illegible]

(۵) [illegible] حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات [illegible]
کا توازن [illegible] کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) [illegible] کا وجود صرف انسانوں کے لئے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے

(۷) [illegible] حیوانات [illegible]
[illegible] انسان [illegible]
[illegible] کی اہمیت [illegible] ہے

[illegible]

آج کچھ حد سے سوا ہو جیسے
[illegible] یادِ حادث تو یہ
[illegible] کی کوئی ادا ہو جیسے
پھر وہی شخص میرے پردے میں
[illegible] دلوں نغمہ سرا ہو جیسے
خندہ زن خنجر پہ ہے دل اپنا
[illegible] عشق آبِ بقا ہو جیسے
ایک مانوس سی خوشبو آئی
پھر وہی جانِ وفا ہو جیسے
شعر سچا ہو تو یوں لگتا ہے
دل دھڑکنے کی صدا ہو جیسے
اتنی نخوت نہیں اچھی لگتی
[illegible] تیرا ہی خدا ہو جیسے
داغِ دل آج بھی لو دیتا ہے
[illegible] نقشِ کفِ پا ہو جیسے
دل کا مدت سے عجب عالم ہے
راستہ بھول گیا ہو جیسے
یوں ہر اک خط کو تکا کرتا ہوں
میرا ہی نام لکھا ہو جیسے
ایک طائر نکل آیا ہے ابھی
[illegible] شہرِ صبا ہو جیسے
[illegible] اشعار وہ یوں پڑھتا ہے
آئینہ دیکھ رہا ہو جیسے
خندہ زن کوئی نہاں تھا مجھ میں
[illegible] اب مر سا گیا ہو جیسے

[illegible] خسرو [illegible] لاہور

غزلیں

رفیق جابس

ہم اس طرح سے نگارانِ سیم تن میں رہے
کہ جیسے کوئی صنم قومِ برہمن میں رہے
تمام عمر اسی فکر اسی جتن میں رہے
کہ تار کوئی سلامت نہ پیرہن میں رہے
ہوائے شوق میری پھر مثالِ نکہتِ رنگ
ہے بے قرار کسی گل کے پیرہن میں رہے
وہ آفتاب قیامت کی زد میں ہیں دیکھو
کبھی جو سایۂ سرو و گل و سمن میں رہے
جنہوں نے اپنے لہو سے چمن کو سینچا ہے
وہ مثلِ حلقۂ بیرونِ در چمن میں رہے
ہر ایک چہرہ یہاں اجنبی سا لگتا ہے
یقین آئے تو کیسے کہ ہم وطن میں رہے
وہ ایک شہرِ غزالاں جسے کہا [illegible] کہئے
ہم اپنے عہدِ تمنا میں اس ختن میں رہے
رہِ حیات میں کتنی ہم سفر جو یاد تری
ترا جو بار ہجومِ غمِ محن میں رہے
وفا کے دشت میں بنتے خار و خس اب تک
جو پھول چننے کے ارمان تھے سو من میں رہے
ہم اہلِ بزم میں جابر رہے بھی یوں ممتاز
کہ جیسے چاند ستاروں کی انجمن میں رہے

ے ان چار شعروں میں غریب الوطنی کا احساس ہے

۲۰ [illegible]

صلاح الدین نیّر

حیدرآباد (انڈیا)

غزل

پھر نئی رسمِ حلف سے یہ شروعات ہوئی
شہر میں پھر نئے قاتل سے ملاقات ہوئی

میرے ہاتھوں سے قلم چھین کے اعزاز نہ دو
ایسی بخشش بھی تو اک طرح کی خیرات ہوئی

شہر کی آبرو ہم سب کی امانت تھی مگر
بچ کے جب نکلی تو پھر نذرِ فسادات ہوئی

کونسی سمت سے آئے گا رہائی کا پیام
زندگی جتنی تھی سب صرفِ مناجات ہوئی

آپ سے پہلے اندھیروں میں بھی رعنائی تھی
آپ آئے تو یہاں اور سیاہ رات ہوئی

تشنگی عام ہے کس کس سے لڑوگے نیّر
مے کی تقسیم کہاں حسبِ روایات ہوئی

ان آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل نہ ملے گا
جو زخم تمہیں آج ملا کل نہ ملے گا

دامن ہے سلامت اسے محفوظ ہی کر لیتے
کل موسمِ گل میں کوئی آنچل نہ ملے گا

آتی ہی رہیں گی یہاں کچھ ٹھنڈی ہوائیں
جو ٹوٹ کے برسے وہی بادل نہ ملے گا

جو کچھ بھی محبت میں ملے پاس ہی رکھنا
جو آج میسر ہے تمہیں کل نہ ملے گا

تسکینِ تفکر کے لئے اک عمر پڑی ہے
تہذیبِ نظر کے لئے اک پل نہ ملے گا

ہستی کی حفاظت ہی بڑا مسئلہ ہے اب
کل شہر میں ڈھونڈوگے تو پاگل نہ ملے گا

تلوار کہیں ہاتھ سے گرنے نہیں دینا
کل دیکھنا ہاتھوں میں یہ کس بل نہ ملے گا

کیا پاؤ گے تم مل کے خردمندوں سے نیّر
جز رسمِ جنوں کوئی تمہیں حل نہ ملے گا

سید معراج جامی

کراچی

غزلیں

ہم نے جب سے کیا سفر سے گریز
سائے کرنے لگے شجر سے گریز

ان سے نظاروں نے نظر بدلی
وہ کرتے رہے نظر سے گریز

شام پھیلی ہوئی ہے شہروں پر
روشنی کر گئی سحر سے گریز

وہ پرندہ فلک کو چھو لے گا
جس کو رہتا ہے بال و پر سے گریز

پوچھتا ہے گھٹن ہر اک گھر کی
کیوں ہوا کو ہے بام و در سے گریز

پردۂ حرف و صوت میں چھپ کر
بے ہنر کر گئے ہنر سے گریز

اپنی بیگانگی پہ حیراں ہوں
گھر میں رہتے ہوئے ہے گھر سے گریز

آسماں کیوں اداس ہے جامی
کیوں پرندوں کو ہے سفر سے گریز

اشک جب آنکھ سے ٹپکا ہوگا
دل کا چھالا کوئی پھوٹا ہوگا

جو ذرا آپ میں سمٹا ہوگا
وہی قطرہ کبھی دریا ہوگا

کتنی خاموش ہے ساحل کی فضا
پھر سفینہ کوئی ڈوبا ہوگا

بل جو ماتھے پہ ابھر آئے ہیں
آئینہ غور سے دیکھا ہوگا

یہی بستی کبھی صحرا ہوگی
یہی صحرا کبھی دریا ہوگا

بک گیا ایک نوالے کے لئے
آدمی اتنا بھی سستا ہوگا

لوگ نفرت سے جسے دیکھتے ہیں
وہی افلاس کا چہرہ ہوگا

اس نے سوچا تھا نہ میں نے جامی
اس قدر عشق کا چرچا ہوگا

غزلیں

صبا اکرام
کراچی (پاکستان)

کوئی در کھلتا نہیں ہے، کھڑکیاں چپ چاپ ہیں
کیسی پھیلی ہے وبا سب بستیاں چپ چاپ ہیں

ایسا لگتا ہے یہاں آفت کوئی آنے کو ہے
شہر کی سب عورتیں سب لڑکیاں چپ چاپ ہیں

ہے کہاں میری تمناؤں کا طارق بن زیاد
مدتوں سے بحرِ دل میں کشتیاں چپ چاپ ہیں

آتی جاتی گاڑیوں کے بڑھتے جاتے غلول میں
مرنے والوں کے بدن کی دھجیاں چپ چاپ ہیں

دل کی گلیوں میں سماں ہے اب صبا بیروت کا
حسرتیں جلتے گھروں کے درمیاں چپ چاپ ہیں

رشید افروز
احمد آباد (انڈیا)

دشت میں سبزہ اُگا، سر پر ردا قائم ہوئی
قریہ جاں میں نئی آب وہوا قائم ہوئی

میں جو چپ تھا اس نے چپ کے سینکڑوں معنی لئے
اک یہی طرزِ ادا، سب سے جدا قائم ہوئی

اپنے ہی سائے سے کترا کر گزر جاتا ہوں میں
عافیت کوشی کی یہ کیسی سزا قائم ہوئی

کاتبِ تقدیر نے قسطوں میں لکھا ہے مجھے
زندگی یوں سلسلہ در سلسلہ قائم ہوئی

اب جہاں اب ہیں وہاں سے واپسی ممکن نہیں
کشتیاں ساری جلا دیں، رتب بنا دِ قائم ہوئی

گوہر شیخپوروی

تیلیا باغ، بنارس

لال پیلی ہری تتلیاں ، اے میاں
موسم گل کی ہیں راز داں اے میاں
اپنے ہاتھوں میں پرچم اٹھائے ہوئے
کالجوں میں ہیں اب لڑکیاں اے میاں
دوست اپنا سمجھتا تھا جن کو وہی
لے رہے ہیں مرا امتحاں اے میاں
اتنی پانی میں آلودگی بڑھ گئی
آگئیں ریت پر مچھلیاں اے میاں
پھر تعصب کا طوفاں اٹھا ہے یہاں
پھر اجڑنے لگیں بستیاں اے میاں
اپنے دکھ درد کی بات کس سے کہوں
کوئی ملتا نہیں مہرباں، اے میاں
باپ نے کیا کیا ہے ہمارے لئے
گھر رہی ہیں کئی بیٹیاں اے میاں
اٹھو گوہر کہ شب بھر بہت سو چکے
آرہی ہے صدائے اذاں، اے میاں

گفتار میں کچھ شوخ بیانی بھی نہیں ہے
پہلا سا وہ احساس جوانی بھی نہیں ہے
حاتم کی سخاوت نہیں اس شخص میں لیکن
اس شہر میں اس کا کوئی ثانی بھی نہیں ہے
پڑھتے رہو بربادیٔ گلشن کی حکایت
جز اس کے سوا اور کہانی بھی نہیں ہے
لکھ دیتا تھا ہر روز نئی ایک عبارت
اب میرے قلم میں وہ روانی بھی نہیں ہے
کچھ ایسا مرے گاؤں کا جغرافیہ بدلا
بستی میں کوئی اینٹ پرانی بھی نہیں ہے
سوچو تو کوئی چیز مہیا نہیں ہوتی
دیکھو تو الم ناک گرانی بھی نہیں ہے
وہ حوصلہ بخشا ہے مجھے کرب و بلا نے
"زخمی ہوں مگر آنکھ میں پانی بھی نہیں ہے"
ہم اتنے مہذب ہوئے اس عہد میں گوہر
باقی کوئی بوڑھوں کی نشانی بھی نہیں ہے

عبدالسلام کوثر

(راج نند گاؤں)

جگر کا درد آنکھوں سے نمایاں ہے جہاں میں ہوں
بہ ہر سو کرب کا طوفاں ہی طوفاں ہے جہاں میں ہوں

نہ علم و فن کی دولت ہے نہ خدمت کا کوئی جذبہ
جسے دیکھو وہی شہرت کا خواہاں ہے جہاں میں ہوں

سسکتی رہتی ہے انسانیت کم ظرف ہنستے ہیں
وہاں اخلاق حیران و پریشاں ہے جہاں میں ہوں

ابھی تو عشق کی لذت سے ناواقف ہے دل میرا
نہ جانے کیوں ابھی سے عشق حیراں ہے جہاں میں ہوں

فریب آگہی کہئے اسے یا خود فراموشی،
عقل مندی جہالت کی نگہباں ہے جہاں میں ہوں

حیاداری کے پردے میں اشاروں میں کنایوں میں
محبت کا حسیں انداز پنہاں ہے جہاں میں ہوں

مسدس کون حالی کی سنے گا کس کو فرصت ہے
ابھی اقبال کا شاہیں پریشاں ہے جہاں میں ہوں

روایت آج بھی مہماں نوازی کی مسلّم ہے
سداما آج بھی کرشنا کا مہماں ہے جہاں میں ہوں

غلط ہے عشق پر الزام کو فر پیش دستی کا
زلیخا آج بھی یوسف کی خواہاں ہے جہاں میں ہوں

ڈاکٹر نفیس بانو

(وارانسی)

باقی تھا شب کا ایک پہر وہ بھی ڈھل گیا
ننھا سا پودا آس کا آخر کو جل گیا

تیرا خلوص دیکھ لیا میں نے ہم نشیں
بس اک ذرا سی بات پہ تیور بدل گیا

لوگوں نے دل دکھایا تو وہ بات اور تھی
ہاں تیرے اس کرم پہ تو بس دم نکل گیا

سچائیاں کچھ اور تھیں چاہت تری کچھ اور
دل تھا کہ جھوٹے وعدوں سے پھر بھی بہل گیا

سرمایۂ حیات لٹا بھی تو کیا ہوا،
اس کے خلوص کا تو پتہ مجھ کو چل گیا

اے شہر آرزو مرے شکووں کا لے سلام
کانٹا تھا یہ وجود چمن سے نکل گیا

قلاش تھا وہ خود بھلا دیتا بھی اور کیا
وہ داغ آتشیں مرا دامن بھی جل گیا

غزلیں

نورالہدیٰ سید
کراچی (پاکستان)

موسم، موسم

شہر کے معمولات تو بدستور تھے تاہم ہفتوں سے ماحول میں کچھ عجیب سی بے رونقی تھی۔

اور آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

سبزیوں کی دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ میں وہ کھڑا سوچ رہا تھا۔

دس روپے کے نوٹ کے عوض سبزی فروش نے اسے دو چیزیں دیں۔ دو روپے کا ایک نوٹ اور دو کیلو آلو۔

اس نے دوکان کی سوکھی سڑی سبزیوں کو ایک بار پھر سے دیکھا۔ تھیلے کو ہاتھ میں لے کر وزن کا اندازہ کیا اور نامطمئن سا آگے بڑھ گیا۔

دالیں، چاول اور — پیاز!! اس نے جیب کی طرف دھیان کیا اور پھر ان سے لاتعلق ہوگیا۔ البتہ آٹے کی سب سے کم چھوٹی تھیلی خریدنے کی غرض سے اسٹور کے سامنے آدمیوں کی قطار میں کھڑا ہوگیا

اب اس کی جیب میں صرف پانچ روپے بچ رہے تھے۔ کل پھر ایسی ہی کئی اور اشیا خریدنی ہوں گی، یہی معمول ہے غریبوں کا۔ کبھی ایک چیز کم تو کبھی دو درکار۔

کرفیو میں وقفہ ختم ہو چکا تھا۔

"گھروں کو جاؤ، ورنہ گولی ماردی جائے گی۔"

"ہونہہ!"

یہ اعلان سُن کر وہ بڑبڑایا اور جلدی جلدی سڑک عبور کر کے اپنے گھر کی جانب چلنے لگا۔

دس افراد اِن اجناس کے منتظر ہوں گے۔ اور اپنی اپنی بھوک کو بہلا رہے ہوں گے۔ دو دن بعد آج کرفیوں میں پہلا وقفہ دیا گیا تھا۔

وہ سوچتا چلا جا رہا تھا۔

بھوک سے آسودگی تک کے سفر میں حرص و ہوس کے عفریت سے بچاؤ کے لئے کسی قطعی تبدیلی

کی ضرورت ہے۔ ورنہ بھوک اور گولی کے بیوپار میں سب کچھ ضائع ہو جائے گا۔

بھوک! — آزمائش اور استقبال

بے یقینی! — احتجاج اور گولی

یعنی موت اور تباہی۔

چلتے ہوئے ایسے کئی خیالات اس کے ذہن میں موجزن رہے۔ محو ہوتے رہے۔

شاید اس کے ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کے تیز تیز قدم بھی ایسے ہی تفکرات کی وجہ سے اٹھ رہے تھے۔ کبھی جیسے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ گولی اور موت کے خوف سے زیادہ انھیں شاید اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں انھیں خواہ مخواہ مرغا بننے اور بید سے مار کھانے کی ذلت برداشت نہ کرنی پڑے۔ عزتِ نفس کی خاطر اس حال میں کوئی جان بھی دینے کی پوزیشن میں تھا۔

معاً تھیلے اس کے ہاتھوں میں ہلکے ہوتے محسوس ہوئے۔ تو اس نے گھبراہٹ میں اپنے ارد گرد چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔

"بے یقینی!"

اس کے اندر نیم جاں سی سرگوشی ہوئی۔

"کل کیا ہوگا؟!"

اس کے اندر کیا کوئی اندیشہ جاگا تھا۔

اس نے سمجھنے کی کوشش تو کی تھی پر وہ گڑبڑا سا گیا۔ "کل ..... ؟ بعض الفاظ ایسے ہی بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان کے مفاہیم دھندلا سے جاتے ہیں۔ یا وہ الفاظ ہماری زندگی سے غائب ہو جاتے ہیں اور دوبارہ لوٹ کر کم ہی آتے ہیں۔

انھیں سوچوں میں گم اسے اپنے ساتھ بے شمار لوگ دکھائی دیئے۔ ادھر ادھر، ہر طرف اور تب وہ اپنے وجود کو اپنے جیسے بے شمار لوگوں میں بٹتا ہوا محسوس کرنے لگا — جنہوں نے ہفتوں سے اپنے اپنے روزگار کو بھی پرچا تھا۔ کیونکہ سب کے سب گولیوں کے عفریت سے سہمے ہوئے تھے یا آنسو گیس سے رو رہے تھے۔ گویا انہیں زندہ رہنے کی مہلت ہی نہ تھی۔

"گولی، آگ اور آنسو!"

اس نے شیر خوار بچوں کی چیخیں سنیں — زخم اور آنسو، دودھ اور آنسو —

داخل سے خارج تک، آنسو، چیخ اور گریہ پر کوئی کسی سے کچھ کہہ بھی نہ پاتا تھا۔ اور کوئی کسی کی کچھ سن بھی نہ پاتا تھا۔ گویا پورا معاشرہ خلا میں تھا۔ اس کے قدم تیز تیز اپنے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس ہولناک خیال کے ساتھ ساتھ کہ گولیاں اب صرف ایک اور ایک ہی رُخ پر چل رہی تھی۔ اس نے انجانی سی جھرجھری لی۔ شاید اس وجہ سے کہ اگر گھر نہ جائے تو گولی اور گھر میں رہے تو گولیوں کی بوچھار! — زندگی تھی یا مثبت اور منفی کا ضرب — جواب؟ — بالآخر نفی یا ہولناک سکوت چلتے چلتے کھڑا ہو گیا وہ، — جکڑ گیا ہو جیسے — اس نے ادھر ادھر دیکھا گھروں کے سارے دروازے بند تھے۔ سوائے ان کے جو جلا دیئے گئے تھے۔ اور ان بے در گھروں میں آگ کچھ رہ گیا تھا تو کٹے ہوئے جسموں کے وہ اعضا تھے جو جل کر راکھ ہو چکے تھے یا وہ راکھ رہ گئی تھی جس میں دبی ہوئی بے جان سسکیاں تھیں، جن کو سننے والا

کوئی نہ تھا۔ اس نے شاہ راہ کے کنارے بند پڑی
دو کانوں کو بھی دیکھا۔ رات کی سیاہ چادر فضا پر
پھیلنے والی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کے دودھیا قمقمے
ابھی اتنے روشن نہیں ہوئے تھے کہ ماحول کی گہری
یاسیت کو واضح کرتے۔ البتہ نیون (Neons)
سائن کی رنگ برنگی تھرکتی روشنی سڑک کی اداسیوں
کا جواب دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سڑک کنارے
جلی ہوئی گاڑیوں کے ملبے یہاں سے وہاں تک ان
آدمیوں کی لاشوں کی گواہی دے رہے تھے جو
اسپتالوں کے مردہ خانوں میں تھے یا سوگواروں
کے دلوں میں۔

" انحطاط ـــــ پستی !!"

وہ بڑبڑایا۔ جیسے ان ہی دو الفاظ سے
اس کی بھڑاس نکل گئی تھی یا ان دو الفاظ کے
سہارے اس نے انسانیت کے حوالے سے بہت کچھ
کہہ ڈالا تھا۔ معاً اس کے چہرے سے تھوڑا سا کرب
کم ہو گیا تھا جو لمحاتی عمل تھا۔

" ہم سب دراصل اندر سے مر چکے ہیں۔"

اس کی بڑبڑاہٹ دراصل اس کے اندر کے
میکانزم کا ایک اہم اعلان تھا۔

" دودھ !"

اس کے کانوں میں اس کے بچے کی سی آواز گونجی۔

" دودھ، مویشی اور گاؤں !"

بچے آدمی کو ہمیشہ اس کے ماضی کی سیر کراتے
ہیں۔ وہ بھی اچانک اپنے ماضی کی طرف رینگ گیا
اس کے کپکپاتے سرد اعضا نے اسے دسمبر کی وہ
سردیاں یاد دلا دی تھیں جس میں وہ کھیتوں کی ہری
کچھو بیلوں اور دھان کی بالیوں کو انگلیوں
چھوتا، کھلے آسمان کے نیچے شبنمی فضاؤں مو
سے اُدھر بے خوف و خطر بھاگا پھرتا تھا۔ اور نہ
جانتا تھا کہ کھیتوں کی پگڈنڈیاں اپنا جواز ا
نہیں بتاتیں۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ ساری فص
کا بڑا حصہ حویلی چلا جائے گا۔ اور پھر وہ حویلی
تیار اناج کے ایک دانے کو بھی نہ چھو سکے گا۔
حویلیاں بے حد محفوظ تھیں اور وہ بغیر اجازت
داخل نہ ہو سکتا تھا۔ مگر ان دنوں کچے نیچے مکا
بھی تو غیر محفوظ نہ تھے ؟! ـــــ ہاں، مکا
مگر...... وہ سوچ کر ذرا سا مایوس ہوا
پر اس وجہ سے کہ وہ تب کی بات تھی، ـــ اس
جلدی جلدی سوچا ئے۔ اور اسے جاڑوں کی
راتیں یاد آنے لگیں جب کھلے آسمان کے نیچے
جلائے جاتے۔ اور ڈھیر سارے لوگ اس آ
کے گرد جمع ہوا کرتے۔ "کون جلاتا تھا الاؤ"
یہ بھول رہا تھا۔ لیکن اسے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ
لوگ رات گئے تک الاؤ کی میٹھی میٹھی حرارت سے لط
اندوز ہوتے تھے۔ یادوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اور
کے بے شمار دریچے جن سے چھن چھن کر اس کے
کی دلکشی اس پر وارد ہوتی جا رہی تھی۔
الاؤ ہی کی آگ میں جھلسائے ہوئے آ
سے اٹھنے والی بھاپ۔

پھونک پھونک کر کھانے کی وہ لذت
کتنے پیارے تھے وہ لوگ
امیر، غریب، کالے گورے سبھی۔

اور وہ سارے جو الاؤ کے گرد گھیرا بنا کر

تھے۔ اپنی اپنی خوشیاں اور اپنے اپنے غم سبھی بیان
کرتے۔ سبھی مسائل انفرادی بھی تھے، اجتماعی بھی۔
اور آلاؤ کی بڑھتی گھٹتی روشنی اور حدت میں وہ
سارے مسائل آلاؤ کی بھی قوتوں سے، مصالحت
سے حل ہو جاتے تھے۔ کہانی، قصے، ساز، سنگیت،
ذکر افکار، غم اور خوشی، سنانا جو بھی ہو، سنتے سبھی تھے۔

"سمٹ کر بیٹھ یار"

کوئی زور سے کسی کو کہتا اور سردی کی تیز لہر سے
بچنے کے لئے ایک ایک چادر میں کئی کئی افراد سمٹ کر
بیٹھ جاتے۔ الاؤ کی میٹھی حدت کی خاطر ـــ اور ایک
دوسرے کے جسموں کی لطف اندوز گرمی۔ اور پھر
بھیگی راتوں میں ان کی بوجھل پلکیں آلاؤ سے کہتی۔

"اب تو بھی سو جا۔"

اور تب الاؤ مدھم ہو کر دھیرے دھیرے مدھم
ہو کر تنہا رہ جاتے۔ اگلی رات کے انتظار میں۔

اچانک وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ اچانک
وہ اس تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ شاید اس کی بے
خیالی میں کوئی اس کے تھیلوں میں کچھ ڈال کر پرے
ہٹ گیا تھا۔ کوئی نرم نرم سی شئے۔

"لیکن تھیلوں کے منہ تو بند ہیں۔"

اس نے اپنے وہم کو دور کرنے کی کوشش کی۔
مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نرم نرم شئے کے
حوالے سے کچھ بھی ممکن تھا۔ اس کی دلکشی تو ایسی تھی
کہ اس کے لئے مہلک اسلحے بھی اپنے اپنے منہ سے شعلے
نکالنے کو ہر دم تیار رہتے ہیں ـــ اور وہ ؟! ـــ اس
کی خواہشات کے جنگل میں بھی طلب کا ناگ ضرور پھنکارتا
ہے۔

"خوشحالی نہ ہو تو زندگی موت کے مترادف ہے۔"

اس کے اندر انجانی سرگوشی ہوئی۔ اور اس
کے باپ کا سوال گونجنے لگا۔

"فکر بھی ہے تمہیں، بیٹی کی شادی کی تاریخ
طے کر دیں، تاریخ طے کر دیں۔"

وہ دل ہی دل میں اپنے باپ کو جواب دیتا
ہوا گھر کے دروازے پر آن پہنچا۔

"دروازہ پہلے تو کبھی اس طرح نہیں کھلا ؟!"

اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی نم آنکھوں
کی طرف

"گیس اور آنسو ؟! ـــ لیکن اب تو ہر طرف
کرفیو ہے ؟!"

اس نے وجہ پر غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ
دروازے میں داخل ہو کر اندر بڑھتا چلا گیا۔
بیوی اس کے پیچھے، ماں اس کے سامنے اور
باپ اس کی ماں کے پیچھے۔ اور بچے دور کنارے۔
بڑی بیٹی الگ کونے میں۔

"کوئی کچھ بولتا ہی نہیں۔"

"ایک بری خبر ہے ـــ"

بوڑھا باپ اظہار کے کرب سے آزاد ہوا تو
بے قابو ہو کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھر ـــ سسکیاں اور گریہ ـــ

"مار ڈالے گئے وہ لوگ !"

اس نے قیاس کے متن کو ہولے ہولے دہرایا۔

"سارا جسم چھلنی کر دیا درندوں نے ......"

بیوی بولتے بولتے رونے لگی۔

"ہمیں بچا کر لے ـــ ہمیں ان سے بچا کر !!"

• تحفظ کے دائرے سے باہر کی آواز ؟! "
وہ اندر ہی اندر جواب سوال میں الجھ رہا تھا۔
"CONFUSING"
وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اور دروازے تک آگیا۔ رکا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔ وہ باہر کہیں جانا چاہتا تھا۔ اچانک سنسناتی ہوئی گولی اس کے چہرے کے قریب سے گزر گئی۔ وہ جیسے ہوش میں آگیا۔ دروازہ اس نے جلدی سے بند کیا اور کانپتے قدموں سے اپنے کمرے میں واپس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں صرف گولیوں کا شور تھا۔ کافی دیر وہ گم صم بیٹھا رہا۔

" موسم یکسر بدل گیا ہے۔"
بیوی کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔ اور دونوں پاؤں رضائی میں ڈال کر بیٹھ گئی
اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور کچھ بولنے کی سکت نہ پا کر چپ رہا۔
بیوی بستر سے اٹھی، اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑک ویران پڑی تھی۔
" تین ایمبولنس گئی ہیں ابھی۔"
چھوٹی بیٹی نے خبر دی۔
" آپی آپی" بچے نے بڑی بہن سے جلدی جلدی کہا ـــ" سپاہیوں نے الاؤ جلایا ہوا ہے۔"
ماں نے ان دونوں کو دیکھا۔
باپ نے ماں کی طرف دیکھا پھر دونوں بچوں کو دیکھ کر گم سا ہو گیا، خیالوں میں۔
" الاؤ ــــ!"
وہ اچانک بڑبڑایا، ٹھنڈی سانسوں سے سہلاتے، شاید وہ اپنے ماضی کی یادوں سے تھا۔

" کچھ کہنا چاہتا ہے۔"
بیوی نے سوچا۔ اور اس کے چہرے پر چھائے ہوئے اضطراب کو محسوس کرتی رہی
" موسم یکسر بدل گیا ؟"
اچانک اس کے لہجے میں سیال لوہے کی حدت تھی جس سے بیوی بھی کراہ سی اٹھی تھی۔ معاً اس نے اپنے دونوں پاؤں زمین پر سیدھے کئے، کھڑا ہونا چاہتا ہو جیسے۔ وہ اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ مٹی کی مورتوں کی طرح!
" سننے سنانے کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔"
سننے سنانے کا سلسلہ ؟!
بیوی نے پوچھا، سمجھنے کی خاطر۔ پر اس کی تفصیل اس کے بس سے باہر تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا شاید ... تک پہنچنے کے لئے، شاید سننے سنانے کے ــــ پر موسم یکسر بگڑ گیا تھا۔

ختم

پرنٹر پبلشر ایم منظر نے نیشنل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریور سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

• براہ کرم اپنی نگارشات اور خطوط صاف اور خوشخط ارسال کریں

ارشاد بن نظام
بارہ بترا، آرہ (بہار)

رفاقت

شہر کی دھدھکتی آگ کے سرد پڑتے ہی رمو نے قریب کے ہوٹل کا رُخ کیا ۔ آج پورے ایک ہفتے کی قید بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد اُسے رہائی ملی تھی ۔ لیکن اس کا ذہن یہ سمجھنے سے ابتک قاصر تھا کہ آخر کس جرم کے پاداش میں اسے آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا تھا۔

وہ ایک مزدور تھا پتھروں کے جگر کو پانی کر دینے والا مزدور وہ بوریا نشیں تھا۔ پھوس کے جھونپڑے میں رہنے والا بوریا نشیں! شعور میں قدم رکھنے کے بعد اگر کسی چیز سے وہ متاثر ہوا تھا وہ روٹی تھی۔ چاند کی شکل کی گول گول سی روٹی ۔ بچپن میں بھی جب وہ روٹی کے لئے بلبلا اٹھتا تو اس کی ماں چاند کو دکھلا کر دکھلا کر اسے سلانے کی کوشش کرتی ۔ اور آج بھی وہ روٹی کے اسی حصار میں مقید تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اب تک اس سے نکل نہ پایا تھا۔ صبح سے شام ہوتی اس کے قدموں میں چرخی سی لگ جاتی لیکن باوجود اس کے کبھی پیٹ بھر روٹی میسر نہ ہوتی ۔ وہ سوتے میں بھی روٹی کے ہی سپنے دیکھا کرتا ۔ اور اس کے خراٹوں کی آوازیں بھی کچھ یوں بلند ہوتیں مانو وہ روٹی کے لئے صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو۔ جب اس نے روٹی کے اس گول گھر سے کبھی باہر جھانکا ہی نہیں تھا۔ تو پھر وہ آہنی سلاخوں کا مرتکب کیسے بن گیا ۔ ہاں اگر دن میں پانچ بار اس کرۂ ارض پر جبین ٹیکنا فعل ممنوعہ ہے ۔ تو یقیناً اس نے عدول حکمی کی تھی ۔ اگر مساوات انسانی کا پرچم بلند کرنا غیر قانونی ہے ۔ تو یقیناً اس نے قانون شکنی کی تھی ۔ اگر مسلمان ہونا گناہ عظیم ہے تو وہ گنہگار تھا۔ لیکن اس گناہ کا کفارہ پیچھلے کئی برسوں سے وہ پورا کرتا چلا آرہا تھا کبھی رحمان بن کر ۔ کبھی سبحان بن کر تو کبھی سمیر بن کر ۔ نواکھالی سے سیتا مڑھی تک اسے کئی بار جنم لینا پڑا تھا اس ملک سے اپنی وفاداری جتانے کے لئے۔

ہوٹل کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی وہ پل بھر کے لئے ٹھٹھک سا گیا۔ کیونکہ اس پر نظر پڑتے ہی اندر بیٹھے لوگوں نے اچانک چپکی سادھ لی تھی پھر بھی رمو کی

صاف ظاہر

اسکی شانتی سے یہ کبھی رہنا چاہتے تھے۔ کیونکہ
ہوٹل کا مالک اندر بیٹھے ایک کھدر پوش شخص سے کہہ
رہا تھا۔

"ویسے آپ جو کچھ بھی کہیں مشرا جی — مگر یہ سب
اچھا نہیں ہوا ایک عرصے میں ہم یہاں مثل شیر و شکر کے
رہتے آئے تھے پر پتہ نہیں کس بدذات کی نظر لگ گئی اپنی
اس پرانی دوستی کو — میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں مشرا
جی گاندھی نانک اور جائسی کے اس پوتر دھرتی پر یہ
فساد آخر کس بات کو لے کر ہے۔ آخر ہم کس اپرادھ
کی سزا دے رہے ہیں ایک دوسرے کو۔ ہم یہ کیوں بھول
جاتے ہیں کہ کل جن گردنوں کو تن سے جدا کیا تھا وہ بھی تو
کسی کے اپنوں، ہاں اسکے ماں باپ اور بھائی کے
پیارے ہی تھیں — آخر لہو کے اس سمندر کو پار کر ہم
کیا پراپت کر لیں گے!" اس نے قدرے جذباتی ہوتے
ہوئے مشرا جی سے پوچھا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو
مولوی بھائی — آج ہمارے وچار اتنے سنکرن
ہو چکے ہیں کہ ہم انسان کہلانے کے بھی شاید حقدار نہیں
رہے۔"

ہوٹل پہ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص نے
مشرا کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اب آپ
بتایئے مشرا جی! رام دین تو بے چارہ اس دنگے میں
مارا گیا — جانتے ہیں وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کا
ایک کنبہ تھا، پریوار تھا۔ ایک دو نہیں بلکہ
چھ بچوں کا وہ باپ تھا۔ اس کی منتیں پھر امید
..... اب تو سب کے سب بھوکے مر رہے ہیں۔ کون
..... نہیں — یہ دھرم خطرے میں ہے کا نعرہ دیکر

..... دھرم ..... ہارا ..... اور ..... کرو کی نیتی اپنانے والے نیتا!" مشرا جی پر قدرے
برستے ہوئے اس نے کہا اور جواب میں مشرا جی دُم دبا کر
ہوٹل سے نیچے اتر گئے۔

رحمو کی سماعت کو ان کی باتیں بھلی لگیں تھیں
اس کے اندر کے خوف کے سایوں کے قد کچھ چھوٹے ہو گئے
تھے اور اس کا زخم مرجھانے لگا تھا۔

"کیا لوگے بھئی — ؟؟" رحمو پر نظر پڑتے ہی
دوکاندار نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"بس دو روٹی —" رحمو نے اپنے کرتے کی جیب
میں باری باری سے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا مگر ایک چونی
کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس
کی پوری تنخواہ تو تھانے میں ہی حوالدار نے نکلوالی تھی
مگر اس نے دو روپے کا ایک ملگجا سا نوٹ پہلے سے
ہی اپنے پائنچے میں اڑس رکھا تھا۔ سو اس نے
ٹٹول کر دیکھا تو اسے اطمینان ہوا۔ اس اثنا ہوٹل
کے بیرے نے ایک پیتل پر دو روٹی اور تھوڑی سی
سبزی ڈال کر رحمو کی جانب بڑھا دیا۔

"کیلاش، چاچا — تمہیں کچھ معلوم ہے۔ رائے
پور گاؤں کے ایک کنوئیں سے چھ لاشیں ملی ہیں۔" ایک
ادھیڑ سا چھوکرا پتہ نہیں کہاں سے نمودار ہوا اور
زہر اگل کر قریب کی گلی میں جا گھسا۔ یہ سن کر ایک
بار پھر رحمو کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ اس کے اندر کے
خوفناک سائے دوبارہ لمبے ہونے لگے تھے۔ ہاں!
سائے جن کے ہاتھوں میں سلگتی ہوئی مشعلیں تھیں
تیر تھے — ترشول تھے اور جو بڑی تیزی کے
نعرے لگاتے ہوئے اس کے گھر کی جانب بڑھ

...ات سے اور اپنے آپ سے بھی — وہ نادم تھا
بزدلانہ کے چند شیطانوں کا مقابلہ بھی نہ کر پایا؟
نادم تھا اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی سے کہ اس نے
م ازل کے ارادے کو پورا کیوں نہیں کیا وہ اس
کوشش سے کیوں بھاگ نکلا ہے؟"

پریشان کروہ ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اتر
درفٹ پاتھ پہ ہی بیٹھ کر روٹیاں توڑنے لگا۔

"اندر آجاؤ بھئی — پوری جگہ خالی ہے!"
کے مالک نے بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے کہا۔

"جی — یہی ٹھیک ہے! ذرا (ذرا) دھوپ
لگ رہی ہے۔" رحمو نے دل کی کیفیات کو چھپانے
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی جاڑے میں ہی تو دھوپ کے مول
انداز ہوتا ہے۔ ورنہ گرمی میں کون پوچھتا ہے
بیچاری کو!" ہوٹل کے مالک نے ایک زوردار قہقہہ
لگاتے ہوئے کہا۔ ابھی رحمو سے آدھی روٹی بھی
نہ کھائی تھی کہ پتہ نہیں وہ کہاں سے کمر مٹکاتے ہوئے
اندر رحمو کے سامنے کچھ یوں پسر کر بیٹھ گئی مانو وہ اس
کی بہت پرانی جان پہچان ہو۔ رحمو نے گھور کر اسے
دیکھا — لاغر جسم کی پسلیاں بھی گن لو۔

"ہفتوں کے کرفیو نے شاید اسے بھی ہلا کر
رکھ دیا" دل ہی دل میں رحمو بڑبڑا اٹھا اور جیسے
ہی روٹی کا ایک ٹکڑا اسے دکھاتے ہوئے چلے جانے کو کہا
تو اس نے لقمے کو ... [illegible] ... لیا تھا سو
اس نے ... [illegible] ... کھسک آئی۔
... [illegible] ... لیکن

بھا — ہفتوں کے کرفیو نے ہم دونوں کی کمر توڑ
کر رکھ دی ہے — مگر یقین جان پھر بھی لوگوں کا
یوں سب کے قریب بیٹھنا بھلا نہ لگے گا اور —
روٹی کا پہاڑ بنا دیا گے۔ خدا کے واسطے میری قسمت
پر ترس کھا اور تو یہاں سے چلی جا۔" رحمو نے
اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر
یہ اس کی آنکھیں نم ہو اٹھیں اور پیٹ کی بھوک
سے مغلوب ہو کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کونڈے
سے روٹی کا ایک ٹکڑا نکال کر رحمو کے سامنے
یوں رکھ دیا مانو یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہو
کہ آخر تو بھی تو انسان ہی ہے نا — روٹی
روٹی کے لئے خون بہانے والا انسان —
تیری نظر میں روٹی ہی سب کچھ ہے تو واپس
لے اپنی یہ روٹی — مجھے نہیں چاہئے!" اس کے
انداز پر رحمو کی آنکھیں بھر آئیں اور اچانک اس
کی کتاب زندگی کے پچھلے اوراق پھڑپھڑا اٹھے۔
اور اسے یوں محسوس ہوا مانو شام کو وہ کام سے
گھر لوٹا ہو اور اس کی بیوی جبراتی اس کے
انتظار میں کھانا لئے کھڑی ہو۔ جبراتی کے تصور
سے اس کی آنکھیں برس پڑیں اور خوب برسیں
اس کی آنکھوں کے سامنے اشکوں کا سیلاب
چلا اور سیلاب کے اس ریلے میں اپنے
بوڑھی ماں کی سسکتی لاشوں کو تیرتے ہوئے
کے بیٹے کا موٹے کتنی دلسوز آواز میں ... [illegible]
پکارا تھا —

[illegible]

کی اینٹیں بکھری تھیں۔ آخر وہ لوگ کون تھے؟

رحمو نے دانت نسپورتے ہوئے جمالو کی جانب پچیس پیسے بڑھائے۔

"کیا لوگے بھئی!" جمالو نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"ایک پیالی چائے"! رحمو نے مسکین صورت بناتے ہوئے مختصراً جواب دیا

"پچیس پیسے اور بڑھاؤ!" اس بار جمالو کا لہجہ قدرے خشک تھا۔

"اب تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ رحمو نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کوئی دوسری چیز خرید لو"

"کلھڑ میں ہی دیدو نا بھیا" رحمو نے منہ بسورتے ہوئے جمالو سے التجا کی۔

"چلو آگے بڑھو آگے!" جمالو نے چولی اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔

"ایسے کاہے بولتے ہو بھیا۔ میرے بھی دن تھے تم سے اچھے دن! رحمو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے جمالو کو گھورتے ہوئے کہا اور تیزی کے ساتھ کلّو نانبائی کے تندور کی جانب بھاگا ——

اگرچہ تندور کی آگ کبھی سرد پڑ چکی تھی پھر بھی وہ وہی گٹھری بنا پڑا رہا۔ کمزور ہڈیوں تک جو تھوڑی بہت حرارت پہنچی تو وہ تخیلات کی دنیا میں جا پہنچا اور اسی کے متعلق سوچنے لگا۔ حالانکہ کلّو تک رحمو کے گوشہ جگر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی مگر اب تو اس کے دل کے کینوس پر اس کا اور صرف اس کا ہی نام لکھا ہوا تھا۔

ایک ہی ملاقات میں کتنا اپناپن سا ہو چکا تھا رحمو کو اس سے اور شاید اسے بھی رحمو سے۔ اور یوں سوچتے سوچتے اسے کب نیند آ گئی۔ اس کا اسے کچھ علم ہی نہ رہا۔ وہ تو کلّو نانبائی کی ٹھوکروں نے اسے بیدار کر دیا —— "کون ہے بے! اور یہاں کیوں پڑا ہے؟" شراب کے نشے میں ڈگمگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"خدا کے واسطے۔ میرے اوپر ترس کھاؤ صاحب۔ فساد میں میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ سر چھپانے کو بھی جگہ نہیں بچا ہے۔ باہر بہت سردی پڑ رہی ہے، ہم مر جائیں گے۔

"میں نے تیرے مرنے جینے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور اگر فساد میں تیرا سب کچھ ختم ہی ہو چکا تھا تو پھر تو کیوں بچ گیا۔ تجھے بھی ختم ہو جانا چاہئے تھا!" اس نے بھنویں سکوڑتے ہوئے کہا

"یہ آپ کہہ رہے ہیں صاحب!" ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے رحمو نے کہا۔

"جھاڑ کے لگا لکچر — جاتا ہے کہ نہیں۔ بھکاری کہیں کا" کلّو نے بڑی حقارت کے ساتھ کہا اور پھر اتنی زور زور سے ٹھوکر ماری کہ بے چارہ رحمو سیدھے سڑک پر آ لڑھکا۔ اور کچھ دیر تک وہیں پڑا آسمان کو ٹکر ٹکر یوں گھورتا رہا مانو رب سے شکوہ کر رہا ہو کہ خداوندا اگر میں بھی تیرا ہی بندہ ہوں تو پھر یہ لوگ مجھے اپنے سے الگ کیوں سمجھتے ہیں آخر کیوں؟

رات کا تھکا ہارا مسافر پچھلے پہر کے حدود میں داخل ہو چکا تھا —— اور اس کے اضطرابی سناٹے میں ہر چہار جانب سے آتی ہوئی چیخ و پکار اور

ہ وقفوں سے ماحول کبھی کبھی اتنا ہیبتناک ہو جاتا
الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ دور کہیں
سے ممتا کے سسکنے کی آوازیں آتی تو کہیں سے
سہاگنوں کی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی کھنک۔ کوئی
بوڑھا اپنے بوڑھاپے کی لاٹھی کے چھن جانے پر
ں کرتا تو کوئی گھائل اپنے زخموں کی سوزش
چیختا چلاتا — کراہتا، سبھوں کے دکھوں کی
عیت جدا جدا تھی مگر اس کی پرچھائیں ایک ہی
تھی اور اس پرچھائیں کی کوکھ سے پیدا ہونے والا
سوال بھی ایک ہی تھا۔

"آخر کس جرم کی سزا دی گئی ہے مجھے!"

برفیلی ہوا کا ایک تیز جھونکا رحمو کی کمزور
ہڈیوں کو چھیدتا ہوا گذر گیا۔ وہ پوری طرح کانپ
اٹھا اب اسے یقین سا ہو چکا تھا کہ کل صبح اس
کی بھی لاش ٹھنڈ سے مرنے والے آوارہ کتوں کے
ساتھ میونسپلٹی والے کسی کوڑا گاڑی میں لاد کر
ہی ندی کے کنارے لا پھینکے گے۔ پھر تو چیل کوے
اس کی بوٹیاں اور شہر کے آوارہ کتے اس کی پسلیاں
ادھر سے ادھر کر دیں گے۔ وہ اس تصور سے ہی
ایک بار پھر کانپ اٹھا اور فوراً سڑک سے اٹھ
کر ٹم ٹم پڑاؤ کے ایک گوشے میں جا گھسا اور
گھٹنوں کو پیٹ میں گھسائے گٹھری بنا پڑا رہا
جسم تھا کہ سرد ہوتا ہی جا رہا تھا اور ہڈیاں
سے ٹھنڈ کے الگ چٹخنے لگی تھیں کہ دریں اثنا
اسے اپنے قریب ایک عجیب سی گرمی — ہاں!
ایک کلو نانبائی کے تندور کسی کسی گرمی کا احساس
ہوا۔ اس کی آنکھ اچانک کھل گئی۔

"ارے تو!!" خوشی اور حیرت کے ملے جلے
تاثرات کے ساتھ اس کے منہ سے اچانک نکل پڑا
اور جواب میں وہ صرف مسکرا دی — رحمو کی ٹھٹھرتی
انگلیاں بڑی تیزی کے ساتھ اس کی ننگی پشت پر
رینگنے لگی مگر اس بار اس نے کوئی احتجاج نہیں
کیا — شاید کے آج وہ پوری طرح خود سپردگی
کا ارادہ کر کے چلی تھی۔ وہ ساری رات رحمو اور
برفیلی ہواؤں کے بیچ ایک دیوار بنی پڑی رہی —
اور اس طرح صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس نے
اپنے جسم کی بچی کچھی حرارت کو بھی رحمو کے جسم میں اتار
دیا تھا۔

دہلی

"یادوں کا سفر" کی شاندار
مقبولیت کے بعد —

قیصر عثمانی
کی
ایک اور تصنیف منظرِ عام پر

یادوں کے سائے

(مصور)

نرگس، مینا کماری، مدھو بالا، موتی لال
چندر موہن، سہراب مودی اور دیویندر گوئل وغیرہ کی
یادیں۔

صفحات:- ۱۲۸۔ طباعت آفسیٹ، سرورق رنگین
پتہ:- قیصر عثمانی۔ ۷ جمیلہ بلڈنگ، پیشا پارک۔ ملاڈ الیسٹ بمبی

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

نام کتاب :-
شاعر :- علامہ سریر کابری مینائی (مرحوم)
مرتب :- سید محمد داؤد اختر کابری
صفحات :- ۱۶۰ قیمت - ۳۵ روپے
رابطہ :- سریر منزل، کریم گنج، گیا (بہار)

"معلومات سخن" اس مشہور و مقبول شاعر کا مجموعہ کلام ہے جنھیں "بلبل بہار" علامہ سریر کابری مینائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا۔

"بہار میں آج بھی باکمال ہستیوں کی کمی نہیں، میں ناقد ہوں شاعر نہیں، ایسے ترشے ہوئے الفاظ داد کے لئے کہاں سے لاؤں۔ جو سریر کابری کی شاعری کے لئے واقعی موجب تحسین ہوں۔"

ایسے عظیم اور قادر الکلام شاعر کے اس اہم مجموعہ کلام میں شامل غزلیں (ردیف وار) رباعیات، قطعات اور تاریخی قطعات ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس میں عہد ماضی سے عہد حاضر تک کی بے حد خوبصورت تصویر کشی ملتی ہے۔ مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی اور فکری و فنی بصیرتیں پورے مجموعہ کے اشعار میں بڑے فنکارانہ اور شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ موجود ہیں۔

اپنی شاعری میں سریر کابری نے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اصلاحی افکار کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی جنگاریوں کو بھی بڑے پروقار اور ایک جمالیاتی معیار کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

علامہ سریر کابری کو صنف شاعری کے تمام ا[illegible] پر یکساں طور پر قدرت حاصل تھا اور ان کی دور رس اور دور اندیش نگاہوں نے اپنے عہد کے ساتھ ساتھ آنے والے عہد کو بھی دیکھا اور بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ بلکہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس مشہور قول سے بھی دو چار قدم آگے نظر آتے ہیں کہ "ایک عظیم شاعر اپنے فن پارہ میں اپنے عہد کی تصویر کشی کرتا ہے۔"

چند مثالیں دیکھئے ؎

کیا جانے آگے چل کر سریر اور ہوگا کیا
آماجگاہ فتنہ و شر ہے وطن ابھی

اس دور میں ہند و پاک سریر آپس میں [illegible] مکدر رہتے

دونوں کو ہی اک حسرت ہے کشمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

بازار میں آج کل ہے ہر چیز گراں

سستا سب سے مگر انسان کا لہو

علامہ سریر کابری ایک حساس اور وقت شناس شاعر تھے، جنہوں نے اپنے عہد میں بھی آنے والے عہد کی دھنک کو بڑی شدت سے محسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں سیاسی، سماجی، معاشرتی مذہبی، اصلاحی احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی پاکیزگی اور شگفتگی میں روائتی شان اور جدید حیثیت کا بے حد خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ جو یقینی طور پر سریر کی انفرادیت اور عظمت کے نمایاں ثبوت ہیں۔

علامہ سریر کابری کی شاعری کا نہیں بلکہ اردو شاعری کا المیہ ہے کہ ایسے بلند مقام شاعر کی شاعری وہ مقام نہیں بخشا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس ادبی جرم کے ذمہ دار ہمارے وہ ناقدین ادب ہیں جو فن کی بجائے فنکار سے مرعوب ہو کر ان کی ادبی حیثیت متعین کرتے ہیں۔

"معلومات سخن" ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو ہماری اُردو شاعری کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس لئے ایسے شعری مجموعہ کی قدر ہونی چاہئے۔ مجموعہ کی کتابت، طباعت وقیمت مناسب ہے۔

▲ سید احمد قادری، گیا

نام کتاب :- تیر و نشتر

مصنف :- جوگندر سنگھ پرنسپل

صفحات :- ۱۶۸، سائز :- ڈیمائی، قیمت :- ۳۰ روپے

ناشر :- جوگندر سنگھ پرنسپل

پتہ :- جوگندر سنگھ پرنسپل، پرنس کوچنگ کالج شاہ آباد، مارکنڈہ، ہریانہ - ۱۳۲۱۳۵

تیر و نشتر پرنسپل جوگندر سنگھ پرنسپل کا پہلا نثری مجموعہ ہے جس میں بارہ باب ہیں۔ پہلے آٹھ میں مصنف نے فرض، اخلاق، زندگی، مذہب اور حسن و عشق وغیرہ سے متعلق اپنے خیالات کا مختصر جملوں کے ذریعے اظہار خیال کیا ہے۔ باقی چار میں بچوں، بزرگوں، بڑھاپے اور بدلتے ہوئے انسان پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

پرنسپل صاحب پچھلے 50 برس سے درس و تدریس میں مصروف ہیں۔ لہٰذا ان کو انسانی نفسیات کو سمجھنے اور زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کا نادر موقع میسر ہوا ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے نصف صدی کے تجربے کی بنا پر لکھا ہے۔ ان کے افکار میں واقفیت ہے، صداقت ہے۔ یہ ان کے تہِ دل سے نکلے ہوئے خیالات ہیں اور محسوس یوں ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ قاری سے کرانے کے لئے کہتے ہیں اس پر وہ خود بھی ایک مدت تک گامزن رہے ہیں۔ ان کے پند و نصائح میں "از دل خیزد بر دل ریزد" کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔

پرنسپل موصوف کا تعلق مذہب سے ہے جس میں یادِ خدا، محنت، مساوات، خدمت خلق اور نوع انسان سے محبت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کرت کرنی، ونڈ چھکنا، نام جپنا، سیوا کرنا اور مانس کی جات کو ایک ہی کنبہ سمجھنا" اس لئے اس کتاب میں ان اعلیٰ تعلیمات کی جھلک جا بجا ملتی

ہے۔ جو قاری کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ اگر
اگر ہم ان کو اپنائیں، اور ان پر گامزن ہوسکیں تو
ہماری زندگی بامعنی، مفید اور پرسکون ہوسکتی ہے،
ہم جہادِ زندگانی میں فتحیاب ہوسکتے ہیں۔ ملاحظہ
فرمائیں یہ چند جملے۔

۱۔ محنت کش زندگی اچھے نصیب کی ضامن ہے
۲۔ زندگی آپ سے صرف یادِ الٰہی اور نیک اعمال کے تحفہ کی محتاج ہے
۳۔ خدمتِ خلق زندگی کا ایک اچھا شیوہ ہے اور میٹھا میوہ ہے۔
۴۔ مجھے تو مندر میں رام کے ساتھ رحیم بھی کھڑا دکھائی دیتا ہے۔
۵۔ مساواتِ انسان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔
۶۔ جو انسانیت کا عاشق اس کا خدا عاشق۔
۷۔ کردار وہی جو حسنِ اخلاق کی مہک دے۔

اس مجموعے میں مصنف نے ان تمام مضامین پر اپنے خیالات کا مفصل اظہار کیا ہے جن کا انسانی زندگی کی تشکیل و تکمیل سے گہرا تعلق ہے۔ فرض شناسی، وقت کی پابندی، وطن سے محبت، خدمتِ خلق، حسنِ اخلاق مذہب کے بنیادی اصول وغیرہ۔ سنسکرت، فارسی، اور انگریزی میں تو اس طرح کی بہت سی کتابیں مل جاتی ہیں مثلاً پنچ تنتر کی کہانیاں، ست اپدیش، شیخ سعدی کی گلستاں، بیکن کے مضامین، سوییٹ مارڈن اور ڈیل کارنیگی کی تصانیف اور لالہ ہردیال کی "ہنٹس فار سیلف کلچر" مگر اردو میں بہت کم لوگوں نے اس طرف توجہ دی ہے۔ اس لئے یہ کتاب کا ذاتی اور پبلک لائبریریوں میں ہونا ضروری ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ زبان سلیس، سادہ اور عام فہم ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اہلِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی اور عوام خواص میں مقبول ہوگی۔

▲ صابر ابوہری۔ جگادھری

اُردو کے ایک اہم دانشور افسانہ نگار
اور صاحب طرز صحافی
کلام حیدری
کی شخصیت اور فن پر
ایک ضخیم اور باوقار پیش کش
ماہنامہ سہیل کا کلام حیدری نمبر
کم و بیش ۳۰۰ صفحات کے اس وقیع نمبر کی تیاریاں
بہت کچھ ہوچکی ہیں
بہت کچھ ہو رہی ہیں
ہند و پاک کے نامور قلم کاروں سے تعاون کی اپیل ہے
ایڈیٹر۔ ماہنامہ سہیل گیا

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ
ڈاک ٹکٹ ارسال کریں
(ادارہ)

شہ خیال

سُہیل کے شمارہ نمبر ۱۱ میں نمود کے تحت جناب مسعود منظر صاحب کا " تخلیق کی معنویت / معنویت کی تخلیق " قابل تعریف ہی نہیں قابل صد تعریف ہے۔ اتنا جامع اور طبیعت کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا بہترین اداریہ لکھنے پر جناب مسعود منظر صاحب یقینی طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آفریں!

کچھ ماہ پہلے (شاید جولائی ۹۲ء آجکل دہلی) میں بھی اداریہ کے تحت " غزل بوم " کے نام سے ایسی ہی تحریر پڑھنے کو ملی تھی۔ اس کا بھی لب و لباب وہی تھا جو نمود کا ہے۔ دونوں میں جو بات کہی گئی ہے اسے آگے بڑھاتے ہوئے خاکسار اپنے ہی شعر سے اپنا نظریہ پیش کرنا چاہتا ہے۔

نہ علم و فن کی دولت ہے نہ خدمت کا کوئی جذبہ
جسے دیکھو وہی شہرت کا خواہاں ہے جہاں میں ہوں

یہ امر مسلم ہے کہ مشہور ہونے کے لئے علم و فن کی دولت کے ساتھ ساتھ خدمت کا نیک جذبہ بھی ضروری ہے مگر آج کا شاعر علم و فن سے تو دور ہے ہی، خدمت کے نیک جذبہ سے بھی یکسر خالی ہے۔ خدمت کا جذبہ آفاقی ہوتا۔ مگر ہمارے شعرائے کرام اس جذبہ کو اپنی روٹی کے لئے صرف اردو کی خدمت (نام نہاد خدمت) تک محدود کرتے ہوئے مشاعروں کو بھی مرثیا کر چکے ہیں، اپنے اشعار میں ادب، تمیز، اخلا اور انسانیت کی اونچی اونچی بات کرنے وا شاعر مشاعرہ میں آکر جب کھانے اور پینے نام سے اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرتا ہے آنے جانے کے کرایہ کے ساتھ ساتھ معاوضہ لے کر جو سطحی بحث کرتا ہے تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ منتظ اور سامعین ایسے شاعروں کو اب تک کیو برداشت کرتے آرہے ہیں۔ اور کب تک بردا کرتے رہیں گے؟

جہاں تک سوال علم و فن کا ہے موجود دور کے ننانوے فیصد %۹۹ شعرا اس سے بے بہرہ ہیں۔ مطالعہ کی بات کرو تو جواب ملتا ہے کہ جب مطالعہ کے بغیر ہم شاعری کر رہے ہیں تو

مطالعہ میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے ؛ شاعری
ہی ایسی کہ خدا کی پناہ ! ایک اندازے کے
مطابق موجودہ دور میں شائع ہونے والے اردو
...ب کے رسالوں، روزناموں اور ہفتہ وار اخبارو
...ں نظم، قطعات اور رباعیات کو چھوڑ کر دیکھا
...ائے تو ہر ماہ تقریباً ایک ہزار غزلیں شائع ہوتی
...ں۔ ان غزلوں کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے تو صرف
پندرہ بیس اشعار ہی ایسے نکلتے ہیں جن پر ناز کیا
جا سکتا ہے۔ کئی غزلیں تو بحر اور وزن سے خارج
عروضی غلطیوں، شعر برائے شعر یا بھرتی کے اشعار
کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ اس سے ایک اور صرف
ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آج کا شاعر سستی شہرت
کے لئے شائع ہونے شائع ہو کر نام کمانے، اور نام کما
کر مشاعروں، نشستوں میں جا کر اپنی جیب گرم
کرنے، اور تر مال اڑانے کے لئے شاعری کر رہا ہے۔
ادب کی افادیت تو دور کی بات، ادب برائے ادب
کے وقار کو قائم رکھنے کی کوشش سے بھی آج کا شاعر
دور ہو چکا ہے۔ زیادہ مثالیں پیش کروں گا تو سہیل
کا الگ سے خاص نمبر نکالنا پڑے گا۔ اس لئے صرف
دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ سہیل میں ہی جناب
لقمان شوق کی غزل کا یہ شعر پڑھنے میں آیا۔

کسی دن ان سے ہندوستان بھی خالی کرالیں گے
چلو مسجد تو دینے کو ہوئے تیار مولانا

یہ شعر بابری مسجد سے متعلق ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" مسجد دینے کو تیار ہو گئی تھی۔ پورا تنازع مسجد کو دینے اور لینے کا نہیں مسجد کو مسمار کرنے کا تھا۔ تلمیح کے اس شعر میں حقیقت کو غلط انداز سے پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ بھرتی کا شعر کہنے کے لئے بابری مسجد کے علاوہ کوئی اور موضوع نہیں ملا ؟ ایک تو شعر برائے شعر کہنا۔ پھر حقیقت سے بعید شعر کہنا کہاں کی عقلمندی ہے ؟ کیا یہ فاش غلطی نہیں ہے ؟ کل کوئی مورخ آج کی تاریخ مرتب کرے گا اور اس کی نظروں سے لقمان صاحب کا یہ شعر گزرے گا تو کیا وہ گڑبڑا نہیں جائے گا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ قوم کے منہ پر طمانچہ مارنے والے اس شعر کو آپ نے شائع بھی کر دیا۔ اسی سلسلے میں ظفر جلالپوری کا مطلع وہ بھی نعت کا مطلع ملاحظہ ہو۔۔۔

طیبہ کی سرزمیں میں محمدؐ کے گاؤں میں
جنت سجی ہوئی ہے کھجوروں کی چھاؤں میں

معیاری کلام کے سہارے نہیں بلکہ مترنم آواز کے سہارے عرب ممالک میں گھوم گھوم کر بے تحاشہ پیسہ بٹورنے والے خوش نصیب شاعر جناب ظفر جلالپوری کا یہ مطلع ان کی کم فہمی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مطلع میں محمدؐ کے گاؤں کی بات کہی گئی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ محمدؐ کا گاؤں چودہ سو سال پہلے تھا۔ اب تو گاؤں الٹرا ماڈرن ہو کر ترقی کی دوڑ میں جاپان اور نیویارک سٹی جیسے خوبصورت شہروں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ گاؤں کہاں رہا۔ مصرعہ ثانی میں "جنت سجی ہوئی ہے" کہنا غلط ترکیب ہے۔ گاؤں، شہر، گلیاں، راہیں، محلہ، آنگن سجتا ہے، سجایا جاتا ہے۔ مگر یہ جنت کا سجنا! چہ معنی دارد ؟ یہ ترکیب کہیں پڑھنے میں نہیں آئی۔ ظفر صاحب نے کہیں پڑھا ہو تو بتائیں۔ نوازش ہوگی۔ پھر یہ کہنا کہ کھجوروں کی چھاؤں

میں "یہ بھی غلط ہے۔ چار سو سال پہلے عبدالرحیم خان خاناں کہہ گئے ہیں ؎

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو چھایا نہیں پھل لاگے اتی دور

ظاہر ہے کہ کھجوروں کی چھاؤں نہیں ہوتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ راجناندگاؤں کے عید میلادالنبی کے سلسلے میں منعقد مشاعرہ میں جب ظفر صاحب یہ شعر راگ الاپ کر جھوم جھوم کر سنا رہے تھے تو شاعری کے شوقین ایک صاحب ہال سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جھلا کر کہہ دیا کہ ہم تو نعت سننے آئے تھے، کھجوریں کھانے نہیں؟ اسی قبیل کے ہزاروں فرسودہ، بکواس اور مہمل شعر پڑھ کر، یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ آج کا شاعر مطالعہ سے کوسوں دور ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ایسی بکواس شاعری کرنے والے شاعر زعم کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ املا صحیح نہیں، ہینڈ رائٹنگ ایسی کہ پہلی کا بچہ دیکھ کر ہنس پڑے۔ تلفظ غلط، بات کرنے کا شعور نہیں، گھٹیا لوگوں کی صحبت۔ خودداری کی بو باس نہیں جانتے۔ ادب اور اخلاق سے کوسوں دور۔ اس پر یہ دعویٰ کہ ہم اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ کئی شاعر تو ایسے بھی پائے جاتے ہیں جنہوں نے دو تین نعتیں لکھی ہیں اور شاعر اسلام کہلانے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔ کوئی متحدہ عرب امارات دورہ کرتے ہوئے ترنم ریزی کے بل بوتے پر گھوم گھوم کر چندہ مانگ کر (بلکہ بھیک مانگ کر) اپنا مجموعہ بہترین انداز میں شائع کروا کر اکڑتا پھر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حماقتوں کا یہ طوفان کہاں جا کر تھمے گا۔

برسوں پہلے سیماب اکبرآبادی نے کہا تھا۔ "غرور و ناز کی ضرورت نہیں۔ خود نمائی و خواری کا موقع نہیں۔ کام کا وقت ہے۔ کام کیجئے۔ نام خود بخود چمک جائے گا۔ اگر آپ کے قلم میں قوت ہے۔ طبیعت میں جودت، خیال میں وسعت اور کلام میں جاذبیت ہے تو دنیا آپ کا لوہا مان لے گی اور زمانہ آپ کی اہلیت کا خود اعتراف کرے گا۔ آج دنیا کی ہر قوم اور جماعت تنازع البقا میں سرگرم ہے۔ آپ کو بھی ایسی کوشش کرنی چاہئے کہ آپ کا کلام اور نام باقی رہے اور جس طرح آپ متقدمین کو یاد کرکے ان کے کارناموں کا احترام کر رہے ہیں اسی طرح آئندہ نسل آپ کے نام اور کام کی عزت کریں اور آپ کو بقائے جاوداں حاصل ہو جائے۔

مشاعروں کی داد تحسین کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس رسمی مطالبۂ نفس کی پرواہ نہ کیجئے۔ قدرت کلام یہ ہے کہ جب شعر کاغذ پر آئے تو پڑھنے والا چند منٹ اپنی نگاہیں اس سے نہ ہٹا سکے۔ اس کی نگاہوں میں اس کا دل سمٹ کر آ جائے اور جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں وہ نگاہوں کے راستے دل میں اتر جائے۔ کیا ہمارے آج کے شعراء اس بات پر غور کر سکیں گے۔ بقول محشر بدایونی ؎

سلسلہ ٹوٹ تو سکتا نہیں سناٹوں کا
دل کے بہلانے کو آواز لگا دی جائے

▲ عبدالسلام کوثر
سہدیو نگر، راجناندگاؤں
(۳۶ گڑھ) ۴۹۱۴۴۱

بانی :۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل شنسہاروی ؛ بیادگار :۔ زین العابدین احمد و ادریس شنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر محمد رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مشفق
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :۔ مسعود منظر
ایڈیٹر :۔ جمیل منظر
اعزازی ایڈیٹر :۔ خورشید ہاشمی
معاونین :۔ شکیل احمد حبابی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
کتابت :۔ سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ۳ — جلد ۵۲

بدل اشتراک
- فی شمارہ —— ۵ روپے
- زرسالانہ —— ۵۰ روپے
- لائف ممبری —— ۱۰۰۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱
فون :۔ ۱۵۷۳

آپسی میل۔ ایکتا اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب و تمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے بنا ہے۔ کوندر، ربندر، قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت سبھی گاؤں گھروں میں گائے جاتے ہیں۔

کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے۔

آئیے۔ ہم سب مل کر قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ:۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

226.24.(24-92)93-94

نمود

عصری ادب — کیوں اور کیا ؟؟

عصری مسائل نے ایک بار پھر اپنی اہمیت منوالی ہے، ادھر پانچ سات برسوں سے اردو شعر و ادب کی تخلیق میں لگے ہوئے فن کاروں کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ ادب عصری تقاضوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ مراجعت بلاشبہ ایک مثبت اقدام ہے، اس سے وہ سازشیں ناکام ہو گئیں جو شعر و ادب کی معنویت گم کر کے اور ان کے مقاصد مسخ کر کے ہمارے معاشرے میں زہر بھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہ بات طے ہے کہ ادب و شعر سے کسی قوم اور ملک کی تہذیبی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ دنیا کی بعض بڑی طاقتیں اس بات کی درپے رہی ہیں کہ وہ ہمیں ذہنی، فکری اور تہذیبی اعتبار سے دیوالیہ بنا دیں اور یوں ہمیں محکوم بنائے رکھیں۔ اس صورت حال سے مقابلہ کرنے کے لئے ادب ایک نہایت موثر حربہ ہے۔ جدیدیت کا نام لے کر ادب میں تخریب کاروں کی جو گھس بیٹھیا جماعت داخل ہو گئی تھی بالآخر ہم نے اسے مار بھگایا ہے اور اب ہمارا ادب ایک بار پھر اپنے اجتماعی مسائل سے قریب ہو چکا ہے اور اس آئینے میں ہم اپنے دور کے واقعات و واردات کا عکس آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ادب محض اپنے عہد کی تصویر کشی کا نام نہیں ہے جو کچھ جیسا ہے اسے اسی طرح پیش کر دینا ادب کی نہایت ادنیٰ قسم تو ہو سکتی ہے مگر یہ اونچا ادب نہیں بن سکتی۔ زندہ ادب کی تخلیق کے لئے ان نظریات و عقاید کی ضرورت بھی ہے جن کی روشنی میں ہم اپنے مسائل کو صحیح انداز میں سمجھ سکتے ہوں، انسانی جماعت سے سچی ہمدردی اور مسائل سے تعلق کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے معاشرے کے مختلف طبقوں کی باہمی کشاکش پر نظر رکھیں۔ سماج کے مظلوم و مقہور طبقے کی پسماندگی، اس کے اسباب اور اس کے تدارک کے سلسلے میں غور و فکر بھی کریں، گویا ہم ایک ایسے نقطۂ نظر کے حامل ہوں جہاں عصری سچائی کا صحیح منظرنامہ سامنے آسکے —— اور یقیناً اسی طرح عصری ادب کا سچا مفہوم واضح ہو سکتا ہے اور شعر و ادب کی معنویت متعین ہو سکتی ہے۔

مسعود منظر

تارا چرن رستوگی

برو باڑی، گوہاٹی

رباعیات سرمد اور منظوم اردو ترجمہ

▲ اورنگ زیب کے دور حکومت میں لکھے گئے تذکروں میں سرمد کے متعلقات نہیں ملتے میرزا محمد کاظم نے اورنگ زیب کے حکم سے سوانح و حالات سپرد کرنا شروع تو کیا مگر یہ سلسلہ دس سال کے بعد اورنگ زیب ہی نے رکوا دیا۔ اس کے بعد دور شاہ عالم میں مستعد خاں نے "مآثر عالمگیری" کے نام سے ۴۰ سال کے مجملا سوانح و حالات سپرد قلم فرمائے اور اپنی تصنیف میں کاظم خاں کے مخطوطے کو بھی شامل کر لیا۔

سرمد اپنی وسیع المشربی کی وجہ سے تنگ نظر حکام کی آنکھوں کا کانٹا بنا ہوا تھا۔ مزید براں، سرمد اور چندر بھان برہمن دونوں داراشکوہ سے وابستہ رہے تھے۔ سرمد کو تہ تیغ کر دیا گیا، جس کے فوراً بعد چندر بھان برہمن غائب ہو کر بنارس چلے گئے جہاں، انھوں نے سادھو سنتوں کے ساتھ عمر گذار دی۔ اس موضوع پر میری انگریزی اسٹرلنگ (STERLING) شائع ہو چکی ہے۔

CONCISE DICTIONARY OF SUFISM & SIX SAINTPOETS OF PERSIAN

(صوفی مصطلحات اور فارسی کے چھ ولی شعراء)

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

" اورنگ زیب ..... خوں ریزی کے بعد ۱۶۵۷ء میں تخت نشیں ہوا اور ایک ہی سال بعد سرمد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا..... سرمد کے خوف کی ہی نیرنگیاں تھیں کہ .... عالمگیر کو بھی راحت و اطمینان کے دن نصیب نہ ہوئے، پیام اجل بھی آیا تو عالم غربت و پریشانی میں ..... جب سرمد نے جلاد سے کہا۔" بہر صورتی کہ می آئی من ترا می شناسم (بہر کیف، جس طرح تو آیا ہے میں تجھے خوب پہچانتا ہوں) تو اسے عالمگیر اور عالمگیری علما سے کیا شکایت ہوگی"۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار
برائے کینہ اغیار در دلم جاں نیست

(ص ص ۲۹ - ۳۰ سوانح سرمد شہید)
سور گیہ شری بانکے بہاری نے اپنی تصنیف
SUFIS MYSTICS & YOGIS OF INDIA
(BOMBAY 1974)
میں لکھا ہے کہ عہد شاہجہانی میں سرمد ایران سے ہندوستان آئے۔ تھوڑے عرصے بعد شاہجہاں کے بڑے لڑکے دارا شکوہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دونوں میں اختلاط وارتباط قلبی قائم ہوگیا۔ دارا شکوہ اس دوران اپنشد اور بھگوت گیتا کے مطالعہ سے مستفید و مستفیض ہوا کرتے تھے —

سرمدی کے کلام سے ان کی زندگی پر قدرے روشنی پڑتی ہے ؎

سرمد بہ کوئے عشق بہ نام شدی
از دین یہود سوئے اسلام شدی
معلوم نہ شد از خدا و احمد
برگشتہ بہ سوئے لکشمن و رام شدی

(یعنی میں راہ عشق میں بدنام ہوا اور یہودی مذہب کو خیرباد کہہ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ نہ معلوم کیوں خدا و احمد سے برگشتہ ہو کر رام اور لکشمن کی جانب رجوع کرنے لگا)

غالباً اسی رباعی پر تکیہ کرتے ہوئے یہ کہا جانے لگا کہ سرمد یہودی نژاد تھے بعد کو اسلام قبول کر لیا۔ مگر، بات یہیں تو ختم نہیں ہوتی کیونکہ رباعی ہذا میں لکشمن و رام کا بھی ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فقیر، سادھو سنت دنیا و مافیہا سے ماورا ہو کر اس علو ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے عندالنظر انسانیت غیر منقسم رہتی ہے۔ کفر و ایمان کے مابین بھی انہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ خدا مست (GOD-DRENCHED) ہوجاتے ہیں۔

اگر سنیاس (SANNYAS) پر توجہ مرکوز کی جائے تو یہی صورت حال ابھرتی معلوم ہوتی ہے۔ "سن" کے معنی متوازن، مستقیم، محبت کرنا، انعامات تقسیم کرنا وغیرہ۔ نیاس کے معنی ہیں نشان لگانا، بنیاد ڈالنا، مصوری، پیش کرنا، چھوڑنا، دریافت کرنا، دستبردار ہوجانا۔ سن اور نیاس سے لغت کے مفاہیم وقیع و وسیع ہیں۔ "سنیاس" فقیر ہوجانے کو نہیں کہتے ترک دنیا کو نہیں کہتے، بلکہ دل و دماغ کی ایسی کیفیت کو کہتے ہیں کہ اس کا حامل دنیاوی آلائشوں سے کنارہ کش ہو کر دنیا کو فلاح و بہبود کی جانب لانے کے لئے مجاہدانہ کاوشیں کرتا ہے۔ وہ انسان انسانیت سے بے لوث محبت کرتا ہے۔ دنیا کے سامنے ایک مثال بن کر ابھرتا ہے، ایک سنگ منزل قائم کرتا ہے۔

سرمد ایسے ہی سنیاسی تھے، ایسے ہی درویش تھے جو دنیا کو نیست ہست نما سمجھتے ہیں۔ ہمہ اوست ہمہ از اوست، ہمہ در ہمہ وغیرہ کے علم بردار سرمد کو اقدار اعلیٰ سے محبت تھی اپنی جان فانی سے نہیں — فنا فی اللہ نیز بقا باللہ کے انضمام اور حملہ جدلیاتی ذات، صفات و اسمائے مرتبہ صوری توحید سے نظر آنے والے آفاق و شعور سے کہیں آگے پہنچے ہوئے سرمد کو صرف ایک ہی بات یاد رہی تھی ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیث دوست کہ تکرار می کنم

یعنی ہم نے جو کچھ سیکھا تھا سب کو حافظہ سے باہر کر دیا۔ صرف یاد حبیب ہی دل میں باقی ہے اور اس کے نام کی رٹ لگی رہتی ہے۔ اور بس

یہ جواب تھا جو سرمد نے داراشکوہ کے مکتوب کا دیا۔ داراشکوہ نے سرمد کو "پیر و مرشد" لکھ کر خطاب کیا ہے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو۔

پیر و مرشد! من ہر روز قصد ملازمت دارد میسر نمی شود۔ اگر من منم پس ارادہ من معطل چیست و اگر نیستم چہ تقصیر مرا۔ قتل حسین اگر مشیت ایزدی است پس یزید در جہاں کیست و اگر غیر مشیت است پس معنی بفعل اللہ ما لنشاء بحکیم ما یرید چیست؟ نبی مختار بہ جنگ کفاری رفت شکست در لشکر اسلام می افتاد۔ علما ظاہری می گویند کہ تعلیم صبر است، منتہی را تعلیم چہ درکار۔

(یعنی اے پیر و مرشد، کیا وجہ ہے کہ میں آپ کی صحبت و خدمت کی تمناؤں کے باوجود ان برکات کو حاصل نہیں کر پاتا۔ اگر میں میں ہوں تو میرا ارادہ کیوں معطل ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر میرا کیا قصور ہے۔ اگر قتل حسین مشیت ایزدی تھا پھر دنیا میں یزید کس کو سمجھا جائے۔ کیا ہے یزید۔ حدیث قدسی کہ ہر فعل اللہ ہی کے ہاتھ سے ہوتا ہے کیا مفہوم رکھتا ہے۔ رسول اللہ کفار سے جنگ کرنے گئے مگر اسلام کے لشکر کو شکست ہوئی، کیوں؟ علما ظاہر کہتے ہیں کہ اس طرح صبر کی تعلیم دی گئی، رسول اللہ ایسے منتہی کے لئے تعلیم چہ معنی دارد۔

داراشکوہ نے جو سوالات اٹھائے معمولی نہیں کہے جا سکتے۔ مگر تعقلات کی بھول بھلیوں میں اہل "دل و نظر" نہیں پھنستے۔ ایسے گورکھ دھندے سرمد ایسے سرمست پر کمندے نہیں پھینک سکتے۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سرمد داراشکوہ کی جانب رجوع نہیں ہوئے۔ داراشکوہ عالم بھی تھا اور علم دوست بھی۔ اپنشدوں کا ترجمہ "سر اکبر" داراشکوہ ہی کے قلم کا رہین منت ہے۔ مجمع البحرین میں داراشکوہ نے اپنا بنیادی فلسفہ یوں بیان کیا ہے۔

" در ہمہ اوست و ہمہ از دست جلوہ گر، اول او آخر اوست و غیرہ موجود نہ باشد" (سب چیزوں میں وہی ہے اور تمام چیزوں کا خالق وہی ہے۔ اس کی ذات ازلی و ابدی ہے اور وہی ہر شے میں جلوہ گر ہے)

داراشکوہ ویدانت اور تصوف کو ہم معنی سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک اسلام اور ہندو دھرم میں لفظی تفاوت ہے۔ دونوں میں ایک ہی حقیقت کی دریافت و شناخت کی جا سکتی ہے۔ داراشکوہ اور سرمد کو اس زمانے کی سیاست کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔ سرمد پر برہنہ گھومنے اور آدھا کلمہ طیبہ پڑھنے کا الزام لگایا گیا۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ سرمد معراج جسمانی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ الغرض کٹھ ملاؤں نے انہیں تہہ تیغ کر ڈالا۔ سرمد کی شہادت سے تین سال قبل داراشکوہ کو ان کے فاتح بھائی اورنگ زیب نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

جناب شارق صاحب نے جنہوں نے رباعیات سرمد کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ "اورنگ زیب نے تخت نشینی کے بعد جب ملا عبدالقوی کو سبب عریانی معلوم کرنے کے لئے بھیجا تو سرمد کا جواب تھا۔ شیطان قوی است۔ ملا عبدالقوی کے دل کو شیطان کے ابہام سے کھٹک کا احساس ہوا اور اس نے

علما کی مجلس میں قتل کا فتویٰ حاصل کیا ــــ اور اورنگ زیب کی منظوری کے بعد (جو پہلے ہی سرمد سے برہم تھا) سرمد کو قتل کرا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سرمد کو قتل گاہ لے جایا گیا تو ان کے ساتھی شاہ اسد اللہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ کپڑے پہن لیں اور پورا کلمہ شہادت زبان سے ادا کر دیں۔ لیکن سرمد نے جواب دیا۔

دیر نیست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

(دیباچہ، ص ۷)

(یعنی وہ آواز جو منصور نے سر دار بلند کی تھی۔
خاموشیوں میں غرق ہو چکی ہے۔ میں اسی دار و
رسن کو سر نو جلوے دے رہا ہوں۔)

دور حاضر ویسے ہی دار و رسن کا دور ہے۔ ظلم و استبداد اخلاق عالیہ کا فقدان۔ فرقہ واریت و وحشتناکیت اقتصادی استحصال، مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر کے جنون کی سرحدوں پر پہنچانے کی خود غرضانہ کاوشیں وغیرہ سے انسانیت کو حیوانیت میں ڈھالنے کا دور دورہ ہے۔ اس پس منظر میں، سرمد کی رباعیاں مشعل حیات سے کم نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے خیالات کو ابلاغ و ترسیل کی منزلوں سے آشنا کیا جائے۔

سرمد کی رباعیاں خوش قسمتی سے ابھی تک دستیاب ہیں مگر یوں کہ فارسی زبان و ادبیات کی مقبولیت کسوف زدہ ہو چکی ہے۔ ان سے استفادہ معدودے چند ہی کر سکتے ہیں۔ جناب محمد مشتاق شارق میرٹھی نے رباعی کی چوبیس بحروں کی تجدیدات پر بھرپور نظر رکھتے ہوئے منظوم ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس مخصوص صنف سخن ہی میں خیالات کو کشید کیا ہے۔ بادۂ سرمد کو ہزار آتشہ بنا دیا ہے۔ یہاں بطور جملہ معترضہ یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ بہار اردو اکیڈمی کے سہ ماہی جریدے زبان و ادب میں فن رباعی سے متعلق میرا ایک مضمون بعنوان "فن رباعی نگاری۔ روایت سے درایت تک" شائع ہوا تھا۔ مضمون ہذا میں موقف ہے کہ رباعی اور قطعہ کے مابین سرحد معدوم ہو چکی ہیں نیز رباعی پر لادی گئی بحور کی بندیوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ ویسے ایک گر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ رباعی کے مصرعے جن کا پہلا رکن مفعول یا مفعولن ہو آخری رکن فع، فاع، فعل، فعول میں سے کوئی ایک ہو اور درمیانی دو ارکان مفاعیل، مفاعیلن، مفاعلن، مفعول اور مفعولن سے لئے جائیں پر بھی استوار کئے جا سکتے ہیں۔ بابا طاہر اور علامہ اقبال نے رباعیوں کو جکڑ بندیوں سے آزاد رکھا اور درست کام کیا۔ شارق صاحب نے جبلہ تجدیدیت کی ہے۔ بادۂ سرمد کے چند جزعات پیش ہیں۔

ہرا کردی تو غلم بہ دل ربائی خود را
ہم در فن مہر و آشنائی خود را
ایں دیدہ کہ بیناست تماشائی تست
ہر لحظہ بہ صد رنگ نمائی خود را (سرمد)

مشہور جہاں ہے دل ربائی تیری
دنیا میں ہے عام آشنائی تیری
کیوں محو تماشا نہ ہوں آنکھیں یارب
ہر رنگ میں ہے جلوہ نمائی تیری (شارق)

ترجمہ:۔ اسلوب کے لحاظ سے قدرے بدلا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ سرمد کہتے ہیں کہ " تو نے خود ہی اپنی دل ربائی

کو مکشوف کیا ہے۔ اپنے مہر و آشنائی کے فن کو بھی خود ہی ظاہر کیا ہے۔ میری آنکھیں دیکھنے والی ہیں اور تیرا جلوہ دیکھ رہی ہیں کہ لحظہ بہ لحظہ سینکڑوں طرح سے تو خود کو آشکار کر رہا ہے۔ بہرکیف، ترجمہ پورے مفاہیم پر استوار ہے اور خوب ہے مگر سرمد کا پورا احاطہ نہیں کرسکا۔

اے جلوہ گر نہاں عیاں شو بدر آ
در فکر بجستیم کہ ہستی تو کجا
خواہم کہ در آغوش و کنارت بگیرم
تاچند تو در پردہ نمائی خود را
(سرمد)

اے پردہ نشیں کبھی دکھا دے جلوہ
ڈھونڈیں بھی اگر تجھ کو تو ڈھونڈیں کس جا
آغوش میں لینے کی تمنا ہے بہت
کب تک تو رہے گا یوں ہی پردہ آرا (شارق)

ترجمہ بہت خوب ہے، صرف سرمد کی رباعی کا آخری مصرع "تاچند تو در پردہ نمائی خود را" ایک نہایت لطیف شوخی ندرت کا حامل ہے۔ بالخصوص "در پردہ نمائی" یعنی پردے کے باوجود جلوہ ساماں ہونا۔

۱۴ شادی بود از دین و دنیا ہمہ را
از ہر دو نجات دہ کہ شاد بست مرا
آشفتہ خود گجن کہ آنم ہوس است
از پردہ بروں بیا و خود بہ نما (سرمد)

ہے دین کا شیدا تو کوئی دنیا کا
ہر دو سے نجات دے مجھے بار خدا
کس درجہ ترا شوق ہے مجھ کو یارب
پردے سے نکل کے کہ آ دکھا دے جلوہ

بہت خوب، اچھا ترجمہ ہے

۱۵ ہر جا کہ نیابی تو نشانی ز جفا
ہر مہر و مروت نجل و بوئی ز وفا
از خلق و ز خلق خود ندانی ہرگز
آں ہر دو بدنسبت اوست گفتم بخدا (سرمد)

ہر سمت نظر آئے نشانات جفا
آئی نہ گلستاں سے کبھی بوئے وفا
کیوں ایسا ہے، سمجھے گا اسے تو کیسے
اس راز سے واقف ہے تو صرف خدا (شارق)

سرمد کی رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرعوں سے قدرے مختلف معنی نکلتے ہیں۔ مطلب کچھ اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ خلق یعنی خلقت اور خلق یعنی خالق کی مرضی کو تو ہرگز نہیں سمجھتا۔ اللہ بہتر جانتا ہے خلق و خلق دونوں اسی کے ہاتھ میں۔ خلق و خالق کے مابین فرق نیز رشتہ کو ترجمہ جگہ نہیں دے سکا۔ خالق کی مرضی یعنی مشیت الٰہی

مشہور شدی بہ دل ربائی ہمہ جا
بے مثل شدی در آشنائی ہمہ جا
من عاشق ایں طور قوام لی بینم
خود را نہ نمائی و نمائی ہمہ جا (سرمد)

ہر دل میں ہے آشنائی کی ادا
جو ہے وہ ہے تری دل ربائی پہ فدا
عاشق ہوں میں اس طور کا تیرے یارب
ہر پردے کے اندر ہے تو ہی جلوہ نما (شارق)

شارق صاحب نے مفہوم ہی کو نظم کیا ہے۔ غالباً یوں قریب تر ہو جاتا۔

مشہور ہے تیری دل ربائی ہر جا

بے مثل ہے شان آشنائی ہر جا
عاشق میں ہوا ہوں اس ادا پر تیری
ہے پردے میں بھی جلوہ نمائی ہر جا

۶ در بادیہ تجربہ یارب ہمہ جا
افتادہ سروکار بہ رشت و زیبا
تحیر از تو کسے نہ گشت فریاد رسم
دیدم ہمہ را و آزمودم ہمہ را (سرمد)

طے کر لیا تجربے کا صحرا میں نے
دیکھا ہے ہر ایک زشت و زیبا میں نے
فریاد رسی ہے تو سنی ہے تو نے
ہر ایک کو آزما کے دیکھا میں نے (شارق)

میدان میں تجربے کے اے یارے خدا
ہر اچھے برے سے کام اپنا اٹکا
کب تیرے سوا سنی کسی نے فریاد
ہر ایک کو میں نے خوب دیکھا بھالا (گمنام)

۷ ہر چند غرور دست گاہ است ایں جا
بر خود پیچیدن عروج جاہ است ایں جا
در ساز شکستگی حضور دگر است
از سرمد شدن سنگ نگاہ است ایں جا (سرمد)

مغرور کی ہے خواہش دولت کچھ اور
پروردۂ زر کی ضرورت کچھ اور
ہے ٹوٹے ہوئے ساز کی قیمت کچھ اور
سرمد شدہ پتھر کی ہے عظمت کچھ اور (شارق)

شارق صاحب نے "ہر چند" کو ترجمہ میں جگہ نہیں دی ہے اور "دست گاہ" کے رقبۂ معنی پر توجہ نہیں دی ہے۔ "دست گاہ" آج کل کی فارسی میں "راگ" (طرز نغمگی) کو کہتے ہیں۔ دولت جاہ و حشمت، قدر و منزلت غرض کہ جملہ تفاخرات پر بھی "دست گاہ" بسیط ہے۔ "بر خود پیچیدن" درد سے بے قرار ہونا، تڑپ اٹھنے وغیرہ مفاہیم پر محیط ہے۔ لہٰذا محولہ فوق رباعی سے یہ معنی و مطلب عبارت ہوتے ہیں۔

دراں حالیکہ دنیا میں جاہ و حشمت، دولت و ثروت وغیرہ پر غرور کیا جاتا ہے اور جاہ و مرتبہ حاصل کرنے کے لئے بے قراری کا عالم ہے۔ مگر ساز شکستگی یعنی حالت بے چارگی میں کچھ اور ہی لطف و مزہ (حضور ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے) ہے نیز پس کر سرمہ ہو جانے سے، یعنی تلخئ حالات سے متاثر ہو جانے سے نظر پیدا ہوتی ہے۔ "سنگ" بہ معنی قدر و قیمت لہٰذا سنگ نگاہ بہ معنی وقار نظر بھی معنوی احاطے میں مشمول ہو کر اس کی حدود کو اور بھی آگے بڑھاتے ہیں۔
ترجمہ ہذا۔ میری دانست میں کم معیار ہو گیا ہے۔

۸ اے بے خبر از ہستئ خود ہم چو کتاب
در جلد تو آیات الٰہی بہ حجاب
یعنی ز تو حق پدیدوانہ اثر سشس
آگاہ نئی چو شیشہ از بوئے گلاب (سرمد)

آگاہ نہیں ہستی سے تو مثل کتاب
ہستی ہے کہ آیات الٰہی کا حجاب
حق تجھ میں نہاں ہے تو نہیں ہے واقف
کب شیشے کو ہے خبر کہ اس میں ہے گلاب (شارق)

شارق صاحب نے مفہوم کو منظوم کیا ہے۔ جلوہ رباعی

کا الکتاب مشکل ہی ہے۔ سرمد نے کہا ہے کہ اسے خبر تو اپنی "ہستی" کو مانند کتاب نہیں جانتا۔ ملحوظ رہے کتاب اپنے مکتوبات سے ناآشنا ہوتی ہے۔ تیری ہستی کی کتاب میں آیات الٰہی چھپی ہوئی ہیں یعنی حق "ـــ" سے ظاہر ہوتا ہے مگر تو نہیں سمجھتا۔ تو ایک طرح سے شیشہ ہے جو گلاب سے ناآشنا ہے۔

۹ آں شعلہ کہ یاقوت وکم رارنگ است
گوہر بہ محیط مست وشرر در سنگ است
او در ہمہ در دست وغافل ہی خلق
ایں معنی رنگیں چہ قدر بے رنگ است

(سرمد)

جو شعلۂ عشق ہے فروغ صد رنگ
وہ بحر میں گوہر ہے، شرر ہے در شعلہ
وہ سب میں نہاں ہے پھر بھی سب ہیں غافل
یہ معنی رنگیں بھی ہے کتنا بے رنگ (شارق)

ترجمہ اچھا ہے مگر لفظ "عشق" گراں بار معلوم ہوتا ہے کیونکہ سرمد کا مدعا شعلۂ خداوندی سے ہے ویسے "عشق" بھی صوفی اصطلاح میں مخصوص معنوں کا متحمل لغت ہے۔

۱۰ اسرار مے وجام بہ کس روشن نیست
ایں راز بہ ہر بیہودہ دلی گفتن نیست
زاہد بہ خدا کہ از خدا بے خبری
سررشتہ ایں بدست ہر کودن نیست

(سرمد)

اسرار مے وجام ہیں کس پر روشن
کب ہوتے ہیں ہر اک پہ یہ انوار افگن
زاہد سے نہ پوچھئے، خدا ہے کیا شے
وہ مکتب عشق کا ہے ادنیٰ کودن (شارق)

کودن۔ مریل ٹٹو اور خچر کو کہتے ہیں۔ مجازاً شخص جو احمق ہو۔ نرا بیوقوف ہو۔ سرمد کہ ہیں اسرار مے وجام ہر کسی پر روشن نہیں ہوتے۔ دل اشخاص سے ان اسرار کا ذکر کار لاحاصل ہے گا۔ بخدا، زاہد کی خدا سے بے خبری (کیوں ہے سررشتہ سے مراد تدبیر مقصود۔ مطلب، دستہ شعبہ رواج، محکمہ، دفتر۔ یعنی اسرار مے وجام احمق نہیں سمجھ سکتے۔ شارق صاحب نے کودن ساتھ ادنیٰ استعمال کیا ہے جو بھدا معلوم ہے غالباً ادنیٰ کی جگہ "ہر اک" کودی جا سکتی تھی۔

۱۱ ہر جا کہ غم یار بود آرام است
بے ایں بہ جہاں ہر کہ بود ناکام است
غافل نہ شدی زیار داز بادہ ناب
گر دولت جم بی طلبی با جام است (سرمد)

ہے دوست کا غم ہی وجہ آرام یہاں
غافل ہے جو اس سے وہ ہے ناکام یہاں
محبوب کو چھوڑ اور نہ جام مے کو
ہے دولتِ جمشید سر جام یہاں (شارق)

شارق صاحب نے "سر جام" کہہ کر قابل داد سخن گوئی کا ثبوت دیا ہے۔

از کار جہاں تمام انکار خوش است
ایں کار کنی اگر تو بسیار خوش است
خود را بکنار گیر و بگذر ز ہمہ
در عالم تدبیر ہمیں کار خوش است

(سرمد)

غمگین نہ ہو فکرِ سحر و شام نہ کر

کام اپنا کئے جا عزم انجام نہ کر
ٹھکرا کے زمانے کو زمانے سے گذر
تو عالم تدبیریں آرام نہ کر
(شارق)

ایک اور ترجمہ ملاحظہ ہو۔

دنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہی رہنا اچھا
اس طور ہی کرنا ہے گذارا اچھا
اپنے ہی سمٹ اور ہر اک شے سے گذر
اس عالم تدبیر میں اس طور ہی رہنا اچھا
(رستوگی)

شارق نے کار جہاں کی تشریح کرتے ہوئے "فکر سحر و شام" کیا ہے۔ دراں حالیکہ ترجمے میں ندرت کا پہلو ہے مگر اس تشریح کے بغیر بھی کام نکل سکتا تھا۔ میرا ترجمہ کچھ زیادہ قریب ہے بایں ہمہ میں شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔

۱۶ ہر کس بہ خیال اوست حالش خوب است
ہم اول و ہم مالش خوب است
بسیار مبند دل بہ دنیا گفتم
ہر چند کہ ہست اعتدالش خوب است
(سرمد)

لو اس سے لگاؤ یہ خیال اچھا ہے
آغاز کے ساتھ اس کا مآل اچھا ہے
اچھا نہیں دنیا سے لگانا دل کا
ہوشیار کہ اس میں اعتدال اچھا ہے
(شارق)

سرمد نے "ہر چند" کہا ہے جس کی جگہ شارق صاحب نے "ہر چند" کا ہم وزن "ہشیار" نظم کیا ہے۔ ترجمہ اچھا ہے مگر "ہر چند" کی اپنی معنویت ہے جس سے ترجمہ عاری ہو گیا۔ اگر ہوشیار کی جگہ وہ "ہر چند" ہی رہنے دیتے تو غالباً احسن ہوتا۔

۱۷ سرمد کارِ آں لطف و کرم است
از معصیت و سیاہ کاری چہ غم است
رخشیدنِ برق ہی جوشِ باراں
رحمت چہ فزوں غضب چہ بسیار کم است
(سرمد)

وہ جان عزیز ہے فقط مہر و کرم
پھر کیوں ہے خطاؤں کا تمہیں اتنا غم
رخشیدن برق و جوش بارا دیکھو
لطف اتنا فزوں اور غضب اتنا کم

ترجمہ اچھا ہے مگر مگر پورا فارسی مصدر "رخشیدن" نظم کیا جانا خراب سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اردو روزمرہ سے مطابقت بھی انتہائی ضروری ہے۔ "رخشندگی" سے بھی کام چل سکتا ہے۔

نہ جانے کیوں شارق صاحب نے درج ذیل رباعی کا ترجمہ نہیں کیا۔

سرمد کہ ز عشق سرمدی یافت
کز بادۂ عشق بیخودی یافت
ہشیار نہ شد ز تیغ جلاد
منزل بہ مقام احمدی یافت

سرمد کو جو عشق سرمدی حاصل تھا
از بادہ عشق بیخودی حاصل تھا
ہشیار رہا تیغ ستم کو بھی سہا
منزل بہ مقام احمدی حاصل تھا
(رستوگی)

۱۶ سرمد کہ ز جا بر عشق مستش کردند
بالا کمرش و باز پستش کردند
می خواست خدا پرستی و ہشیاری
مستش کردند و بت پرستش کردند
(سرمد)

سرمد کو نہ جانے کیسی مستی بخشی
پہنچا کے بلندیوں پہ پستی بخشی
اس کو تھی فقط خدا پرستی درکار
لیکن اسے اس نے بت پرستی بخشی
(شارق)

ترجمے میں "ہشیاری" کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے، "درکار" کے بجائے "باہوش" کر دینا اچھا رہتا۔ اس کے ساتھ ہی "اس کو تھی" کو "مانگی تھی" کر دیا جائے۔

۱۷ زاہد تو بخور بادہ کہ بسیار نکوست
از خرقہ کشی خمار صد فتنہ در دست
بے شبہ حلال است بگوئی تو حرام
کیفیت ایں ہر کہ بیاید ہمہ اوست
(سرمد)

زاہد مئے تازہ سے نہ کر تو انکار
یہ خرقہ پشمینہ ہے فتنہ آثار
یہ نشہ کہ یکسر ہے سرور ہمہ اوست
تو اس کو حرام کہہ رہا ہے اے یار
(شارق)

اردو ترجمہ مفہوم کو بدل دیتا ہے۔ سرمد کے چوتھے مصرعے کا ترجمہ تیسرے مصرعے میں پیش کیا گیا ہے۔ سخن سنجی کے اعتبار سے یہی کلیدی مصرعہ ہے لہٰذا اس کو آخری مصرع قائم رکھنا احسن معلـ ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو کیا برا ہوگا ـ

زاہد تو شراب پی کہ بہتر ہے یہی
سو فتنے ہیں یہ خرقے میں، نہ کر خرقہ کشی
بے شبہ حلال ہے، تو کہتا ہے حرام
جو کیف یہ دیتی ہے سبھی کچھ ہے وہی
(رستو

سرمد مارا بہ عشق رسوا کردند
سرمست و سراسیمہ و شیدا کردند
عریانی تن بود غبار رہ دوست
آں نیز بہ تیغ از سر ما وا کردند
(مت

سرمد کو کیا عشق نے کتنا رسوا
سرمست بنایا اسے شیدا بھی کیا
عریانی جسم تھی غبارہ رہ دوست
تلوار نے یہ رشتہ بھی آخر توڑا
(شہ

جناب شارق صاحب کے خیال میں سرمد کی آ
رباعی یہی ہوگی۔ (ص ۸۴ الہامات سرمد) :
قابل صد داد ہے۔

۱۹ سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد
یا جاں بہ رہش نثار می باید کرد
(م

شکووں سے نہ نکلے گا کبھی جی کا بخار
ان دو میں سے اچھا ہے کرو ایک ہی کا

یا تن کو کرو اس کی رضا پر قربان
یا جان کو قدموں پہ کرو اس کے نثار

(شارق)

مد کا چوتھا مصرع اس طرح بھی بتایا جاتا ہے یا
طع نظر زیادی باید کرد۔

۲۰ ہر کس کہ سر حقیقتش باور شد
او پہن تر از سپہر پہنا در شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک با احمد شد

(سرمد)

ہے جس کی نگاہوں میں حقیقت کی جھلک
کچھ بھی نہیں اس کے لئے پہنائے فلک
ملا نے کہا گئے فلک پر احمد
"سرمد نے کہا آیا فلک احمدؐ تک"

تھے مصرعے کو عرش ملسیانی کے ترجمے سے لیا گیا
۔" در شدن" کے معنی ہیں داخل ہونا، پیوست
جانا، مشغول ہو جانا" فلک" صوفی اصطلاح
ں ہے جو تموجِ جمالِ حق" اور ایک روحانی منزل
مفاہیم پر محیط ہے۔ فلک ایک منزل سلوک ہے۔
مد کی رباعی خاصے گہرے معنی کی حامل ہے۔ سرمد
ہیں کہ راز حقیقت سے آشنا ہونے پر بڑی
بڑی وسعت سمٹنے لگتی ہے۔ عام طور پر جو یہ
جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ فلک پر گئے جب
فلک اور ذاتِ رسول دونوں ہم پیوست
۔صوفیا زمین و آسمان کو مظہر خداوندی
سمجھتے ہیں۔

۲۱ یا رب بہ کرم مرا ز گرداب برآر
از بہر گناہ گشتیم گیر کنار
جرم من و احسان تو بے حد و حساب
این طرفہ حساب است کہ ناید بشمار

(سرمد)

گرداب معاصی سے مری ناؤ نکال
ہو جائے نہ یہ غرق کہیں اس کو سنبھال
مانا کہ مرے جرم ہیں بے حد و حساب
یا رب تری رحمت بھی ہے معراج کمال

(شارق)

ترجمے کا چوتھا مصرع قدرے کم وزن سا معلوم
ہوتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تیری رحمت اور میرے
گناہ دونوں بے حد و حساب ہیں۔ بایں ہمہ، اوزانی
جکڑبندیوں کے پیش نظر ترجمہ خاصا کامیاب ہے

۲۲ ممکن نہ بود کہ یار آید بکنار
خود راز خیالِ خام و اندیشہ برار
ہر چیز کہ غیر اوست در سینۂ تست
بسیار حجابیست میان تو و یار

(سرمد)

کب خاک کے ذروں سے بنا ہے سونا
ہاں خود کو خیالِ خام میں ہے کھونا
ہے غیر کی الفت ترے سینے میں اگر
ممکن نہیں دوست تک رسائی ہونا

(شارق)

ترجمہ محض مرکزی خیال کو محیط ہے۔ مزید برآں
سینہ اور دل ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ دل میں
الفت ہوتی ہے نہ کہ سینے میں، بہر کیف روز مرہ یہی
ہے۔

دارا شکوہ ویدانت اور تصوف کو ہم معنی و مفہوم سمجھتے تھے۔ "سرِ اکبر" میں اس پہلو پر دارا شکوہ مرحوم شہید نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ حق تعالیٰ ذات و صفات و اسمار سے بالاتر ہے۔ نرگن (بے صفات) تخئیل میں آکر ہی سگن (باصفات) معلوم ہوتا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ یار تیرے پہلو میں آجائے گا۔ یہ خیال خام ہے، باز آ ایسے خیال سے۔ دل میں جو کچھ بھی وہ غیر اللہ ہے۔ دل میں گھر کئے خیالوں کو پردے ہی پردے سمجھ۔ یہ بات دراصل مراقبات و مجاہدات کی ہے۔ سفر روحانی "لا" ہی سے شروع ہوتا ہے۔

۲۴ جرم من فضل یار افزوں زشمار
ایں ہم چوں حالی ست زسمشار
چشم کرشمۂ عاشق حسنِ گنہ است
زنہار زکردار بد اندیشہ مدار

(سرمد)

جرم اور کرم ان میں سے ہے کون فزوں
واقف ہے ادھر وہ تو ادھر میں بھی ہوں
اس کی نگہ لطف ہے اور حسن گناہ
پھر کیوں نہ خوشی انجام ہوں اکمال زبوں

(شارق)

چوتھے مصرعے کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ اپنے کردار (گناہ) سے تو مت ڈر۔ مفہوم وہی ہے جو نظم کیا گیا ہے۔

۲۵ بے یار درین میکدہ بے یار مباش
بے ساقیِ گل عذار زنہار مباش
ایں جام جہاں نما بہر کس ندہند
غافل تو ازیں دولت بیدار مباش

(سرمد)

تو دور نہ جا میکدہ عشرت سے
باز آ کسی محل رو کی نہ تو الفت سے
یہ جام جہاں نما کسے ملتا ہے
اچھا ہے تو غافل نہ ہو اس دولت سے

(شارق)

۲۵ باخرقہ مخو یار، غلط گیر غلط
ایں زہد زیاں کار غلط گیر غلط
سررشتۂ مہر یار در دست بیار
ایں سبحہ و زنار غلط گیر غلط

( )

نہ جھوٹ کا کردار غلط اور غلط
یہ زہد زیاں کار غلط اور غلط
سررشتۂ مہر یار ہاتھوں سے نہ چھوڑ
یہ سبحہ و زنار غلط اور غلط

(شارق)

۲۶ آں راکہ بود بہرہ از عقل کمال
بیروں رود از دائرۂ فکر محال
در گوشۂ میخانہ تماشا بلند
شمع است یکے ہزار فانوس خیال

(شارق)

بیروں رود از دائرۂ فکر محال کا ترجمہ زنہار نہ ہو غم و فکر محال کیا گیا ہے غالباً یوں بہتر ہو:
ہو دائرۂ فکر سے باہر ہے محال

۲۷ با فکر و خیال کس بنا شد کارم

درطور غزل طریق حافظ دارم
اما برباعی ام مرید خیام
نے جرعہ کش بادہ او بسیارم
(سرمد)

میں سب سے الگ میرے سخن کے انداز
حافظ کے مقام تک ہے شعری پرواز
لیکن ہوں رباعی میں مرید خیام
رکھتا نہیں گو مادۂ خیام سے ساز
(شارق)

"م" کی ردیف میں ایک چشم انداز رباعی اور ہے جس کو نہ جانے کیوں شارق صاحب نظر انداز کر گئے ہے

۲۸ از نقش برآب ہر چہ گفتم گفتم
واز گوش حباب ہر چہ گفتم گفتم
ایں عالم پیری و زبانم خاموش
ایام شباب ہر چہ گفتم گفتم

یعنی میں نے جو کچھ کہا وہ بیکار ہی سا کہا بس نقش برآب کی مانند تھا اور جس سے کہا وہ بھی گوش حباب کی مانند تھا۔ اب بوڑھا کھوسٹ ہوں اور میری زبان پر تالے پڑ گئے ہیں۔ جوانی کے ایام میں جو کہا سو کہا مطلب یہ ہے کہ دوران عنفوان شباب دور از کار باتوں ہی میں پڑا رہا۔ ایسی باتیں جو بڑھاپے میں گفتنی بھی نہیں ہیں۔

۲۹ سرمد تو حدیث کعبہ و دیر مکن
در وادیٔ شک چو ہاں مگر سیر مکن
ایں شیوہ بندگی ز شیطان آموز
یک قبلہ گزیں، سجدہ بر غیر مکن (سرمد)

سرمد کبھی ذکر کعبہ و دیر نہ کر
ہشیار رہ شک میں کبھی سیر نہ کر
شیطان سے پوچھ زندگی کا شیوہ
ہو قبلہ نشیں، سجدہ سر غیر نہ کر
(شارق)

تیسرے مصرعے میں "پوچھ" کی جگہ "سیکھ" پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

ایک اور رباعی جس پر شارق صاحب کی نظر انتخاب نہیں پڑی مگر رباعی اچھی ہے۔

۳۰ سرمد بہ جہاں بسے نکو نام شدی
از مذہب کفر سوئے اسلام شدی
آخر چہ خطا دیدی ز اللہ و رسول
برگشتہ، مرید لچھمن و رام شدی
(سرمد)

اسی قسم کی ایک دوسری رباعی ہے ۔

۳۱ سرمد کوئے عشق بدنام شدی
از دین یہود سوئے اسلام شدی
معلوم نہ شد از خدا و احمد
برگشتہ بہ سوئے لچھمن رام شدی
(سرمد)

ملحوظ رہے۔ رباعیات سرمد کے نسخوں میں اختلاف نظر آتا ہے لہذا دونوں رباعیوں پر متوجہ ہونے کی ضرورت سی محسوس ہوئی۔ بہرکیف مفہوم ایک ہی ہے۔ سرمد دنیا میں نکو نام ہوا یا بدنام کہ وہ دین یہود سے اسلام کی جانب گیا۔ بعد ازاں اللہ و رسول یا خدا و احمد۔ ان سے ہٹ کر رام اور لچھمن کی سمت ہوا۔ ان رباعیوں سے مطلب نکالنا کہ سرمد

یہودی نژاد تھے۔ بعد کو مسلمان ہوئے اور اس کے بعد رام اور لچھمن سے مخاطب و مراقب ہو گئے سرمد صلح کن سے منسوب تھے۔

شارق میرٹھی نے سرمد کی ایک سو گیارہ رباعی منتخب کر کے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے رباعی کی اوزانی جکڑ بندیوں کو قبول کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ میرے نزدیک کسی وزن میں کہے ہوئے چار مصرعے، یعنی ہم قافیہ و ردیف دو اشعار کو رباعی کہا جا سکتا ہے۔ سرمد کے یہاں بھی ایسی رباعیاں ملتی ہیں جو رباعی کے نام نہاد اوزان میں نہیں ہیں۔ مثلاً

اعتبار وعدہ ہائے مردم دنیا غلط
ہاں غلط آب غلط امشب غلط فردا غلط
نسخۂ مینائی دیوان عمر ما پیرہن
خط غلط، معنی غلط، انشا غلط املا غلط

(فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن)

یعنی دنیا ہر طرح غلط ہے، غلط انداز ہے

اور یہ رباعی ـــ

ترک کردم چارہ ہائے جملہ از ماوائے خویش
نور حق را دیدہ ام از زیر تا بالائے خویش
گر تو می خواہی ببینی ہم چو جدا از جائے خود
تا ببینی مظہر حق جملہ سر تا پائے خویش

(فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن)

اور درج ذیل رباعی، رباعیات عمر خیام میں بھی ملتی ہے ـــ

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

یعنی کون ہے جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو اور اس نے بے گناہی میں زندگی کیوں کر بسر کی اگر میں برا کام کرتا ہوں تو اس کا صلہ برا کیوں ہو۔ اے خدا پھر مجھ میں اور تجھ میں فرق ہی کیا رہا۔

سرمد خدا مست ہستی تھے۔ سرخوشی جذبۂ عالیہ سے سرشار دنیا و مافیہا سے بیگانہ وار اِدھر اُدھر گھوما کرتے تھے لہٰذا ان کو یہ ہوش کہاں کہ وہ اپنا کلام کہہ رہے ہیں یا کسی اور کا حافظے سے پڑھ رہے ہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ سرمد اپنا کلام بیاض میں لکھتے تھے یا نہیں۔ جس شخص کو غیر خدا لفظ ہی نہ آتا ہو وہ اپنے پاس بیاض ہی کیوں کر رکھ سکتا تھا۔ غالباً ان کا کوئی مرید لکھتا رہا ہو۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریور سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا۔

اردو کے ایک اہم اور مشہور شاعر۔
"فرحت قادری"
کی شخصیت اور فن پر ماہنامہ سہیل کی خصوصی پیشکش
فرحت قادری نمبر
ایڈیٹر ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ، گیا

رباعیات

فیروز نظامی، لکھنو

جھونکے یہ مزاجوں کے کھٹکنے جاتے ہیں
حالات کلیجہ سا سلے جاتے ہیں
ڈرتے نہیں ہم وقت کی آندھی سے مگر
وہ گرم ہوا ہے کہ جلے جاتے ہیں

آداب شفا کی فقرا انداز ہی سیکھ
وہ بات جو صحت کو کرے راضی، سیکھ
اے مردک تند و تیز، اے یار حکیم
بہتر ہے کہ پہلے طب الف قلی سیکھ

نا سب ہی برا ہے نا سبھی اچھا ہے
سب اچھا کہیں جس کو تبھی اچھا ہے
کہنہ و جدید پہ نہیں ہے موقوف
جو شعر کہ اچھا ہو وہی اچھا ہے

اس طرح نہ تو بھی کہیں فریاد کرے
ڈر ہے کہ نہ یوں تجھ پہ وہ بیداد کرے
اے باپ کے دتنے کو بھلانے والے
اللہ تجھے صاحب اولاد کرے

غم خوردہ و احساس دریدہ ہم ہیں
احوال کا در پردہ قصیدہ ہم ہیں
جس دور کی دن رات دعا مانگتے تھے
اس دور میں حالات گزیدہ ہم ہیں

پر حول جہالت میں سمو جاتے ہیں
ان کے سارے اصول کھو جاتے ہیں
تو باغ کو بیت جبر کے زمانے میں دیکھ
اس دور میں پیڑ آدمی ہو جاتے ہیں

بگڑا عالم عظیم و انسب ہو جائے
ہر آدمی خود بخود مہذب ہو جائے
یا سارے جہاں کا ایک بن جائے ضرور
یا سارا زمانہ ایک مذہب ہو جائے

اک لب پہ خوشی ہے اور اک لب پہ ہائے
حالانکہ یہ دونوں ایک ہی جنگ سے آئے
جانباز کو صدمہ کہ شہادت نہ ملی
بزدل نے کہا جان بچی لاکھوں پائے

تخریب کو زندگی کے لالے پڑ جائیں
چہرے جور و ستم کے کالے پڑ جائیں
ہم آج اگر جھوٹ سے توبہ کر لیں
کل ساری عدالتوں میں تالے پڑ جائیں

راحت کی نوید بن، فغاں بن کے نہ پھیل
بن جانِ وفا دشمنِ جاں بن کے نہ پھیل
غربت میں، وطن میں، انجمن میں، گھر میں
خوشبو کی طرح پھیل دھواں بن کے نہ پھیل

گل خار کو، ذرے کو بتا کر تارا
سر پر مسیحائی کے چلایا آرا
کل ایک تعصبی نے، بے جرم و قصور
تاریخ کے چہرے پہ طمانچہ مارا

ملک و شہی و گوہر و الماس نہ دے
تیغ و الم و خامہ و قرطاس نہ دے
ہر طرح گذر سکتی ہے یہ عمر، مگر
اللہ کسی کو زعمِ احساس نہ دے

خاموش اندھیروں سے ملاقات رہی
یکجبستگیٔ حرف و حکایات رہی
جس روز کہ روتے ہوئے رخصت ہوئے تم
اس روز تو دن بھر مرے گھر رات رہی

تدبیر کی وادیوں میں کھو جاتا ہوں
خواہش کے جزیرے سمو جاتا ہوں
ہر رات سمٹ کر مجھے جوڑتی ہے
ہر صبح کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہوں

ماحول میں روح بن کے بس جاتے ہیں
الفاظ ان کے لئے ترس جاتے ہیں
اٹھتی ہیں یہ آنکھیں تو پھر ان آنکھوں سے
بے لفظ مکالمے برس جاتے ہیں

ہر لمحہ تو لب پہ دعا جاتا ہے
مدہوش ہے جس کو بھی چھوا جاتا ہے
سنتا ہوں وہ آئیں گے پئے پرسشِ حال
ہر شخص غزل چہرہ ہوا جاتا ہے

اک جھوٹ سی مسکرا کے کھا لیتا ہوں
بجھتے دیپک کی لو بڑھا لیتا ہوں
اللہ سے یقین، کہ ان کے ہر وعدے پر
امید میں پیوند لگا لیتا ہوں

اے مردِ غلط شعار کیا روتا ہے
یوں رونے میں اپنا وقت کیوں کھوتا ہے
بچوں کو سدھانا ہے تو سیکھ اس کا ہنر
الفاظ انڈیلنے سے کیا ہوتا ہے

اجڑا اسنسار لگ رہی ہے دنیا
بوجھل بیمار لگ رہی ہے دنیا
جس دن سے وہ بچھڑے ہیں اسی دن سے مجھے
باسی اخبار لگ رہی ہے دنیا

آ دیکھ کر حملے ہیں بلا کے میرے
دہلاتے ہیں دشمنوں کو خاکے میرے
اڑ جائیں نہ کیوں حسن کے حریفوں کے دماغ
مشہور ہیں تخلیقی دھماکے میرے

تم ہی شعروں میں تم ہی افسانوں میں
تم ہی لفظوں میں تم ہی ارمانوں میں
اپنے کو اگر تلاش کرنا ہے تو پھر
جھانکو مرے الفاظ کے تہہ خانوں میں

بجھنے والی صورتیں کل جاتی ہیں
بنیادیں مخالفت کی ہل جاتی ہیں
سچ بات کو جھوٹ سے دبانے کے لئے
آوازیں کرائے کی بھی مل جاتی ہیں

اچھائی کسی ایک کی جاگیر نہیں
اس جو کھٹے میں ایک بھی تصویر نہیں
جو جاگے وہ پائے اور جو سوئے وہ کھوئے
نیکی کسی قوم کی جاگیر نہیں

ٹپکا کرتے ہیں دلکے چھالوں کی طرح
چبھن کانٹے ہوئے رہتے ہیں کانٹوں کیطرح
فیروز مرے ذہن کے دیواروں پر
کچھ حادثے بیٹھے ہیں سوالوں کیطرح

دنیائے فن پہ کیا یوں ہی چھائے ہیں
کھوئے ہیں بہت تو جا کے کچھ پائے ہیں
اک عمر بہاروں سے مانجھی پہلے
تب جا کے بصیرت کی طرف آئے ہیں

ہر راہ پہ ادراک کا در کھول دیا
ہر زاویہ پر مشورہ المنول دیا
آیا جہاں احساس میں کچھ پھیکا پن
میں نے وہیں تجربوں کا رس گھول دیا

طنز و تمسخر و خوش و جفا کچھ بھی نہیں
قہر و غضب و جبر خطا کچھ بھی نہیں
افسوس کہ اب میرے حریفوں کے یہ
مجروح تعلّی کے سوا کچھ بھی نہیں

پامال صف جور و ستم کر جائے
دامان شجاعت میں گہر بھر جائے
ہو مرد بہادر تو جنے میرا سپوت
بزدل ہو تو اللہ کرے مر جائے

آؤ ذرا دوڑائیں دماغ آج کی را
چھلکائیں چلو پھر وہ ایاغ آج کی
گاندھی، آزاد، نہرو، قدوائی، سبھا
روشن کریں پھر کہنہ چراغ آج کی را

کیا یوں کوئی فن جوانی ہو جاتا ہے
ہر لمحہ اک امتحان ہو جاتا ہے
منزل کی بلندی پہ پہنچنے کے لئے
ادراک لہولہان ہو جاتا ہے

تیرے بغیر

رے بغیر بھی تم کو سکوں میسر تھا !
رے بغیر بھی تم نے خوشی منائی تھی
رے بغیر بھی دنیا تھی محو نظارا
رے بغیر بھی ہر سو بہار چھائی تھی

ہ ایک جھونکا ہوا کا تھا اور وہ جھونکا
ر گیا تو فضاؤں میں ارتعاش نہیں
ور دولت احساس کھو چکا پیاری!
تمہاری، تمہیں میری اب تلاش نہیں

نا زندگی کے مصائب تو جھیل سکتا ہوں
ہاری آنکھ میں آنسو مجھے پسند نہیں!
ست ہے، یہ مری بات آزمودہ ہے
ہاں میں کوئی کسی کا کبھی دردمند نہیں

ے بغیر بھی سورج طلوع ہوتا ہے
ے بغیر بھی تارے نکلتے رہتے ہیں
ے بغیر بھی سب کے لبوں پہ نغمے ہیں
ے بغیر بھی دریا مزے سے بہتے ہیں

ے بغیر بھی تم زندگی گزارو گی !
ے بغیر بھی تم مانگ کہکشاں سے بھرو
ے بغیر بھی تم کو سکوں میسر ہے!
ے بغیر بھی تم اہتمام جشن کرو!

مجاہد مرزا
۲۰۔ بلاک ۵۔ گوجرانوالہ (پاکستان)

خراج

گرسنہ رات کے پنجے اگر بیکار ہو جائیں
فصیلِ صبحِ فردا کے مقفل در نہیں کھلتے
دریچے میں ہوا سرگوشیاں کرتی گزرتی ہے
بہارِ راحتِ جاں کے مگر منظر نہیں کھلتے!

اگر خیمہ اکھڑ جائے، طنابِ راہ کٹ جائے
شبِ امید، خوابِ دلنشیں بنتی نہیں دیکھی
فریبِ منظرِ ہستی میں ہم الجھے رہے برسوں
وفا سارے جہاں میں پھول اب جنتی نہیں دیکھی

نظر کی تابشو! زنجیر کیوں ہوتے نہیں جلوے
فضا میں تتلیاں اڑتی ہوئی مظلوم دیکھی ہیں
بدن روبوٹ کی صورت چلا کرتے ہیں سرِ جاں
حسیں لوگوں کی روحیں بھی بڑی محکوم دیکھی ہیں

رگِ حرفِ رواں میں جب لہو رکنے لگے لوگو!
وفا کے راستے میں تیرگی پر کھول دیتی ہے
رُکے دریا تو ہر منظر پہ اک افسردگی چھائے
گرسنہ رات بھی ایسے خراجِ خوں بھی لیتی ہے!

سیہ بر سفید

فاخر جلال پوری
جلال پور، فیض آباد (یو۔پی)

(جنوبی افریقہ کی مبینہ طور پر تین سو چالیس سالہ نسل پرستی کے خاتمہ کے معاہدہ سے متاثر ہو کر)

کتنی صدیوں کا نورِ سحر آج تک
کتنی نسلوں کا خونِ جگر آج تک
بے اثر ہی رہا
بے ثمر ہی رہا
ہاں مگر — کتنی صدیوں کے بعد اب یہ عقدہ کھلا
ظلم کی شاخ کٹتے ہی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سنتے ہی چلتی نہیں
نیلسن[1] کے خلوصِ جنوں کو سلام
اور مولائس[2] کے سوزِ دروں کو سلام
اُف یہ مشقِ ستم
ہر نفس ہر قدم
قریہ قریہ ہو جیسے ہجومِ الم
کیسے وہ لوگ تھے
نسل در نسل یہ جبر سہتے رہے
[وقت آ ہی گیا دستِ منعم بھی مفلوج ہو کے رہا]
اور ایسا لگا سنگ و آہن کے ماحول میں
دستِ داؤد ہو جیسے وقفِ دعا
آؤ اس کا ہم اک اک رُواں چوم لیں
اور مہکتی ہوئی استخواں چوم لیں
میرا ان آہنی بازوؤں کو سلام
ان پسینوں کی ہر خوشبوؤں کو سلام
اور مقدس لہو کے جو قطرات ہیں
ان کی پاکیزہ تر سرخیوں کو سلام
شاید افریشیائی تصور کا اعجاز ہے
نسل اور رنگ کے بطنِ گیتی سے پھر
تازہ اک آفتاب آج پیدا ہوا

۱؎ سیہ فام لیڈر جو اٹھائیس سال جیل میں رہ کر چند سال قبل رہا ہوئے تھے
۲؎ سیہ فام نوجوان شاعر جسے پچھلے برسوں سفید فاموں کے جبر و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے پر پھانسی دیدی گئی تھی

سید احمد سحر

شاہجہاں پور

فریب عقل و وہم آگہی ہے
نہ موت اپنی نہ اپنی زندگی ہے

لگی ہے اب بھی تو ان سے وفا کی
دلِ ناداں یہ کیا دیوانگی ہے

یہ کون آیا مرے ظلمت کدے میں
اماوس میں یہ کیسی چاندنی ہے

بپا ہونے کو ہے پھر کوئی طوفاں
بلا کی خامشی چھائی ہوئی ہے

جو مفہومِ غمِ ہستی سمجھ لے
وہ حقدارِ نشاطِ زندگی ہے

اسی کا کام ہے جینا جہاں میں
جسے احساس کی دولت ملی ہے

سحر اس زیست نے ہم کو دیا کیا
کہ آنکھیں موت کو دکھلا رہی ہے

غزل

اک سوزِ دل و جاں سحر و شام ملا ہے
صد شکر! محبت کا یہ انعام ملا ہے

واماندگیٔ فکر یہ پھر طنز کا موقع
کیا خوب تجھے گردشِ ایام ملا ہے

ہے ورطۂ تحقیق میں ذہن آج بھی غرقاب
انجام نہ ملتا تھا نہ انجام ملا ہے

اب کس میں ہیں ارمان نہ امنگیں نہ امیدیں
ہر قافلۂ شوق سبک گام ملا ہے

جس راہ سے گزرا ہوں سحر شہرِ وفا میں
دامن کشِ دل کوئی بہر گام ملا ہے

غزلیں

سب اہلِ چمن گلستاں دیکھتے ہیں
فریبِ بہارِ خزاں دیکھتے ہیں
کبھی ہم سوئے آسماں دیکھتے ہیں
کبھی صورتِ باغباں دیکھتے ہیں
نظر تو ہے خود آئینہ دارِ جلوہ
ہم اپنی نظر سے کہاں دیکھتے ہیں
جہاں جا کے غم آشنا ہو گئے ہم
ستم ہے تمہیں اب وہاں دیکھتے ہیں
غمِ زندگانی کا خوابِ مسلسل
بہ عنوانِ اشکِ رواں دیکھتے ہیں
میرا کارواں آسمانوں سے گزرا
ستارے رہِ کارواں دیکھتے ہیں
رہِ زندگی میں تمہاری تمنا
جہاں دیکھتے ہیں جواں دیکھتے ہیں
تمہاری نگاہوں کے پردے میں برقیؔ
محبت کے گہرے نشاں دیکھتے ہیں

• از برقی عباسی، چریا کوٹی، گورکھپور

جب فریبِ نظر یاد آئے
زندگی کے قدم ڈگمگائے
بھول کر بھی جو ہم مسکرائے
مدتوں ہم نے آنسو بہائے
غم تھے جتنے بھی اپنے پرائے
دل نے کتنی خوشی سے اٹھائے
ان کا دامن سجایا ہے میں نے
میرے آنسو بہت کام آئے
ان بہاروں سے دھوکا نہ کھانا
یہ ہیں صیاد و گلچیں کے سائے
چھا گیا ہے خرد کا اندھیرا
کوئی شمعِ محبت جلائے
اک خطائے محبت پہ اپنی
دل نے پرویزؔ سب زخم کھائے

• ڈاکٹر تحسین عباسی پرویزؔ
گورکھپور، یوپی

ناہید کیفی
دارالسی کینٹ

میکدے میں دور وہ آ جائے گا
نام ساقی کا اچھالا جائے گا
روشنی اور عہدِ نو کی روشنی
اب اندھیرا اور بڑھتا جائے گا
آنسوؤں میں ہے میرے دل کا لہو
اس سے گلشن کو سجایا جائے گا
سر کہیں پر اور جھکتا ہی نہیں
اُن کا در مجھ سے نہ چھوڑا جائے گا
راستہ میں گلچیں کے ہے تنظیم تو
حالِ گلشن کس سے دیکھا جائے گا
دور اب ناہید وہ آنے کو ہے
کوئی بھی ظالم نہ چھوڑا جائے گا

غزل

[illegible] (دہلی)

اک اک لمحہ ڈھونڈ رہی ہوں
جیون گزرا ڈھونڈ رہی ہوں
منظر منظر اس منظر کو
تنہا تنہا ڈھونڈ رہی ہوں
گلیوں گلیوں یاد تجھی سے
قریہ قریہ ڈھونڈ رہی ہوں
وہ آنکھیں وہ جھیل سی آنکھیں
چہرہ چہرہ ڈھونڈ رہی ہوں
جانے اس بیتے موسم کو
صحرا صحرا ڈھونڈ رہی ہوں

[illegible]

جسے تیری الفت کا سودا نہیں ہے
وہ کہنے کو بندہ ہے بندہ نہیں ہے
اک اک ذرہ مل کر زمیں بن گئی ہے
جو قطرہ نہیں ہے تو دریا نہیں ہے
ہر اک شے سے چھلکے ہے انوار تیرا
حقیقت ہے یہ کوئی دھوکا نہیں ہے
ترے حکم پر چل کے عقبیٰ سنواریں
یہ سودا ہمیں کوئی مہنگا نہیں ہے
نہ دیکھی کوئی چیز بے رونق ایسی
کہ جس میں خدا تیرا جلوہ نہیں ہے

روحی ملک
جہان آباد

جو سچ تھا ۔ ۔ ۔!

وہ اپنے سفر میں تھا۔ ایک ایسے سفر میں جس کا کوئی سرا اسے نہیں مل رہا تھا۔ اسے یاد ہے اس کا سفر اس وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا جب وہ اپنی ماں کی کوکھ میں تھا۔ اس وقت وہ خون و گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں تھا۔ اُسکی ماں اس کے ناجائز باپ کی شہوانی زیادتی کا شکار بنی تھی۔ اپنی کوکھ میں ناجائز بچے کو جائز ٹھہرانے کے لئے اس کی ماں اپنے شوہر کے قریب رہنے لگی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو یہ یقین دلایا تھا کہ اس کی بطن میں پل رہا بچہ اس کا ہے۔ اس بھلے مانس نے یقین کر لیا تھا۔ اور وہ اس سیاہ کوٹھری میں کلبلا کر رہ گیا تھا۔ اس کی ماں اپنے شوہر کو حقیقت بتا کر عذاب کا مرتکب نہیں بننا چاہتی تھی کہ وہ قبل ہی وہ ایک غیر مرد کا عتاب جھیل چکی تھی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس کا مرد اسی سماج کا ایک حصہ ہے جس نے ایسے معاملوں میں ہمیشہ عورت کو ہی مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ سچ بتا کر کم سے کم وہ اپنے ضمیر کو زندہ رکھ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ حقیقت جان کر اس کا شوہر بھی اس کے لئے ظالم سماج بن سکتا تھا۔ وہ عورت تھی، بزدل تھی۔ ظلم سہنے اور برداشت کرنے کی قوت نہیں تھی اس میں۔ جب اس کی ماں کا شوہر، اس کی ماں کے بہت قریب ہوتا، اس کے پیٹ کے ابھار کو تکتا اور کبھی اپنا گرم ہاتھ اس کے پیٹ کے ابھار پر رکھ دیتا تو اس کی ماں پر ایک عجیب سی ہذیانی حالت طاری ہو جاتی مانو ایسا لگتا وہ چیخ پڑے گی ـــــ

مت چھوؤ مجھے، یہ تمہاری اولاد نہیں ہے۔ یہ اسی غیر مرد کا گناہ ہے جو تمہاری عدم موجودگی میں ناجائز طور پر میری کوکھ میں ڈال گیا ہے۔ لیکن پسینے میں نہائی اس کی ماں کے ہونٹ کپکپا کر رہ جاتے۔ مانو کوئی بڑی غیبی طاقت تھی جو اس کی

ماں کے ہونٹوں سے الفاظ چھین لیتے اور وہ
ساکت رہ جاتی۔

جب وہ بڑا ہوا، شعور پکڑنے لگا ——

ایک دن چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔ جانے کتنے
دن یونہی بھٹکتا رہا۔ آخر ایک دن کسی سادھو
کے ہاتھ لگ گیا۔ گمشدہ بچہ سمجھ کر سادھو اس
کا ٹھور ٹھکانا پوچھنے لگا۔ جب پتہ چلا کہ بچہ
گمشدہ نہیں ہے اپنا گھر چھوڑ کر آیا ہے تو وہ اسے
اپنی کٹیا میں لے آیا۔ سادھو بڑا گیانی اور سادہ
لوح انسان تھا۔ وہ کئی برس تک اس کے ساتھ رہا۔
اس کی صحبت میں اس نے بڑی بڑی گیان کی باتیں
سیکھی۔ سادھو کی شخصیت سے وہ اس حد تک
متاثر ہوا کہ اس کی خدمت گذاری کو اپنی زندگی کا
نصب العین بنالیا۔

لیکن ایک دن ——

مسلح پولیس نے کٹیا کو چاروں طرف سے
گھیر لیا تھا۔ دو جوان اندر گھسے، زبردستی سادھو
کو پکڑ کر باہر کھینچ لائے۔ یہ سب اس کی آنکھوں
کے سامنے وارد ہو رہا تھا، اس کے جسم کا سارا خون
سمٹ کر چہرے پر اتر آیا۔ وہ احتجاجاً جوانوں پر
جھپٹ پڑا۔ لیکن ایک جوان نے اپنے بوٹ کے وار
سے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ وہ دور لڑھک گیا۔
پولیس سادھو کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال رہی تھی۔ اس
پھر دیکھا سادھو کے چہرے کا نور یکلخت غائب ہو
چکا تھا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ سادھو جیل سے
فرار ایک مجرم ہے۔ اس پر قتل کا کیس ہے، وہ
ایک خونی ہے ——

اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے، وہ درد
سے بلبلا اٹھا۔ پھر سادھو سے اس کا رشتہ اس
طرح منقطع ہو گیا، جس طرح رحم مادر سے تولد
نوزائیدہ بچے کا ماں کی ناف کے ساتھ رشتہ ختم
ہو جاتا ہے۔ یہ تمام رشتوں کی طرح عقیدت کا رشتہ
بھی لفظوں میں سمٹ کر رہ گیا۔ اب کوئی رشتہ
نہیں بچا تھا۔ نفرت کا رشتہ بھی نہیں۔ کیوں کہ وہ
سادھو سے نفرت نہیں کر سکا تھا۔

لیکن ——

کچھ تھا، ایسا کچھ ضرور تھا۔ جو اس کے اندر
گھس کر بیٹھ گیا تھا۔

اس نے دنیا داری سنبھال لی تھی۔ ڈھیروں
دولت کمائی۔ گھر بسایا، بیوی اور بچوں کے درمیان
زندگی کا بیشتر حصہ گذار دیا۔ ایک دن جب اس نے
محسوس کیا، کہ بیوی کو کلبوں سے فرصت نہیں رہتی ہے۔
بچے دوست یاروں میں گھرے رہتے ہیں تب اسے لگا،
بیوی اور بچوں سے اس کے تعلقات محض رسمی سے
ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی دن اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔
وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان تعلقات کو نبھانا جس کی
نوعیت رسمی ہو کر رہ گئی تھی۔ انہیں کے ساتھ رشتہ
جیا جاتا ہے۔ نبھانے کی بات سوچنا بھی اس کے
لئے مشکل تھا۔ کیوں کہ نبھاہ اس کی نظر میں ایک
قسم کا دھوکہ تھا اور دھوکہ کیا ہے؟ جھوٹ،
فریب ——!

ایک بار پھر وہ جھوٹ کے دائرے میں تھا،
اور —— وہ سچ کی تلاش میں نکل پڑا —— اور
تب سے وہ مسلسل سفر میں ہے۔ اب تو اسی کے جسم

...ایک عضو تھکا تھکا سا لگتا ہے۔ ہو سکتا
...ں لمبی مسافت نے اسے تھکا دیا ہو۔ اور
...ستقل آرام کرنا چاہتا ہو۔
لیکن نہیں ـــــ
وہ تھکا نہیں ہے۔ کیونکہ اپنی زندگی سے
...س نہیں ہے۔ اس میں جینے کی خواہش ہے
...جو اپنی زندگی سے مایوس نہ ہو، جینے کی
...ہش رکھتا ہو۔ وہ سفر میں رہ سکتا ہے۔
...سفر میں ہے اور شاید مزید رہنا چاہتا ہے
...نکہ اسے معلوم ہے، وہ زیادہ دنوں تک
...میں نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اپنی رفتار تیز کرلی
... وہ دوڑ رہا ہے، تیز بہت تیز یا شاید بھاگ
رہا ہے ـــــ

وہ اپنے سفر میں ہی تھا، اس لڑکے کو دیکھ
...وہ رک گیا۔ جو چار پہیوں والے ٹھیلے کے قریب
...باہر سے چنے بیچ رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی دس
برس رہی ہوگی۔ ایک دو روپے کا سکہ اس
...لڑکے کی طرف بڑھایا ترازو میں ایک پتھر کا باٹ
...کر وہ چنے تولنے لگا۔ اس نے وہ پتھر اٹھا
...شاید یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اس باٹ میں
...ہے یا نہیں۔ لڑکا تھوڑا خوف زدہ ہوا۔ پھر
...لگا۔ باٹ کھو گیا ہے۔ سو گرام پتھر کا باٹ ہے۔
...ب۔ وہ خاموش رہا اس نے پتھر کا باٹ ترازو
...رکھ دیا۔ گویا اس کی صفائی سے اسے کوئی سروکار
...نہیں ہے۔ وہ چنے لے کر لڑکے کو گھورنے لگا۔ اس
...غیبہ پر چنے مٹھی میں سکڑنے لگیں۔

اس بے کاری، بدحالی اور آسمان چھوتی مہنگائی
کے دور میں اگر یہ لڑکا دو چار گرام بچا لیتا ہے تو
برا کیا کر رہا ہے؟ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ وہ آگے
بڑھ گیا۔ وہ ایک دم سے تھک جائے اس سے قبل
اسے اپنی تلاش پوری کرنی تھی۔ اس لئے وہ پھر اپنی
رفتار میں آگیا۔ وہ چلتا رہا، کبھی شہری علاقہ عبور
کیا۔ کبھی دیہات کا رخ اختیار کیا۔ کبھی پہاڑی
علاقوں اور جنگلوں سے بھی گذرا۔ وہ کئی روز تک
مسلسل چلتا رہا۔ اس کا رُخ پھر آبادی کی طرف
تھا۔ اس نے دیکھا کھلی جگہ تھی۔ جہاں ہزاروں کا
مجمع لگا ہوا تھا۔ وہ بھی بھیڑ میں شامل ہو کر بھیڑ
کا ہی حصہ نظر آنے لگا۔ لیکن جلد ہی وہ بھیڑ کو چیرتا
ہوا باہر نکل آیا۔ مانو کچھ دیر بھی وہ ٹھہر گیا تو اس
بھیڑ کا ہی حصہ بن کر رہ جائے گا۔ اور وہ نہیں
چاہتا تھا کہ وہ اس بھیڑ کا حصہ بنے جو جھوٹے
وعدے جھوٹی باتیں سننے کو جمع ہو جایا کرتی ہیں۔ کیا
اس بھیڑ میں ایسا کوئی نہیں ہے جو سمجھتا ہو کہ تقریر
کرنے والا اس کا خیر خواہ نہیں ہے وہ محض اپنا الّو
سیدھا کر رہا ہے۔ اگر سمجھتا ہے تو کیوں اس
بھیڑ کا حصہ بنا ہوا ہے۔ جہاں جھوٹ ہے، فریب ہے۔
اس بھیڑ سے نکلتا کیوں نہیں ـــ؟ یہاں تو
سچ ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ پھر سفر میں آگیا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا
تھا۔ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ معاملہ کیا ہے کچھ
سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لوگ بس بھاگ رہے تھے
ایک ایک کر تمام دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ
والوں کی حالت اور زیادہ خراب تھی۔ وہ تماشا
بین بنا سب کے حرکات نوٹ کر رہا تھا۔ ایک ٹھیلے

والے نے پیچھے سے آکر اسے ٹکر ماردی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ٹھیلے والا جوان تھا۔ اس کے قریب سے ٹھیلہ نکالتے ہوئے اسے گھور کر بولا۔

"بڑے میاں یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ شہر میں فساد ہو گیا ہے۔ کیوں فسادیوں کا نشانہ بننے کو کھڑے ہو۔" وہ تیزی سے آگے نکل گیا تھا۔

لیکن وہ ابھی بھی بجلی کے کھمبے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ مانو زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ قریب ہی سے جیسے شری رام اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا ظاہر ہے وہ صرف سوچ ہی رکھتا تھا۔ کیوں کہ عمر کے اس حصّے میں پہنچ چکا تھا، جہاں انسان صرف سوچ سکتا ہے اور وہ سوچ رہا تھا۔ یہ مذہبی جنون انسان کو کہاں لئے جا رہا ہے۔ کس مذہب نے دوسرے مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی تعلیم دی ہے۔ مذہب کی کس کتاب میں یہ لکھا ہے کہ نفرت و بغض پھیلاؤ، مذہب کے نام پر بے گناہ معصوم انسانوں کا خون بہاؤ۔ انسانی قدریں اتنی سمٹ کر کیوں رہ گئیں ہیں — دنیا میں مختلف مذاہب سے وابستگی رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن انسان پہلے ایک سماجی مخلوق ہے۔ اس کی زندگی خواہی نخواہی بالواسطہ یا بلاواسطہ دوسرے بے شمار لوگوں سے واسطہ ہیں سب ایک ہی زمین سے حاصل ہونے والی غذا کھاتے ہیں۔ ایک ہی چشمے کا پانی پیتے ہیں اور ایک ہی ماحول کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور جب جینے کے لئے تمام ضرورتیں ایک سی ہوں تو کیا دو مذاہب

کے ماننے والے مختلف فرقوں اور مسلکو
نہیں ہیں تو کیا کبھی ان کی نسل کمشی
شری رام اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر کو
بلند ہوں گی — ؟ کیوں۔ سب نعرے
ہو رہے ہیں ؟ اور کب تک ہوتے رہیں گے
ان کے اعمال صحیح ہیں ؟ کیا یہ راہ راس
نہیں ہیں۔ آہ ! انسان ترقی کی یہ کون
طے کر رہا ہے ؟

وہ آگے بڑھ گیا۔ نعروں کی آوا
گئی۔ وہ ایک بار پھر کسی غیر آباد علاقے
لیکن شاید آبادیاں تو تھیں، لیکن اتنے
پر لوگ بسے تھے کہ دیکھنے میں وہ علاقہ
ہی لگ رہا تھا۔ غروب آفتاب کی سرخی
طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جھونپڑی کے
پر مٹی کا چبوترا بنا ہوا تھا وہ بیٹھ گیا۔ پا
گندے پانی کا نالا بہہ رہا تھا۔ جہاں چند
سڑپ سڑپ کی آواز کے ساتھ پانی پی رہی
چند ایک اسی گندے پانی میں اپنے پنکھوا
کر بھگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جھونپڑ
کچھ بچے کھیل رہے تھے اسے دیکھ کر بچوں
بند کر دیا۔ بچے شاید ڈر گئے تھے۔ وہ اٹ
کے قریب گیا اور بولا — میرے ساتھ کھ
بچے نفی میں سر ہلا کر بھاگ کھڑے ہوئے
کی بوڑھی آنکھیں بھاگتے بچوں کو دیکھتی رہ گ
نے محسوس کیا، وہ بہت تھک چکا ہے ا
مٹانے کے لئے جا کر اسی چبوترے پر لیٹ گ
ہی دیر میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس

...آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، چند لوگ اسے شکوک ...نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم ۔ اس علاقے کے نہیں لگتے۔"

...لوگ کھڑے تھے انہیں میں سے ایک نے سوال کیا

"مسافر ہوں تھک گیا ہوں"

"کہاں سے آرہے ہو؟"

"یاد نہیں رہا کہاں سے چلا ہوں"

"جاؤ گے کہاں؟"

"جہاں میری تلاش مجھے لے جائے۔"

"دیکھو بڑے میاں اپنے بارے میں صاف ...صاف بتا دو کون ہو، کہاں سے آئے ہو، ورنہ تم اس ...ہمارے علاقے میں نہیں رہ سکتے، اکثر باہر کے ...ہمارے علاقے میں گڑبڑی پھیلاتے رہتے ہیں ہم اجنبی پر بھروسہ نہیں کرتے۔" آنے والوں میں سے ایک ...سے کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا غیر ملکی ایجنٹ لگ رہا ہے۔ کسی نے دہشت پسند ہونے ...کا شبہ ظاہر کیا۔ کسی کی نظر میں وہ بڑا خطرناک ...آدمی لگ رہا تھا اور ایک نے تو اس کے بوڑھے ہونے ...پر بھی شک کا اظہار کیا۔ اس کی نظر میں وہ جوان ...تھا بوڑھے کے بھیس میں۔

اس درمیان داروغہ تک اس علاقے میں کسی اجنبی ...کے ہونے کی بات پہنچ گئی تھی۔ اور داروغہ کو اسے ...دیکھ کر شک ہی نہیں یقین ہو گیا کہ یہ آدمی ضرور اس ...علاقے میں گڑبڑی پھیلانے آیا ہے اور وہ اس ...خطرناک آدمی کو آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے ...سوالات میں بند کر دیا۔ سلاخوں کے پیچھے گھٹنوں ...اپنا چہرہ چھپائے وہ یہ سوچ رہا تھا جو ہو رہا ہے وہ سچ ہے، کیا میں یقین کر لوں کہ یہی سچ ہے؟

نہیں یہ سچ نہیں ہے۔ میری تلاش ابھی ادھوری ہے، اپنا سفر مجھے جاری رکھنا چاہئے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔

اور جب رات کا بیشتر حصہ گذر چکا تھا وہ اچانک اس سفر پر نکل گیا جہاں اسے آخری پڑاؤ ڈالنا تھا ۔۔۔ اور جو سچ تھا۔ ایک مکمل سچ!

ختم

اعلان ملکیت و دیگر تفصیلات

بابت ماہنامہ سہیل گیا

فارم ۴ قاعدہ ۸ کے تحت

مقام اشاعت :۔ ماہنامہ سہیل، ریلور سائڈ روڈ گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱

وقفہ اشاعت :۔ ماہنامہ

پرنٹر پبلشر کا نام و پتہ :۔ این منظر، ماہنامہ سہیل ریلور سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

کیا ہندوستان کے شہری ہیں :۔ ہاں

ایڈیٹر کا نام و پتہ :۔ مسعود منظر۔ ماہنامہ سہیل ریلور سائڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

کیا ہندوستان کے شہری ہیں :۔ جی ہاں

ان افراد کے نام و پتے جن کا رسالہ کی ملکیت میں ایک فی صدی سے زائد حصہ ہے۔

میں این منظر تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔

این منظر
دستخط پبلشر

محمد پرویز اقبال لکھمنیاوی
شاہ روڈ، دلاور پور، مونگیر

محو حیرت

▲ حسین صاحب اپنے وقت کے ایک مشہور ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسکول میں ان کے اصول و ضوابط کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنی ملازمت کی معیاد پوری کرنے کے بعد جب وہ سبکدوش ہو گئے تو انہوں نے اپنی دل بستگی کے لئے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی پھولوں کی کیاریاں بنواتے، کبھی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت کرواتے، کبھی پوتے کے اسکول جا کر کلاس ٹیچر سے اس کی پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتے، تو کبھی گھر کے لوگوں کو کہیں کی سیر کرا لاتے۔ غرض یہ کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے اور اس طرح دن گذر جاتا۔ اور پھر جب شام آتی تو کرنل مسعود کی بیٹھک میں براجمان ہو جاتے جن کا دروازہ ان کے مکان کے سامنے ہی کھلتا تھا۔ حسن اتفاق سے وہ بھی اپنی ملازمت [illegible] سے سبکدوش ہو چکے تھے

کرنل اپنی باتوں میں بیشتر اوقات
زندگی کو دہراتے اور خود کو ایک بڑا سو
جواب میں حسین صاحب بھی اپنی ہیڈ م
قصے سناتے جس میں اساتذہ اور طلبہ
اور دبدبہ کی شان و شوکت کو بیان
قسم کی بدعنوانیوں کے خلاف خود کو ایک
ہیڈ ماسٹر بتاتے اور اس طرح خود کو اپنے
آئیڈیل ہیڈ ماسٹر ثابت کرنے کی کوشش
یہ بھی کہتے کہ میں با اصول اور ایمان
وجہ ہے کہ وہ اسکول آج بھی ایک
اور میری غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر ہی
کے ہاتھوں اعزازی تمغہ عطا کیا گیا
کے علاوہ دونوں کچھ ادھر ادھر کی با
جس سے ان لوگوں کا وقت بڑے مزے
اور یہی وجہ تھی کہ رفتہ رفتہ دونوں ایک
ضرورت بن گئے۔

حسب معمول اک شام کرنل مسعود حسین صاحب کے منتظر تھے۔ جب وقت مقررہ سے کافی دیر ہوگئی اور وہ نہیں آئے تو کرنل صاحب بہت پریشان ہوئے کہ آخر بات کیا ہے؟ آج حسین صاحب آئے کیوں نہیں، پھر یہ سوچ کر اطمینان کر لیا کہ کسی کام میں مشغول ہو گئے ہوں گے۔ لیکن جب حسین صاحب کئی دنوں تک نہیں آئے تو کرنل صاحب کی پریشانی بڑھی اور سوچا کہ آج خود چل کر دریافت کر لیا جائے۔ چنانچہ تیار ہو کر نکلنے ہی کو تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور جب دروازہ کھولا تو سامنے حسین صاحب کا ملازم کھڑا تھا۔ اس نے سلام کیا اور بولا۔ "آج ہم لوگ سلیم پور جا رہے ہیں اس لئے بابو نے گھر کی چابی آپ کو دینے کو کہا ہے۔ اور تاکید کی ہے کہ ذرا گھر پر نظر رکھیں گے۔"

کرنل صاحب نے چابی لے لی اور کہا۔

"حسین صاحب سے کہو ذرا مجھ سے مل کر جائیں۔"

"جی بابو تو سبھوں کے ساتھ آگے جا چکے ہیں۔ ہم اور بی بی جی اب جا رہے ہیں۔" اتنا کہہ کر حسین صاحب کا ملازم چلا گیا۔ کرنل صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے۔ خود نہیں آئے اور چابی ملازم کے ذریعہ بھیجی۔ پھر انہوں نے ان خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ تقریباً بارہ تیرہ دنوں بعد حسین صاحب کا ملازم دوپہر کے وقت چابی واپس لینے آیا تو کرنل صاحب نے پوچھا

"آ گئے تم لوگ؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں" اور چابی لے کر چلا گیا۔ شام کو کرنل صاحب، ہیڈ ماسٹر صاحب کا تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد خود ان کے یہاں پہونچ گئے۔ دروازے پر دستک دی تو ان کا ملازم آیا۔ کرنل صاحب کو دیکھ کر سلام کیا اور اندر جا کر ان کی آمد کے بارے میں خبر پہنچائی اور واپس آ کر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ بابو آپ بیٹھئے میں چائے لے کر آتا ہوں۔

"ارے نہیں نہیں چائے نہیں حسین صاحب کو بھیجو"

اتنے میں حسین صاحب کا پوتا آ گیا اور سلام کر کے وہ بھی کہنے لگا۔

"بیٹھئے دادا جان"

کرنل صاحب بیٹھ گئے۔ چند لمحے بعد ہی چائے آ گئی۔ کرنل صاحب چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ "ذرا دادا جان کو جلدی بلاؤ۔" تو حسین صاحب کا پوتا بولا

"جی وہ تو زمان پور چلے گئے ہیں۔"

"زمان پور چلے گئے ہیں۔ کیا تم لوگوں کے ساتھ نہیں آئے۔"

"جی نہیں۔"

"کیوں بیٹے سب خیریت تو ہے۔"

"جی ہاں سب خیریت ہی ہے۔"

اور اس کے آگے کہ وہ وہاں کیوں گئے ہیں۔ وغیرہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا بلکہ چند رسمی باتیں کر کے وہ وہاں سے واپسی کی سوچنے لگے۔ لہذا انہوں نے حسین صاحب کے پوتے سے پوچھا۔

"اچھا بیٹے تم لوگوں کا سفر کیسا رہا؟"

جی بہت مزے کا داداجان "

" واہ کیا خوب طبیعت لگنے والی ہے سلیم پور "

" جی ہاں خوب طبیعت لگتی تھی وہاں ۔"

" کیا کسی رشتہ دار کے یہاں گئے تھے ؟ "

" جی نہیں ۔"

" تو پھر ۔"

" وہاں تو کرائے پر دو کمرہ لیا گیا تھا تیرہ دنوں کے لئے ؟"

کرنل صاحب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے " کرائے کا دو کمرہ مگر کس لئے ؟"

" وہ اس لئے کہ آخر اتنے لوگ رہتے کہاں ؟"

" لیکن اتنے لوگوں کو ایک ساتھ وہاں کیوں جانا پڑا ۔"

[illegible] داداجان گھر کے سبھی لوگ وہاں نہ جاتے تو کھانا وغیرہ کون پکاتا "

مگر بیٹے ۔

" تیا داداجان ۔ ہمارے دو ماموں اور میرے داداجان کے چار شاگرد بھی تو تھے ساتھ میں ۔"

" داداجان کے چار شاگرد اور تمہارے دو ماموں ۔ بیٹے یہ لوگ وہاں کیا کرنے گئے تھے ؟"

آپ [illegible] آپ کو نہیں معلوم کہ میرے دونوں ماموں بھاگ دوڑ اور اچھل کود میں کتنے ماہر ہیں ۔"

" اور تمہارے داداجان کے چاروں شاگرد کیا ڈرپوک تھے " کرنل صاحب بولے ۔

" جی نہیں ۔ وہ لوگ تو اپنے وقت کے بہترین طالب علم رہ چکے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کوئی کئی [illegible] میں مہارت حاصل ہے ۔

کرنل صاحب نے کہا " بہت اچھے " پھر وہ لڑکا " لیکن داداجان کو کافی پریشانی اٹھانی اور پیسہ بھی ان کا بہت خرچ ہو گیا ۔ وہاں رہنے میں جو خرچ ہوا سو ہوا لیکن میرے ایک ماموں پولس نے پکڑ لیا تو ان کو چھڑانے میں خاصی خرچ ہو گئی ۔"

" انہوں نے کوئی بدمعاشی کی ہوگی ورنہ شریف آدمی کو تو پولس نہیں پکڑتی ۔"

" افوہ ۔ آپ کو نہیں معلوم کہ پولس صرف پیسوں کے لئے ایسا کرتی ہے اور جب پیسہ مل جاتا ہے تو پھر وہی کام کرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے ۔"

کرنل صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لہٰذا انہوں نے پوچھا کہ ۔ " اچھا تمہارے دادا کب تک واپس آ رہے ہیں ؟"

" جی اصل میں وہ جس کام سے گئے ہیں اسے پورا کر کے ہی واپس آئیں گے ۔"

" ورنہ کیا وہ وہیں رہ جائیں گے ؟"

" نہیں نہیں میرا مطلب ہے کام کر کے ہی لوٹنے کا ارادہ ہے ان کا ۔ سبھی لوگوں کا ایڈریس لے کر گئے ہیں سبھوں سے مل کر ہی آئیں گے ۔"

" اچھا تو گویا آپ لوگ سیر کرنے وہاں گئے جس میں آپ کے داداجان کو بے حد صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور خرچ بھی کافی ہوا ۔"

" نہیں ۔ سیر کو تھوڑے ہی گئے تھے ۔"

" تو پھر کس لئے گئے تھے ۔ ؟"

" یا اللہ ۔ آپ ابھی تک سمجھے نہیں دادا ۔"

" بھئی سمجھوں گا کیسے بتاؤ گے جب نا ۔"

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے!)

نام کتاب :- خوابوں کے ہم سائے
نوعیت :- شعری مجموعہ
فن کار :- شاہد جمیل
ضخامت :- ۱۲۰ صفحات ، قیمت ۵ روپے
پتہ :- مکتبہ خوشبو ، نیو کریم گنج ، گیا - ۸۲۳۰۰۱

شاہد جمیل کا مجموعہ خوابوں کے ہم سائے میرے سامنے ہے۔ انہیں متعدد رسائل میں اکثر پڑھنے کا موقع ملا ہے اور اب اس شعری مجموعے کے ذریعہ انہیں تفصیل سے پڑھنے اور ان کے بارے میں کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ ادھر سال بعد سال سے شاہد جمیل [illegible] ایک گرید سی تھی۔ ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک روپ تو یہ سامنے تھا کہ وہ ایک متوازن تسلسل کے ساتھ لکھ رہے [illegible]

صفحات پر پھیلا ہے۔ اور اس میں مختلف نوعیت کی مختصر نظمیں موجود ہیں، نظمیں اور غزلیں ہیں، متفرقات کے لئے ایک حصہ مخصوص ہے۔ اپنے جیون کے حادثات و ارتعاشات سے متاثر ہو کر کبھی نظمیں [illegible] اور غزلیں ہیں۔ کسی فنکار کو سمجھنے کے لئے اتنا [illegible] ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری اپنے بعض معاصرین سے امتیاز کی حامل ہے۔ یاد اور خواب [illegible] استعارے میں جن کی تخلیقی [illegible] یادوں اور خوابوں کے [illegible] شاہد جمیل [illegible] کے تجربات کو سمیٹنے کی کوشش کی [illegible] کی شاعری میں ایک [illegible] ایک ایسی [illegible] [illegible]

[illegible]

ہے۔ اپنے عہد اور اپنے عصر کے کرب و وحشت کو تو ہر حساس فنکار کے یہاں کسی نہ کسی طرح جھلک جاتا ہے۔ لیکن جو بات شاہد جمیل کے اختصاص کی لکیر بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ذات کو انجمن بناتے ہیں، ان کا سفر ناصر کاظمی کی طرح باطن کا سفر ہے۔ ظاہر ہے ... یہ ادنیٰ مماثلت کی بنیاد پر کبھی جاری ہی ... میر اور ناصر کاظمی کی طرح دیر تک اور دور تک ... کے درجے کی اداؤں کا ہمیں شاہد جمیل ... میں انتظار کرنا ہوگا۔ جانے مستقبل انہیں ... لے جائے۔

شاہد جمیل کی نمائندہ نظموں میں اے میری ... یاد نیلے سمندر، دھواں دھواں سی کائنات ... اور درد وغیرہ کے نام خاص طور پر لئے ... ہیں۔

تنہائی کی ایک اور پیچیدہ نفسیات شاہد ... کے اسلوب سے آشکار ہے۔ اور وہ یہ ... کے ہونے کا ایک واہمہ انہیں اکثر ... گھیرے رہتا ہے۔ خود کلامی میں بھی کہیں ... الشان اپنے مقابل میں کسی دوسری ... کا سہارا لے لیتا ہے۔ شاہد جمیل کے ... اور حقیقی کردار یا تخاطب کا انداز ... کی شدت بڑھاتا ... ہے۔ شاہد جمیل کی نظمیات اور ... شاعری بناتے ... ایک ... توازن ہے

[illegible]

سا ہم بچھ گیا تو ان کی شاعری جدید تر شاعری کے لئے مقبولیت تو حاصل کرلے مگر ہم جیسے لوگوں سے دور ہو جائے۔ ان کے نظموں میں جو ذہنی تجربات نظر آتے ہیں وہ بھی ایک ایسے مخصوص خاکے بناتے ہیں جہاں ان تجربات کو ہر دلعزیزی حاصل ہونے لگتی ہے۔ یہ بات یوں تو اچھی لگتی ہے کہ اس طرح ان کی شاعری بہت سے دلوں کی دھڑکن بن سکتی ہے مگر انہیں اپنے آپ میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے سے محروم بھی کر سکتی ہے۔ ان کی نظمیں ان کی غزلوں سے زیادہ خوش گوار اور دل نشیں ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہد جمیل کی شاعری ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں امکانات اور خدشات دونوں موجود ہیں لیکن یہ بات مسلم ہے کہ اپنے اس پہلے مجموعے سے ہی شاہد جمیل ہمیں چونکاتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ میری سخن جو کوشش حقیقت نیو لیشن ہے۔ نئی آوازوں کے اس ہجوم میں ان کی آواز صاف سنی جاتی ہے یہ معمولی بات نہیں۔

● ڈاکٹر علیم اللہ حالی، گیا

نام کتاب :- شعلۂ سخن
مصنف :- محبوب علی خاں اخگر قادری
قیمت :- ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ :- حالی بک ڈپو، محبوب گنج، حیدرآباد

شعلۂ سخن اپنے ... تک چونکاتا ہے ...

کے ساتھ ساتھ حضور کی تصویر جلیس و عشق کے لازم و ملزوم ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ آخری صفحہ پر جناب سید اصغر علی اختر کے کلمات غیر نیک توقعات پر مبنی ہیں۔ مصنف نے حسب روایت قدیم کتاب میں ابتداً اپنی تصویر (شاملکل کی تصویر کے علاوہ) کے ساتھ ساتھ اپنے پیش لفظ نویس جناب سید نظیر علی عدیل کی تصویر بھی شائع کی۔ ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ کی "شغلہ سخن" کے بارے میں رائے شامل ہے۔ پھر کچھ اپنے بارے میں بھی لکھا جو شاعر کے مزاج سے واقفیت حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ SOURCE ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے اخگر صاحب کے قریبی دوست عدیل صاحب نے بیسویں صدی کے شعری رجحانات کے حوالے سے اخگر صاحب کی شعری شناخت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول عدیل صاحب :-

" بیسویں صدی کے کسی شاعر کے کمرے میں انیسویں صدی کے کیلنڈر کی تلاش بھولے پن ہی کی دلیل ہو سکتی ہے۔۔۔۔ شاعری صرف بیان واقعہ کا نام نہیں کیوں کہ یہ کام اخباروں سے بھی ہو سکتا ہے۔"

جناب اخگر حضرت غلام علی حاذق جیسے استاد سخن کے شاگرد ہیں جو اپنے دور کے ممتاز و مقبول اور منفرد لہجے کے استاد صفی اورنگ آبادی سے وابستہ تھے اس طرح یہ وابستگی سخن در سخن جناب [illegible] میں آئی یہی سبب ہے کہ [illegible]

ساتھ ساتھ دلکشی بے ساختگی و بے تکلفی جو صفی کی خصوصیات ہیں۔ اخگر صاحب کے سخن میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بقول جناب اخگر :-

" شاعری میں غزل میری پسندیدہ صنف ہے تا بہ حد بساط اس صنف سخن کو اختیار کیا اور مشق سخن بہم پہنچائی۔ میری شاعری جدید پسندانہ نہیں ہے۔ نئے رجحانات اور نئے نظریات کا نہ میں نے تجربہ کیا نہ یہ چاہا [illegible] شاعری دبستان صفی کی رہین منت ہے عشق و محبت اور تجربات زندگی کا - زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ اظہار - سادہ خیال اور بول چال - محاورے ضرب الامثال اور تلمیحات کا برموقع استعمال - میری [illegible] انہیں لوازمات کے تانے بانے سے مرکب [illegible] ان کے علاوہ کچھ اور تلاش کرنا (بقول عدیل صاحب) اپنے بھولے پن کا ثبوت دینا ہے۔

اخگر صاحب نے اپنے بارے میں [illegible] لکھا کہ انہوں نے اپنے کلام کے ساتھ [illegible] برتی بلکہ جو کچھ لکھا اسے سنبھال کر رکھا - [illegible] کم شاعروں کے حصے میں آتی ہے۔ بیشتر شعرا [illegible] پن کی وجہ سے اپنی تخلیقات سے [illegible] خود صفی اورنگ آبادی کے بارے میں کہا گیا [illegible] بیشتر کلام مشاعروں اور [illegible] کی نذر ہو گیا [illegible] صفی کو کہنا پڑا -

یہ پراگندہ ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے [illegible]

میں [illegible]

یہ قربت دراصل قربت حق نہیں بلکہ [illegible]
[illegible] تو یہ تکان و بہ تماشا [illegible]
[illegible] میں [illegible] گئے تھے۔ خوشی کی بات ہے اخگر
صاحب نے اپنے شعر میں اپنی ذمہ داری محسوس کی اور
[illegible] کے لئے سرگرانی و سرگردانی کا موقع
[illegible] ہوا۔

اس مجموعہ میں جہاں اللہ تعالیٰ کی کبریائی، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و شفاعت کا ذکر ہے
وہیں حضرت عبدالقادر جیلانی رح کو مشکل کشائی
اور حضرت خواجہ کو غریب نوازی کی دہائی بھی دی
[illegible] یہ شاعر کے اپنے اعتقادات کا معاملہ ہے اور
[illegible] ادب ہے۔ بقول خود اخگر ؎

پکاریں اس کو جو مشکل کشا ہے مشکل میں
مگر تمیز ہی مشکل کشا کی مشکل ہے

اخگر صاحب کی غزل بہت سادہ و پرکار اور عوام الناس
[illegible] سے بہت قریب ہے۔ ان کی غزل میں نہ سرمایہ و
محنت کی کشمکش ہے۔ نہ جدیدیت کی علامات و استعارات
اخگر صاحب نے نہایت ہی سیدھے سادے لہجے میں
سیدھی سیدھی سمجھ میں آنے والی باتیں کی ہیں۔ ان کے
[illegible] سمجھنے کے لئے ذہن پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں
[illegible] صاف ہونا چاہئے۔

کہا تو یہ کہا گردن جھکا کر
مجھے اپنے [illegible] کر تکا کر

[illegible] کے جاتے ہی میں نے مٹا دیا
وہ جو نشان [illegible] گئے تھے مکان پہ
[illegible]
[illegible]

[illegible] تجھے
اٹھا کے تو ذرا سر آستاں سے

[illegible] سادگی کی مثال میں یہ شعر پیش کئے جا سکتے
ہیں۔

[illegible] آئینہ سے اپنا بولتی آنکھوں سے [illegible]
شہر بھر میں کیوں مرے غم کا پکارا ہوگیا

"پکارا" ٹھیٹ دکنی محاورہ ہے۔

وضع کے پابند لوگوں کو نہ چھیڑ
ہاں چلنے میں کبھی بل جاتا ہے

اخگر صاحب زبان و بیان کی سادگی کے باوجود کبھی
کبھی اپنے قافیوں کے نرالے پن سے بھی چونکا دیتے ہیں ؎

میٹ کر دوں گے آپ کے وہ [illegible] نہیں
اور ہر جا [illegible] والا میرا ماتھا بھی نہیں

سکونت ہے ہی کتنے دن یہاں کی
ہمیں ہو فکر کیوں دنیا جہاں کی
کروڑوں سال کی دنیا ہے اخگر
مگر اب تک ہے وہ بانکی کی بانکی

"شعلہ سخن" ایک ٹھنڈی آنچ ہے جو برف باری
کے موسم میں مزہ دیتی ہے۔

● —— رؤف خیر، حیدرآباد

نام کتاب:- صدق جائسی
مؤلف:- (نواب) محمد نورالدین خاں
سنہ اشاعت:- جنوری ۱۹۹۳ء قیمت:- پچاس روپے
ملنے کا پتہ:- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد - ۲ [illegible]
خاک حیدرآباد نے [illegible]
[illegible] استقبال کیا [illegible]

رہا ہے۔ عنہیں ہمیشہ شمال کی بالادستی قبول کرتا رہا ہے۔ یہی مرعوب ذہنیت نے شمالیوں کے لئے راہ ہموار کی۔ نظام دکن نے ہر چند کہ ملکی و غیر ملکی کی افتاد کھڑی کی تھی مگر وہ برائے نام تھی کہ فرمان خاص سے مستثنا بھی کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ملکیوں پر غیر ملکیوں کا تسلط برقرار رہا۔ فانی بدایونی نے جب دور دراز علاقے کی منصفی پر شہر کی صدر مدرسی کو فوقیت دی تو نظام دکن نے فرمایا تھا کہ چھوٹی چھوٹی اسامیوں پر کم از کم ملکیوں کا تقرر کیا جانا چاہئے۔ مگر آخر کار فانی کا غیر ملکی ہونا ان کی ملازمت کی راہ میں کوئی رکاوٹ کا سبب نہ بن سکا۔ انہیں بھی فرمان خاص سے اجازت مرحمت ہو ہی گئی۔ ایک فانی ہی پہ کیا موقوف سبھی نظام کے دربار سے فیض اٹھاتے رہے ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ دکن میں صلاحیتوں (Talents) کا فقدان تھا۔ دراصل انہیں اپنے آپ کو منوانے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ چنانچہ شمالیوں کی بن آئی تھی۔ جس علاقے کا بادشاہ خود مرعوب ذہنیت کا مالک ہو وہاں استحصال تو ہوگا ہی۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا بلکہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی کہیں نہ کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سے بھی انکار بہرحال نہیں کیا جا سکتا کہ دکن نے ان شمالیوں کے کمال سے پورا پورا استفادہ بھی کیا اور منہ مانگی قیمت بھی چکائی۔ خاکِ دکن کی فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ اس نے شمالیوں کے طعنے سنے پھر بھی انہیں دلیس نکالا نہ دیا بلکہ کئی مشاہیر کو اپنی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جذب کر لیا۔ [illegible] آئے۔ امیر مینائی، جلیل وغیرہ یہیں آ [illegible]

صدق جائسی بھی ایک ایسا ہی شاعر تھا جو جائس سے دکن آیا۔ یہاں امراء کی نگاہ لطف سے فیض اٹھاتا رہا۔ اور جہاں اس لطف میں کوئی کمی آئی وہیں ان کی ہجو ملیح بھی لکھتا رہا۔ جیسے مہاراجہ کشن پرشاد اور نواب مہدی یار جنگ اور سر اکبر حیدری کی ہجو۔ حیدرآباد کو "شہر ناپرساں" بھی کہتا رہا اور اس شہر سے جاتے ہوئے دل گرفتہ بھی تھا۔
بقول صدق :-

"۱۹۲۳ء کے موسم بہار کی ایک سہانی صبح کو میں براہ منماڑ اول بار نظام ریلوے کی ایک سست رفتار ٹرین سے کاچی گوڑہ ریلوے اسٹیشن پر اترا" (دربار دُربار)

صدق جائسی جہاں ہوش بلگرامی کے حوالے سے اس شہر حیدرآباد کو ایسا شہر بھی کہتے ہیں جہاں اہل ادب کا کوئی "پرسان حال نہیں" وہیں وہ خود اپنے وطنِ مالوف کے بارے میں بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

"نواب کاظم جنگ اگر اپنا وعدہ پورا کرتے تو شاید حیدرآباد مجھ سے جیتے جی نہ چھوٹتا مگر مشیت کو تو کتاب "دربار دُربار" لکھوانی منظور تھی۔ اس نے آخر میں ایک بار پھر مجھے جائس پہنچا دیا۔ جہاں اب علم و حکمت کے چرچوں کے بجائے بے خردی اور جہالت کا دور دورہ تھا"

(مقدمہ ۔ دربار دُربار)

فلاں فلاں شخص، حیات اور کارنامے" جیسے تھیسس [illegible] لکھ کر کئی ریسرچ اسکالر راتوں رات

اک ایسی شخصیت ہیں جنہیں تحقیق کا چسکا ہے۔ یہ ایک ایسا [illegible] ہے جس کے آگے ہر تشنہ سبک نظر آتا ہے۔ خان صاحب نے بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ صدق جائسی کے حالات اور تخلیقات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں صدق کے شاگردوں سے بھی مدد لی اور جس قدر مواد انہیں دستیاب ہو سکا وہ اس کتاب "صدق جائسی" میں پیش کر دیا۔ ایسا لگتا ہے صدق کو ادبی دنیا نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا۔ اس میں ادبی دنیا کا کوئی قصور نظر نہیں آتا۔ جو تخلیقات "صدق جائسی" میں دی گئی ہیں وہ نہایت ہلکی پھلکی اور "درباری" قسم کی سی لگیں۔ بیشتر تخلیقات شخصی رد عمل پر مبنی لمحاتی اور موقتی نوعیت کی ہیں۔ البتہ ان سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ صدق کو شعر کہنا بھی آتا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ تو تب ہوگا جب ان کی قابل ذکر تخلیقات کا قابل ذکر (CONSIDERABLE) حصہ دریافت ہو۔ موجودہ منظوم تخلیقات کی بہ نسبت "دربار دُربار" کی نثر ہزار درجہ زیادہ بہتر لگتی ہے۔

اس کتاب میں محمد نور الدین خاں صاحب نے صدق جائسی کے چہرے مہرے، عادتیں، یادداشت، غزلیں، نظمیں، مخمس، ہجویات وغیرہ جمع کر کے ریسرچ کرنے والوں کو للکارا ہے۔ اور اس طرح دکنی روایات اور [illegible] کا ثبوت دیا ہے۔ بہت ممکن ہے مطبوعات و مخطوطات [illegible] کلام کے علاوہ بھی کچھ نکل ہی آئے۔ جس کو کھوجنے کی ضرورت ہے۔ اس "شہر نا پرساں" میں صدق جائسی کا ایک

پرسانِ حال تو نکل آیا ۔ اور [illegible]
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے
● —— رؤف خیر، حیدرآباد

بقیہ :- محو حیرت

"بتاؤں گا کیوں نہیں۔"

"ہاں تو بتاؤ کس لئے گئے تھے۔؟"

"امتحان دینے کے لئے گئے تھے۔؟"

"امتحان دینے کے لئے! کونسا امتحان دینے کے کس کا امتحان۔۔۔؟"

"میرا میٹرک کا امتحان تھا۔"

"اور تمہارے دادا جان کا کون سا امتحان۔ جو زمان پور چلے گئے؟"

لڑکا ہنستے ہوئے بولا۔ "وہ میری کاپیوں کا پتہ لگانے کے لئے گئے ہیں جہاں جہاں جانچی جائیں گی۔"

اب کرنل مسعود کی سمجھ میں پوری بات آگئی تھی لیکن وہ محو حیرت تھے کہ کیا یہ وہی حسین صاحب ہیں جو کبھی بدعنوانیوں کے سخت مخالف اور اصول پرست ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں۔ جنہیں ایک آئیڈیل ہیڈ ماسٹر ہونے کے سلسلے میں صدر جمہوریہ کی جانب سے تمغۂ امتیاز بھی ملا تھا۔؟

ماہنامہ سہیل گیا کی عظیم پیش کش
کلام حیدری نمبر
بہت جلد منظر عام پر —— [illegible] ماہنامہ سہیل گیا

شہرِ خیال

کلام حیدری کے سلسلے میں گشتی مراسلہ بھی ملا تھا اور اب آپ کا پوسٹ کارڈ بھی موصول ہوا۔ کلام میرے ہم عصر، ہم عمر اور دوست تھے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ ۴۹ - ۵۰ء سے باقاعدہ خط و کتابت تھی۔ آخر وقت تک گہرے روابط رہے۔ وہ یہاں نوئیڈا میں قریب ہی رہتے تھے۔ گیا کے آخری سفر پر روانہ ہونے سے ایک دن پہلے شاہدہ بھابی کے ساتھ ساتھ ملنے آئے تھے۔ انتقال سے چند روز قبل انہوں نے خط لکھا تھا۔ جس کا جواب وصول کئے بغیر وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ نوئیڈا میں تھے تو تقریباً روزانہ ان کا فون آتا تھا اور طویل گفتگو ہوتی تھی۔ بہت سی یادیں ہیں جنہیں تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے نمبر کے لئے ضرور لکھوں گا۔

"سہیل" برابر مل رہا ہے۔ بعض دوستوں سے اس کے سلسلے میں گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے۔ افسوس ہے کہ میں اس کے لئے اپنی کوئی تخلیق بہت دنوں سے نہ بھیج سکا۔ قریباً ایک سال پہلے ایک غزل بھیجی تھی۔

جلد ۱۴ شمارہ ۱۰ میں مشفق زبیری کا مضمون "عطا محمد شعلہ۔ ایک شعلۂ مستعجل" بے حد پسند آیا۔ اس مضمون سے وہ لوگ خاص طور پر لطف اندوز ہوں گے جنہوں نے عطا محمد شعلہ کے تنقیدی مضامین اور ترائلے پڑھے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اردو میں سب سے پہلے فرانسیسی صنف سخن ترائلے (TRIOLET) کو عطا محمد شعلہ نے متعارف کرایا۔ کچھ لوگ احمد ندیم قاسمی کا نام لیتے ہیں۔ مشفق صاحب ملیں تو ان سے میرا سلام کہئے اور میری جانب سے اس مضمون کے لئے مبارک باد دیجئے۔ ان سے اس طرح کے مضامین لکھواتے رہئے۔ اسی شمارے میں اویس احمد دوراں کا مضمون "ماہنامہ سہیل کا ادبی کردار" بھی بہت اچھا ہے۔ ان کے حافظے کی داد دینی پڑتی ہے۔

● —— مظہر امام، دلی

مزاج گرامی!

شاید آپ کو یہ اطلاع مل چکی ہو کہ میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کا چیرمین بنا دیا گیا ہوں۔ یہ عہدہ بہار میں پہلی بار کسی مسلمان اور اردو داں کے حصے میں آیا ہے۔ کمیشن کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے تمام لکچرر، ریڈر، پروفیسر کا تقرر اسی ادارے سے ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل، یونیورسٹیوں کے رجسٹرار، فنانس آفیسر سب ہی اسی ادارے سے بحال

کئے جاتے ہیں۔

اب میں رانچی میں نہیں ہوں۔ اس خط کے سرنامے پر جو پتہ ہے ازراہ کرم اپنے رسالے میں درج کر کے میرے نئے منصب کی اطلاع پڑھنے والوں کو دیدیں، میں بہت ممنون ہوں گا۔ دفتر اور رہائش گاہ کے فون نمبر بھی دیدیں تو مزید کرم ہوگا۔

● —— وہاب اشرفی، پٹنہ

پتہ:- پروفیسر وہاب اشرفی، چیئرمین
۲۲- اسٹرینڈ روڈ، نیتا جی سبھاش مارگ
پٹنہ — ۸۰۰۰۰۱
فون نمبر رہائش گاہ — 653472
" آفس — 260063

گذشتہ شماروں میں آپ نے میرے مراسلہ کو سہیل میں شامل کر کے صحافتی دیانتداری کا ثبوت دیا ہے پچھلے شمارے میں میرے شعری انتخاب پیپل کا آسمان پر [illegible] سہابادی کا گرانقدر تبصرہ دیکھا جو نہایت [illegible] ہے۔ یہاں کئی احباب نے پسند کیا۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ روائتی گھسے پٹے جملوں سے پاک ہے ورنہ بیشتر دوران تبصرہ نگار حضرات کے بیشتر تبصرے کسی بھی ادیب شاعر پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ فیض صاحب اس تبصرے میں انہیں انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ہیں۔ اور یہی انفرادیت دیگر نقاد اور تبصرہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ مجھے موصوف کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ میں ان کو الگ سے خط لکھتا۔

میری جانب سے ان کا شکریہ ادا کر دیں۔

محترم [illegible] صاحب گذشتہ مراسلہ [illegible] سے ابھی تک نا واقف ہیں ایسا لگتا نہیں

[illegible]
لیں مرتب [illegible] کر دے۔

● —— عبدالمتین نیاز، بھو

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔

اویس احمد دوراں کا مقالہ سہیل کا ادب نہایت دلچسپ اور خیال انگیز ہے۔ تبصرے اور خ بھی خوب ہیں۔ حامدی کاشمیری کی نظم ہواؤں کی ا میری نظم "ابھی اور" کے دوسرے مصرعے میں "یہ" کی جگہ "یہیں" یعنی غلط چھپ گیا ہے۔

" درپیش ہے مشکل" جسے پانچواں مصر دکھایا گیا ہے کتابت میں، دراصل چوتھے مصرعے کا حصہ ہے۔ آخری حصے میں "ابھی میں" کاتب کی کارستانی ہے۔ یہ مصرع یوں پڑھنا چاہئے۔

اسی باعث ابھی میں اور جینا چاہتا ہوں،

ازراہ کرم یہ خط ضرور شائع کر دیں۔

اہل علم یہ جان لیں کہ میں نے غلط مصرعے نہیں تحریر کئے۔

● —— کرشن موہن۔ د

سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ ڈاک کی بدنظمی کی وجہ سے سہیل کے گذشتہ دو شمارے نہیں مل سکے جس کی وجہ سے فائل میں شماروں کا تسلسل [illegible] گیا ہے۔ بہرکیف سہیل کے تازہ شمارہ نے ساری کسر پوری [illegible] یہ شمارہ کافی وقیع اور جاندار ہے۔ بالخصوص اویس ا دوراں نے جس انداز سے تاریخی اور تہذیبی [illegible] پس منظر میں سہیل کے ادبی کردار کا جائزہ لیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ مسلمانوں کی اگلی قسط کا انتظار [illegible]

[illegible]
●

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسملؔ شہسرامی

سُہیل گیا

ماہنامہ

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد محسن
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
- ایڈیٹر :- جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی

معاونین :- شکیل احمد حیالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان رضوی

▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

شمارہ ۱۲ جلد ۱۵

— بدل اشتراک —
- فی شمارہ ——— ۵ روپے
- زر سالانہ ——— ۵۰ روپے
- لائف ممبری ——— ۱۰۰۰ روپے

یادگار :- زین العابدین احمر و ادیبی شہسرامی

فہرست

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل

دلپور سائیڈ روڈ، گیا

فون نمبر :- ۲۱۵۷۳

کیا آپ زندگی کے قدرتی حسن میں یقین رکھتے ہیں

اگر ــ ہاں ــ تو

بہار آئیے

شاندار ماضی اور ترقی پذیر حال کے ساتھ قدرتی حسن سے بھرپور صوبہ بہار آپ کو سیاحت دل پذیر مسرت دے گا۔

اگر آپ مذہبی شخص ہیں تو سبھی مذاہب کا مرکز ہے بہار ــ اگر آپ قدرتی حسن کے پجاری ہیں تو پھر چھوٹا ناگپور آئیے اور بہار کے شاندار جنگلوں، خوبصورت پہاڑوں، حسین جھرنوں جیسے ہنڈرو، نیترہاٹ، راج رپا وغیرہ کی سیر کا مکمل لطف لیجیے۔ اور ــــ اگر رومان پسند کریں تو ہزاری باغ اور متیلا کے گھنے اور بڑے نیشنل پارکوں میں جنگلی مخلوقات کے بیچ گذاریئے۔

بہار کی سیاحت یعنی گاگر میں ساگر

یہاں سیدھے سادے لوگ، یہاں کی تہذیب، یہاں کا فن، یہاں کا روائتی تیوہار، آپ کو دامن میں سمیٹ لے گا ــ آپ یہاں ایک بار آئیے ــ آپ یہاں بار بار آنا چاہیں گے۔

صوبائی حکومت نے بہار سیاحت کو صنعت اعلان کیا ہے اور سیاحت سے متعلق ہر سہولیات آپ کو مہیا کرانے کے لئے پرعزم ہے۔

رابطہ قائم کریں

سیاحت اطلاع مرکز ــ مظہر الحق پتھ پٹنہ ــــ سیاحت اطلاع مرکز ــ کچہری کیمپس، رانچی
دربھنگہ ــ فون نمبر ۲۵۲۹۵ فون نمبر ۲۰-۴۲۶

جاری کردہ : ــ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار
06 21 (210-01) 94-95

نمود

کلاسیکس
CLASSICS

جنیئس فن کار کی تخلیق زمانی حدود سے آگے نکل جاتی ہے لیکن یہ اپنے دور میں بھی ہوتی ہے — اس کا مطلب یہ ہے کہ فن کار اگر ایک طرف اپنے عصری حالات کی پیش کش کرتا ہے تو اس کے فن پارے میں ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ آنے والے حالات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کو فن پارے کی اضافی خوبی نہیں کہا جا سکتا بلکہ اچھے اور معیاری ادب کے لئے اس کی حیثیت ایک تلازمے کی سی ہے۔

ان تمہیدی سطروں کا مدعا یہ ہے کہ ہمیں اپنے سرمایۂ ادب کو ہر دور میں اس کے اپنے تقاضوں کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ میرؔ و غالبؔ، شیکسپیئر اور گوئٹے، مولانا روم اور حافظ شیرازی، امرالقیس اور متنبی وغیرہ کی جو تفہیم ہم ایک عہد میں کر چکے ہیں وہ کافی نہیں — جن ادوار میں ہم نے انہیں سمجھا اور پڑھا ہے وہ ہم سے زمانی طور پر دور ہو چکے ہیں آج ان کی تفہیم از سر نو ہونی چاہئے۔ شعر و ادب کی آفاقیت کا تصور اسی طرح قائم رہ سکتا ہے اور اسی حیثیت سے ادب کی دائمی معنویت مقرر ہو سکتی ہے۔ ہمارا شعری و ادبی اثاثہ ہمیں مطالعہ نو کی دعوت دیتا ہے۔ غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ اور دوسرے مشاہیر شعرا کی جو تشریحیں پہلے سے سامنے آ چکی ہیں بلاشبہ ان سے ایک وقت میں ہم نے دانشوری کی نئی جہتیں حاصل کی ہیں۔ مگر شعر فہمی کا مسئلہ وہیں پر ختم نہیں ہوتا اور ان تفہیمات کے بعد یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ہمیں اب ان اساتذہ سے جو کچھ لینا تھا وہ ہم لے چکے۔ اچھا اور معیاری ادب خیر جاریہ ہوتا ہے اور ہر دور میں ہماری تفہیم کے نئے باب کھولتا ہے۔

اس تواتر کے بغیر حال اور مستقبل میں بہتر تخلیقی کارناموں کی پیش کش ممکن ہی نہیں۔ ادب میں نئے INTERPRETATIONS نئے INVENTIONS کے لئے راہیں ہموار کرتے ہیں۔ کلاسکس کی نئی اور جدید تر تعبیر و تشریح آج ہماری بصیرت و دانش کے لئے پہلے سے کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتی ہے

— مسعود منظر

مظہر امام
(دہلی)

نیا ملک، نئے رسائل

سیاسی ہوائیں جو رخ بھی اختیار کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین ادبی۔ فکری اور ثقافتی سطح پر یگانگت، رواداری اور باہمی محبت کے رشتے برابر قائم رہے ہیں۔ اس یگانگت کے نقوش دونوں مملکتوں کے قیام کے ابتدائی سترہ اٹھارہ سال میں زیادہ ہی نمایاں رہے۔ ہرچند اس کے بعد سیاسی تلخیاں اور سرحدی تنازعے آپسی ربط و تعلق پر اثر انداز ہوئے اور عوامی سطح پر آمد و رفت میں کمی آئی۔ لیکن ادبی اور ثقافتی محاذ پر اب بھی غیر سگالی کے جذبات قائم و دائم ہیں۔ اور ہندوستانی اور پاکستانی ادبی رسائل کے صفحات دونوں ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات سے روشن رہتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ آیئے، آزادی کے بعد کے پاکستانی رسائل پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ اس وقت کے اہم ادبی رسائل کا جائزہ لیتے وقت پہلا تاثر تو یہی قائم ہوتا ہے کہ ان میں شائع شدہ ادبی نگارشات کو کسی خاص ملک سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے قطع نظر کہ ان میں پاکستان کے علاقے کے لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے ان کے مقام اشاعت مثلاً لاہور، کراچی سے صرف نظر کر لیا جائے تو انہیں دہلی یا بمبئی سے شائع ہونے والے ادبی جرائد سے ممیز نہ کیا جا سکے گا۔

قیام پاکستان کے وقت جو رسالے لاہور سے شائع ہو رہے تھے۔ ان میں ادب لطیف۔ ادبی دنیا، اور سویرا مستحکم بنیادوں پر قائم تھے۔ ادب لطیف کی ترتیب و تزئین کا سارا کام فکر تونسوی کے سپرد تھا۔ تقسیم ہند کے بعد فکر سرحد کے اس طرف چلے آئے۔ پہلے جالندھر پھر دہلی۔ لاہور کے ہنگاموں میں ادبی دنیا کے دفتر اور مولانا صلاح الدین احمد کے کتب خانے کو نقصان پہنچا اور یہ رسالہ جس نے اردو افسانہ نگاروں کو درجہ امتیاز بخشا تھا۔ بہت دنوں تک تعطل کا شکار رہا۔ چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد کے درمیان جائداد کے بٹوارے کے بعد "مکتبہ اردو" اور "ادب لطیف" چودھری برکت علی کے ... چودھری

نذیر احمد نے "نیا ادارہ" قائم کیا اور "سویرا" جاری کیا، جو احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی کی ادارت میں بڑے طمطراق سے نکلا اور اس نے صوری نفاست اور معنوی لطافت کا نیا معیار قائم کیا۔ اس رسالے کے دو شمارے تقسیم سے پہلے ہی منظر عام پر آچکے تھے۔ آزادی کے کئی ماہ بعد "سویرا" کا نیا شمارہ اپنی پرانی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کا ایک حصہ آزادی سے متعلق لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل تھا۔ اسی شمارے میں فیض کی مشہور نظم "سحر" پہلی بار شائع ہوئی اور اس کے پہلے مصرے۔ یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر۔ نے ہی عوام و خواص کو مسخر کر لیا۔ اسی موضوع پر اس شمارے میں جوش، مجاز، جذبی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی نظمیں بھی تھیں۔ یعنی ہندوستانی اور پاکستانی شعرا کا تناسب برابر تھا۔

اس زمانے میں پاکستان سے تین نئے رسالے منصۂ شہود پر آئے۔ "سنگ میل" پشاور سے نکلا جس کے ایڈیٹر فارغ بخاری اور رضا ہمدانی تھے، جو اس وقت ادبی دنیا میں تقریباً نووارد تھے۔ اس رسالے میں اس وقت کے ادبی مباحث کی بازگشت صاف سنائی دیتی تھی۔ تقسیم کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے تھے اور ترقی پسند اور غیر ترقی پسند اپنے اپنے ادبی تشخص کے لئے فکری اور نظریاتی محاذ پر جو لڑائیاں لڑ رہے تھے۔ "سنگ میل" کے صفحات سے ان کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس رسالے کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا اور یہ اپنے علاقے کی ادبی اور تہذیبی جڑوں کو پہلی بار اردو دنیا سے متعارف کرا رہا تھا۔ خوشحال خاں خٹک کے افکار باقاعدگی سے [illegible]

بلراج کومل کی ابتدائی نظم "اکیلی" بھی۔ ایک مغویہ لڑکی کی زبان سے ادا کی ہوئی یہ نظم اپنی فوری اپیل کی وجہ سے سرحد کی دونوں طرف مشہور ہوئی۔ اس نظم کی آخری لائنیں ہیں:-

میرے ابا ہنو
میری امی ہنو
میری آپا ہنو
میرے ننھے سے معصوم بھیا ہنو
میری عصمت کی مغرور کرنیں ہنو
میرے کچھ تو ہنو
میرے کچھ تو ہنو
میرے کچھ تو ہنو

انہیں دنوں یعنی اپریل ۴۸ء میں محمد طفیل نے احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں ماہنامہ "نقوش" اجرا کیا۔ یہ رسالہ اپنے معیار اور ترتیب کی خوش سلیقگی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ پاکستان کا سب سے بڑا رسالہ بن گیا۔ اس رسالے میں شروع ہی ہندوستان کے معروف لکھنے والوں کی نگارشات کو مقام پاتی تھیں۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر مخدوم محی الدین، اختر الایمان، سردار جعفری، شکیلہ اختر کو اس کے ابتدائی شماروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "نقوش" اور احمد ندیم قاسمی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حسن منٹو کو دوبارہ افسانہ نگاری کی طرف راغب ناساعد حالات میں بمبئی چھوڑ کر لاہور جانے کے بعد سخت ذہنی کرب میں مبتلا تھے اور ایک تو مولوی ملک اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھ کر ذہن کو لکھنے [illegible]

[illegible]

کی فرمائش کی تعمیل نہ کر پانے پر ان کی ناراضگی دور کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" لکھا، جسے دیکھ کر احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ یہ "نقوش" کے لئے گرم ہے۔ لہٰذا دوسرے دن منٹو نے دوسرا افسانہ دینے کا وعدہ کیا اور اپنا مشہور اور بدنام افسانہ "کھول دو" ان کے حوالے کیا۔ یہ افسانہ جون ۱۹۴۸ء میں — "نقوش" کے تیسرے شمارے میں چھپا۔ اس کے چھپتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور "نقوش" پر چھ ماہ کی پابندی لگا دی گئی۔ اس وقفے کے بعد جب دوبارہ "نقوش" خاص نمبر کی صورت میں نکلا تو اس میں عصمت چغتائی کا ہنگامہ خیز مضمون "پوم پوم ڈارلنگ" شامل تھا۔ جس میں قرۃ العین حیدر کے تحریروں پر طنز کے نشتر چلائے گئے تھے۔ اس شمارے میں شائع شدہ ممتاز حسین کا مقالہ "کچھ ادب عالیہ کے بارے میں" طویل بحث کا شاخسانہ بنا۔ ترقی پسندی کی شدت پسندی کے دور میں ادب عالیہ اور کلاسیکی ادب کی اہمیت اور عظمت کو اجاگر کرنے کی ایک بڑی عالمانہ کوشش تھی۔ ممتاز حسین کچھ ہی پہلے بمبئی کے ترقی پسند حلقے سے بیزار ہو کر پاکستان چلے گئے تھے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد بمبئی کے متشدد ترقی پسندوں میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ اس کے جواب میں بمبئی کے "محاذ" میں مجروح سلطان پوری کے نام سے ایک مضمون چھپا، اس شکایت کے ساتھ کہ اسے "نقوش" نے شائع نہیں کیا۔ مجروح کا مضمون دو صفحات پر مشتمل تھا۔ ممتاز حسین نے شاہراہ دہلی میں دو قسطوں میں ساٹھ ستر صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ اپنے موقف کی وضاحت، تشریح اور تعبیر کے لئے چھپوایا، جس میں مارکس، اینگلز اور روسی ادبی ناقدین کے حوالے سے ادب عالیہ کی تعیین قدر پر زور دیا گیا تھا۔ ادبی نقوش کے اسی شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا تازہ مضمون بھی تھا، جو "نیا ادب" بمبئی کے "آزادی کی منزلیں نمبر" کی عبسیت کے خلاف لکھا گیا تھا۔ اس کے چند شماروں بعد نقوش (مئی ۴۸ء) میں پروفیسر عزیز احمد کا ایک معرکہ آرا مضمون سربرآوردہ شاعر "شاد عظیم آبادی" پر شائع ہوا جنھیں اردو دنیا نظر انداز کرتی رہی ہے۔ "نقوش" ہی میں فراق گورکھپوری نے محمد عسکری کے "اسلامی ادب" کے نعرے کے خلاف مضمون لکھا۔ "نقوش" میں شائع شدہ فراق کے خطوط کے پیش نظر ایک اخلاقی مسئلے کو لے کر سردار جعفری نے "شاہراہ" میں ایک سخت مضمون لکھا، اور اس کے بعد دونوں طرف سے تائید اور تردید میں ایک بڑے عرصے تک لمبے لمبے مضامین لکھے جاتے رہے۔

۱۹۴۸ء میں ہی عارف عبدالمتین اور نصیر انور کی ادارت میں ایک اور خوبصورت رسالے "جاوید" کا اجراء ہوا۔ پہلے ہی شمارے میں کرشن چندر کا افسانہ شامل تھا۔ ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات اس میں بھی تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ منٹو کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کو "نقوش" میں جگہ نہ ملی۔ "نیا دور" کی مدیرہ ممتاز شیریں نے بھی خطرے کے پیش نظر اسے اپنے رسالے میں چھاپنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی عارف عبدالمتین نے جرأت رندانہ سے کام لے کر اس افسانے کو "جاوید" کے سالنامہ (مارچ ۱۹۴۹ء) میں شائع کر دیا۔ اس افسانے کا چھپنا تھا کہ حکومت کی سنسنی خیز حرکت میں آگئی اور سالنامے کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ مصنف، اڈیٹر اور پرنٹر پبلشر کو آخری

رجلے میں بطور سزا تین تین سو روپے کا جرمانہ ہوا۔ "جاوید"
کی اشاعت ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ "نقوش" کے ساتھ
"ادب لطیف" اور "سویرا" بھی ترقی پسندانہ نگارشات
کی اشاعت کی وجہ سے عتاب کی زد میں آئے تھے اور ان
کی اشاعت پر بھی چھ ماہ کی پابندی لگا دی گئی تھی۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں فسادات کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ بربریت کے نہایت جانگداز مظاہرے ہوئے، ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بے شمار مکانات جلے، لاکھوں بے گھر ہوئے۔ نقل مکانی اور ہجرت کی آفتیں نازل ہوئیں ہر حساس اور شاعر اس سانحے سے متاثر ہوا اور اس موضوع پر لکھی ہوئی تحریروں کا سیلاب سا آگیا۔ ظاہر ہے اس میں رطب و یابس کی کمی نہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسے شاہکار بھی تخلیق ہوئے جنہیں وقت کی گرد دھندلا نہیں سکی ہے۔ یوں تو اس موضوع پر ہر دو ملک کے لکھنے والوں نے خون کے آنسو بہائے اور انہیں دونوں ملکوں کے رسائل و جرائد میں جگہ ملی، لیکن اس موضوع پر باقاعدہ ایک ضخیم اور بے حد وقیع خاص نمبر چھاپنے کا سہرا ممتاز شیریں اور صمد شاہین کے "نیا دور" کے سر ہے جو بنگلور سے کراچی منتقل ہو چکا تھا۔ اس رسالے کا "فسادات نمبر" آج بھی حوالوں کے کام آتا ہے۔ اس میں خواجہ احمد عباس کا وہ دیباچہ بھی دوبارہ چھاپا گیا تھا جو انہوں نے راماننද ساگر کے ناول "اور انسان مر گیا" کے لئے لکھا تھا۔ اور جس پر بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں بہت لے دے ہوئی تھی اور خواجہ احمد عباس کا ایک طرح ادبی بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے فسادات کی ذمہ داری انگریزوں کے سر ڈالنے کے بجائے اسے خود برصغیر کے لوگوں کی ہی فرقہ وارانہ ذہنیت کا نتیجہ بتایا تھا۔ اور اس طرح ایک مخصوص پارٹی لائن سے انحراف کیا تھا۔ اس مضمون کی دوبارہ اشاعت پر محمد حسن عسکری نے بھی ممتاز شیریں کو داد دی تھی۔

اس خاص نمبر میں احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور شکیلہ اختر کے نہایت اعلیٰ افسانوں کے علاوہ تین ایسے شاہکار بھی پیش کئے گئے تھے جو دوامی اہمیت کے حامل ہیں — بسل مترا کے طویل بنگالی افسانے "فیرس لین" کا ترجمہ شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ "دلی کی بپتا" اور قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ "یاخدا"

۱۹۴۸ء کے اوائل میں ہی میاں افتخار الدین نے روزنامہ "امروز" کا اجرا کیا تھا اور فیض احمد فیض اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اسی ادارے سے ہفتہ وار "لیل و نہار" کا اجرا ایک صحافتی واقعہ تھا۔ ہر چند یہ نیوز میگزین تھا، لیکن اس کا ادبی حصہ وقیع ہوا کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید سبط حسن تھے۔ جانے پہچانے کمیونسٹ تھے اور اپنی ترقی پسندی کے لئے نیا ادب کے ابتدائی زمانے سے مشہور تھے، مگر ان کی ادارت میں ایسی تحریروں کی اشاعت بھی ہوتی رہی جو ترقی پسندی کے منشور کے تابع نہ تھیں۔ کہنا چاہئے کہ "لیل و نہار" نے بالواسطہ طور پر اردو ادب میں غیر ترقی پسندانہ نئے رجحان کی تعمیر میں بھی ایک مثبت رول ادا کیا اور خود ہندوستان کی نئی نسل پر اس نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ ادب کے جدید ترین میلان کو فروغ دینے میں سب سے بڑا کام "سویرا" نے انجام دیا، جب اس کے ایڈیٹر حنیف رامے اور صلاح الدین محمود ہوئے۔ تجریدی اور علامتی افسانوں

عبد القوی دسنوی
۲۔ پرنس کالونی، عیدگاہ ہل، بھوپال

یادوں کے سائے

(قیصر عثمانی کی ایک دلچسپ تصنیف)

قیصر عثمانی کا تعلق صوبہ بہار کے قدیم تاریخی شہر گیا سے ہے۔ ۱۹۳۹ء کے دوران پٹنہ میں کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد دو سال (۱۹۴۰ء ۱۹۴۱ء) ماہنامہ سہیل کے مدیر رہے اس طرح انھیں ادبی صحافت کے گیسو سنوارنے کا موقع ملا، پھر کلکتہ جاکر فلم انڈسٹری سے ایسا تعلق پیدا کیا کہ ہمیشہ کے لئے اسی کے ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ادب سے رشتہ جوڑے رکھا۔ ابتدا میں انھوں نے افسانہ نگاری کی لیکن زیادہ مدت تک اس سے نباہ نہ ہو سکا، البتہ شاعری سے ساری زندگی وابستہ رہے۔ چنانچہ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنا تعارف بھی کرایا۔ مقبولیت بھی ان کے حصے میں آئی۔ شہرت بھی حاصل کی۔ ان کا شعری مجموعہ "حدیث دل" عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ ایک طویل نظم "پرچھائیوں کا دیس" بھی کتابی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہے۔

۱۹۹۱ء میں ان کے ایک درجن خاکوں کا مجموعہ "یادوں کا سفر" منظر عام پر آیا اور پسند کی نظر سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر عبد المغنی نے اس مجموعہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے نہایت اچھی بات تحریر کی ہے:

> یہ عثمانی صاحب کی مرقع نگاری کی چابکدستی ہے۔ اشخاص کے مطالعہ میں ان کا مشاہدہ بہت باریک، تیز اور گہرا ہے اس سلسلے میں انھوں نے ایک ایسے مصور کی مہارت کا ثبوت دیا ہے جو اپنے موضوع پر ایک نظر ڈال کر صرف چند لکیروں اور رنگوں کے امتزاج سے ہر چہرے کے تیکھے نقوش اس طرح ابھار سکتا ہے کہ متعلقہ شخصیتوں کے اندرونی پیچ و خم بھی عیاں ہو جائیں[1]

بلاشبہ اس کتاب کی اشاعت نے اردو ادب کے خزانے

---

[1] یادوں کا سفر: قیصر عثمانی ص ۶

میں اچھے خاکوں کا اضافہ کیا ہے، جن کے مطالعہ سے اردو کے بارہ فنکاروں اختر قادری، سہیل عظیم آبادی، جمیل مظہری۔ شیدا کیوروی، آرزو لکھنوی۔ احسن رضوی، کرشن چندر، ظ انصاری، نیاز حیدر، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی اور خواجہ احمد عباس کی شخصیتوں اور ان کی دلچسپیوں سے آگاہی ہوتی رہے گی۔ اور ان کی یادیں بھی تازہ ہوتی رہیں گی اور ان سے تعلق مضبوط ہوتا رہے گا۔

اب قیصر عثمانی کی نئی کتاب "یادوں کے سائے" نہایت خوبصورت، ترتیب اور تزئین کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ یہ یادیں مملکت ادب کے شہزادوں کی نہیں ہیں بلکہ آسمان فلم کے ستاروں کی اور دنیائے فلم کے معیار بلند کرنے والے معماروں کی ہیں۔

یہ یادیں ۱۹۴۲ء سے شروع ہوئی ہیں اور تقریباً نصف صدی پر محیط ہیں۔ جس میں قیصر عثمانی نے ان فلمی ستاروں اور معماروں سے تعلقات اور ان کے واقعات کا کچھ اس انداز سے ذکر چھیڑا ہے کہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کرنے ہی کو جی چاہتا ہے — زبان نہایت سلیس اور رواں ہے خیالات میں کہیں کوئی پیچیدگی نہیں ہے ایک کے بعد ایک پردے اٹھتے جاتے ہیں اور مختلف شخصیتیں اپنی خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ ابھرتی اور متوجہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ان شخصیات کی یادوں کے ساتھ خود قیصر عثمانی کی شخصیت اپنا تعارف کراتی محسوس ہوتی ہے لیکن فلمی دنیا کے ایک فرد کی صورت میں بہت کم جلوہ افروز ہو سکے ہیں۔ البتہ ایک بار کشمیر میں بلراج ساہنی نے نظم سنانے کی فرمائش [illegible]

سناتے ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ بلراج ساہنی کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

اک موڑ پر یوں دیر سے میں چپ کھڑا ہوا
آنکھیں میں ڈبڈبائی ہوئی دل بجھا ہوا
جاؤں کہاں یہ فیصلہ مجھ سے نہ ہو سکا
اب کون ہے جو مجھ کو گلے سے لگائے گا
میرے لئے جو راہ میں آنکھیں بچھائے گا
جب تھک گیا دماغ مرا سوچ سوچ کر
دنیائے بیکسی میں مرا دل تھا راہبر
اب میں تھا گھر کے سامنے اور سامنے تھا گھر
وہ گھر جو تھا کبھی مرا اب میرا گھر نہیں
وا ہو گا میرے واسطے اب اس کا در نہیں

ایک جگہ مدھو بالا کا ذکر کرتے ہوئے اپنا یہ شعر گنگناتے ہیں۔

آیا جو غم ذرا سا لبھائے خوش نما پر
تاروں کا ہو گیا اک [illegible] کا اوسا فضا پر

اور مدھو بالا کی زبان سے ساحر لدھیانوی کا یہ قطعہ کرتے ہوئے اس سے کہلواتے ہیں۔

"مجھے ساحر لدھیانوی کا ایک قطعہ بے حد ہے جسے اکثر گنگناتی رہتی ہو۔ سناؤں؟"

"مدھو بالا نے ایک ادائے خاص سے کہا"

"ارشاد" میں نے کہا اور مدھو بالا نے بڑے دلنشیں انداز میں سنانا شروع کیا۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

اور یہ اشعار میناکماری کے مکان کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کے لب پر آگئے۔

اف یہ تیری نگاہ دزدیدہ
جس میں شوخی بھی ہے حجاب بھی ہے
دیکھ کر بھی نہ دیکھنے کی ادا
اس ستم کا کوئی جواب بھی ہے

پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد جہاں سید فضل احمد کریم فضلی، ایس ایف حسنین، ایس فضلی، دیوندر گوئل کا تعارف ہوتا ہے وہاں میناکماری، جیندر موہنی، نرگس، سہراب مودی، موتی لال، بلراج ساہنی اور مدھوبالا سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ دیوندر گوئل کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے جس سے وہ ایک باصلاحیت اور محنتی شخص بھی نظر آتے ہیں اور ہمدرد دوست اور مخلص انسان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بلراج ساہنی کی صلاحیتوں اور کردار کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔

اردو کے شعراء آرزو لکھنوی، جگر مرادآبادی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، اور پیارے لال شاکر میرٹھی کا ذکر ملتا ہے۔ مجروح سلطانپوری کے متعلق پہلی بار اس کتاب سے ہی یہ علم ہوتا ہے

.... جدن بائی کے اس دربار میں نہ صرف فلمی دنیا کی برگزیدہ ہستیاں نظر آتی تھیں بلکہ وہاں وقتاً فوقتاً اردو کے ممتاز شعراء کو بھی باریابی نصیب ہوا کرتی تھی۔ مجروح سلطان پوری تو کچھ دن اس گھر کے ایک خاص فرد بن کر رہے بھی تھے ۳۲؎

بمبئی میں منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کا ذکر کرتے ہوئے یہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

" میں آپ کو اپنا استاد مانتا ہوں۔"

" وہ کیسے؟"

جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو میں آپ کے رسالے بچوں کی دنیا کا خریدار تھا اور اس میں وقتاً فوقتاً میرے چھوٹے چھوٹے مضامین اور نظمیں سید عبدالحئی یعنی میرے اصلی نام سے شائع ہوا کرتی تھیں جن پر آپ کی اصلاح ہوتی تھی۔ میں نے بڑی عقیدت سے کہا۔

یہ آپ کی سعادتمندی ہے شاکر صاحب نے خوش ہو کر کہا —— ہم دونوں باتیں کرتے کرتے خواجہ بلڈنگ کے نیچے آگئے تھے اور شاکر صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تو میں نے سوچا شاید وہ خواجہ صاحب کے کمرے میں ٹھہرے ہوں۔

" آپ یہاں ٹھہرے ہیں؟" آخر میں نے بیچ میں قدم رکھتے ہی تجسس کے ساتھ دریافت کیا —

جی ہاں اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں میرے داماد ماسٹر علی بخش رہتے ہیں۔"

" شاکر صاحب نے چند مغلظات کے ساتھ جواب دیا۔ جب وہ جوان تھے تو ایک دن میری بیٹی کو بھگا کر لے گئے تھے جب پہلے تو انھوں نے تھیٹر میں ڈال دیا پھر اسے کنورٹ کر کے اپنی بیوی بنا لیا۔ خورشید جونیئر، میناکماری اور بے بی مادھوری اس طرح میری نواسیاں ہیں" ۳۳؎

پوری کتاب پڑھنے کے بعد جی یہی چاہتا ہے کہ یادوں کے سائے کو اور زیادہ پھیلنا چاہئے۔ جن گوشوں اور شخصیات پر ابتک روشنی نہیں پڑ سکی ہے، انہیں بھی نمایاں کرنا چاہئے تاکہ فلمی دنیا کے ان روشن پہلوؤں سے بھی لوگ آگاہ ہوتے رہیں جن سے عام طور سے لوگ بے خبر ہیں۔

۳۲؎ یادوں کے سائے، قیصر عثمانی صفحہ ۲۴

۳۳؎ یادوں کے سائے، قیصر عثمانی صفحہ ...

ہائیکو نما

کرشن موہن
دہلی - ۹۲

زندگی ایک ترازو ہی تو ہے
جو سُبک ہوتے ہیں چڑھ جاتے ہیں اوپر اس میں
جو گراں ہوتے ہیں وہ نیچے اتر جاتے ہیں

گاہے گاہے ہوتا ہے ایسا عالم
خاموشی بھی بزم آرائی بنتی ہے
تنہائی دل کی شہنائی بنتی ہے

جو چمک نہیں رکھتا، مت کہو اسے موتی
حاصلِ سخن تو ہے کیف، رنگ اور آہنگ
ماترائیں گننے سے شاعری نہیں ہوتی

اہلِ علم و عرفاں کی، کیا ستم ظریفی ہے
اپنے رنگ میں، رس میں چاہے چھب ہو گوری کی
ہندوؤں کی اردو سے، آئے بو کچوری کی

یہ گجراتی کہاوت ہے
کہ بیبیہ شیرنی کا دودھ ہوتا ہے
اسے پانا اور اس کا ہضم کرنا دونوں مشکل ہیں

وہ جذباتِ حزیں جن کی پذیرائی نہیں ہوتی
وہی وجہ سکونِ خاطرِ ناشاد بنتے ہیں
جو پتے سوکھ جاتے ہیں بالآخر کھاد بنتے ہیں

ہوا کم اس قدر الفاظ کا علم
پڑھے لکھے بھی اب تو مرے ربّا
مربی کو سمجھتے ہیں مربّہ

کم آمیز و کم آہنگ و انا کیش
ہے اک ایسا بھی شاعر
بزمِ خویش، درویش خوش اندیش

ضیاءالانجم
جبلپور

دوہے

خون پسینہ کیجئے تب بنتی ہے بات
قسمت کو کیوں کوسئے سب محنت کے ساتھ

سینوں کے آکاش پر اگے ہیں تارے چاند
آنکھیں کھلتے ہی سکھی پڑ جاتے ہیں ماند

دربدری کو تیاگ دے کر لے کہیں قیام
ہونے کو ہے اے ضیاء اب جیون کی شام

باتیں ہوں اخلاص کی تو بن جاتی ہے بات
ورنہ جیون ویرتھ ہے جیسے سوکھا پات

حرف حرف جادوگری لفظ لفظ لغات
جو ہو سچی بریرنا تو غم سے ملے نجات

منزل کتنی دور ہے پوچھ رہے ہیں پاؤں
کیا خود چل کر آئے گا سجنی تیرا گاؤں

تسلیم نیازی
عالم نگر، برہانپور

رباعیات

باہر اسے روتے نہیں بنتا ہوگا
وردی وہ تبسم کی پہنتا ہوگا
اندر لیکن وہ بے قابو ہوکر
جذبات کے پیالے میں چھنتا ہوگا

دن بھر وہ سڑکوں پہ گھستا ہوگا
حالات کی چکی میں پستا ہوگا
پھر دیر تلک رات کی تنہائی میں
سینے کا غم آنکھوں سے رستا ہوگا

پاگل ہے وہ کب عقل کی سنتا ہوگا
ہر روز نئے سپنے بنتا ہوگا
ہاتھوں میں کھلی کتاب رکھی ہوگی
پلکوں سے مرا خیال چنتا ہوگا

جب درد کا پھل آنکھوں میں پکتا ہوگا
تکئے کی زمیں [illegible] ہوگا
احساس مرا برق کے کوندے کی طرح
اس کے وجدان میں لپکتا ہوگا

غزلیں

ذوالنورین، رہبر لکھنوی

لشکرِ انجم و مہتاب کو ٹلتے دیکھا،
پردۂ شب سے جو خورشید نکلتے دیکھا
گرمئ مہرِ مشیت ارے توبہ توبہ
برف کی طرح پہاڑوں کو پگھلتے دیکھا
جس کو ٹھکرا دیا ناکارہ سمجھ کر تم نے
عمر بھر ہم نے اسے پھر نہ سنبھلتے دیکھا
کشتیاں سونپ دیں کوفی کے رکھوالے کو
رُخ ہواؤں کا جہاں ہم نے بدلتے دیکھا
پڑ گئے ان کی بھی خود جان کے لالے اکثر
وقت بے وقت جنھیں زہر اگلتے دیکھا
آخرش آتشِ نمرود کو بجھنا ہی پڑا
گُلِ توحید کو جب پھولتے پھلتے دیکھا
میں تو کیا کوہ کن و قیس کو میں نے رہبر
سر کے بل کوچۂ محبوب میں چلتے دیکھا

ظفر حمیدی
مظفرپور

کیا بتاؤں آپ کو کیا نعمتیں ملتی رہیں
ہر گھڑی جینے کی مجھ کو تہمتیں ملتی رہیں
حضرتِ آدم کے جنت سے نکل جانے کے بعد
وعدۂ فردا کی صورت جنتیں ملتی رہیں
معرفت کا مسئلہ پیچیدہ تر ہوتا گیا
اہلِ عرفاں کی مسلسل صحبتیں ملتی رہیں
روشنی ہی روشنی کی جستجو کے خبط میں
نور میں سانچے میں مجھ کو ظلمتیں ملتی رہیں
میں محبت کا بھکاری تھا مگر اس شہر میں
میرے کشکولِ وفا کو نفرتیں ملتی رہیں
منکشف مجھ پر ہوا میں ہوں محیطِ بیکراں
ہے غنیمت کہ ایسی ساعتیں ملتی رہیں
ذات کے گہرے کنوئیں میں میں سمٹتا ہی گیا
اس کی گہرائی میں مجھ کو وسعتیں ملتی رہیں
ایک شب میں ماں کی تربت سے لپٹ کر سو گیا
کیسی کیسی چاہتوں کی برکتیں ملتی رہیں
میں کتابوں پر کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک گیا
ایک ہی معنی کو کتنی ہیئتیں ملتی رہیں
میری سانسوں سے دہکتا ہی گیا رخسارِ وقت
پیکرِ فنکار کو کچھ حدتیں ملتی رہیں
اے ظفر یہ خون کی سرخی کراماتی ہی
ذرے ذرے کی انوکھی رنگتیں ملتی رہیں

حمید الماس

(بنگلور)

کس نے آباد کیا شہرِ نوا پانی پر
کوئی آیا نہ گیا میرے سِوا پانی پر

پشتِ احساس پہ چھائے ہیں کئی برسوں سے
لکھ کے لائے کوئی تعویذِ شفا پانی پر

جل گئی آج سمندر کی زباں تک بھی
کس نئی سمت سے آئی ہے بلا پانی پر

جھنڈ کے جھنڈ پرندوں کے چلے آتے ہیں
نئی سج دھج سے خراماں ہے ہوا پانی پر

رابطہ خوف کا باقی نہ رہا دنیا میں
میں نے رکھی ہے تعلق کی بنا پانی پر

شاید اس سمت کوئی ناؤ بھٹک کے آئے
رکھ دیا میں نے سرِ شام دیا پانی پر

آگ سے بچ کے نکل آئے ہیں الماس مگر
منتظر ہیں کہ ملے ان کو سزا پانی پر

اختر شاہ جہاں پوری

شاہجہاں پور

سبز موسم کو بزرگوں کی دعا جانتے
ہم نے جو کچھ بھی کیا اس کو خطا جانتے

وہ مرے قتل پہ کیوں اشک بہانے آ
سرخیِ خون کو جو رنگِ حنا جانتے

طعنہ زن اس لئے احباب ہوئے ہیں ہم
ہم تو بیٹے کو بڑھاپے کا عصا جانتے

روز دے جاتا ہے اک تازہ خبر تو ہم
بے خبر ہم بھی زمانے کی ہوا جانتے

میں ہوں خلاق مری رنگ بھری دنیا
خوش خیالوں ہی سے پوچھو کہ وہ کیا جانتے

موسمِ وصل انہیں راس نہ آئے کا کبھ
جو تری ہجر نصیبی کا مزا جانتے ہ

یہ بھی دستک مری پہچانی ہوئی ہے اخ
رنج و غم ہی تو مرے گھر کا پتا جانتے ہ

لیں

ساجد خیر آبادی
شاہجہاں پور

چشم کرم ادھر ہو کہ اغیار کی طرف
لیکن نگاہ رکھئے گا کردار کی طرف

مانا کہ مجھ سے آپ کو الفت نہیں مگر
نفرت سے دیکھئے نہ مرے پیار کی طرف

کیا جانے کس خیال سے بسمل کے خون پر
قاتل نے دیکھا سرخیٔ تلوار کی طرف

اتنی کشش ہو ذوقِ طلب میں تو بات ہے
مطلوب خود ہی آئے طلبگار کی طرف

جب اہلِ ہوش پر مری منزل نہ کھل سکی
لے کر جنوں چلا ہے مجھے دار کی طرف

کیا کیا کرشمہ سازیاں ہیں حسنِ یار کی
دل دیکھے ہے نظر کو نظر یار کی طرف

ذوقِ تلاشِ یار کی منزل نہ پوچھئے
ہے دشت کی طرف کبھی گلزار کی طرف

کشتیٔ عشق کو ہے تلاطم کی جستجو
دل جا رہا ہے گیسوئے خمدار کی طرف

جلوے بھی اپنے دل میں ہیں ظلمت بھی ہے
کیا سوچ کر ہم آئے تھے انوار کی طرف

ساجد ہے میکدہ وہ سکوں آفریں مقام
آ ر نہ [illegible]

شاہد اختر
سہسرام

ریزہ ریزہ ٹوٹ کر مجھ میں بکھر جاتی ہے رات
شام سے پہلے ہی اپنا کام کر جاتی ہے رات

کیا تمہارے شہر کی تقدیر لکھے گا کوئی
دن نکلتا ہی نہیں ہے اور مر جاتی ہے رات

نقش ہے سارے بدن پہ تیرگی کا ذائقہ
ایسا منظر دیکھ کے خود سے بھی ڈر جاتی ہے رات

پھر سمندر اس کی چاہت کا بہت روشن رہے
پھر مرے سارے بدن میں آگ بھر جاتی ہے رات

کم سے کم مجھ کو تو اب اتنا تہی داماں نہ کر
میرے گھر سے نکل کر کس کے گھر جاتی ہے رات

سب ملاقاتوں سے بہتر زندگی کی شام ہے
دیکھنا یہ ہے کہ اب کے کس کے سر جاتی ہے رات

غزلیں

شارق عدیل
علی گڑھ

آئینہ رکھ کے ذرا آنکھوں میں ڈالو آنکھیں
یہ سمندر ہیں تو پھر خوب کھنگالو آنکھیں
منہدم پلکوں کی دیوار نہ ہو جائے کہیں
روشنی تیز ہے ہاتھوں سے چھپا لو آنکھیں
دل نہ لپکے کہیں معصوم گناہوں کی طرف
فاحشہ رات کی آنکھوں میں نہ ڈالو آنکھیں
جاگے احساسِ جدائی تو ترنم چھوٹے
میری آواز کی خوشبو سے لبالو آنکھیں
سبز منظر کی ڈھلانوں کا سفر ہے شارق
کیا بھروسہ کہ پھسل جائیں سنبھالو آنکھیں

زاہد امر
کلکتہ

وہی جو اشکوں میں ڈھل چکا ہے
گرا کہاں ہے، سنبھل چکا ہے
ترے بتوں کو کوئی کہے کیا
مرا خدا بھی بدل چکا ہے
خرد سے کہہ دو کہ تیز دوڑے
جنوں تو آگے نکل چکا ہے!
چلو اتار آئیں قرضِ ساحل
سنا ہے طوفان ٹل چکا ہے!
ہمارا گھر تو ہمارا گھر تھا
خدا ترا گھر بھی جل چکا ہے

تاج پیامی
مہادیوا محلہ آرہ

نظام وقت کو اب احتجاج بدلے گا
زمانہ دور نہیں جب سماج بدلے گا
ستم میں کم نہیں جمہوریت کے شاہنشاہ
کبھی تو ان کا بھی یہ تخت و تاج بدلے گا
خدا نے چاہا تو اک دن مریضِ دل پر درد!
طبیب بدلیں گے ان کا علاج بدلے گا
زمین دیتی ہے نذرانہ آسمانوں کو
مگر یہ کہنہ نظام خراج بدلے گا
زمانہ ایک سا رہتا نہیں جہاں میں کبھی
پیامی وقت کا برہم مزاج بدلے گا

ابوالخیر نشتر

میں تو اک خواب ہوں آنکھوں سے نہ ٹالو مجھ کو
ذہن میں رکھ لو، خیالوں میں بسا لو مجھ کو
میری چاہت کے اجالوں سے کرن پھوٹے گی
دل کے تاریک شبستاں میں چھپا لو مجھ کو
مجھ سے روشن ہیں زمانے میں محبت کے چراغ
عصر لو! وقت کے تیز پہ اٹھا لو مجھ کو
بحر ظلمات کے طوفان سے گذر جاؤ گے
ناخدا اپنے سفینے کا بنا لو مجھ کو
شاخ سے ٹوٹ کے گرنا تو مقدر ٹھہرا
پھر نکھر جاؤں گا زلفوں میں سجا لو مجھ کو
ہر طرف جبر و تشدد ہے، ریاکاری ہے
خوف و دہشت کی فضاؤں سے نکالو مجھ کو
اب سیہ کار سیاست، نہ بچے گا، نشتر!
شہر کے تازہ خداؤں سے بچا لو مجھ کو

میں سمجھتا ہوں کسی کی بد دعا ہے
کیا حوادث اور کیا موج بلا ہے
سر پہ تو میرے ابھی دست دعا ہے
دید کی ہے خواہش لیکن یہ بھی سوچو
طور تو پہلے ہی صدیوں جل چکا ہے
وقت کے بربط پہ رکھ کر انگلیوں کو
جانے کیوں ہم زاد میرا رو دیا ہے
پھر جبین وقت پر بھی سرخ دھبے
پھر لہو انسانیت کا بہہ رہا ہے
دشمنوں کی سازشوں میں ہیں ملوث
دوستوں کو ان دنوں کیا ہو گیا ہے
حسرتوں کی دھوپ میں اے کیف اکثر
اپنے سائے کا قد و قامت گھٹا ہے

لبوں پر ہے صدائے آفریں کیوں
مرے دشمن ہوئے ہیں نکتہ چیں کیوں
نہیں بنتا کوئی حسن یقیں کیوں
بدل تیرا کہیں ملتا نہیں کیوں
بدلتی رت پہ برستی بارشوں میں
سلگتی ہے جبینوں کی زمیں کیوں

کوئی بھی خواب جب دیکھا نہیں تھا
تو آنکھیں رات بھر جلتی رہیں کیوں
کسی بھی حادثے کے سب ہیں منکر
تو پھر میں نے وہ آوازیں سنیں کیوں
فریب آرزو سمجھا کیا اک حادثہ تھی
مقدر کی لکیریں مٹ گئیں کیوں
نہیں جن کی کوئی تعبیر قیصر
نظر آتے ہیں وہ خواب حسیں کیوں

قیصر شبلی
شاہجہاں پور

نظمیں

افتخار انجم
قریشی محلہ، آسنسول

نرت گھنگرو نے سخت ببول
سارے نا چیزیں ہیں نہیں قبول
خواب مرے تجھ پہ ہے محمول
تو ہی مجھ کو گیا ہے بھول
مری راہ میں خار ہی خار
تری راہ میں پھول ہی پھول
ہاتھوں میں تم دے کر ہاتھ
آنکھوں میں دیتے ہو دھول
سچ کی راہ ہے کانٹے دار
خوابوں سے ہی جھولا جھول
بہت لکھا اب یہ بھی لکھ
فعلن فعلن فعل فعول

اختر بانو نازؔ
پر کھنڈ (مہاراشٹر)

روشن صدف صدف رہے میرے دھیان میں
وہ لاجو تھے، تری آنکھوں کی کان میں
اڑنے کو اڑ رہا تھا پرند آسمان میں
لیکن بہت ہی جھول تھے اس کی اڑان میں
سر چڑھ کے بولتا ہے جو لفظ بیان میں
اک سحر ہے بھرا ہوا، اس کی زبان میں
ہونے ہیں ہم ضرور، یہ امکانی بال و پر
پیچھے نہیں ہیں پھر بھی کسی سے اڑان میں
یہ باہمی شکست یقیں کا معاملہ
تیرے گماں میں تھا نہ میرے گمان میں
وہ میری سوچ میں ہے نہیں اسکی سوچ یکساں
کیا چیز آڑے آ گئی پھر درمیان میں
اے نازؔ تیرے ساتھ کڑی دھوپ جھیل کر
وہ آگ کیوں اندر جل گیا سائبان میں

نثار احمد نثار
بیگم پور، سمستی پور

نیند خوابوں کو دھو گئی ہوگی
آنکھ بیدار ہو گئی ہوگی
سبز گھاسوں پہ اوس کے دانے
رات یہ فصل بو گئی ہوگی
دیکھ کر قافلہ پرندوں کا
یوں لگا شام ہو گئی ہوگی
فکر میری ترے خیالوں کی
دھند میں جا کے کھو گئی ہوگی
اک ادا شہر دل میں یادوں کے
خار و نشتر چبھو گئی ہوگی

شرون کمار ورما
(دہلی)

تم نہیں سمجھوگے

رام کلی جب چائے کی ٹرے لے کر مالکن
کے بیڈروم میں داخل ہوئی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ چہرہ دیکھ کر لگا۔ رات بھر سوئی نہیں ہیں — آج دیر تو نہیں ہو گئی۔
رام کلی نے ڈر سے سوچا۔

وہ ہر صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے جاگ جاتی۔ بجلی کی کیتلی لگاتی۔ برتن دھو کر سکھاتی۔ پلیٹ میں دو نمکین بسکٹ سلیقے سے رکھتی اور ایک منٹ کم چھ بجے مالکن کے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتی۔ اندر سے مالکن کی الساتی ہوئی آواز آتی۔ "کم ان" وہ آہستہ سے دروازہ کھولتی۔ پاؤں فٹ پیڈ پر رکھتی۔ آہستہ سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتی اور دیواروں تک پھیلے ہوئے گہرے نیلے مخملی قالین پر بلّی کی طرح چلتی ہوئی پلنگ تک جاتی۔ آپس میں الجھتی ہوئی، [illegible] خوشبوئیں، [illegible] باسی، بوجھل سی فضا کے ساتھ مل [illegible] سے نکل بھاگنے کی کوشش میں اس سے ٹکراتیں۔ سگریٹ، شراب، مچھلی، باسی پھولوں اور بدیسی مصنوعات، لوشنز، اور کبھی کبھی کسی مردانہ جسم کی بو۔

بنا آواز کئے ٹرے قریبی میز پر رکھ کر وہ ٹیبل لیمپ روشن کرتی۔ شروع شروع میں وہ اس ٹیبل لیمپ کو چھوتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔ جھجک سی ہوتی۔ کانسے میں ڈھلی ننگی عورت، دائیں ہاتھ میں بلب اٹھائے، بایاں ہاتھ کولہے کے خم پر رکھے۔ نازک سی کمر کو لذت آگیں خم دیئے مسکراتی، اپنی ہی روشنی میں نہائی، جوان عورت۔ وہ کچھ اس انداز سے تراشی اور ڈھالی گئی تھی کہ اس کے بدن کے تمام نشیب و فراز نوکیں، گولائیاں اور خم خطرناک حد تک نمایاں ہو گئے تھے۔ ایک پڑھی لکھی عورت کے کمرے میں یہ چیز دیکھ کر اسے دھکا سا لگا تھا۔۔

"کیا دیکھ رہی ہے —؟" مالکن نے پہلی صبح اس کی جھجک بھانپتے ہوئے کہا تھا۔ "عورت نہیں دیکھی کبھی؟" پھر اسے غور سے نہارتے ہوئے کہا تھا: "نہاتے ہوئے کو نہیں دیکھا تو نے۔ کیسا لگتا ہے اپنا آپ [illegible]

عام سی جنسی تو مالکن نے کھل کر کہا۔۔۔ "تو کیا اپنی باؤلی تو نہیں جانتی، اری مورکھ، یہ آرٹ ہے۔ فائن آرٹ، اسے سمجھنے کے لئے نہایت ہی سلجھا اور تربیت یافتہ دماغ چاہیئے۔ آرٹسٹک مائنڈ۔ تو نہیں سمجھے گی۔"

ٹھیک کہا تھا مالکن نے — وہ ان کی بہت سی آرٹسٹک باتیں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں تو یہی نہیں آ رہا تھا کہ خاوند سے الگ ہو کر میڈم کبھی کبھی دوسرے مردوں کو گھر کیوں لے آتی ہیں۔ عورت تو وہ خود بھی تھی۔ عورت بھی ایسی کہ مردوں کی نگاہیں اس پر پڑتیں اور اٹک جاتیں۔ بہت سی دوسری عورتیں دیکھی بھی تھیں۔ رنڈیوں کے بارے میں بھی سنا تھا۔ ننگی عورت میں کیا آرٹ ہو سکتا ہے۔ یہ وہ سچ مچ ہی نہیں سمجھ سکی تھی۔ عورت کی سندرتا تو خود کو چھپانے میں ہے۔ اس نے تو یہی سنا اور سیکھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس آرٹ میں مرد فن کار کی جنسی بھوک اور لالچ بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس صبح ٹیبل لیمپ کی روشنی میں مالکن کا چہرہ کچھ تھکا، بجھا اور اجنبی سا لگ رہا تھا۔ جیسے چہرے کے نقوش پگھل کر ایک دوسرے میں گم ہو رہے ہوں۔ اس کے گھر کے راستے میں پڑنے والے اس کھنڈر کی طرح جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے۔ پچھلی رات یہی چہرہ وہی بدن کسا کھلا کھلا روشن اور کسا ہوا سا تھا۔

مالکن نے بکھری ہوئی سی انگڑائی لی اور خود کو سمیٹ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔ ہلکی زرد روشنی میں وہ کسی سوکھی ندی سی لگ رہی تھی۔ کہیں گڑھے کہیں ریت کے چھوٹے موٹے جزیرے، جن پر بگلے مچھلی یا کیڑوں کی تلاش میں، بھگت بنے کھڑے رہتے ہیں۔ چائے کی پیالی دے کر رام کلی نے باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا کا خوشگوار جھونکا، شروع اپریل کا نشہ آور لمس لئے۔ اس کے چہرے کو چھو کر، کمرے کی باسی، بوجھل فضا میں گم ہو گیا۔ رام کلی نے پچھلی رات کی خالی پلیٹیں، گلاس، ایش ٹرے، سوڈے کی بوتلیں، باسی پھول اور مالکن کے زیر جامے سمیٹے اور کمرے سے نکل گئی۔

مالکن نے اس روز چائے بھی جلد ہی ختم کر لی۔ عام طور پر وہ آہستہ آہستہ چائے پیتیں۔ چائے ٹھنڈی ہو جاتی تو رام کلی دوسری پیالی بنا دیتی۔ مالکن چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کئے جاتیں۔ کچھ شکائتیں کچھ ہدائتیں اور کچھ ایسی باتیں جن سے رام کلی کا دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔ پھر وہ سو جاتیں اور نو بجے کے بعد بستر چھوڑتیں۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں دن بھی جیسے میڈم کا منہ دیکھ کر نکلتا تھا۔

اس صبح وہ جیسے کسی خاص مہم پر جانے والی تھیں۔

"ذرا مالش کر دے۔ وہ نیا ہربل شیمپو لے آ۔"

مالش کے اس عمل میں رام کلی کو صرف بدیسی لوشنز کی خوشبوئیں اچھی لگتی تھیں۔ اس ڈھلتے، سرد ہوتے لجلجے بدن پر ہاتھ پھرا کر اسے عجیب سا احساس ہوتا۔ جیسے پرانی کوئی روئی والے لحاف میں نگندے ڈال رہی ہو۔ ڈھلکتے گوشت، خشک ہوتی جلد اور جھڑتے بالوں کو کوئی بھی بدیسی مدد سہارا نہیں دے رہی تھی۔ شیمپو، کریم، لوشن، پاؤڈر، ہیئر آئل، ہیئر ڈائی سب مات کھاتے جا رہے تھے۔

مالکن دیر تک مالش کراتی، دیر تک باتھ ٹب میں خوشبودار جھاگ میں پڑی رہتی۔ دیر تک آئینہ کے سامنے خود کو سجاتی، سنوارتی، جوڑتی، باندھتی اور سنبھالتی اور رام کلی اندر ہی اندر ہنستی رہتی۔

مالکن ہر رات قدرے دیر سے آتی۔ کسی کے لئے جلدی آتی۔ خاوند سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ فیکٹریاں بنگلے، بینک بیلینس، شیئرز۔ بڑا بیٹا اوسلو میں مستقلاً آباد ہو گیا تھا اپنی نارویجین بیوی کے ساتھ اور بیٹی نے ایک امریکی سے شادی کر لی تھی۔ وہ تو اپنی کوکھ کے جائوں کے لئے بیکار سی ہو کر رہ گئی تھی۔ میڈم کی کار کا دروازہ رام کلی کھولتی، میڈم باتھ روم میں ہوتی تو جب سے بوتل گلاس سوڈا اور نمکین سجا دیتی۔ پاپ میوزک کی ویڈیو کیسٹ چالو کرتی اور پلنگ سے پیٹھ لگا کر یوں بیٹھ جاتی جیسے خزاں زدہ پیڑ پر کوئی پنچھی۔

پہلی بار جب رام کلی نے میڈم کے لئے پیگ تیار کیا تھا تو مالکن نے اس کی ذہنی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا تھا۔

" اری بے وقوف، کیا فرق پڑتا ہے۔ مرد پیئے کے عورت شراب تو نشہ دیتی ہے۔ ذرا سی دیر کو تمام دکھ بھلا دیتی ہے۔ ذہن کو سکون بخشتی ہے — یہ دنیا بڑی واہیات اور ظالم ہے۔ اس سے بھاگا بھی نہیں جا سکتا۔ بس کچھ دیر کے لئے اسے جوتی کی نوک پر رکھا جا سکتا ہے۔ شراب آدمی کو یہ حوصلہ دیتی ہے۔

میڈم گھنٹہ بھر میں تین چھوٹے پیگ پیتی۔ کھانا کھاتی۔ کچھ دیر باغ میں ٹہلتی۔ اپنے پالتو کتوں سے بامعنی باتیں کرتی۔ لو برڈز کے پنجرے کے سامنے کھڑی ہو کر انہیں دیکھتی۔ اس دوران رام کلی اس کے ساتھ

" لے ذرا دبا دے۔ تھک گئی ہوں۔"

ریشمی باریک نائٹی میں پگھلتے ہوئے — چاندی سے اس بدن کو نرمی سے دباتے ہوئے رام کلی حیرت سے سوچتی۔ یہ کاروں میں گھومنے، لفٹ میں اوپر نیچے جانے اور آرام دہ صوفوں پر پڑی رہنے والیاں تھک کیسے جاتی ہیں۔ جب وہ نشے اور نیند کی وادیوں میں ڈوب جاتی تو رام کلی چلی جاتی۔

" تھک جاتی ہوں رے پگلی، یہ سوشل سرکلز میٹنگز، پارٹیز، کاروباری مصروفیات تھکا دیتی ہیں آدمی کو — خیر — تو نہیں سمجھے گی یہ سب۔

دیر تک یہ خوبصورت الفاظ رام کلی کے دیہاتی ذہن میں ابابیلوں کی طرح پھڑپھڑاتے رہتے۔ آخر اس نے یہ سب سمجھنے کی کوشش بھی چھوڑ دی۔ کیا کرنا ہے اسے ان بڑے آدمیوں کی باتیں سمجھ کر۔

پچھلی رات مالکن معمول سے زیادہ دیر سے آئی تھی۔

" آج بہت دیر کر دی میڈم "

" ہاں — سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ تھی۔ ہنگامی۔ مسز شوبھنا سلطان کل صبح آئی ہیں۔ بہت بڑی اور مشہور مزدور لیڈر ہیں۔ فری مزدور کی کل ہند جنرل سکریٹری ہیں۔ چین کا دورہ کر کے آئی ہیں۔ لیکن تو یہ سب نہیں سمجھے گی۔

شوبھنا سلطان، نام سن کر رام کلی چکرا گئی تھی۔ شوبھنا ہوئی ہندو اور سلطان صاحب ہوئے مسلمان۔ یہ چکر کیا ہوا۔ مالکن نے اس کی الجھن بھانپتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

گنوار ہی رہی۔ کتنی محنت کی ہے میں نے تجھ پر کہ کچھ سیکھ جائے۔ لیکن سب اکارت گیا۔ تیرے بھیجے میں کچھ آتا ہی نہیں۔ مذہب کا محبت کے معاملے میں کیا دخل۔ ہندو۔ مسلمان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دل ملے کا سودا ہے۔ لندن میں دونوں ملے۔ پیار ہوا۔ اور دونوں نے شادی کرلی۔ رشتہ تو عورت مرد کا ہی ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے ایسا ہی چلا آرہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مذہب وذہب اور رسم ورواج تو سب اوپر کی باتیں ہیں۔ بھلا آدم اور حوا کا کون سا مذہب تھا۔

رام کلی کی جانے بلا۔ آدم، حوا کون تھے اور ان کا کیا مذہب تھا۔ بولقوں کی طرح مالکن کو دیکھتی رہ گئی۔ مالکن اس کی بے وقوفی سے محظوظ ہوتی رہی۔ رام کلی کا گھر والا کہا کرتا تھا سلری رمیا، مذہب تو مرد کا ہوتا ہے۔ سکھ، ہندو، مسلمان مرد کی الگ شناخت ہوتی ہے۔ عورت بے چاری کی کیا پہچان۔ جس مرد کے ساتھ بندھ گئی۔ اس کے مذہب کی ہو گئی۔

کچن میں جاکر رام کلی نے شوبھنا جی اور سلطان صاحب کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو بری طرح الجھتی چلی گئی۔ اس کا چھوٹا دیہاتی ذہن یہ قبول ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ ہندو مسلمان آپس میں شادیاں کر سکتے ہیں۔ خوش رہ سکتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو آئے دن پھر فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ دنگے، آتش زنی، عصمت دری، لوٹ مار کس لئے۔ مذہب تو یہ سب نہیں سکھاتا۔ مندر مسجد کا جھگڑا کیوں۔ اسے اپنے گاؤں کا چھیدی لال یاد آگیا جو ایک میرٹھ کی ایک پٹھان مسلمان لڑکی کو بیاہ لایا تھا۔ معاملہ وہی پیار محبت کا تھا۔ مندر میں باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ چند روز بعد لڑکی کا باپ، بھائی اور دیگر رشتہ دار پولس لے کر اس کے گاؤں آدھمکے تھے۔ لڑکی نے لاکھ کہا کہ وہ بالغ ہے۔ شادی بھی اس کی رضامندی سے ہوئی ہے اور کہ اس کا باپ اسے ایک عرب شیخ کے ہاتھ بیس ہزار میں بیچ رہا تھا۔ وہ بھاگ آئی۔ داروغہ نے کچھ نہیں سنا چھیدی لال کے ساتھ اس کے باپ اور ماں کو بھی بے دردی سے مارا۔ لڑکی کو اس کے باپ کے حوالے کیا اور چھیدی غریب کو حوالات میں ڈال دیا۔ قانون بھی امیر غریب میں امتیاز کرتا ہے۔ سلطان صاحب بڑے جاگیردار تھے اور چھیدی بے چارہ ایک غریب دیہاتی۔ قانون اندھا نہیں ہوتا۔

ناشتہ کے بعد میڈم نے نئی کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ریلوے اسٹیشن جارہی ہوں۔ شوبھنا جی کو رسیو کرنے۔ ان کا کمرہ، باتھ روم وغیرہ اچھی طرح صاف کر دینا۔"

کمرہ سجاتے، سنوارتے رام کلی نے سوچا کتنی عظیم ہستی ہوگی۔ شوبھنا جی۔ ولایت پلٹ۔ کروڑپتی، جاگیردار کی بیوی ہو کر مزدوروں کے لئے کام کرتی ہے۔ ان کی گندی بستیوں میں جاتی ہے۔ ان کے لئے جلسے کرتی ہے، جلوس نکالتی ہے۔ جیل تک ہو آئی ان کے لئے۔

ذرا سستانے بیٹھی تو چار آنے منہ میں کھینی رکھ آگیا۔

"ارے او بدھو رام، شوبھنا جی کو یہ پان کھانا، تمباکو چبانا اچھا نہیں لگتا۔ جا کلی کر کے آ۔ لیکن

نہیں سمجھے گا ۔

"کیا نہیں سمجھوں گا" چارلی ہنسا۔ "میں ان
میر عورتوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ سب جھوٹ ہے۔"

چارلی کو وہیں چھوڑ کر وہ نوکروں کے کوارٹرز
کی طرف چلی گئی۔ وہاں کا حال دیکھا تو جیسے بھڑک گئی۔
اس کے دونوں بیٹے ننگ دھڑنگ گھاس پر لوٹیاں
لگا رہے تھے۔ مالن کالی کلوٹی بیٹی کا سر گھٹنوں میں لئے
اس کے بالوں سے جوئیں نکال رہی تھی۔ بدبودار پیوند
لگی، میلی سی رضائی دھوپ میں پھیلا دی گئی تھی۔ پتلی
مالی، ٹانگوں کو کھجاتا مالی بیڑی پھونک رہا تھا۔ ادھر
ادھر بیڑیوں کے ٹوٹے بکھرے تھے۔

"ارے بے شرمو، یہ کیا کر رہے ہو۔" رام کلی
نے غصہ سے کہا۔ "اے رام بھروسے۔ اپنا یہ رضائی اور
چارپائیاں۔ اندر رکھ، انہیں اور ان بھتنوں کو
آدمی بنا نہلا دھلا کر۔ اور سکھیا تم یہ کیا کر رہی
ہو۔ اس چڑیل کے بال کٹوا کر ڈی۔ ڈی۔ ٹی ڈال ان
میں۔"

"موسی، اندر سے شیمپو اور تیل لا دو۔ خوشبودار۔"
لڑکی ہنسی۔

"اب رمیا۔ تہار طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔ کسی
کا بیاہ سادی ہے کیا۔ پر کہیں کی ہوگی۔ مالکن تو اکیلی رہتی
ہیں۔"

"بڑبڑ مت کر چیادہ، جو کہہ رہی ہوں سو ہی کر۔
نہیں تو شوبھنا جی ۔" اس نے سوچا یہ جاہل کچھ نہیں سمجھے
گی۔ مفت کی سر کھپائی سے فائدہ۔

اندر آکر ڈرائنگ روم، کلینر سے پردے، قالین، صوفے
دلوا دیں صاف کیں۔ چادریں بدلیں، نئی کٹلری اور کراکری
نکال کر سلیقے سے رکھی۔ میڈم نے کہا تھا کہ شوبھنا جی کے
لئے چاندی کے برتن نکالنا۔ فریج میں بیف سٹیکس،
پورک، سلامی، ساسیجز، انڈے، مکھن، پنیر، شہد،
موسمی پھل، سارڈین بھرے تھے۔ شوبھنا جی آتے
ہی میوہ پانی لیں گی۔ پھر دو چار پھل ناشتہ میں بیف
سٹیکس اور پورک، بعد میں کریم کافی۔ دوپہر تک
آرام۔ لنچ میں مٹر چکن، ٹماٹو سوپ، مکسڈ ویجی ٹیبلز
اور فروٹ کریم۔ سہ پہر کو فروٹ جوس۔ اس کے بعد
مزدور بستیوں میں بھاشن دینے جائیں گی۔ غریب
مزدور عورتوں سے ملیں گی۔ چین کی عورتوں کے بارے
میں تفصیل سے بتائیں گی۔ فری ہومیو پیتھک ڈسپنسری
کا ادگھاٹن کریں گی۔ رات کے کھانے میں چکن سوپ،
بریانی اور قورمہ لیں گی۔ چپاتی برسوں سے چھوڑ رکھی ہے
سونے سے پہلے بالائی والا دودھ، رات کے کھانے پر شہر
کے معزز مل اونرز اور خاندانی رئیس جناب سکھوٹیا
صاحب ایم پی مہمان خصوصی ہوں گے۔

رام کلی تو بالکل ہی گڑبڑا گئی تھی۔ شوبھنا جی
سلطان صاحب کی بیوی ہو کر پورک اور سلامی کھائیں گی۔
یہ رام! گائے اور سور دونوں کھا جاتی ہیں۔ آخر اسے یہی
سمجھ آیا کہ وہ بہت بڑی مزدور لیڈر ہیں اور چین کا دورہ
کر کے آئی ہیں۔ چارلی سے بات کی تو کمبخت نے ہنس کر کہا۔

"دیدی، ان امیر آدمیوں کا کوئی دھرم ایمان
نہیں ہوتا۔ انہیں تو دولت اور اونچی کرسی چاہئے۔ چاہے
جیسے بھی ملے۔ لیکن تم یہ سب نہیں سمجھو گی۔"

میڈم سٹیشن سے اکیلی اور اداس لوٹیں۔

"شوبھنا جی نہیں آئیں؟" رام کلی نے تشویش سے پوچھا
"نہیں۔" میڈم نے حقارت سے کہا۔ "وہ لکھوٹیا

ہندی :- وجے
اُردو :- شمینہ

جنگ

ساری رات سہرا سے ڈر لگتا رہا۔ جھپکی ٹوٹتے ہی لگتا کہ مردا پوری طرح کفن میں لپٹا سیڑھیاں چڑھ کر دستک دے رہا ہے۔ "بائی او بائی دروازہ کھول نا" بستر پر وہ اور سکڑ جاتی۔ ما نو خود کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

اچانک پیچھے دروازے سے گناہ سسکی اوپر آجاتی۔ شیرا کو لگتا کہ سسکی کے ساتھ اُس بھی اندر آگئی ہے اور پنکھے سے لپٹ کر چاروں طرف پھیل رہی ہے۔

سڑک پر ابھی بسوں کی آواز نہیں تھی۔ شیرا سمجھ جاتی ہے کہ وقت دو اور تین کے بیچ کا ہوگا۔ رات ایک بجے تک سڑک چلتی ہے۔ آخری شو سے نکلے لوگ بسوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ پھر یہ جاپ کی طرح بسوں کا آخری تماشا گزر جاتا ہے۔ بمبئی سو جاتا ہے۔ لوکل گاڑیاں اور بسیں چار بجے جاگ جاتی ہیں۔ اور انہیں کے ساتھ جاگ جاتا ہے۔ بمبئی۔

بہت اجنبی لگا تھا یہ شہر۔ جب وہ بمبئی کارپوریشن میں آرکیٹیکٹ بن کر آئی تھی۔ شروع میں ڈری تھی تو باپ نے سمجھایا تھا۔ میں تو آگرہ سے شعلہ پور پہنچا تھا مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ اس نام کا کوئی شہر ہوتا ہے کوشش کر کے بھساول پہنچا اور پھر بھوپال۔ گارڈ بن کر جانا کہ ہر شہر، ہر گاؤں کا نام اور بولی الگ ہے۔ مگر اندر سے سب ایک ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کچھ شہر رکے رہتے ہیں جہاں مشکیں اور فیتا نہیں ہیں۔ اور کچھ بھاگتے رہتے ہیں کہ آدمی کے پاس ستانے کا وقت نہیں رہتا ہے۔"

پہنچتے ہی باپ نے لاج میں ٹھہرا دیا تھا۔ دو دن تو ماتحت گھومتے رہے اور ساتھی کتراتے رہے۔ بسلجا دیشپانڈے سے کسی ومن ہاسٹل کی بات کی۔ تو چٹکی بجا دی "کائی حرکت نئی میڈم۔ ہمارا ٹانگر انتظام کر دیگا"

ٹانگر یعنی اس کا عاشق۔ دل ہی دل میں ہنسی تھی شیرا۔ چوتھے دن سلجھا۔ فرینڈس کے ساتھ آئی۔ "چلئے میڈم۔ تمہارا پرابلم سولو جھالا۔ سکنڈ بلڈنگ میں اکاؤنٹ آفس میں کیشئر تو اکھولی بنایا ہے۔ کانٹروپ میں

اوپر منجھلا کمرہ رسوئی باتھ روم۔

فرنیڈ فریز ہانکتا ہے۔ اور اکاؤنٹ میں خوب ہاتھ مارا سالا۔ کھولی بنا ڈالا اور پیسہ آتے ہی پیلیس بنائے گا۔

ٹیکسی میں سلبھا ساتھ آئی تھی۔ دو سو گز کے پلاٹ پر نیچے چار کمرے، رسوئی ایک طرف چھت پر زینہ اور ایک کمرے کا سوٹ۔ باہر تختی۔ ایم۔ این۔ ککّڑ کی۔ چھوٹے سے آنگن کو دیکھ لگا کہ بمبئی میں ہندوستانی جی رہا ہے۔

لانگھدار دھوتی میں کھڑی عورت سے سلبھا بات کرتی رہی۔

بیٹی لا لوین آلی کا ہے۔ اپلیپا یہاں یہی ڈی تیلاما لون حیا (بمبئی میں نئی آئی ہے۔ اپنی بہن کی طرح ماننا)

مندا نے کچھ کہا تھا کھسپھسا کر تو سلبھا ہنسی تھی۔ نکو تائی انجینئر ہے۔ چھوکرا لوگ کیا پاس آئے گا۔ آفس کا صاحب ہے۔ ایسا ویسا پودگی نہیں ہے۔ ککّڑنی بھاؤں سے بوت بڑا افسر ہے"

قریباً ستائیس، اٹھائیس سال کی مندا سے تعجب سے تاکتی رہی تھی۔ پھر مسکرا اٹھی۔ "اکڑے یا" (آؤ)

سامان رکھ کر سلبھا کے ساتھ ٹیکسی سے ہی لوٹ پڑی تھی۔ مہنگا نہیں ہے میڈم۔ ہزار کرایہ اور ہزار روپیہ تین سال نیچے چھتیس پگڑی۔ چھوڑے گا تو لوگ پچاس دیدیگا۔ آفس کا آدمی ہے۔ ایک شٹ نہیں مانگتا۔ پراپرٹی ڈیلر تو چمڑی نکال لیتا ہے۔ بمبئی میں ہر چیز حاضر ہے۔ بس کھولی مشکل۔ کچھ ہے تو ہم راجہ ہے"

اور وہ منتہا۔

کوئی حرکت نہیں میڈم۔ بولتا تھا کہ ایسی چھوکری ہے۔ پورگا لوگ تو نہیں آئے گا۔ گھر بچہ لوگ والا ہے۔ ارے ایسے تو بمبئی کا ہر عورت ساوتری بنا دنیا کو لوم مارتا ہے۔ اور چھپکے جوہی پر بھیل پوری کھاتا ہے۔ ایلیفنٹا پر رومانس جاتا ہے سولیزیشن (civiligetion) ہی ایسا ہے کہ کھل کر جینے ہی نہیں دیتا ہے۔ اپنا آئی ہے نہ، بولتا ہے ٹانگر سے شادی بنائے گا۔ تو پوئجن (Poison) کھالے گا۔

چونکی تھی خیرا۔ "پھر؟"

ہم بولا ایسا (ابھی) کھوا۔ پرادر پوئجن بھی نقلی ملے گا جب تیری بات۔ پھر تم بھاکر (روٹی) مانگے گا۔ سکتا ہے نہیں۔ سو ما کھی ہم ہی دے گا۔ میں جانتا ہوں میڈم۔ کہ بمبئی شہر جھوٹ سے چمکتا ہے اور روٹی کے واسطے ترستا ہے۔ بوڑھا عورت کے ماتھے پلاسٹک سرجری سے جوان بنا سکتا ہے۔ اور اندر جانت نہیں ہو قریب چھ بجے وہ جاگ گئی ہے۔ نیچے دو چار لوگ آ گئے تھے۔ ایک بوڑھی بار بار وٹھل۔ وٹھل چلا رہی تھی۔ شیرا چھت سے نیچے جھانکتی ہے۔ مزا بائی بیہوش سی پڑی تھی۔ بوڑھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی جا گیو یا مزا بائی، تمہارا وٹھل جات آہے؟

(جاگو منزا بائی۔ تمہارا وٹھل جا رہا ہے)

کچھ ہی دیر میں ایک ٹیمپو آتا ہے۔ شیو ڑے ساتھ مزدور برف کی دو سلیاں اندر لے آتے ہیں۔ لاش کو برف پر لٹا دیا جاتا ہے۔ شیرا آفس جانے کا خیال ترک کر دیتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اگر نیچے اتری تو ککّڑنی روتی کھڑا ہوگا۔ اور کلائی پکڑ لے گا۔ دیکھ۔ دیکھا تمہارا چیرتر۔ بائی تو تو جانتا ہے سب۔ تیرا مرگھ اور یہ دونوں۔

وہ دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ خیال آتا

کیا مردہ اکیلے لائی ہوگی منزا بائی؟ یاد آتا ہے کہ رات میں عمر فن کے ساتھ آنے کے بعد شیوڑے واپس کہاں گیا تھا۔ ..... تو کیا دونوں بے صبری سے کلکرنی کی موت کا انتظار کرتے رہے۔"

برش کر کے کمرے میں آتی ہے تو کوئی دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے۔ بھانڈے مانجھنے والی بائی تھی۔ چار سال کے رنکو کو لئے کھڑی تھی۔ نیچے تو گڑبڑ چل رہا ہے ـــ شیوڑے شاب بولا۔ اوپر میڈم کو دے آؤ۔ اٹھتے ہی بھوت مافق دودھ مانگتا ہے۔ کہتے ہوئے کانچ کی بوتل پکڑا دیتی ہے۔

رنکو نیند میں تھا۔ بستر پر لٹاتے ہی سو گیا۔ شیرا گیس جلا کر دودھ گرم کرنے رکھ دیتی ہے کہ نیچے کے تماشے سے گنگو بائی کو فرصت نہیں ملے گی اوپر کام کے لئے۔

شیرا کو یاد آتا ہے کہ شروعات کے دو مہینے منزا بائی کو بنی ٹھنی دیکھا تھا۔ شوہر روز پی کر آتا تھا۔ اتاؤلے پن سے اسے اندر لے جاتی تھی۔ بھانڈے والی کہتی ـــ روز پچاس سو پاکیٹ سے مار لیتی ہے منزا بائی۔"

کبھی اوپر آکر خود ہی جھینپ چھڑانے کے لئے باتیں گڑھتی منزا بائی ـــ "کیا بولے شیرا بائی یہ مرد لوگ ہوتا ہی ایسا ہے۔ دارو مارنے کے بعد ہی کھولی اور بائی کو یاد کرتا ہے" کہہ کر ہنستی۔

آفس کے لوگ باتیں کرتے۔ دو چار سو کے نوٹ ڈال کر جاتا ہے سالا۔ آدھی سے زیادہ وہسکی مار کھولی پہونچتا ہے۔"

آہستہ آہستہ اداس رہنے لگی تھی منزا بائی۔ ہمارا مرد کا ڈوکا بگڑے لا ہے۔ دارو مار کے لہاش (لاش) کی مافق پڑا رہتا ہے۔ عورت اور عورت کی ضرورت سے مطلب نہیں۔ رنکو نہ ہوتا۔ تو لوکل نیچے گردن دے دیتا۔ بولنے پر گالی دیتا ہے..... رنڈی کیا تیرے کا پیتا ہے۔"

ایک نیا تجربہ شیرا کو ملا۔ آدمی کے مظالم اور کا چپ چاپ سہے جانا۔ تبھی دروازہ بھی اب اتاولے سے نہیں کھولتی۔ کلکرنی دروازے پر چھوڑ کر جاتا۔

اور ایک دن خبر آئی۔ ڈسمس ہو گیا کلکرنی۔ ٹھیکے داروں نے ثبوت جمع کر لئے تھے۔ غلط چیک رشوت اور کیس کا ہیر پھیر۔ اس رات بھی خوب پی کر آیا کلکرنی۔ مگر شیوڑے باہر سے نہیں لوٹا۔ آ گیا کلکرنی کو لے کر۔

نوکری چھوٹنے سے بوکھلا گیا کلکرنی۔ دن میں نکل جاتا اور رات میں شیوڑے چھوڑنے آتا۔ شیرا نے اسے صبح جلدی نکلتے دیکھا۔ رات میں بھی منزا بائی کو دروازہ کھولنے لگی تھی۔

منزا بائی نے ایک دن خود ہی کہا ـــ بہت اچھا مانس ہے شیوڑے۔ چھوٹا بھائی مانتا ہے کلکرنی کو۔ بہت سمجھاتا ہے، دارو چھوڑو۔ اپنے ٹھیکے پر کام دیگا۔ مگر کلکرنی سنتا ہی نہیں۔"

شیرا نے دیکھا کہ منزا بائی کے چہرے پر پہلے سے زیادہ گلابی پن آگیا تھا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی تیر رہی تھی۔ مانو پیتا شوہر ہو اور خمار بیوی کی آنکھوں میں اتر آتا ہو۔ اسے لگا کہ سلجھا سہمی کیتی تھی۔ بچی کے بارے میں۔

کبھی گھر میں کسی کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا اور منزا بائی رنکو کے ساتھ غائب۔ اندر کلکرنی لڑکھڑاتا دکھائی دیتا۔

دوسرے دن منزا بائی صفائی دیتی: "دارو چھوڑنے
ے ڈاکٹر سے اگت پوری میں۔ اور آج گیا کل۔ مانڈوپ
؛ اور۔ اور پھر اگت پوری۔ بوت ٹائم لگتا ہے۔"

"دوا ملی ــــ"

"نکو" ــــ ڈاکٹر بولا۔ تین دن بعد آنے کا۔
نک بنائے گا اسپیشل دوا۔ اور پھر تیسرے دن منزا
غائب۔

سلبھا دلیش پانڈے سے اس نے کہا۔ کوئی دوسرا
دیکھو۔ یہاں تو زاون لیلا اور داس لیلا چلتی ہے۔"

خوب ہنسی سلبھا ــــ بروبر سنگیتا میڈم ــــ
ن اڑی داس لیلا۔ "یہی تو خاص بات ہے ممبئی کی۔"
ہ سنجیدہ ہو کر بولی سلبھا دلیش پانڈے۔ یہ ممبئی ہے میڈم
نرک (جہنم) کے اوپری منزل پر اپنا سورگ (جنت)
ے رکھنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا لیلا ہے نہ ــــ ڈاور
بٹ میں کاکا کے پاس رہتا تھا۔ اس کے نیچے یورگی
، کا اناتھ آشرم تھا۔ تیرہ سال کا یورگی پر ٹیگنینٹ
یا۔ پولس تلاش کیا۔ تو یورگی بتایا کہ اوپر شندے
انے۔۔۔۔

"پکڑا گیا ــــ"

نہ بابا، پولس کو پیسہ کھلا دیا۔ اناتھ آشرم سے
رگی نکال دیا گیا۔ ڈر کے مارے لیلا میرے پاس آگیا۔
تماشہ دیکھو میڈم۔ اس ممبئی میں پکچر بنتا ہے۔
نا پردے پر دیکھو، کبھی کھولی میں۔"

رنکو جاگ گیا۔ شیرا دودھ ٹھنڈا کر کے بوتل میں
ر بوتل رنکو کو تھما دیتی ہے۔

نیچے اب پانچ چھ لوگ تھے۔ ایک آدمی پوچھ رہا
۔ ڈاک کون دے گا؟" شنیدہ نے ادھر ادھر تاکتا
ہے۔ پوچھنے والا شاید پنجابی تھا۔ دوسرا آدمی جھنجھلاتا
ہے ــــ داغ ــــ واہیات داغ ــــ الیکٹرک کریمٹوریم
میں ایسا کوئی لفڑہ نہیں۔ سلیج پر ٹکتی رکھو ٹنکی اندر
اور آدھا گھنٹہ بعد آدھا کلو راکھ سمندر میں پھینک
دو ــــ گنگا ہو یا کوئی اور ندی ــــ سب سندھو میں
سماہت ــــ پھر کلکرنی کا تھا کون، کمائی تھی۔ سو
لگن ہو گئی۔

رنکو کے ساتھ وہ بھی چائے پی ڈالتی ہے۔ روح
کی آواز اٹھی۔ گھر میں مردا پڑا ہے۔ اور تو چائے پی رہی
ہے۔"

خود کو بہلا رہی ہے ــــ موت تو نیچے ہوئی ہے۔
مرنا تو کہیں نہ کہیں کوئی رہتا ہی ہے۔ پھر چائے پیے
بنا گزارا بھی نہیں ہے۔ مردا اٹھتے ہی سبھی ہٹیں گے۔

ریلنگ سے نیچے جھانکتی ہے۔ اب نیچے سات
آٹھ لوگ تھے۔ اندر آ کر دیکھتی ہے کہ رنکو بوتل ایک
طرف پھینک کر اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے بستر گیلا کر دیا
تھا۔ شیرا مسکرا کر کہتی ہے۔ "نواب" پھر چھی چھی
کر کے اس کی چڈھی نیچے پھینک دیتی ہے،
رنکو کو بٹھا کر بسکٹ کا پیکٹ پکڑا دیتی ہے
رنکو پیکٹ کھول کر بسکٹ کھانے لگتا ہے۔ شیرا بھی
کچھ بھوک محسوس کرتی ہے پر اسے بھوپال کی یاد آجاتی
ہے ــــ اربرا کالونی میں چاچا کے یہاں گئی تھی ماں۔
وہاں اوپر کرایہ دار کے والد کا انتقال ہو گیا۔ دوپہر کو لوٹی۔
تو جلدی سے نہا کر بولی۔

"شیرے کچھ کھلا ــــ بہت بھوک لگی ہے۔"

"کیوں، چاچا کے یہاں کچھ کھایا نہیں؟"

"نا گیا رے۔ گھر مرا پڑا تھا پر مردا پڑا ہو تو کوئی

کیسے کھائے ؟

شیرا رنکو کو ٹوکنے والی تھی — لیکن نہیں کہا رنکو۔ نیچے تیرے باپ کی لاش پڑی ہے۔ مگر کہتے کہتے رک گئی۔

بھانڈے والی پھر اوپر آگئی۔ اور رنکو کو یہ کہتی لے گئی۔ شیو رہے درشن کرا آ جا آ ہے، بائی (آخری درشن کرانا ہے بائی)

کمرے میں تالا ڈال کر وہ بھی نیچے آجاتی ہے۔

شیوڑے نے شاید سب جگہ خبر کردی تھی۔ پرانے دفتر والے، یار دوست اور رشتے دار اندر، باہر کھڑے تھے۔ مندا بائی اب ہوش و حواس میں اپنی چوڑیاں فرش پر توڑی۔ بار — بار شوہر کے سینے پر گر رہی تھی۔ دودھ والے بھیا کی کاکی بار بار پیچھے کھینچ کر کہہ رہی تھی۔ "ارے اب تھوڑے آنسو بچا لے — اب تو جنم بھر رونا ہے۔"

ارتھی باہر لے جانے کے لئے اٹھانے سے پہلے شیوڑے لاش کے سرہانے رنکو کا سر رکھ دیتا ہے۔ اور پھر کفن سے ڈھک دیتا ہے۔ پنجابی سا دبلا آدمی کہتا ہے — پاؤں آگے کی طرف بھائی۔"

عورتیں بلکھ اٹھتی ہیں۔ رنکو چیختا ہے "پاپا" شیرا اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔ "پاپا ... جا رہے ہیں۔" شیرا کو لگتا ہے کہ فانی جسم کی اصلیت آدمی جیتے جی بھلا رہتا ہے — وید۔ قرآن اور بائبل۔ عزو دل پیسے اور عیش ... رہتا ہے"

آنگن چیخوں کے بعد سناٹے سے بھر جاتا ہے۔ ... بے جان سی بیٹھی تھی۔ دودھ والی بھیا کی کاکی اور ... بڑھا مندا بائی کو غسل خانے لے جاتی ہے

دروازہ کھلا رہتا ہے۔ اور یہ لاش کے اوپر پانی رہتی ہیں۔ مندا کے گداز جسم کا اندازہ لگا لیتی ہے اب — اب تو کلکرنی بھی گیا —

شام کو شیوڑے کے بچے آگئے۔ پندرہ کی لڑکی۔ اور دس سال کا ارون — چوتھے دن بھی آئے۔ پوجا بھی ہوئی۔ اور ساتویں دن شیو کا خاندان بھی آگیا ٹرک میں سامان بھر کر۔ معلوم کہ شیوڑے کی بیوی بھی مر چکی ہے اور وہ رنڈوا

اداس لہجے میں بتایا مندا بائی نے — اپنے سے ایک لاکھ دے کر بچایا تھا۔ شیوڑے نے جانے سے پہلے میں گھر اور شراب کے لئے دیتے" وکیل کے سامنے دو کمرے اور رسوئی کا اسٹامپ لکھ گئے تھے۔ کہتے ہوئے لمبا سا سانس بھرا تھا مندا شیرا سمجھ گئی۔ ٹھیکیدار شیوڑے نے پورا بنایا ہوگا۔ مکان اور عورت پر قابض ہونے کا۔

اکثر شام کو شیرا لوٹتی تو گھر میں بس بچے رنکو شکایت کرتا ارون کی۔ "مارتا ہے" دفتر اکر شکریہ ادا کر گئیا تھا ایک دن شیوڑے — کریں میڈم — دوست تھا کلکرنی۔ چاہتا تو پورا لکھا لیتا — پر ایسا نہیں کیا — آخر بھگوان بھی ہے۔ اس دن آپ بہت مدد کیا۔

سلجھا پاس بیٹھی تھی۔ شیوڑے چلا گیا بنا کر بولی۔ فالتو شائننگ مارتا ہے سالا کہ مکان تو مکان — غریب کا ہائے کو بھی مار گئے حرامی نے۔ یہ بمبئی ہے میڈم۔ اور پورا ملک بھی کوشش میں ہے۔ سرکار خوب مدد کر رہا ہے۔
...

شیرا سلیھا سے کہتی ہے۔
کہاں جائے۔ ابھی قیس کی ہے۔ مرد کا آنکھ اور ناخون سے کہاں بچے گا۔ پھر اس کا اپنا تمنا۔ دبے ڈھکے میں سب چل رہا ہے۔ اسے ایڈجسمنٹ آف لائیونگ کہتے ہیں۔

کب تک چلے گا۔ کیسے چلے گا؟

جب تک شیوڑے بوڑھا نہ ہوجائے۔ یا منداتڑک نہ اٹھے۔ اور ایسے چلے گا جیسے بمبئی چلتا ہے جہاں ہوٹل کے کوڑے دان سے چوسی ہوئی بوٹی منہ میں ڈال کر فٹ پاتھ کا چھوکرا پوسٹر سے جھانکتی ہوئی ادھ ننگی پوجا بھٹ کے خواب دیکھتا ہے۔

اسی دن کی شام اوپر آئی تھی منڈا بائی گھبرائی ہوئی۔ رشمی بھاگ گیا میڈم۔ شیوڑے بابو کو پہلے آج بولا تھا کہ چھوکرا لوگ کے ساتھ زیادتی مت گھومنے دو۔ تب ہنسا تھا ——— تم فقط میٹرک فیل ہے سو نہیں سمجھے گا۔

شیرا غور سے منڈا بائی کی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔

شیرا کو لگا۔ کہ دکھ اور کمزوری کے باوجود منڈا بائی خوبصورت لگتی ہے ۔۔۔۔ بمبئی کی طرح جہاں ناجائز دھندے، تعلق اور کوڑے دان سے اٹھا کر جھوٹن کھاتے رہتے ہیں لوگ۔ مگر بمبئی سجی رہتی ہے —— سر پھرا ہے بمبئی۔

بھاگ، دوڑ، پولس اور دیواروں پر ٹکا مار لڑکی کے بھاگ جانے کا دکھ ہوا۔ کو سوپ کلکرنی کی طرح شیوڑے شراب میں ڈوب کر آتا ہے۔ ہاری تھکی سی منڈا بائی دروازہ کھولتی ہے تو شیوڑے دہاڑتا ہے

کتی، رات ہوئیا اگو در جھونی جائے۔ (کتیا، رات ہونے سے پہلے سو جاتی ہے)

ایک رات ہاتھ اٹھا دیا تھا۔ ملا تھا بوا ڈوری تو کوٹھا ایسے۔ تو بھوا بڑیلا جیا پیشاور بھی پیٹ ناہی (تو کون ہے روکنے والی۔ تیرے خصم کی کمائی نہیں پیتا ہوں)

چپ چاپ اندر چلی گئی تھی منڈا بائی۔ اور اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ نشہ اترنے پر منانے آیا تھا شیوڑے۔ مگر لگاتار دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی منڈا بائی نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ شیوڑے دروازے کے باہر ہی پڑا رہا تھا رات بھر۔ زندگی ہار گئی، کچھ ایسا ہی لگا ہوگا منڈا بائی کو۔

رات کی داستان سن کر خوب ہنسی تھی سلیھا دیش پانڈے۔ دنیا گول ہے میڈم۔ کلکرنی ہٹا تو شیوڑے آگیا سین میں۔

پھر گمبھیر ہو بولی تھی —— مرد کے مرتے ہی عورت کٹی پتنگ ہو جاتا ہے۔ جو لوٹ لے وہی اڑاتا ہے۔ من مافق استعمال کرتا ہے۔ ہم اور آپ پیروں پر کھڑا ہے۔ اس آدمی پر منحصر نہیں رہے گا۔

شام کو گھر لوٹی شیرا تو منڈا بائی کو خوب سجے سنورے ہوئے دیکھا۔ شیرا سنگھار کی وجہ سوچتی ہے۔ محسوس کرتی ہے کہ منڈا بائی لڑنے کی تیاری میں ہے۔ روپ کا آخری تیر چلانے کی تیاری میں ہے۔ پر کیا جنگ فیصلہ کن ہوگی۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس
پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے
مانڈ روڈ گیا سے شائع کیا

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب :۔ تشنہ تشنہ
نوعیت : شعری مجموعہ
فنکار محمد خطیب اللہ حمیدی
ضخامت :۔ ۵۶۴ صفحات قیمت :۔ ۱۰۰ روپئے
پتہ :۔ محمد خطیب اللہ حمیدی، آم گولہ روڈ، مظفرپور ۲

★ ڈاکٹر محمد خطیب اللہ حمیدی کا مجموعہ کلام تشنہ تشنہ اپنی شاندار کتابت و طباعت اور اعلیٰ گٹ اپ کی وجہ سے پہلی نظر میں دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ اس مجموعے کی دوسری وجہ کشش اس کی غیر معمولی ضخامت ہے۔ ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ضخامت کا یہ مجموعہ کئی حیثیتوں سے یہ بتا رہا ہے کہ یہ عام روش سے مختلف ہے۔

یہ تاثر اندرونی صفحات کے مطالعہ کے بعد بھی قائم رہتا ہے اس لئے کہ یہاں اردو شاعری کے مروجہ نظام صوتیات سے رخصت و فرار کے نقوش ہر جگہ ملتے ہیں۔ یہ بات یقیناً طمانیت اور مسرت کی ہے کہ خطیب اللہ حمیدی نے شاعری کو ہیئت کی پابند بنانے کی کوشش نہیں کی ہے اور اس طرح ایک فرسودہ نظام ساخت کو توڑنے کی جرات مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری کو محدود و مخصوص ڈھانچے سے باہر نکال کر برتنے کے قائل ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ کائنات میں پھیلا ہوا صوتی نظام گنے چنے اوزان کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ شاعری کو غنائیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غنائیت کا کیا مفہوم ہے اور اس میں کتنی وسعت پیدا کی جا سکتی ہے نیز مختلف انسانی طبقوں میں غنائیت کا مفہوم کیوں اور کس طرح بنتا ہے اس پر تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے ۔۔ مگر فی الحال اس کا موقع نہیں۔

ڈاکٹر خطیب اللہ حمیدی نے ایک جامد ساکت صوتی دائرے سے نکلنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن اب تک وہ کوئی نئی خوشگوار منزل حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ان کی نظمیں فکری اعتبار سے تو کہیں کہیں عمیق ضرور ہیں لیکن ان میں شعری سرمدیت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ ان لفظوں میں ان کی شخصیت کا اکیلا پن ان کی تنہا پسندی اور ان کے لہجے کی کلاسیکی کا شائبہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اپنے قاری کو ساتھ لے چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ کسی زبان

ت میں تخلیقی اجتہاد کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں وہ
طیب اللہ حمیدی کی سرحد گرفت سے باہر رہیں۔
کے امکانات کے ساتھ ساتھ ان کے محدودات
نظر رکھنی چاہئے۔ غزل جیسی باقاعدہ اور روایت
صنف شاعری میں بھی انہوں نے جس آزاد روی کا ثبوت
اس کی وجہ سے متعدد مصرعے بحر و وزن سے خارج
ہیں۔ بفضلہ طیب اللہ حمیدی کے یہ انحرافات قابل قبول
ہو سکتے۔ وہ اردو شاعری کے قارئین کے ذوق کو
چاہتے ہیں یہ اچھی بات ہے لیکن میری ان سے یہ
ش ہوگی کہ وہ کچھ اپنے آپ کو بھی بدلنے کی کوشش
اور اردو کے شعری جمالیات کے ساکت دریا میں
طرح پتھر پھینکیں گے کہ ان سے خوشگوار لہریں پیدا
۔ یہ بات میں ان سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان
ن کار خیر کی صلاحیت خلقی طور پر موجود ہے۔

▲ ڈاکٹر علیم اللہ حالی

ن :- اکائی کے بعد (شعری مجموعہ)
ن کار :- ضیاء الانجم ضیا پرتاب گڈھی
ت :- ۱۶۰ ▲ قیمت :- ۵۰ روپئے
ہ :- اکائی منزل ملک کمپاؤنڈ صدر بازار، جبل پور

ایم۔ پی ۔ ۴۸۲۰۰۰
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے اشتراک تعاون
نظر عام پر آیا ضیا پرتاب گڈھی کا یہ شعری مجموعہ
ئی کے بعد" جدیدیت اور قدامت کے اشتراک کا
لیا حسین و جمیل اور فنی و اسلوبیاتی خوبیوں سے
گر ہوتا ہے جس سے قاری کے ذوق تسکین کے

ردائتی کلاسیکی شاعری کے اس کشاکش دور آتے نے
ادبی حلقوں میں ضیا کی سابقہ پہچان اور انفرادیت کو
اور بھی استحکام بخشا ہے۔ گرچہ یہ صحیح ہے کہ اس سے
قبل "اکائی سے پہلے" نے ہی ادبی دنیا میں ان کی شناخت
قائم کر دی تھی جس کا اعتراف خود شاعر کو بھی ہے ؎

دنیا نے مجھ کو جانا اکائی کی شکل میں
ورنہ مرا وجود صفر سے سوا نہ تھا

ضیا کی شاعری میں کیفیات عشق، ہجر و وصال کی لذتیں،
حسن کا عشوہ طراز یاں، غم و الم، حسرت و یاس، محرومی
و نامرادی کا اظہار، غم جاناں اور غم دوراں کی حدیث فکر
روزگار سب کچھ ہے۔ لیکن ان سبھوں کے ساتھ اس
فضائے حسرت و یاس سے نکلنے اور ان کا مردانہ وار
مقابلہ کرنے کا عزم و حوصلہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے جو
سب سے بڑی چیز ہے۔ ملاحظہ ہوں اس سلسلے کے چند
اشعار ؎

میں تمہاری آنکھوں میں اترا ہوں مجھ کو علم ہے
دل کی بستی میں جگہ دے کر بسا ڈالو مجھے

ضیا کی شاعری میں کیفیات

آ تصور ہی میں آ، کچھ قرب کی لذت ملے
بن ترے اے دوست اپنی زندگی دوبھر لگے

تمام راحت دنیا میں عیش و عشرت میں
ترے بغیر ملے بھی تو کچھ سکون نہیں

تازہ لہو سے غسل پرندوں کا دیکھ کر
بڑھتی ہی جا رہی ہے مری روح کی گھٹن

ایسا لگتا ہے ابھی چاند نکل جائے گا
ایسا منظر کبھی ان نظروں سے گذرا ہی نہ تھا

[illegible] جہاں جانے فضاؤں میں شہاروں کی طرح
[illegible] شاعری کا بغور مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے
[illegible] شعری سفر میں بڑی سبک روی اور تیز گو[illegible]
[illegible] ساتھ قدیم شعری روایات کو سینے سے لگائے
[illegible] فنی شعور کو دوش بدوش لئے اپنی منزل
[illegible] گامزن ہیں۔ انہوں نے بڑی فنی مہارت اور
[illegible] کے ساتھ لفظیات کو جدید معنی و مفہوم عطا
[illegible] اور محاورات و تمثیلات کو جدید معنی و مفہوم
[illegible] و آہنگ دے کر خوبصورتی کے ساتھ شعری پیکر
[illegible] ڈھالا ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔
[illegible] ضرب الامثال اور تمثیلات کی ادائیگی میں تو
[illegible] مہارت کاملہ حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں شعریت،
[illegible] ، موسیقیت اور ترنم کی لہریں موجزن ہیں۔ بعض
[illegible] میں بلا کا رنگ تغزل ہے۔ غزلیں چھوٹی بحر میں ہوں
[illegible] بحر میں سب اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی جدت پسند
[illegible] اور پرواز فکر نے نئی تراکیب پر بھی کامیاب
[illegible] آزمائی کی ہے۔ وہ اپنی کاوشوں میں فنی عروضی
لسانی اعتبار سے کامیاب نظر آتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں صفحہ ۵۶ اور ۵۸ کے چند
[illegible] علاوہ چند دیگر توجہ اور نظر ثانی کے طلبگار ہیں۔
[illegible] "بیر" اور "بھانکے سیکر" جیسے
[illegible] پر گراں ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب
[illegible] کوشش ہے۔ اشعار میں روانی اور سلاست ہے الفاظ
[illegible] ضخامت اور طرز قابل قبول ہے۔ عام

[illegible]
اس کی ضخامت اور افادیت کے لحاظ سے زیادہ نہیں
ہے۔

▲ ڈاکٹر سید ابولطیف سید آبادی

دو آتشہ

نام کتاب :- دو آتشہ
مترجم شاعر :- چندر شیکھر عکس بھارتی
صفحات :- ۱۳۶ قیمت :-
پتہ :- چندر شیکھر عکس بھارتی، پرنسپل گورنمنٹ سیکنڈری اسکول چاؤ لا تحصیل نو، شہر دو آبہ ضلع جالندھر (پنجاب) پن کوڈ ۱۴۵۱۰

دو آتشہ چندر شیکھر عکس بھارتی کی چیدہ فارسی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں کی شعری تخلیقات کے جامع اور پر مغز اردو ترجمے کا مجموعہ ہے جو ایک معیاری ترجمہ کی تمام تر خوبیوں سے کماحقہ، آراستہ و پیراستہ ہے فنون ادب میں ترجمہ ایک مشکل ترین فن ہے۔ اور اس پر بھی شعری ترجمے کا کام تو جوئے شیر لانے کے ذرہ برابر بھی کم نہیں کیونکہ شعری ترجمے کے لئے مترجم کو خود یکتائے فن ہو اور جس زبان کے شعری سرمایے کا ترجمہ کر رہا ہو اس پر ہر لحاظ سے اس کی مکمل گرفت تاکہ ترجمے میں اصل روح کسی طرح بھی مجروح نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ عکس کا "دو آتشہ" اس کسوٹی پر پورا اترا ہے اور اس کے تراجم میں اصل نسخے کی تمام تر خوبیاں ا[illegible] کیفیات بجنسہٖ و کماحقہ موجود ہیں [illegible] تو یہ کہ اگر ان کے اصل [illegible]

تو یہ ترجمہ اس عہد کا سب سے اعلیٰ و معیاری تخلیقی علمی اور شہ پارہ ہوگا۔

"دوآتشہ" میں کل ۷۲ مندرجات ہیں۔

کتاب کے آغاز میں عرفی اور فیضی کا دو مشہور شعر ہے۔ اس کے بعد لغتیہ کلام کی تمام تر خوبیوں سے مزین شاعر کی اپنی نعت ہے۔ بعد ازاں شاعر نے پند نامہ عطار سے نعت شریف کا مرصع اور مسجع ترجمہ پیش کیا ہے۔

"دوآتشہ" میں عکسی نے ۱۸ مشہور آفاق انگریزی نظموں اور سانیٹ کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ تراجم جہاں ایک طرف عکسی کی انگریزی زبان و فن شاعری پر مکمل گرفت کی نشاندہی کرتے ہیں وہیں ان کے خالق و فنکار سے ان کی جذباتی ہم آہنگی کی بھی عکاسی ہیں۔ یہ ساری نظمیں اخلاقی قدروں اور بہتر انسانی کردار کا درس دیتی ہیں۔ ان میں حب الوطنی، انسان دوستی، اولوالعزمی، یکجہتی، اور درس خودداری و خود اعتمادی ہے۔ یہ اصل ماخذ کی تمام تر خوبیوں سے مرصع اور لبریز ہیں۔

فارسی کی نظموں اور ترکیب بند کی تعداد ۱۳ ہے۔ جس میں اقبال کی نظم "سرود انجم" اور حضرت فریدالدین عطار کی نظم "در بند غم خواری مردم" کے علاوہ محتشم کاشی کے ۱۱ ترکیب بند بھی شامل ہیں جو واقعات و سانحات کربلا کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میں انسانیت کے لئے پیام زندگی ہے۔

ہندی اور سنسکرت نظموں میں بھرتری ہری کے اقوال اور گیتا کے وہ مذہبی اقوال ہیں جو دانائے علم و حکمت، پیامبر نقیب، انسانیت اور انسانی زندگی کو سنوارنے نکھارنے سجانے اور بنانے والے ہیں۔ ان کی کل تعداد ۱۴ ہے یہ تراجم بھی اپنے اصل سے مکمل طور پر اور بہر صورت مماثلت رکھتے ہیں۔ اور ان زبانوں کی نحوی اور فنی لوازمات سے مترجم کی پوری واقفیت اور دسترس کی غماز ہیں۔

کتاب کے آخر میں شاعر کی مطبوعہ اور زیر تخلیق تصانیف ایک لمبی فہرست ہے جو فن ترجمہ سے اس کے ذہنی اور جذباتی لگاؤ کی شاہد ہے۔

جہاں تک "دوآتشہ" کی زبان کا تعلق ہے زبان صاف ستھری عام فہم اور رواں دواں ہے۔ ہندی کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ عام فہم اور روزانہ مستعملات میں سے ہیں جیسے جیئے، سہاجلے، جیتی، دھن، چھپتر وغیرہ۔ اردو کے بھاری بھرکم الفاظ سے احتراز کیا گیا ہے۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری پاکیزہ اور اچھی ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ دوآتشہ کی لذت سے مخمور نگاہوں کی کیفیت قاری کو اپنی طرف خود بخود کھینچ لیتی ہے اس تصویر میں نفسیاتی کشش ہے۔

اس کتاب کی قیمت صرف ۲۵ روپئے ہے جو اس کی طباعت اور گیٹ اپ اور سرورق نیز اس کے مواد کی اہمیت و ماہیت و افادیت کے لحاظ سے تو درکنار اس ہوش ربا گرانی کے لحاظ سے بھی کچھ نہیں ہے

ادب نواز اور فن ترجمہ میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ اردو اکادمیوں کو اگر اپنی زبان اور اپنے ادب سے واقعی محبت ہے تو انہیں اس طرح کے کاموں کی تکمیل کے لئے اس کتاب کو انعامات سے نوازنا چاہئے۔

ڈاکٹر ابوالفیض سیدابادی

براہ کرم اپنے خطوط اور مضامین اختصار میں لکھیں
سہیل کے محدود صفحات کا خیال رکھیں (ادارہ)

شہرِ خیال

ادھر آپ مسائل اداریہ لکھ رہے ہیں اور یہ خوش آئند بات ہے۔ "سہیل" کے شمارہ ۱۲ جلد ۱۵ اداریہ پڑھ کر مجھے "اردو انٹرنیشنل" میں ڈاکٹر شکیل نوازش رضا کا اداریہ یاد آگیا۔ آج اردو شعر و ادب کی جس طرح بے قدری ہو رہی ہے اس پر ڈاکٹر موصوف نے اپنے انداز سے روشنی ڈالی تھی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ شعر و ادب کی تخلیق اظہار ذات کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بقول غالب

ع ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

والی بات بھی ہوتی ہے۔ ورنہ تخلیق خالق کے ذہن و دل کے نہاں خانے سے نکل کر سارے عالم میں نہ پھیلتی۔ شکیل نوازش رضا نے لکھا ہے کہ شعر و ادب کے خالق کے لاشعور میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی خواہش اور داد و تحسین حاصل کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ ہر فنکار یہ چاہتا ہے کہ اس کا فن زیادہ سے زیادہ نظروں سے گزرے۔ ہر شاعر و ادیب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تخلیق کے زیادہ سے زیادہ قاری ہوں۔ یعنی قاری کی اہمیت مسلم ہے اور قاری تک کوئی تخلیق اس وقت پہونچ سکتی ہے جب اس کی اشاعت ہو۔ کوئی تخلیق جب شائع ہوتی ہے اور قارئین کے زیر مطالعہ آتی ہے تبھی اس کے حسن و قبح کا اندازہ ہوتا ہے۔ تبھی تخلیق کار کی تنقید و توصیف ہوتی ہے۔ اس وقت اس فن پارے کی بلندی اور درجہ کا تعین کیا جاتا ہے اور اس وقت یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ شاعر و ادیب کس مرتبہ کا ہے اور اس کی تخلیق کس حیثیت کی ہے۔ یعنی تخلیق کی اشاعت بے حد ضروری ہے اور کسی تخلیق کے شائع ہونے کے بعد اس کے قاری کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح شعر و ادب کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

اردو شعر و ادب کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا قاری عنقا ہو گیا ہے۔ شعراء و ادبا بہت ہیں اور اعلیٰ تخلیقات بھی۔ مگر قاری ناپید ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ قارئین کی کمی کا مسئلہ صرف اردو شعر و ادب کا مسئلہ ہے۔ دوسری زبانوں میں جو تخلیقات تحریر کی جاتی ہے ان کی تعداد اشاعت ہزاروں اور لاکھوں میں ہوتی ہے۔ فکشن کے تو بلاشبہ کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے

ہوتے ہیں اور بہت آسانی سے فروخت ہوتے ہیں لیکن اردو میں شعری مجموعے کی تعداد تو ہزار سے آگے بڑھتی ہی نہیں اور وہ بھی بے چارہ شاعر اسے اپنے دوستوں کی نذر کر دیتا ہے۔ فکشن کی حالت اس سے قدرے بہتر ہے اور ادبی رسائل و جرائد کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نشر و اشاعت کا کام ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔

اردو شعر و ادب کا قاری ادبی رسائل و جرائد کے خریدنے کا قائل ہی نہیں ہے۔ زیادہ تر رسائل اشتہارات کی موجودگی کے باعث شائع ہوتے ہیں یعنی جب اشتہار مل جاتا ہے تو شائع ہو جاتے ہیں اور دوسرے شمارے کے لئے پھر کاسہ گدائی پھیل جاتا ہے۔ خریداروں کی فہرست ہوتی ہی نہیں۔ رسالہ شائع کرنے کے بعد ناشر و مدیر اپنے جیب خاص سے پوسٹیج کا بندوبست کر کے تمام ادیبوں اور شاعروں کو اپنا جریدہ روانہ کر دیتے ہیں۔ جواب میں چند توصیفی خط موصول ہوتے ہیں اور بعض جید ادبا و شعرا، تو جواب سے سرفراز فرمانا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ادبی جرائد کی حالت تباہ ہے۔ وہ مر مر کر جی رہے ہیں۔

اس رویہ اور انداز فکر اور ان حالات کی وجوہات کیا ہیں؟

کیا ٹی وی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی یا تعلیمی معیار کی پستی! بالکل نہیں! اگر ایسا ہوتا تو ان ممالک میں جہاں ٹی وی پر سینکڑوں چینل دن بھر چلتے رہتے ہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق بند ہو چکی ہوتی۔ ادبی جرائد کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان ممالک میں شعر و ادب کے قارئین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ گرانی اور تعلیمی معیار کی پستی کو بھی سبب قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ غیر ادبی اور نیم سیا[سی] نیم فلمی رسائل، جرائد اور اخبارات کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ایک باشعور بالغ نظر انسان یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اردو شعر و ادب کی اس بے قدری کی سب [سے] بڑی وجہ یہاں کی معاشرتی و سماجی زندگی میں نما[یاں] تبدیلی ہے۔ اقدار اور انداز فکر کی تبدیلی ہے۔ تو[ہم] معیار علم بدل گیا ہے، وہ قدریں جنہیں کبھی اعلیٰ و ا[رفع] تصور کیا جاتا ہے اب بے وقعت ہیں اور اسی وجہ [سے] شعر و ادب کی اس سماجی زندگی میں کوئی حیثیت نہ[یں] ہے۔

کیا یہ اردو کے شاعر و ادیب کے لئے لمحۂ فکریہ ہے؟

سہیل کے اس شمارہ میں پروفیسر سید نجیب[...] پر مضمون بڑا جاندار اور بہت ہی بولڈ ہے۔ یہ مضمون قمر عثمانی صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔ ان سے مزید یادداشت لکھوایئے تاکہ شخصیت نگاری میں اضافہ ہو سکے

▲ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سہیل پابندی سے مل رہا ہے۔ شکریہ
اپنی غزلوں کی اشاعت کا انتظار ہے، تاکہ اور کچھ کلام بھیجوں۔

آپ نہایت توجہ طلب مسائل کو اپنے [...] میں ابھار رہے ہیں۔ جو انتہائی اہم ہیں اور غور و فکر [کی] دعوت دیتے ہیں۔ کچھ نام نہاد ادبی رسائل بڑا [...] مواد جو سطحی اور مخرب اخلاق بھی ہوتا ہے ادب [کے نام] پر شائع کرتے ہیں۔ بیشک تخلیق کار کے ساتھ ایسے

رسائل بھی اس کے لئے اتنے ذمہ دار ہیں۔

اس بار ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کی خود نوشت پڑھ کر ان کی شخصیت کے عظیم پہلوؤں کا انکشاف تو ہوا ہی لیکن زلزلے میں ان کے متعلقین کی دردناک ہلاکت کا المیہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے صبر جمیل اور زندگی کو زندگی کی طرح جینے کے حوصلے نے یقیناً نہایت متاثر کیا بلکہ رہنمائی دی ہے۔ لیکن انہوں نے کالم اچانک ادھورا چھوڑ جانا ٹھیک نہیں۔

حصہ غزل بہتر ہے لیکن زیادہ تر غزلیات کاتب صاحب کی کرم فرمائی کی نذر ہو گئی ہیں۔ اور غالباً پروف ریڈنگ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتی ہے۔

۱۔ مثلاً رفیق جابر صاحب کی غزل کا مصرع
" وفا کے دشت میں نبتے خار و خس اب تک "

۲۔ صلاح الدین نیر صاحب کا مصرع
(۱) دامن ہے سلامت اسے محفوظ ہی کر لیجئے
(دوسرا شعر)

(۲) دوسرا مصرع
" کل دیکھنا ہاتھوں میں یہ کسی پل نہ ملے گا "
(ساتواں شعر)

۳۔ رشید افروز صاحب کا مصرع
" اب جہاں اب ہیں وہاں سے واپسی ممکن نہیں "

۴۔ سید معراج جامی صاحب
مصرع " وہ کرتے رہے نظر سے گریز
(دوسرا شعر)

۵۔ اور گوہر شیخپوروی صاحب کا مصرع پڑھ کر تو حیرت ہوئی
" جیز اس کے سوا اور کہانی بھی نہیں ہے۔"

۶۔ عبدالسلام کوثر صاحب کے مصرع کا بھی جواب نہیں

غفلت و جہالت کی نگہبان ہے جہاں میں ہوں

امید ہے آپ اس طرف خاص توجہ دیں گے اور رسالے کو ایسی فاش غلطیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کریں گے۔

۸ سید احمد سحر، شاہجہاں پور

سہیل شمارہ ۲ شہر خیال کے تحت آپ نے جناب عبدالسلام کوثر کا خط شائع کیا ہے جہاں تک مشاعرہ باز شعرا کا تعلق ہے۔ شعرا کی اکثریت مطالعہ سے کوسوں دور ہے۔ شعری تخلیقات کی بھرمار کی بات بھی سچ ہے۔ اکثر مشاعرہ کمیٹیاں مشاعرے (ٹھیکیداروں (ناظم مشاعرہ) کے تعاون سے انجام دیتی ہیں۔ یہ ٹھیکیدار (ناظم مشاعرہ) ان مشاعرہ باز شاعروں کو کمیشن پر طے کر لیتا ہے اور یہ مخصوص قسم کے گلے باز شعرا صرف چار پانچ گیتوں، غزلوں کو ہی پورے ہندوستان کے شہروں گاؤں میں گاتے پھرتے ہیں۔ ان میں (اکثر) نوجوان خوبصورت گلے باز شاعرات مشاعرہ میں ناز و انداز اور نخروں کے ساتھ گیت پڑھتے نہیں گاتے ہوئے طوائف اور مجرا کا ہی تاثر دیتی ہیں اس طرح اردو زبان کے لاکھوں کروڑوں پست معیار سطحی سامعین شائقین کا منورنجن تو ہو جاتا ہے لیکن مشاعرہ گاہیں اردو زبان و ادب کا قبرستان ہی ثابت ہوتی ہیں۔ سچ ہے شہرت، دولت عزت کی خاطر دنیا میں کتنی ذلت تک برداشت کر لیتے ہیں لوگ!

کوثر صاحب نے نعمان شوق صاحب کی سہیل میں شائع شدہ غزل کے ایک شعر "کسی دن ان سے ہندوستان بھی خالی کرالیں گے۔ چلو مسجد تو دینے کو ہوئے تیار مولانا" پر اعتراض کرتے ہوئے ثبوت مانگا کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے کب مسجد حوالے کر دینے کی بات کہی۔ یہ خبر کسی اخبار

ہیں جیسے دراصل صلاح الدین اویسی، سید شہاب الدین اور حنیف تنویر جیسے لوگ بھی بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں اہم رکن بنے جو کسی صورت مولانا نہیں۔

یہ شعر ظالم، لٹیرے، مکار، حکمرانوں نے منظور نظر صلح حدیبیہ کو طوطے کی رٹ کی طرح بار بار دہرانے والے مولانا جو آج کل آر ایس ایس کے مسلم نمائندے الرسالہ کے ایڈیٹر جب ملک جل رہا تھا، قتل عام ہو رہا تھا تب جبکہ (ہندو) اور سرکاری سنتوں کے ساتھ حکومت کی سرپرستی میں ملک میں گھوم گھوم کر مظلوم قوم مسلمانوں کو ظالم فسادی کہہ کر بابری مسجد چھوڑ دینے پر آمادہ کرنے کے لئے، ماحول ساز گار بنانے میں جٹے مولانا وحید الدین خاں کی اس سازشی حرکت کی طرف اشارہ ہے میں ایک معمولی سا شخص ہوں۔ لقمان شوق کا یہ شعر موجودہ علمائے کے لئے تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے ویسے عبد السلام کوثر صاحب کے اس اعتراض پر لقمان شوق صاحب بہتر روشنی ڈال سکیں گے۔

سہیل ادب برائے بکواس نہیں بلکہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا ہی ترجمان رہا ہے۔ اس کے لئے سہیل کو مبارکباد۔

▲ منصور اعجاز، ایوت محل (مہاراشٹر)

شمارہ ۲ صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے پچھلے شماروں سے جاذب ہے۔ آپ کا اداریہ پسند آیا۔ شہر خیال کے تحت عبد السلام کوثر کا مکتوب بھی حقیقت سے قریب ہے۔ ارشاد بن نظام کی کہانی بہت اچھی لگی۔

▲ تسلیم نیازی
برہمپورہ، مسنول

ملی ہی سہیل کا تازہ شمارہ (۲، ۲۰۰۵) ملا اور میں عید سے دو دن پہلے کلام حیدری مرحوم کی تبصرہ نگاری پر ایک مضمون بھیج چکا تھا ساتھ ہی گزشتہ شمارے پر بھرپور رائے بھی تھی۔

موجودہ شمارے میں محترم پروفیسر گیان چند جین صاحب کا مولوی عبد الحق مرحوم پر تحقیقی مضمون شمارے کی جان ہے۔ خاص طور پر طلبہ کے لئے ریکارڈ رکھنے کے قابل ہے۔ گیان چند جین صاحب نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ حق ادا کیا ہے۔

ایلاف نیری نے نوجوان قلم کاروں کو جو مشورے دیئے ہیں وہ یقیناً قیمتی ہیں۔ فیروز نظامی، رند ساغری، عبد المتین نیاز، راز اناوی، مدہوش بلگرامی کی غزلیں اور نذیر فتح پوری کے ماہیے بہت خوب ہیں۔

کالی داس گپتا رضا بھی ہمارے دور کے ایسے محقق ہیں کہ جن پر رشک آتا ہے۔ کیسی کیسی نایاب تحریریں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور انہیں تمام سیاق و سباق کی روشنی میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ماہر غالبیات تو وہ ہیں ہی۔ پروفیسر علیم اللہ حالی کا "انتخاب واقعات اشعار غالب" پر مختصر مگر دلچسپ تبصرہ اس کے مطالعہ کے لئے ترغیب دیتا ہے۔

میری کتاب "شہاب" پر جناب سید ابو الطیف سید آبادی گیا کا تبصرہ پڑھ کر خوشی نہیں ہوئی۔ انہوں نے تبصرہ کا حق ادا نہیں کیا۔ تبصرہ نگار کو چاہئے کہ اپنے ریمارکس کے ثبوت میں زیر تبصرہ کتاب سے ثبوت بھی فراہم کر دے تاکہ پڑھنے والوں کی تشفی ہو جائے اور صاحب کتاب کی اصلاح بھی ہو جائے ابو الطیف صاحب نے لکھا ہے:-

فن کے پرانے اصول وضوابط اور قدماء کے ذریعے استعمال شدہ استعارات وکنایات کو نیا رنگ وآہنگ دینا، نئے فنی اور عروضی، بحور وارکان کی ایجاد اور الفاظ کو نیا معنی ومفہوم عطا کرنا ہی اصل جدت وجدیدیت ہے۔ رؤف خیر نے بڑی گہری تنقیدی نظر سے جدیدیت کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے مخصوص لب ولہجہ میں فن برتا ـــــ"

ابتدا ہی میں مبصر نے یہ بھی فرمایا تھا کہ :۔

رؤف خیر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے "اقرار" اور "ایلاف" کے ذریعہ انہوں نے پہچان پہلے ہی بنائی ہے۔"

اس کے بعد موصوف نے میری بعض تخلیقات کو جو غیر متداول بحور میں ہیں، بے بحر بھی قرار دے دیا ـــ انہوں نے بغیر کسی حوالے کے یہ لکھ دیا کہ :۔

رؤف خیر کی غزلوں میں چند ایسی خامیاں ہیں جو کانٹا بن کر آنکھ میں چبھتی ہیں۔ جیسے بعض اشعار کا اوزان وبحور کی قید سے اس درجہ آزاد ہونا کہ قاری کو الجھن محسوس ہو۔ کلام میں تنافر، ابتذال اور ابہام کا احساس ہوتا۔ فاصلہ بعید یا ایسے الفاظ کا استعمال جو متروک ہیں ...."

مگر انہوں نے مثال ایک بھی نہیں دی۔ ان کی الجھن کا سبب دراصل غیر متداول بحر ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ میں نے ایک حمد، ایک غزل اور ایک ترائیلے غیر متداول بحر میں کہہ کر مجموعے میں شامل کیا ہے باقی سارا مجموعہ تو متداول بلکہ مانوس بحروں ہی میں ہے ایک غیر متداول بحر کی غزل پر "شب خون" (الہ آباد) میں بحث بھی چھڑی آرہی تھی۔ مگر کسی نے اسے بے بحر قرار دیا ـــــ۔

عروض کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے مگر اتنی بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بحرہ نہیں ہوں۔

بہرحال ابوالفیض سیدلیادی صاحب میرا مجموعہ "شہداب" دوبارہ غور سے پڑھیں تو شاید انہیں وہ غیر متداول بحر بھی سمجھ میں آجائیں۔ "حمد" کی بحر کا تو خاص طور پر میں نے ایک تجربہ کیا ہے۔ غیر متداول تخلیقات کے نیچے میں نے لکھ دیا کہ یہ غیر متداول بحر میں ہیں۔

کرشن کمار طور کا مجموعہ "عالم عین" اگر وہ پڑھ لیں تو شاید طور کو شاعر ہی نہ مانیں کہ وہ تو پچاس فیصد غیر متداول بحور میں ہے

انہوں نے میرے فکروفن کو کافی سراہا بھی ہے اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں، مگر جو مینگنی بھرے دودھ میں انہوں نے ڈالدی وہ پانی پھیر رہی ہے

● ـــــ رؤف خیر، حیدر آباد

سہیل کا شمارہ ۱۲ ۱۹۹۴ء اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر کے سامنے ہے۔ "عطا محمد شعلہ ـ ایک شعلہ مستقبل" اچھا مضمون ہونے کے ساتھ ساتھ اس شمارے کی جان بھی ہے۔ اس بار آپ نے ہمیں بہت اچھی غزلیات پڑھنے کو دیں۔

کتنی میٹھی گفتگو جاوید کی
پیڑ ہے کیا اس کے گھر میں آم کا

اب ذرا سوچئے ان کے گھر میں آم کے درخت کی جگہ اگر ببول یا کیکر کا درخت ہوتا تو گفتگو کا ذائقہ کیسا ہوتا" "ابراہیم" ہر لمحے کا حساب جوڑنا ہے۔ صدیوں سے

صاب مانگتے ہیں۔ "حساب" ح "س" سے لکھنے
بجائے "ح" "ص" سے لکھنے کا عمل کاتب صاحب
تو نہیں ہو سکتا۔ "رئیس الدین رئیس" عارض،
عیں، ابرو، زلفیں، کب لکھنا۔ ہم سے آیا رنگیں
لبیں کب لکھنا — پہلے مصرعہ میں کاتب صاحب
مہربانی سے "لب" کی جگہ "کب" چھپ گیا ہے۔
ان کا مسئلہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ یہ رنگین
لبیں لکھنا چاہتے ہیں مگر لکھ نہیں پاتے ہیں۔

حنیف نجمی" اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں آپ
میری غزل کا سب سے اچھا اور فکر انگیز شعر
ما دیا۔ لگتا ہے اب کہ جیسے خدا کو بھی ہے پسند۔
ندوں کا قتل اپنے مفادات کے لئے۔" میں تو اس
عر کے حرف حرف میں گھوم پھر کے لوٹ آیا مگر فکر
عنصر کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ "بھی" کی تاکید کے
الله بندوں کا قتل فائدے کے لئے خدا کو پسند
، کھلتا ہے اور برا ماننے کی حد تک۔ "غزل" کو
شاعت کے لئے شکریہ لداریہ "سچا ادب" کی سچائی
ے لئے مبارکباد۔

▲ شارق عدیل، علیگڈھ

سہیل کا شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۴۵ پڑھا۔ آپ
نے اپنے اداریے میں "ہندوستانی معاشیات پر شب
ون" سے متعلق جن خطرات کی نشاندہی کی ہے وہ
الکل بروقت اور حق بجانب ہے۔ افسانہ "نیلا
گل کیوں ہوئی" مانک ٹالا صاحب کی موجودہ ذہنی
پرواز کی کوتاہی کا غماز ہے۔ اس سے قارئین کو
مایوسی ہوئی ہے۔ شہاب دائروی صاحب کا افسانہ

"خاموش نگاہیں" کمزور اور فرسودہ ہے۔ افسانوں
پر بھی توجہ دیں۔ ایلاف خیری صاحب نے نوجوان
قلم کاروں کو جو مشورے دیئے ہیں اس کے لئے شکریہ
"شہر خیال" کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا ہے۔
جوگندر پال صاحب کے افسانوں کو مدیران پسند کرتے
ہیں ہو سکتا ہے انھیں ان میں نیا پن ملتا ہو یا اور
کوئی مقصد ہو۔

میرا مشورہ ہے کہ آپ سہیل کو جدید طرز پر
مزین کریں اور کاروباری بنائیں۔ اس کے صفحات
میں اضافہ، نظم و نثر میں تنوع۔ طباعت و کتابت
میں جدت کے ساتھ ساتھ قیمت میں بھی اضافہ کریں۔

▲ صابر رومانی، بھتا وے

ان دنوں بچوں کے پاس یعنی فرید آباد میں ہوں۔
فرید آباد میں اردو کی مناسب خدمت ہو رہی ہے۔ یہاں
اردو کے کئی نامور و مایہ ناز ادیب و شاعر موجود ہیں
جیسے جناب ساحر ہوشیار پوری، جناب ادم کرشن
راحت، جناب ہیرانند سوز، جناب قاضی کرت پوری
جناب شاد، محترمہ شاذیہ شاد، جناب ولا نقوی اور
جناب اول پرکاش لاغر، شعر و شاعری کی محفلیں اکثر و
بیشتر منعقد ہوا کرتی ہیں۔ ادبی تعصب دیکھنے کو نہیں
ہے۔ ہندی اور اردو کے ادبا و شعرا ایک پلیٹ فارم
پر جمع ہو کر ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہا کرتے
ہیں۔ دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی کئی ادبی انجمنیں
ہیں جو فعال ہیں جیسے انجمن ادب جس کے سکریٹری
سوز صاحب ہیں۔ دوسری کا نام ہے "ہندی اردو
سنگم" جس کے روح رواں جناب ادم کرشن راحت

ہیں اس طرح اردو کی خدمت کے لئے ایک اور انجمن ہے جس کے کرتا دھرتا جناب اوم پرکاش لاغر ہیں۔ ان کے علاوہ ہندی کے بھی کئی پلیٹ فارم ہیں۔ مگر آپسی رشہ کشی نہیں ہے سب ایک دوسرے کی محفلوں میں آیا جایا کرتے ہیں۔ سہیل کو یہاں لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔ "فن اور فنکار نمبر" کو بھی لوگوں نے بہت سراہا ہے۔

جناب بلراج کومل، جناب احمد شیخ سلیم، محترمہ شہناز فاطمہ (ٹونک)، اور محترم جناب ذہین نقوی سکریٹری غالب اکیڈمی) جناب سیماب سلطانپوری اور جناب جگدیش جین۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس سے بار بار ملنے کی خواہش نہ ہوتی ہو۔ بڑے فراخ دل لوگ ہیں اور ادیبوں سے ادیب کی طرح ملتے ہیں۔ امام غزل (جناب مظہر امام) اور فقیر شہر (جناب سید عنوان چشتی) اور کچھ دیگر شعرا کرام سے ٹیلیفون سے اکثر و بیشتر باتیں ہو جایا کرتی ہیں۔

کچھ شاعروں اور قارئین سہیل کے اس شمارے کے افسوس کا اظہار کر رہے تھے جس میں دہلی کے چار مشہور و معروف شعرا کرام کے سلسلے میں جناب [illegible] رستوگی صاحب نے غلط بیانی کی تھی۔ لوگ رستوگی جی کو اب بھی بخشنے کو تیار نہیں ہیں۔

ایک دوسرے شمارے میں بھائی اویس احمد دوراں کے طویل مضمون کو بھی لوگوں نے سراہا ہے۔ موصوف نے میری غزل کی بھی خاطر خواہ تعریف کی ہے ہاں ایک مصرعہ میں ختم بر وزن (خشم) کا استعمال کسی کاتب صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ سے زبان و بیان کی غلطیاں "نہیں" کے برابر ہوا کرتی ہیں چونکہ میں بارہ برسوں تک اتر پردیش میں رہا ہوں جہاں کے لوگ اہل زبان مانے جاتے ہیں۔ بہر حال دوراں صاحب کے مشورے سر اور آنکھوں پر۔

▲ ناشاد اورنگ آبادی، فرید پور

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر
کی نئی پیش کش

ہندوستان میں اقبالیات
اور
دوسرے توسیعی لیکچر

مصنف: پروفیسر جگن ناتھ آزاد
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر
راؤز ایوینیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

صابر آروی کے عقیدتمندانہ کلام
گنجینۂ عرفان کا مجموعہ — قیمت: ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ - ۴

— بقیہ: نیا ملک، نئے مسائل —

کو مقبول بنانے میں بھی اس رسالے کا خاص ہاتھ ہے جب اس نے انور سجاد اور خالدہ اصغر کے ساتھ ساتھ ہندوستانی افسانہ نگاروں بلراج مین را اور انور عظیم کی کہانیاں بھی اسی اہتمام سے شائع کیں۔ ہندوستان میں "شب خون" سے پہلے جدیدیت کے لئے فضا سازگار کرنے میں "سویرا" کا خاص حصہ ہے۔

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شسہاروی ۔ بیادگار :- زین العابدین احمر وادرتیں سہاروی

سُہیل گیا

ماہنامہ

Vol. 54 (5-6)

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر محمد رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مشنی
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
- ایڈیٹر :- جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی

معاونین :- شکیل احمد جالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

فہرست

★

- شمارہ ۵-۶ جلد ۵۴
- بدلِ اشتراک
- فی شمارہ .... ۵/- روپے
- زرِ سالانہ .... ۵۰/- روپے
- لائف ممبری .... ۱۰۰۰/- روپے

▲ خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل

دلیو ساشٹ روڈ گیا - ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر :- ۲۱۸۶۳

درخت لگائیں ــ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے اہم جان ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

(۲) یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے مہیا وسائل کا استعمال پورے ویدک سے کریں۔

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے اس کی حفاظت آنے والی نسل کے لئے کریں۔

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحہ عمل ہے۔ اس سے فرار نقصان دہ ہوگی

(۵) بارش اور حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہو جائیں گے کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائے گا۔

(۶) سرزمین کا وجود صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے۔

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانات کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوئی تھی۔ انھوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے۔ جس سے انسان کا اس سرزمین پر افزائش ہوئی آج بھی ان کی اہمیت برقرار ہے۔

درخت لگائیے ــ جنگلی اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں۔

جاری کردہ :- محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار

29 जन (जन-5) 94-95

یہ شمارہ

ماہنامہ سہیل کا یہ شمارہ جناب فرحت قادری کے نام مخصوص کیا گیا ہے — فرحت قادری ریاست بہار کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پچاس ساٹھ برسوں کی فنی ریاضت اور اپنے غیر معمولی تخلیقی اعمال کے ذریعہ اپنی پہچان کرائی ہے۔ اس طویل عرصے میں ہمارا شعر و ادب متعدد انقلابات سے دوچار ہوا۔ کئی نئی تحریکوں نے اپنے اثرات ڈالے، کئی رجحانات نے شعری فضا میں مد و جزر پیدا کئے۔ ادب اور زندگی کی نئی جہتیں سامنے آئیں، اسلوب و ہیئت اور بیان و اظہار کے بہت سے زاویئے پیدا ہوئے۔ اس ہر آن بدلتی ہوئی صورت حال میں ہمارے شعری منظر نامے میں تھوڑی دیر کے لئے کئی چہرے روشن ہوئے مگر پھر تجربات کے نشیب و فراز کی نذر ہو گئے۔ جناب فرحت قادری اس اتار چڑھاؤ، شکست و ریخت اور ہو ہڑپ سے الگ رہے۔ ایک جینوئن فنکار کی طرح (جس نے پائدار روایت کی ڈگر پر آگے بڑھتے رہنے کا ہنر جان لیا ہو) فرحت قادری نے اپنے فن پاروں کا جو BULK پیش کیا ہے اس کی معیار بندی کا کام تو وقت طلب ہے — یہ دقت طلب بھی ہے۔ اس لئے کہ جناب فرحت قادری کی زنبیل سخن میں متعدد شعری اصناف موجود ہیں — ان سبھوں پر الگ الگ گفتگو کی ضرورت ہے — اور پھر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ SUM TOTAL سے فن کار کا کیا قد نکلتا ہے نیز یہ کہ اس میں دوام کے کتنے آثار موجود ہیں۔

جناب فرحت قادری اس بات کے اہل ہیں کہ ان کے سلسلے میں یہ محاکمہ کیا جائے۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ماہنامہ سہیل اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے اس ادبی فریضے کی انجام دہی سے قاصر ہے۔ دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار کے اعتذار و اعتراف کے ساتھ ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ ماہنامہ سہیل نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ صحرائے شعر و ادب کے ان ذروں کی طرف متوجہ کر دیا جائے جن میں آفتاب کی توانائی پوشیدہ ہے — اس کوشش کا مقصد یہ ہے کہ ادب و شعر کے قارئین اہل قلم حضرات اور ناقدین آج بالکل بطن گیتی سے پیدا ہونے والے ان آفتابوں کی اہمیت کا اعتراف کریں اور ان سے اکتساب نور کریں — جناب فرحت قادری کا قرض تو ہم سب پر ہے۔ ہم نے اس کی ایک قسط ادا کر کے آپ کو یاد دلایا ہے کہ آپ کو یاد دلانا ہے کہ ابھی بہت کچھ ہے جو واجب الادا ہے۔

مسعود منظر

میں اور میری شاعری

فرحت قادری

(۱) نام :- سید ابوالفرح

(۲) تاریخی نام :- سید ابوالفرح ذوالنون محمد جاہ

(۳) تخلص / قلمی نام :- فرحت قادری

(۴) والدین کے نام :- حکیم سید ابوالظفر محمد قادری (والد)
عابدہ خاتون (والدہ)

(۵) خاندان اور پیشہ :- میرا تعلق سید احمد جاجنیری مدنی کے ساداتِ بارگانواں، شیخ پورہ، (ضلع مونگیر) سے ہے۔ خاندانی پیشہ طبابت، معلمی اور تبلیغ دین تھا۔ میں خود سرکاری ملازمت میں ہوں۔

(۶) مستقل اور عارضی پتہ :- محلہ معروف گنج، گیا (مستقل)
۱۲۔ سیوا نگر، گیا (عارضی)

(۷) تعلیم :- درس نظامی (دیوبند) اور آئی۔کام تک

(۸) تاریخ پیدائش مع جائے پیدائش :- میری پیدائش بتاریخ ۹ رمضان المبارک سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۶ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء بروز جمعہ اپنے ننہیال موضع اوگانواں، ضلع پٹنہ میں ہوئی۔

(الف) شادی کب، کہاں اور کس سے ہوئی؟ :- میری شادی سنہ ۱۹۵۰ء میں موضع بنشدہ (شیخ پورہ) میں مبلغ دین مولانا سید محمد اخلاق صاحب کی بڑی صاحبزادی مسلمہ خاتون سے ہوئی۔

(ب)- اولادیں :- ۱۔ رضیہ سلطانہ، ۲۔ ضیاء الرحمان، ۳۔ غزالہ روحی، ۴۔ عطاء الرحمان، ۵۔ فرحانہ تبسم
۶۔ رضاء الرحمان، اور ۷۔ ثمینہ مسرت

(۹) . علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اور صحافتی زندگی کا آغاز :- میرا باضابطہ تعلیمی سفر ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا جب مجھے میرے ماموں جان حضرت مولانا سید فصیح احمد صاحب (ظفر ادیب گنگوہی کے والد) اپنے ساتھ قصبہ سرونج (ریاست ٹونک) لے گئے اور مدرسہ ریاض المدارس میں میرا داخلہ کرا دیا۔ وہاں میں نے فارسی اور ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس سے قبل میں گیا کے مدرسہ انوار العلوم میں اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے میں نے دارالعلوم، دیوبند میں داخلہ لے لیا۔ دیوبند ہی میں میری ادبی زندگی کا آغاز روایتی غزلوں اور قومی نظموں سے ہوا۔ دیوبند سے واپسی کے بعد میں انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور گیا کے اسکول اور کالج میں آئی۔کام تک تعلیم حاصل کی۔

سیاست، سماج، مذہب اور صحافت سے میرا تعلق قابل ذکر نہیں

تلمیذ :- ۱۹۶۳ء میں میں نے سحاب سخن حضرت علامہ آتش احسنی گنوری (بدایونی) کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۹۶۹ء میں علامہ موصوف نے مجھے فارغ الاصلاح کر دیا۔

(۱۰) تصانیف (مطبوعہ/غیر مطبوعہ) :- "زمین ہند" (قومی نظموں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۶۷ء "کائنات غم" (غزلوں اور پابند نظموں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۷۰ء "ضروریات شعر و ادب" (عروض و بلاغت سے متعلق مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۲ء "شیشے اور پتھر" (غزلوں اور آزاد نظموں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۳ء (پہلا ایڈیشن) ۱۹۸۶ء (دوسرا ایڈیشن)
غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست :- "عکس و رقص" (حمد و نعت اور دینی و ملی نظموں کا مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۳ء میں زمین ہند کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ "ایک جام اور" (غزلوں اور آزاد غزلوں کا مجموعہ)۔ "راتیں ہی راتیں" (ایک موضوعی نظموں کا مجموعہ)۔ "باران کرم" (رمضان شریف سے متعلق قصائد کا مجموعہ)۔ "نیا سفر نئی منزل" (سہروں اور تہنیت ناموں کا مجموعہ)

(۱۱) نظریہ :- ادب کے معاملے میں میرا ذاتی نظریہ اعتدال پسندی کا ہے۔ میں انتہا پسندی کو معیوب سمجھتا ہوں، خواہ وہ "روایت" میں ہو یا "جدیدیت" میں۔ ادب ایک فن ہے، اس لئے میں ادب میں فنی بصیرت، سچے جذبات و احساسات اور زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ کا قائل ہوں۔ علاوہ ازیں میں ادب میں نئے نئے تجربات کو بھی سراہتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ "انتہاؤں" سے پاک اور فنی بصیرت سے مملو ہوں۔

(۱۲) بیرونی ممالک کا سفر/اہم جلسوں میں شرکت :- ۱۹۸۱ء میں میں کراچی (پاکستان) گیا تھا۔ تقریباً دو ماہ کا عرصہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں میں گزرا۔ بڑی اچھی صحبتیں رہیں، اور کو قسم سے زیادہ

میری پذیرائی ہوئی۔ میرے اعزاز میں کئی چھوٹے بڑے مشاعرے ہوئے جن میں پاکستان کے مشہور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ رئیس امروہوی صاحب نے باقاعدہ میرا انٹرویو لیا اور میری غزلوں کے ساتھ اخبار "جنگ" کراچی کے ادبی ایڈیشن میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا ——— علاوہ ازیں، میں نے کلکتہ، آسنسول، الہ آباد، اعظم گڑھ، اورنگ آباد، بہار شریف، اور پٹنہ کے آل انڈیا مشاعروں میں کئی بار شرکت کی (ان کی تفصیل سے طوالت کا اندیشہ ہے)

(۱۲) **اعزازات والانعامات وغیرہ** :- ۱۹۵۶ء میں "اردو مجلس، گیا کالج" کے لائف ممبر شپ کی سند عطا کی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تو گیا میں وار فنڈ کے لئے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرے میں بمبئی سے آئے ہوئے کئی مشہور فلمی شاعروں نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں میں نے ایک طویل قومی نظم سنائی جس سے متاثر ہو کر ایک مقامی رئیس نے مجھے گولڈ میڈل سے نوازا۔ ۱۹۷۶ء میں میرے پہلے شعری مجموعے "کائناتِ غم" کی اشاعت پر بہار اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ ۱۹۸۲ء میں میرے دوسرے شعری مجموعے "شیشے اور تیشہ" کی اشاعت پر بہار اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔

(۱۳) **اداروں سے وابستگی** :- ۱۹۵۰ء میں "اردو مجلس، گیا کالج" کا جوائنٹ سکریٹری چنا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں "بزمِ سریر گیا" کا اسسٹنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں "مرکز ادب" گیا کا جنرل سکریٹری مقرر ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں "بزمِ قلمکار" گیا کا نائب صدر منتخب ہوا۔

(۱۴) **ملازمت/پیشہ** :- سرکاری ملازمت (سول کورٹ، گیا میں سررشتہ دار ہوں) اب ریٹائر ہو چکا ہوں

(۱۵) **اخبارات و رسائل سے تعلق (براہ راست یا بالواسطہ)** :- ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ "مفاہیم" گیا کا نائب مدیر مقرر ہوا۔ دو سال تک "مفاہیم" بڑے آب و تاب سے نکلتا رہا۔ ادبی دنیا میں "مفاہیم" کی ساکھ اتنی جم گئی کہ ہند و پاک کے صف اول کے ادیب و شاعر بھی "مفاہیم" میں اپنی شرکت کو فخر کی بات سمجھتے تھے۔ "مفاہیم" کے دو خاص نمبر "جدید اردو کہانی نمبر" اور "۱۹۸۰ء کا ادب نمبر" آج بھی ادبی دنیا میں یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "مفاہیم" میں تبصرہ نگاری کا کام میرے ذمہ تھا۔

(۱۶) **پسندیدہ شخصیتیں** :- میرے والد محترم سید ابوالظفر قادری اور میرے استاد محترم علامہ اکبر احسنی لکنوری میری پسندیدہ شخصیتیں ہیں۔ کیونکہ ان کی بردباری، تدبر، روشن خیالی اور علمی صلاحیتوں نے میری ذہنی نشو و نما کی اور میرے کردار و عمل کو جلا بخشی ——— لیکن شاعری میں مرزا غالب، حضرت جگر مرادآبادی اور فیض احمد فیض کی شاعری نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

(۱۷) **مسلم سماج/ادبی ماحول/مذہبی دنیا کے بارے میں آپ کی رائے** (سماجی، مذہبی اور علمی ماحول سے متعلق مسائل کا حل ؟)

جب سے ہندوستان آزاد ہوا اور ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ ہمارے ملک ہندوستان میں مسلم سماج

کا ڈھانچہ ہی بدل کر رہ گیا۔ چالیس سال سے یہ بات مشاہدے میں آرہی ہے کہ ہر گوشۂ زندگی میں ملکی سیاست بری طرح حلول کر گئی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی سماج بھی اب یہاں کی غیر معقول سیاست سے مبرا نظر نہیں آتا۔ مسلم سماج کا جو خوشنما تاج محل ہمارے پرکھوں نے سجایا تھا وہ درہم و برہم ہو چکا ہے۔ اب ایک مشترکہ سماج کی دھارا دھیرے دھیرے بہہ رہی ہے جو میرے خیال میں آگے چل کر نئے ہندوستانی سماج کا روپ اختیار کرے گی۔ یہی حال علمی اور ادبی ماحول کا بھی ہے۔ اس کا بھی پرانا ڈھانچہ بکھر رہا ہے اور آہستہ آہستہ نئے رنگ و آہنگ میں تشکیل پذیر ہو رہا ہے نومولود آزاد ممالک میں شکست و ریخت کا یہ عمل غیر فطری نہیں ہے۔ تاریخ کے اوراق ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ یورپ اور ایشیا کے چھوٹے بڑے بیشتر ممالک شکست و ریخت کے اس فطری عمل سے گزرنے کے بعد ہی آج موجودہ شکل میں نظر آرہے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کا رنگ و روپ بھی ایک صدی کے بعد وہ نہ رہے گا جو گزشتہ ایک صدی میں تھا۔ یہ ارتقائی عمل دنیا میں جاری رہے گا اور قدریں بدلتی رہیں گی۔ آنے والی نئی دھاراؤں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ اگر مسائل ہیں تو ان کا حل یہ ہے کہ ہم ان سے سمجھوتہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلیں۔ کیونکہ اگر ہم ان مسائل سے سمجھوتہ نہیں کریں گے تو یہ مسائل ہمیں پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جائیں گے۔

مذہبی دنیا کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ بالکل ختم تو نہ ہوگی لیکن رفتہ رفتہ سمٹ کر محدود ضرور ہو جائے گی۔

میری شاعری —— خود پر قلم اٹھانا اور اپنے فن پر اظہار خیال کرنا ایک فن کار کے لئے بڑا مشکل کام ہے۔ غالباً ایسے ہی موقع پر غالب نے کہا تھا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

میں تقریباً پچاس سال سے شاعری کے میدان میں دادِ سخن دے رہا ہوں، مگر آج تک کبھی اس بات کی طرف دھیان بھی نہیں کیا کہ میں کیا ہوں اور میری شاعری کیا ہے؟ یا میں شاعری کیوں کرتا ہوں؟ شاعری کی اس طویل زندگی میں میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ لوگ میرے اشعار پڑھنے کے باوجود مجھ سے ہی میری شاعری کے متعلق سوال کریں گے — لیکن اب یہ افتاد آن پڑی ہے تو عرض کرتا ہوں کہ ؎

"مجھ کو دیکھو یا مرے اشعار کو۔ ایک ہی رنگ، ایک سی انداز ہے

اگر آپ میری شاعری کا بغور مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کے تمام سوالات کے جواب میرے اشعار میں مل جائیں گے۔ میرے جذبات کیا ہیں، میرے اشعار بتائیں گے۔ میرے احساسات کیا ہیں، میرے اشعار بتائیں

گے۔ میرا فلسفہ کیا ہے، میرے اشعار بتائیں گے۔ میری زبان کیا ہے، میرے اشعار بتائیں گے۔ میرے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ کیا ہے؟ ساری باتیں میرے اشعار بتائیں گے ــــ آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ یہ سب نا ماننے والی باتیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود نہیں سمجھ سکا کہ آخر میں شاعر کیسے بن گیا اور سب کام چھوڑ کر صرف شاعری کیوں کرنے لگا؟" اور بھی تھے کام دنیا میں سوائے شاعری" پھر شاعری ہی گلے کیوں پڑ گئی؟ عام خیال یہ ہے کہ محبت (عام معنوں میں) شاعری کی داغ بیل ڈالتی ہے۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے میرے ساتھ ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ وراثت میں بھی یہ چیز مجھے نہیں ملی۔ کیونکہ میری خاندان میں دُور دُور تک کسی شاعر کا پتہ نہیں ملتا ــــ میرے خیال میں، جب خدائے تعالیٰ کسی شخص کو حساس ذہن و دل ودیعت کرتا ہے تو وہ شخص اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتا ہے ــــ میرے ساتھ بھی دراصل یہی معاملہ ہے۔ میں اپنے حساس دل کے ساتھ جب عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند پہنچا تو وہاں کے علمی و ادبی ماحول میں اپنے ارد گرد شعر و سخن کی زبردست ہلچل دیکھی۔ علامہ انور صابری، عامر عثمانی، رئیس امروہوی، اسلم مظفر نگری، قمر مونگیری، ناظم گیاوی وغیرہ مشاہیر کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ ان کی صحبتوں نے میرے حساس ذہن و دل کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا اور میرا ذوقِ شاعری بیدار ہونے لگا ــــ اس وقت کی عام شاعری روایت سے جڑی ہوئی تھی، اس لئے میری شاعری کا دھارا بھی اسی ڈگر پر چل پڑا اور کچھ اس قسم کے اشعار سرزد ہونے لگے۔

پھنکا جاتا ہے دل، سوزِ محبت کم نہیں ہوتا + کسی صورت چراغِ داغِ دل مدھم نہیں ہوتا

بھٹکتا ہے جو انساں وادیٔ ایمن میں، ناداں ہے
چراغِ طور ہر انساں کے دل میں فروزاں ہے

اگر پناہ نہ ملتی جنوں کے دامن میں ؛ خرد کا پاک تھا قصہ ہی دشتِ ایمن میں
دلِ محزوں پہ جو بے تابیوں کے نام گزرے ؛ حقیقت میں وہی لمحے بڑے آرام سے گزرے

عجیب وادی ہے غم کی وادی، عجیب عالم ہے دل کا عالم + بہکنے والا سنبھل رہا ہے، سنبھلنے والا بہک رہا ہے
محبت کی نمائش اہلِ غم کرتے نہیں فرحت ؛ جو ناشائستۂ غم ہے اسی کا چاک داماں ہے

پھر جب اپنے شہر (گیا) (۱۹۴۴-۴۵ء میں) واپس آیا تو یہاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی صحبت نصیب ہوئی۔ انور عظیم، کلام حیدری، بدیع مشہدی، صہبا بی۔ کام، کامریڈ حبیب، شہلا قادری، شاہد احمد شعیب وغیرہ یہاں کی ادبی بساط پر چھائے ہوئے تھے۔ ان مشاہیر کی صحبتوں نے میری شاعری کا بھی رخ موڑ دیا اور میں اس انداز کے شعر کہنے لگا۔ تیرے غمِ حیات کے کھائے ہوئے ہیں ہم۔

یا

پنی صلیب خود ہی اٹھائے ہوئے ہیں ہم

کسی نے آج تک دیکھا نہ ہوگا ایسا نظارہ ؎ قفس بھی ہے اسی شاخِ نشیمن پر جہاں میں ہوں
یا کریں خاک رفو خامہ ہستی ہم لوگ ؎ زندگی بھر تو رہے چاک گریباں کی طرح
یہاں نہ تفریق ما و تو ہے نہ کشمکش ہے نہ کم نگاہی ؎ یہ دامنِ میکدہ ہے واعظ، فضائے دیر و حرم نہیں ہے
میں وقت کے ہاتھوں میں ہوں اک بانسری فرحت ؎ چھلنی ہے جگر اور لبوں پر ہے ترانہ

پھر اسی شہر گیا میں (۷۰ ۔ ۱۹۶۰ کے درمیان) ایک وقت ایسا بھی آیا کہ "جدیدیت" کی زبردست آندھی چل پڑی اور پرانی بساط الٹ گئی ۔ اب یہاں تازہ دم و تازہ کار جدید شاعر و ادیب، مثلاً وہاب اشرفی، ظہیر غازیپوری، شاہد کلیم، حق اعظمی، م۔ق۔ خان، بدنام نظر، حسین الحق، شفیع مشہدی، خورشید حیات وغیرہ مسند آرائے سخن ہوئے ۔ میں نے انہیں بھی مایوس نہیں کیا اور ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا ۔ اب میرا لہجہ کچھ اس قسم کا ہو گیا ۔

نہ اختیار کی کلیاں نہ اعتبار کے پھول ؎ وہ دے گیا ہے مجھے صرف انتظار کے پھول
کسی نے آگ بجھائی نہ میری بات سنی ؎ جھلس کے رہ گئی آخر مری صدا گھر میں
سچ کا اک کنکر گرا تھا جھیل میں ؎ جھوٹ کا طوفان برپا ہو گیا
جھونپڑی میں جانے کب لگ جائے آگ ؎ اوڑھ کر سو جاؤ، ٹھنڈی چاندنی
مٹی کے یہ ستوں نہ گر جائیں آپ پر ؎ ٹوٹے ہوئے دلوں کو نہ ٹھوکر لگائیے
جانے کب ٹوٹے گا یہ چوبیس گھنٹوں کا حصار ؎ کام بڑھتے جا رہے ہیں، وقت بڑھتا ہی نہیں

اس طرح آپ محسوس کریں گے کہ میری مسافت شاعری میں وقفہ وقفہ سے تین آوازیں شامل ہوئیں جن سے تین مختلف ادوار کے رجحانات و مشاہدات عکس ریز ہیں اور اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ شاعری ایک حساس انسان کے ذہن کی عکس گر ہی نہیں، اپنے عہد کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے ۔ مشاہدہ حیات اور انسان شناسی شاعر کے لئے ضروری ہے ۔ اسی لئے میں نے ہر منزل پر بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ اپنی شاعری میں زندگی کی اعلیٰ قدروں اور سچے جذبوں کی عکاسی کی ہے ۔

فرحت

زمینِ ہند — ایک تجزیہ

بدر اورنگ آبادی
(بیڑی گیم کیج، گیا)

فرحت قادری کی قومی نظمیں اور قطعات

"سنگِ جمیل" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اب شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل فنِ عروض پر شاعر کی ایک تصنیف اور مجموعۂ رباعیات "انتخابِ ذوق" سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اس لئے فرحت قادری کا نام محتاجِ تعارف نہیں — یہ پچاس سال سے گیسوئے اردو کی مشاطگی کر رہے ہیں۔ اور ان کے کلام سے شعری ادب میں گراں مایہ اضافہ ہوا ہے لیکن خود شاعر شکوہ سنج ہے کہ — "مجھ کو ملا — فقط گمنامی اور تنگدستی ملا" — بات ایسی نہیں۔ ممکن ہے کہ فرحت قادری کو حسبِ منشا نہ ملا ہو کہ وہ مستحق ہیں لیکن ان کے بہی خواہوں [illegible] اعتراف ہے اور ان کے کلام کی پذیرائی ہوئی ہے —

تنگدستی کا شکوہ اس لئے بھی بے جا ہے کہ یہ تو اردو زبان کے فن کاروں (بہ استثنائے چند) کی تقدیر بن چکی ہے۔

میدانِ ادب میں اصلاً غزل کے شاعر فرحت قادری "ہمیشہ سے قوم پرست" رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے اندولن کے "ننھے مجاہد" رہ چکے ہیں۔ دار العلوم "دیوبند" میں دورانِ تعلیم مولانا سید حسین احمد مدنی کی گرفتاری کے خلاف احتجاجی جلوس کی سربراہی (صرف ۱۴ سال کی عمر میں) کس جذبہ کے ساتھ کی اسے فرحت قادری نے خود یوں بیان کیا ہے — "میں آگے آگے سینہ تانے چلتا اور سڑک کے دونوں طرف انگریزی فوج رائفل تانے کھڑی رہتی۔ اس وقت میرے سینے میں ایسا جذبہ اسلامی ہوتا کہ کاش یہ انگریزی فوج گولی چلا دے اور میں شہید ہو جاتا۔" اس جذبہ کی بھرپور جھلک اس شعر میں ملتی ہے۔

زخمۂ تارِ رگِ جاں خاموش ہیں
ورنہ فرحتؔ شاعری اچھی نہیں (صفحہ ۲۸)

خارف کے تحت علامہ ابر احسنی گنوری کی یہ بات
ہے کہ ــــ "شاعر جب قوم و وطن کو قابلِ
حالت میں نہیں پاتا تو اس کا دل تڑپ جاتا
ہر تڑپ، درد، خلوص اور جذبۂ سرفروشی
ہوئی ایک نظم بن جاتی ہے ۔ آپ فرحتؔ کی
کو پڑھئے ــــ آپ ضرور میرے ہم نوا ہوں
سی خلوص، وفا اور قومی درد کو ضرور لیئے
یس کریں گے جو فرحتؔ کے دل نے محسوس کر کے
جامہ پہنا دیا ہے ۔" چین کی جارحیت ہو
نا کی، سقوطِ ڈھاکہ ہو یا قبضۂ گوا ۔ اس کا
مصالحت تاشقند ہو یا شملہ معاہدہ ــــ
کی لرزہ خیز داستان ہو یا جہیز کی لعنت.
ت کی تابانیاں ہوں یا حبیب جنوری کی شان
لو بچی بیٹیوں کا ظلم و جور ہو یا نیتاؤں کا
ڑھے غنڈوں کی ستمگری ۔ اپنے وطن میں وقوع
نہ، ہر تحریک، ہر واقعہ اور ہر عمل نے فرحتؔ
دل کو تڑپایا ہے، جھنجھوڑا ہے ۔ نتیجتہً
دری کی نظموں ... اپنے وطن کی خوشبو کے
ت مسرتوں اور شادمانیوں کی جلوہ گری ہے.
رفت شاعر کے کرب ... الم کی تحریریں بکھری ہیں یعنی
رحتؔ قادری یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ
یہ دھرتی اس کو دے سکتی ہے سونا
مگر پہلے پسینہ چاہتی ہے
پریشاں حالی دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں.
ہر چہرے کی جانب سے حق گو کی زباں سند

پھر نظمِ جہاں زیر و زبر دیکھ رہا ہوں

اعلان تاشقند اور شملہ معاہدہ کے توسط سے امن و
اماں کے جو دروازے وا ہوئے اس سے متاثر ہو کر
شاعر کا یہ پیغام ــ !!

ہوگا بلند پرچمِ تہذیب و ارتقا
ہونے دو عام جذبۂ ایقان تاشقند

فرحتؔ کروڑوں دل ہیں فدا اس ملاپ پر
صد رشکِ التفات ہے شملہ معاہدہ

اور ملک کے رہنماؤں کو جس انداز میں شاعر نے خراجِ
عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی ایک نئے انداز، نئی آواز
اور نئے لہجے کا حامل ہے ــــ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد،
اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے سلسلے میں یہ اچھوتا اسلوب
دیکھئے ــــ

جس نے گلشن کو بچایا تھا عدو کے ظلم سے
اس کو اپنوں نے مٹا ڈالا یہاں کل رات کو

نباضِ وقت، ماہرِ فطرت خموش ہے
رمز آشنائے چشمک انجم نہیں رہا

فرحتؔ ایسے شخص کی صدیوں میں ہوتی ہے نمود
جیسے بحرِ بیکراں تھے ڈاکٹر ذاکر حسین

ختم

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے اسپیل
آرٹ پریس مینگو ملا سے چھپوا کر دفتر سہیل
ریلوے سائڈ، گیا سے شائع کیا

پروفیسر عنوان چشتی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

فرحت قادری کی شاعرانہ حیثیت

فرحت قادری اردو کے ایک مشہور اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ موصوف دبستانِ آبر احسنی کے ایک اہم رکن ہیں۔ انھوں نے شاعری کی متعدد اصناف میں اپنی تخلیقی توانائی کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو غزل کا پیمانہ خاص طور پر سازگار آیا ہے۔ فرحت قادری نے غزل کی کلاسیکی روایت سے روشنی حاصل کی ہے۔ زبان و بیان، عروض اور فن کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر شاعری کرنا کتنا مشکل کام ہے، یہ وہی جانتے ہیں جن کو اس کارِ شیشہ و آہن کا عملی تجربہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ فرحت قادری اس پرخار وادی سے بہ فیضِ احتیاط کامیاب انداز سے گزرے ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کی معنوی سطح کا تعلق ہے، وہ بھی خاصی بلند ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مخرّبِ اخلاق اور فحش و رکیک افکار و جذبات سے گریز کیا ہے۔ فرحت قادری نے سنجیدہ افکار و خیالات اور بہترین سماجی اور تہذیبی اقدار کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں اظہار کی سطح پر بھی اور معنویت کی سطح پر بھی ایک مانوس فضا کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فضا انھیں آبر احسنی، احسن مارہروی اور داغ دہلوی کی فنی کاوشوں کی فضا تک لے جاتی ہے۔ میں یہ بات خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ فرحت قادری نے اردو شاعری کی اس بامعنی اور باثر روایت میں اپنے ذاتی تجربوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس لئے اس میں شاعر اور سماج کے کرب و کیف اور درد و داغ کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں کہیں اس دور کی پیچیدگی اور پریشان نظری کا احساس بھی ہوتا ہے۔

فرحت قادری نے اپنی شاعری میں جس فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے اس کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر اس دور کے بالغ نظر انسان کے شعوری تجربوں میں شرکت کی مسرت ملتی ہے۔ یہ شعری تجربے رومانی ہوں یا زندگی کے حقائق پر مبنی ہوں، جس خلوص اور شعری چابک دستی سے بیان ہوئے ہیں، قابلِ داد ہیں۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی
وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا

فرحت قادری

روشن زاویئے ۔ سیاہ حاشیے

بسا اوقات میں اس فکری مخمصے میں گرفتار ہوجاتا ہوں کہ تمام تر تخلیقی صلاحیت کے باوجود کسی فن کار کو وہ مقام کیوں نہیں ملتا جس کا وہ حامل نظر آتا ہے ——— اور یہ سوچتے ہوئے میرے سامنے اکثر جناب فرحت قادری کی مثال آجاتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ فرحت قادری نے ریاست بہار کی دوسری بہت سی شخصیتوں کی طرح اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کی کوشش کی ہو۔ ہمارے پرانے بزرگوں کے متعدد کارنامے آج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ جنہوں نے صرف اپنے ذوقِ سخن کی تسکین کے لئے بیش بہا شعری اثاثہ چھوڑا ہے، وہ زندگی بھر لکھتے رہے۔ لیکن چھپنے چھپانے اور حصولِ شہرت سے بھاگ کر گوشۂ گمنامی میں ہی رہنا پسند کیا ہے۔ وہ زمانہ اور تھا مگر آج صورتِ حال بدل چکی ہے۔ آج ہماری ریاست کے تخلیق کار دوسرے خطوں کے افراد کی طرح روشناس خلق ہونے میں کوتاہی نہیں برتتے

چنانچہ فرحت قادری کے بھی کئی مجموعے سامنے آچکے ہیں۔ زمینِ ہند، کائنات غم، ضروریاتِ شعر و ادب، شیشے اور پتھر، رقص و عکس وغیرہ کی اشاعت کے بعد فرحت قادری پر یہ الزام تو دھرا نہیں جاسکتا کہ انہوں نے قعرِ گمنامی میں رہنا پسند کیا ہے۔ اس کے باوجود برصغیر ہند و پاک میں ان کے شعر و سخن کی جگہ گونج سنائی دینی چاہئے۔ وہ ہنوز پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب ہم فرحت قادری کی شاعری [illegible] خصوصیات پاتے ہیں جو کم از کم شاعر کو عام شہرت و مقبولیت بخشتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک مضبوط سلسلہ تلمذ سے ہے۔ اس سلسلے کے اساتذہ نے شعر و سخن اور زبان و بیان کی سطح پر جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف خوب خوب ہوتا ہے۔ علامہ احسن گنوری جیسی اہم علمی و تحقیقی شخصیت

سے انہیں براہ راست شرف تلمذ حاصل ہو چکا ہے۔
ان حقائق کے علاوہ فرحت قادری کی ذاتی فنکارانہ
خوبیاں بھی ان کی فنکارانہ شخصیت میں امتیازی نقوش
بناتی ہیں۔ جناب فرحت مضبوط مشاہدے کے حامل
ہیں، سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی تبدیلیوں
کا انہوں نے غائر مطالعہ کیا ہے، ایک طویل عرصے
تک اردگرد کے ماحول میں ہونے والی تبدیلیوں کو نہ
صرف دیکھا ہے بلکہ ان انقلابات سے گزرے بھی
ہیں۔ ان کی زبردست لسانی گرفت ان کے اظہار
میں اعتماد پیدا کرتی ہے، ان کا خلاق و طباع ذہن
متنوع موضوعات سے وابستگی کی صلاحیت
رکھتا ہے۔ ان کی قدرت کلام و بیان پر کوئی شبہ
نہیں کیا جا سکتا، متذکرہ بالا مجموعوں میں متعدد ایسی
تخلیقات موجود ہیں جو میرے دعوؤں کی تائید کرتی ہیں۔

جناب فرحت قادری کی فن کارانہ شخصیت میں غیر
معمولی وسعت ہے وہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی
کرتے رہے اور ہر طرح کے موضوعات کو زبان کی صفائی
اور فنی محاسن کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔ فن کارانہ
شخصیت کے اس پھیلاؤ اور ان کی ہمہ جہت دسترس
جہاں قابل ستائش ہے بلکہ بسا اوقات قابل رشک
ہے وہاں اس کا ایک منفی پہلو بھی سامنے آتا ہے۔
اور وہ یہ کہ کسی ایک صنف سخن میں اپنی [illegible]
MARK۔ پہچان نہیں بنا پاتے یا پھر یوں کہئے کہ ہر جگہ
پہچان بنانے والا کسی مخصوص حلقے کا باشندہ نہیں ہو
پاتا، غزل نظم، رباعی، قطعات، مراثی، تہنیتی نظمیں،
حمد و نعت، دینی و ملی منظومات، خاندانی منصوبہ بندی،
سہرا، الکشن، شملہ معاہدہ، انقلاب، رمضان شریف

کے قصائد — غرض جناب فرحت قادری نے ا
کو اس فراغ دلی سے باغنا ہے کہ اس کے نتیجے م
پہچان کی لکیریں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں ہیں۔ ہر
ہتے ایک دوسرا نقش پیش کرنے لگتا ہے۔ فرحت
ایک نقطے پر ٹھہر نہیں سکتے، کسی ایک خیمے میں نہ
ایک خاص قبیل کے فن کاروں کے ساتھ جیو
شاید یہ بھی ان اسباب میں سے ایک سبب
فرحت قادری کو ان کے صحیح مقام دینے میں ما
جاتے ہیں۔

فرحت قادری صحت زبان و الفاظ کے
سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام غلطیو
پاک ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر مو
رعایت سے اور اس کے سماجی و تہذیبی پس منظ
نظر جناب فرحت قادری مناسب ترین اشارات و
استعمال کر لیتے ہیں، یہ وہ منزل ہے جہاں ان کی
کلام پر حیرت ہوتی ہے لیکن ایک نفسیاتی م
کہ NGUAGE CONSCIOUSNESS
اندرون کو باہر لانے میں اکثر و بیشتر رکاوٹ پید
ہے۔ اس صورت حال نے جہاں جناب فرحت
میں روانی و سلاست پیدا کر دی ہے وہاں د
غزلوں کی آواز گھٹی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے
فنکارانہ شخصیت کی محتاط روی پر زبردست
پہرہ پڑا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی تخلیقی
کے ارتکاب سے نہیں بلکہ اس کے اندیشے
SUPPRES معلوم ہوتی ہے۔ خرم و احتیاط
رکھ رکھاؤ کا لازمی طور پر یہی نتیجہ ہونا تھا۔
اس کے باوجود ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ شا

اوج اکبر پوری
ضلع اسکول، گیا، بہار

فرحت قادری فن اور شخصیت

ایک ایسی شخصیت پر جو ہمہ گیر صلاحیت اور ہمہ جہت فن کی مالک ہو کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ پھر بھی الحکم فوق الادب کے مصداق خامہ فرسائی کر کے شریک بزم ہو جاتا ہوں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

قابل احترام فرحت قادری کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ فن شعر و ادب کے آپ تابندہ سورج ہیں۔ ہر فن پر آپ نے زور قلم دکھایا ہے اور زبان و ادب کو اپنی تخلیقات کا ایک بیش بہا سرمایہ عطا کیا ہے۔ سحاب سخن علامہ ابرا حسنی گنوری (جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے) کے یہ جملے آپ کے تعارف کے لئے کافی ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "سید ابوالفرح فرحت کو خدا نے ایسے گھر میں پیدا کیا جس کا گوشہ گوشہ علوم شرقی کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسے تجلی ریز اور نور بیز ماحول میں جو بچہ پرورش پائے گا وہ اگر ایک حرف بھی نہ پڑھے

درسگاہوں سے خالی ڈگریاں حاصل کرنے میں تو کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گئے مگر یہ ماحول نصیب نہ ہو جو فرحت کو ہو گیا۔"

ان سب کے باوجود خود فرحت صاحب نے لکھا ہے کہ "میں صوبہ بہار کا ایک گمنام اور اردو زبان و ادب کا بدقسمت شاعر ہوں۔ تقریباً پچاس سال سے گیسوئے اردو کی مشاطگی کرتے کرتے اور قومی نظمیں لکھتے لکھتے میرے بدن کا رواں رواں سفید ہو گیا۔ لیکن صلہ کیا ملا۔ وہی محرومی جو اردو شاعروں بالخصوص بہار کے شعراء کا خاصہ ہے۔ نصف درجن سے زائد کتابوں اور مجموعوں کے مصنف کا جب یہ حال ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا۔ اس انمول جوہر کی ہم نے قدر شناسی نہیں کی اور خاطر خواہ تواضع سے نہ نوازا۔ یہ درحقیقت خود اردو والوں کی کم نصیبی ہے اور بدقسمتی ہے۔

خاندانی ماحول اور علمی صحبت جو آپ کو نصیب ہوئی

سے علمی اور تعلیمی میدان تک آپ کی زندگی قابلِ رشک ہے۔ ایسا بیش بہا موتی مہاتما بدھ کی دھرتی (گیا) کو ملا۔ جہاں آپ نے بود و باش اختیار کیا۔ پچاس برسوں تک خونِ جگر جلا جلا کے مشق سخن جاری رکھا۔ زمانے کے انقلاب اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ لیکن زبان و ادب کی خدمت سے نہ منہ موڑا۔ بے لوث اور یکسو ہو کر اپنی راہ پر گامزن رہے۔

شہر گیا جو مہاتما گوتم بودھ کی مناسبت سے بودھ دھرتی کے نام سے بھی موسوم ہے۔ جہاں سے مہاتما بودھ نے ساری دنیا کو امن و شانتی کا پیغام دیا۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں انکے پیرو موجود ہیں۔ اسلئے اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ایسی سرزمین پر جاجنیری سید خاندان کا یہ لعل بے بہا موجود ہے جو اپنی شاعری کے ذریعہ ساری دنیا کو آواز دے رہا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ اس کی یہ آواز فضا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی۔ مشاعروں اور عام اجلاسوں کی زیب و زینت بننے اور چند خوش کن الفاظ کے سوا اسے آج تک کچھ نہ ملا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ تحریر وجود میں نہ آتی ــــ "اردو زبان کا بدقسمت شاعر ہوں" یہ اندرونی کرب جو شاعر کے احساسات کی ترجمانی ہے اس پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ نہ سرکاری اعزازات سے نوازا گیا اور نہ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اس ادائے خاموشی کو جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ فرحت صاحب خود اپنے مجموعہ کلام "رقصِ عکس" میں یوں رقمطراز ہیں ؎

شاعر ہوں غریبوں کو جگاتا ہوں میں
جینے کے سبھی راز بتاتا ہوں میں
اے میری زبان کاٹنے والے زردار
جب رہ کے بھی طوفان اٹھاتا ہوں میں

جناب مسعود منظر ایڈیٹر سہیل گیا قا[بلِ مبارکباد] ہیں جو فرحت صاحب پر خاص نمبر شائع کر[رہے] ہیں ان کے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ ممکن ہے [اس] معمولی کوشش سے مصنف کے اندرونی کرب [کا] کفارہ ہو سکے اور آئندہ نسل کے لئے مشعل راہ [ہو]۔

یوں تو فرحت صاحب نصف درجن سے [زائد] کتابوں کے مصنف ہیں لیکن میرے پیش نظر ا[س وقت] تین کتابیں ہیں۔ (۱) زمین ہند (قومی نظموں کا [مجموعہ]) (۲) ضروریات شعر و ادب (فن عروض و بلاغت [مختصر] مگر جامع اور نہایت کارآمد کتاب) (۳) رقصِ [عکس] (حمد و نعت، دینی و ملی نظموں اور رباعیات و ق[طعات] کا مجموعہ)

(۱) "زمینِ ھند" بہار اردو اکادمی کے ما[لی تعاون] سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۷۶ [ء] اور پھر دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ ہے علامہ ابر احسنی گنوری کے تعارف نے اس میں [چار چاند] لگا دیئے ہیں۔ کتاب کھولتے ہی ایک قطعہ ملتا [ہے جو] مجموعہ کا خلاصہ کہیئے ؎

یہاں جو قوم جینا چاہتی ہے
خوشی کا جام پینا چاہتی ہے
یہ دھرتی اس و دے سکتی ہے سونا
مگر پہلے پسینہ چاہتی ہے

اس کا انتساب وطن عزیز کے ان جاں[باز] شہیدوں کے نام ہے جنہوں نے وطن کی آزادی اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے اپنی قیمتی جانیں [قربان] کر دیں۔ اس میں پچاس نظمیں اور بارہ قطعات [ہیں۔] "مولانا حسین احمد مدنی" سے "قرض قومی ترانہ ہم ا[...]

تک ساری نظمیں پڑھ جائیے اور اندازہ لگائیے کہ شاعر حب
الوطنی کے جذبے سے کس قدر سرشار ہے۔

(۲) عروض وریاضت مشق ادب :- علم عروض پر درجنوں
کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن موصوف کی یہ کتاب جتنی مفید اور
کارآمد ہے۔ میرے خیال میں دوسری کتابیں نہیں ہیں۔
سہل انداز تحریر میں مبتدی سے منتہی تک کے لئے یہ ایک
عظیم سرمایہ ہے۔ یہ کتاب افرو پبلی کیشن، کریم گنج گیا نے
۱۹۸۲ء میں شائع کی ہے۔ اقسام نثر، اقسام نظم، غزل
گوئی کے چند اصول، عیوب شعر، تقطیع اور بحریں انھیں
عنوانات کے تحت اس میں باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) رقص بے عکس :- یہ مجموعہ ۱۹۸۸ء میں بہار اردو
اکادمی کے تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس کا انتساب آپ
نے اپنے والد محترم حکیم سید ابوالظفر قادری اور استاد
محترم علامہ ابراحسنی گنوری کے نام کیا ہے۔ اس کی ابتدا
میں شاعر کی خود نوشت سوانح حیات بعنوان "میری
کہانی" درج ہے۔ جس سے قاری کو مصنف کا مکمل تعارف
حاصل ہو جاتا ہے۔ اس میں خاندانی شجرہ، درس و تدریس
اور شاعری کی ابتدا سے موجودہ حالات تک تفصیل
سے باتیں کہی گئی ہیں مصنف کے متعلق یہ خود نوشت سوانح
بہت مفید اور معلوماتی ہے۔ اپنے حالات کو خود مصنف
جتنا بہتر جانتا ہے۔ دوسرے کو کیا معلوم۔ آپ نے اپنی
تاریخ لکھ کر ہم جیسے لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس
مجموعہ میں شامل نظمیں اور دوسری تمام تخلیقات نہایت
عرق ریزی، کاوشوں اور تجربوں کا نتیجہ ہیں۔ فن کی
پختگی اور بیان کی سلاست کے ساتھ زبان کی حلاوت
بھی ملتی ہے۔ اس مجموعہ میں حمد و نعت کے علاوہ ۳۷ نظمیں
[illegible] رفتگاں کے تحت نظمیں

ہیں۔ اس عنوان میں آپ نے اہم اور قابل قدر شخصیتوں
کی یاد میں نظمیں لکھ کر ایک بڑا اور قیمتی سرمایہ فراہم
کیا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو رفتگاں کو یاد کرتے ہیں اور
یاد رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس مجموعے میں رباعیات و
قطعات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔

آخر میں یہ بتادوں کہ فرحت قادری صرف ایک
شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر گر بھی ہیں۔ درجنوں تلامذہ ان سے
اکتساب فیض کرتے ہیں۔ یہ خدمت آپ جس خندہ روئی
سے انجام دیتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ
ملک گیر شہرت یافتہ شعراء میں سے ایک ہیں۔ خوشامد اور
چاپلوسی سے دور رہنے (جو آپ کا خاندانی ورثہ ہے) کے
سبب آپ کو وہ مقام نہ ملا جو دوسروں نے حاصل کیا۔
اعلیٰ اخلاق، نرم و خوش مزاج، شیریں کلام اور ملنسار
ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے فن پر پوری دسترس
رکھتے ہیں۔

میں نے آپ کا نام قبل سے سنا تھا۔ ذاتی طور پر ملنے
کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ آرزو دل میں کروٹ
بدلتی رہی تھی۔ چنانچہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جب میں
مونگیر ضلع اسکول سے بدل کر گیا ضلع اسکول میں
میں آیا تو یہ تمنا پوری ہوئی۔ ان کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا
موقعہ ملا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔

سب سے آخیر میں جناب عطا کاکوی کی نظم کے چند اشعار
کے جو اشعار فرحت صاحب کی نذر کرتے ہوئے رخصت [illegible]

اے ادیب خوش بیاں اے شاعر شیریں زباں
تیرے سوز و ساز سے معمور ہے سارا جہاں
تیری تصنیفات ہیں آئینہ بہر ادراک دل
جن سے ہوتا ہے ترے قلب و نظر روشن عیاں

ظہیر غازی پوری
ہزاری باغ (بہار)

فرحت قادری کی غزل — عصری آگہی کا منظرنامہ

فرحت قادری ایک ہمہ جہت، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ہمہ جہت اس لئے کہ انھوں نے صنفِ شاعری کی مختلف ہیئتوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کی نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو نظم کے شاعر معلوم ہوتے ہیں اور رباعیات اور قطعات پر نظر مرکوز کی جائے تو لگتا ہے کہ انھیں ان شعری ہیئتوں سے فطری لگاؤ رہا ہے۔ اور انہوں نے ان سب کو نئی شعری حسیات سے ہم آہنگ کر دیا۔ انھوں نے سانیٹ، ہائیکو اور آزاد غزل کے تجربے بھی کئے ہیں جو انھیں "معتبر آگاہ" شاعر کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی قومی نظمیں جذبۂ حب الوطنی کی آئینہ دار ہیں اور ان میں ملک و وطن کی سوندھی مٹی کی والہانہ خوشبو رچی بسی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

فرحت قادری کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "کائناتِ غم" ۱۹۵۸ء میں طبع ہوئی تھی جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ "شیشے اور پتھر" ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا جس میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۳ء کے درمیان تخلیق کردہ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ تیسرا مجموعۂ کلام "رقص و عکس" ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں ان کی مختلف موضوعات پر کہی گئی نظمیں، قطعات اور رباعیات شائع ہوئی ہیں۔ ان کا چوتھا مجموعہ "زمینِ ہند" ہے جو ۱۹۹۲ء میں طبع ہوا۔ اس میں صرف قومی نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی ایک کتاب عروض و بلاغت پر "ضروریاتِ شعر و ادب" بھی چھپ کر مختلف حلقیانِ ادب میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔

"رقص و عکس" میں خود نوشت سوانح حیات "میری کہانی" زینتِ کتاب ہے جس سے ان کی خاندانی اور ذاتی حالات منعکس ہوتے ہیں۔ یہ محققین کے لئے بے کار آمد ثابت ہوں گے۔ "زمینِ ہند" میں بھی بعنوان "مصنف" فرحت قادری نے اپنی قومی نظموں سے متعلق بڑی بے باکی سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے ان کے جذبات اور حالاتِ حاضرہ کی ناانصافیوں کا ایک پہلو رونما ہوتا ہے۔ جہاں حق و صداقت کا خون ہوتا ہے وہاں اہلِ فن کی ناقدری بہرحال ہوگی۔ مگر فنکار کو دل برداشتہ کبھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اقدار و تہذیب کا پاسدار ہوتا ہے۔ مرثیہ گو نہیں!

ان کے پہلے مجموعہ کلام "کائنات غم" میں پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی اور پروفیسر عبدالمغنی کی آراء شامل ہیں۔ بقول عطا کاکوی "فرحت قادری کا کلام ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے، وہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ کلام میں تغزل کے تمام عناصر موجود ہیں۔ اشعار بڑے پرکیف اور وجد آفریں ہیں" اس رائے سے فرحت کی غزل یا غزل گوئی پر کوئی ایسی روشنی نہیں پڑتی جو ان کے شاعرانہ مزاج کو سمجھنے میں معاون ہو سکے۔ تمام شعراء کا کلام دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر شاعر جو محسوس کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ یہ بڑی عام بات ہے۔ شاعر کے کلام سے ذہنی ہم آہنگی ہونے پر اس کے اشعار پرکیف اور وجد آفریں معلوم ہوتے ہیں۔ عطا صاحب کا صرف ایک جملہ قابل غور ہے کہ "فرحت قادری کے کلام میں تغزل کے تمام عناصر موجود ہیں" تغزل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سارے لوازم ان کی غزل میں نمایاں ہیں جو اس زمانہ میں غزل گوئی کے لئے لازمی تصور کئے جاتے تھے۔ مگر تمام عناصر کے موجود ہونے کی بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ عطا کاکوی نے یہ رائے ۱۹۶۶ء میں لکھی تھی اور وہ زمانہ ترقی پسند شاعری کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس لئے فرحت کے مجموعہ میں وہ غزلیں بھی شامل تھیں جو کلاسیکی قدروں کی حامل تھیں اور وہ غزلیں بھی جن میں ترقی پسند شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔ مگر انھیں "تمام عناصر" کا نام دینا مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ ولی دکنی سے فرحت قادری تک غزل اتنی اسالیب و افکار سے گذر چکی ہے کہ ان تمام عناصر کا کسی ایک شاعر میں یکجا ہونا تقریباً ممکن نہیں ہے۔ ان کی غزل سے متعلق

" غزلوں میں اردو تغزل کی مسلمہ روایات کی پابندی کی گئی ہے۔"

" ان غزلوں میں جان ہے اور ان کے مطالعہ سے احساسات سرشار ہوتے ہیں۔ یہاں رنگ بھی ہے اور آہنگ بھی۔

" کہیں کہیں درد دل کی کسک بھی ملتی ہے لیکن اب اردو غزل اتنی بالیدہ اور شستہ ہو چکی ہے کہ انفرادیت اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے بڑے ہی خاص قسم کے تجربات احساسات، نیز ان سے ہم آہنگ اسلوب اظہار درکار ہے۔ فرحت قادری اس نکتہ پر جتنی توجہ دے سکیں، ان کے فن کے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔"

بلاشبہ "کائنات غم" کی غزلوں میں کلاسیکی تغزل اور مسلمہ روایات کی پابندی موجود ہے اور اس عہد کا رنگ و آہنگ بھی۔ عبدالمغنی صاحب کی یہ رائے کہ "انفرادیت اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے بڑے ہی خاص قسم کے تجربات اور احساسات نیز ان سے ہم آہنگ اسلوب اظہار درکار ہے" بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اور میرے خیال میں فرحت قادری کے لئے یہ مشورہ مشعل راہ ثابت ہوا۔ کیونکہ اس عہد کے بعد کی غزلوں میں کلاسیکی اقدار کی پاسداری کے ساتھ ہی عہد آگہی کی عکاسی، عصری مسائل سے ہم آہنگی، اسلوب اظہار کی تازگی اور نئے فکری رنگ و آہنگ رچ بس گئے ہیں۔

ویسے فرحت قادری نیک، مہذب اور شائستہ انسان ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری میں بھی تہذیبی قدروں کی پاسداری کے تمام تر اثرات نمایاں ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے علاوہ فارسی اور عربی زبان کا بھی مطالعہ

حسیت کی وارفتگی اور عصری آگہی کے زندہ و تابندہ نمونے موجود
ہیں۔ "کاشانات غم" میں جہاں رومانی انداز میں تخلیق کردہ
یہ اشعار موجود ہیں ؎

کیا کہوں، کتنے احترام کے ساتھ
درد اٹھتا ہے تیرے نام کے ساتھ
کیا خبر کس لئے نگاہ دوست
رہ گئی جھک کے میرے نام کے ساتھ

وہیں اکثر غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے شعری رویوں سے ہم آہنگ رہے ہیں اور ایسے شعر بھی کہے ہیں جن میں عصری حسیت بھی ہے اور ترقی پسندانہ اندازِ بیان بھی۔ مثلاً ؎

سختیاں وقت انھیں پہ کرتا ہے
وقت کے جو رسول ہوتے ہیں
جو ور دنیا سے بہت تنگ آ چکے
اب تو یہ دنیا نہیں یا ہم نہیں

فرحت قادری کے دوسرے مجموعہ کلام "شیشے اور پتھر" میں ایک اہم شاعر علامہ جمیل مظہری اور مشہور ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی کی آرا شامل ہیں جو عمومی طور پر ان کی شاعری اور خصوصی طور پر ان کی غزل کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان کا مطالعہ از بس ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علامہ جمیل مظہری نے اظہار خیال کیا ہے کہ:

"سرسری مطالعہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ فرحت صاحب قدیم رنگ و سخن کے پرستار تھے۔ مگر انھوں نے روش زمانہ کو دیکھ کر جدیدیت کی ہوا کا ساتھ دینے کی کوشش کامیابی کے ساتھ کی ہے کیونکہ سکۂ رائج الوقت یہی ہے۔"

ان میں تازگی [illegible] بھی ہے، شدتِ احساس، بھی، دلکشی بھی اور دلربائی بھی۔ مگر کہیں کہیں ان جذبۂ اصلاح اور جوشِ انقلاب ان پر غالب آ گیا ہے۔ لہجے میں خشونت اور جھنجھلاہٹ آ گئی ہے جس نے غزل کے تنِ نازک کو مجروح کر دیا ہے۔"

یہ بات مندرجہ بالا سطور میں کہی جا چکی ہے کہ ابتدا فرحت قادری نے روایت کی مستحکم بنیادوں کو ا شاعری اور غزل گوئی کا محور بنایا تھا، مگر وہ د ادب میں رونما ہونے والی نئی فکری و فنی جہتوں سے آشنا تھے اور جدیدیت کے رجحانات اور نئی ا د حسیت کو بھی انھوں نے خوش آمدید کہا۔ اس تبد کے باعث ان کے اشعار میں تازہ کاری کے ساتھ ... اسلوبِ اظہار کا قدرے تیکھا انداز پیدا ہو گیا جسے جمیل مظہری صاحب نے خشونت اور جھنجھلاہٹ کا نا دیا ہے۔ حالانکہ یہ اندازِ بیان بدلتے ہوئے مزاج کے م مطابق تھا۔ رہا سوال غزل کے تنِ نازک کے مجروح ہو کا تو اس دور کے اکثر شعرا اور ناقدین "حرفِ تغزل" کو معبد بنا کر پیش کرنے کی سعی کرتے رہے، حالانکہ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ علامہ جمیل مظہ صاحب خود اپنی غزل سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"جب کبھی غزل کہنے بیٹھا تو اپنے اشعار کو الفا افکار کی ثقالت سے بچا نہ سکا۔ غزل ہونے کو ہو لیکن جن کش میں نہ وہ لطافت پیدا ہوئی اور نہ فکر خیال میں وہ رعنائی، نہ زبان میں وہ لوچ اور نہ بیا میں وہ تاثیر جو غزل کی جان ہے۔"

"جدیدیت کی لہر کے ساتھ الفاظ و افکار میں ا تبدیلیاں آئیں جو اس عہد کے شعرا کے جوابِ وجد [illegible]

لگے تھے۔ فرسودہ اور پامال تراکیب اور موضوعات شعر کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ اس کی جگہ پیکر تراشی، استعارہ سازی اور علامت نگاری نے اپنے جوہر دکھائے۔ لہٰذا قدیم انداز فکر کے شعرا کو ان سب تبدیلیوں میں "نقائص" نظر آنے لگے۔ اور "تغزل" کی روح فنا ہونے لگی۔ مگر یہ سب کچھ وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ اسی باعث خود جمیل مظہری صاحب بھی غیر شعوری طور پر سہی، ان تبدیلیوں سے متاثر بھی ہوئے اور سچائی کے ساتھ اظہارِ خیال بھی کیا۔

" ڈاکٹر وہاب اشرفی نے فرحت قادری کو "ایک حساس ملتہب شاعر" قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

" فرحت قادری ہم عصر مزاج کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ کسی گوشے پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا ذہن ساکت و جامد نہیں رہتا۔ نہ محدود روایتی فضا انہیں مقید کرتی ہے۔ ایسے میں ان کے ذہن کی وسعت کی داد دینی پڑتی ہے"

ان چند سطروں میں ڈاکٹر وہاب اشرفی نے فرحت قادری کی شاعری سے متعلق جو باتیں کہی ہیں اگر ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو بلا مبالغہ ایک کتاب لکھنی پڑے گی جس کے ابواب کچھ اس طرح ہوں گے۔

(۱) فرحت قادری ہم عصر مزاج کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

(۲) وہ لگتا ہے کہ اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔

(۳) وہ بعض گوشوں پر تنقید بھی کرتے ہیں

(۴) اس لئے ان کا ذہن ساکت و جامد نہیں

(۵) محدود روایتی فضا انہیں مقید نہیں کرتی

(۶) (ایسے میں) ان کے ذہن کی وسعت کی داد دینی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی رائے میں، میرے نزدیک دو باتیں بے حد اہم ہیں۔ ایک یہ کہ فرحت قادری ہم عصر مزاج کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ محدود روایتی فضا انہیں مقید نہیں کرتی۔ یہ دونوں باتیں متضاد بھی اور ایک دوسرے کی نفی بھی نہیں کرتیں۔ ان میں "سمجھنا چاہتے ہیں" اور "مقید نہیں کرتی" کے ٹکڑے غور طلب ہیں اور بحث طلب بھی۔ اگر وہ ہم عصر مزاج، ہم عصر شاعری، ہم عصر تقاضوں اور اس کے تلازموں کو صرف سمجھنا چاہتے تو ان کا اظہار نہ ہوا ہوتا۔ اور وہ ان کے ذہن و شعور کے کسی گوشے میں سمٹ کر رہ گئے ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہم عصر مزاج کی جھلک ان کی غزلوں میں نظر آتی ہے۔ اور اسی وجہ سے محدود فضا انہیں مقید کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ثبوت کے طور پر چند عصری حسیت کے حامل اشعار پیش ہیں ؎

منزل ملی تو لوگوں کی پہچان کھو گئی
چہروں پہ تھے غلاف مسافت کی دھول کے

چھوٹا سا اک مکان تھا محلوں کے درمیان
آیا جو زلزلہ تو وہی سر بلند تھا

لوگ اب سر کو ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں
جانے کس سمت سے قاتل کی سواری نکلے

تم نے کبھی کرید کے دیکھا کہاں مجھے
سوئے تھے کتنے خواب نگاہوں کی تہہ میں

سچ کا اک کنکر گرا تھا جھیل میں
جھوٹ کا طوفان برپا ہو گیا

بڑا بھیانک یہ حادثہ ہے
زبان رکھ کر بھی ہم ہیں گونگے

ان اشعار میں غزل کے شعر وضع کرنے کی روایت کے سوا کہیں کوئی اور روایتی فضا نہیں ہے۔ الفاظ عام فہم ہیں مگر ان کا برتاؤ نیا ہے۔ اسلوب میں تازگی ہے اور موضوعات اپنی ذات کے اندر اور باہر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ زبان کی ندرت اور الفاظ کے رکھ رکھاؤ کی خوبیوں نے ایک نوع کی تازگی، دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ مسافت کی دھول کے خلاف، قاتل کی سواری، ننگا پول کی برف، سچ کا کنکر وغیرہ جدلیاتی انداز فکر اور استعارہ سازی کے مظہر ہیں اور نئی معنوی دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں۔ زبان رکھ کر گونگے ہونے کی بات نئی نہ سہی مگر پورا شعر ہی اک استعارہ ہے اور اپنے اندر معنویت کی کئی پرتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ تمام خصوصیات نئی غزل کی امتیازی پہچان ہیں۔ فرحت قادری کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں استعاروں اور علامتوں کو اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ شعر کے مفہوم و معنی میں کوئی الجھاؤ یا ابہام و تفہیم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ترسیل کی ناکامی کا المیہ بھی نہیں ہے اور خواہ مخواہ کی شکست و ریخت اور فنی توڑ پھوڑ کا بھی کہیں کوئی شائبہ نہیں ملتا، جیسے جدیدیت کا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا تھا۔ فرحت قادری نے الفاظ کے استعمال اور اظہار و بیان میں ہمیشہ اعتدال پسندی سے کام لیا ہے۔ اور میرے خیال میں، یہی اعتدال پسندی ان کی انفرادیت بھی ہے اور شناخت بھی۔

فرحت قادری کی وضع کردہ علامتیں بھی نہایت بلیغ ہیں۔ وہ شعر کو مبہم بنانے کی بجائے ان کو نیا حسن عطا کرتی ہیں۔ روشنی، اجالے، شعاع، سورج، چاند جیسے الفاظ کو انھوں نے علامت کی شکل میں ڈھال کر کے موضوعات شعر کو تابانی بخشی ہے۔ اس قول کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

اس ٹھنڈی رات میں تو اندھیرے کا راج ہے
سورج جلا رہا تھا مگر روشنی تو تھی !

کتنے ہی لوگ دن کے اجالے میں لٹ گئے
فرحتؔ خدا سے اور دعائے سحر نہ مانگ

فراز شب سے کوئی چاند اتار کر لاؤ !
اندھیری رات کے سر پر غرور رہتا ہے

اک چاند کو انسان نے دیکھا ہے تو حیرت
سورج کے مراحل تک ٹوٹیں گے بھرم کتنے

ہم نے سورج کو خلاؤں میں اچھالا، لیکن
روشنی سے کبھی جو نکلے تو اندھیرے نکلے

کون مانے گا کہ سورج ہے اندھیرے کا سفیر
چھیننے کا حق کوئی مجھ سے بصیرت میری

راس آیا نہ کبھی مجھ کو اجالوں کا لباس
اوڑھتا آیا ہوں مدت سے میں کالی راتیں

شاید کوئی سورج ہے نہاں فکر و نظر میں
شبنم کو بھی ہم شعلہ نما کاٹ رہے ہیں

اجالوں کو کسی نے کب سمیٹا اپنی آنکھوں میں
سحر تو آئی تھی فرحتؔ اندھیری رات سے پہلے

مندرجہ بالا تمام اشعار میں استعمال شدہ علامتوں کی تفسیر و تشریح تو ممکن نہیں، مگر پہلے اور چوتھے "سورج" اور "چاند" کی علامتوں پر غور فرمائیے تو اندازہ ہوگا کہ ان الفاظ نے شعر [illegible]

پیدا کردی ہے بلکہ نئی معنوی پہلو بھی اجاگر کر دیے ہیں۔
مثلاً پہلے شعر میں لفظ "سورج" کو گزشتہ موسم، عہد رفتہ کے نظام حکومت یا کسی دشمن یا ظالم شخص کے تعلق سے منسلک اور اس کے حالات سے متعلق کر دیا جائے تو شعر بالکل ہی نئی فضا اور نئی معنوی جہتوں کا عکاس نظر آئے گا۔
کچھ ایسی ہی کیفیت چوتھے شعر میں استعمال شدہ "لفظ" "سورج" کی بھی ہے۔ چاند تک انسان کی رسائی ہو چکی ہے۔ مگر سورج تو جلا کر خاک کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے لہٰذا اس کے مراحل بلاشبہ دشوار گزار ہیں اور بھاؤ توڑ نے اور اعتماد کو چکنا چور کر دینے والے ہیں۔ مگر انسان آگ میں بھی زندہ رہنے کے ذرائع کسی حد تک ڈھونڈ چکا ہے۔ اور ابھی تگ و دو جاری ہے۔ چاند کو کسی مخلص انسان اور سورج کو کسی جابر انسان کی علامت تسلیم کر لیں تو شعر ایک اور فکری سمت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ دراصل علامتی الفاظ کے اوصاف بھی ہیں کہ وہ غور و خوض کے کئی در وا کر دیتے ہیں اور قاری اپنے اپروچ کے مطابق ان کے مفاہیم و مطالب سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ علامت کے سلسلے میں ڈاکٹر کرامت علی کرامت نے بڑے واضح انداز میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔
"علامت سے مراد ایک ایسا لفظ ہے جو اپنے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر بہت ہی پیچیدہ، وسیع اور تہ در تہ معنی رکھتا ہے۔"
شعر میں علامتی الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس کی پہچان وہی کر سکتے ہیں جو شاعری کے رموز و علائم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ علامت کی وضاحت یا شناخت سے متعلق بھی کرامت علی کرامت نے لکھا ہے کہ۔
"چونکہ علامت میں پہلو بہ پہلو مختلف قسم کے پیچیدہ جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے جو بذات خود متضاد حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، اس لئے نہ علامت کی وضاحت ممکن ہے نہ مختلف قارئین کے ذہن میں اس سے متعلق یکساں رد عمل کی امید کی جا سکتی ہے۔"
فرحت قادری کی غزل میں پیکر تراشی اور استعارہ سازی کی بات میں کر چکا ہوں۔ موجودہ عہد کی شاعری میں اگر یہ اقدار نہیں تو وہ کسی نہج پر ادب کے قاری کو متاثر نہیں کر سکتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی تجربات کو اقدار سمجھتے ہیں۔ نئی غزل سے متعلق انھوں نے لکھا ہے۔
"غزل ان تمام تجربات کو بعینہٖ قبول کر سکتی ہے جن سے شاعر ایک داخلی انسان کی حیثیت سے دو چار ہوتا ہے"
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرحت قادری نے بھی اپنے اندر جھانکنے کی کوششوں کے ساتھ اپنے ماحول اور معاشرہ کے لوگوں اور ان کے مسائل پر بھی کڑی نظر رکھی ہے اور نہ صرف گہرے انداز سے پھیلی ہوئی بدعتوں، نفرتوں اور متعصبانہ کیفیتوں کا بھی بھرپور مطالعہ کیا ہے۔ شاعر اپنے معاشرہ اور ملک میں پیدا ہونے والے حالات اور زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور ان صداقتوں کو اپنے لفظوں میں سمیٹنے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہے۔ کیونکہ شاعری جہاں رجحانات سے وابستہ ہے۔ وہیں تاریخ و تمدن کی آماجگاہ بھی ہوتی ہے ۔
فرحت قادری کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جو اس عہد کے انسانوں کو اور ان کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۔

ڈھونڈنے لگی نہ دیوار کا نقصان ہو گا نہ یہ جانتا تو پلٹ کر نہ گھر گیا
بھرے مکان میں طوفاں کے بعد کوئی نہ تھا
بھٹک رہی تھی بس اک بے اثر دعا گھر میں

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں فرقہ وارانہ فسادات
کی جانب واضح اشارے کئے گئے ہیں۔ ان اشعار کے
لفظ لفظ میں قتل و خون کی واردات کا ایک لامتناہی
سلسلہ پوشیدہ ہے جو اس ملک کا مقدر بن چکا ہے۔
اب چند ایسے اشعار کا مطالعہ کیا جائے جو زندگی کی تلخ
حقیقتوں سے عبارت ہیں ؎

جلتا رہا لاؤ ذہین کے حصار میں
پھر جادۂ آگہی کا لیکن زبان تھا

بہتر ہے دینیات کا آئینہ توڑ دے
کب تک صلیب رسم و وفا تو اٹھائے گا

سمجھا گیا مجھے بھی سحابوں کا ہمرکاب
حالانکہ میرا گوشۂ دامن بھی نم نہ تھا

کوئی دیوار تو ملتی نوائے شب گزیدہ کو
اگر کھڑکی کھلی ہوتی تو پردہ ہی ہلا دیتے

چلتے چلتے بھی چونک جاتا ہے
غالباً آدمی ہے خواب زدہ!

حباب میرے بدن سے بھی سر اٹھاتے ہیں
مرا خیال ہے میں بھی کوئی سمندر ہوں

جنون شہر کیسی تشنگی ہے
چھنتی ہے فصل جسم و جاں تک

فرحت قادری کے محولہ بالا تمام اشعار کی روشنی
میں قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں
عصری آگہی، جدید ادبی حسیت اور مابعد جدیدیت
کے اثرات و عناصر بھی موجود ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے
شعر و ادب پر ہمیشہ تنقیدی نظر ڈالی ہے اور غور و فکر کو
اپنی غزل کی اساس تسلیم کیا ہے۔ اور بلاشبہ غور و فکر
کی صلاحیت ہی غزل کی روح ہے۔ غزل صنف ہی داخلی اظہار

نہیں سلیکہ وجدانی کیفیات کا اظہار بھی غزل کی
پہچان ہے۔ فرحت قادری کم و بیش عام برسوں سے
غزل کی آبیاری کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند
تحریکوں کا دور بھی دیکھا، ترقی پسند تحریکات کی
قریب سے ہو کر گزریں اور جدیدیت کی باڑھ اور کھردرے
السلاکات کے زیر اثر نہیں گوئی کی مسند نشینی بھی
سے دیکھی اور ان کی آزمائش بھی کی، مگر اپنے فن اور
کو "شب خونی" اثرات سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ اس لئے
کی غزل آج بھی عصری آگہی کا منظر نامہ ہے اور ان کی
غزل تازہ کاری کا احساس دلاتی ہے۔ وہ کل بھی رجحان
کو پہچانتے تھے اور آج بھی عصر دوراں کے مزاج داں
ان کی یہ خصوصیت انھیں دنیائے شاعری میں زندہ
کے لئے کافی ہے۔

بقیہ:- فرحت قادری، روشن نادیے...

موجودہ کھیپ ہمارے سامنے تواتر کے ساتھ خو
میں منہمک ہے اس میں جناب فرحت قادری امید
کے حامل ہیں ـــ ہماری شاعری کا مستقبل ان
کی بھی کوئی ضمانت نہیں دیتا جن کا ذکر جناب فرحت
کے واسطے سے کیا جا چکا ہے۔

علم العروض پر گوہر شیخ پوری کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف
"گوہر عروض و بلاغت"
شائع ہو گئی ہے

چند قطعات

شاعر آروی

(بھائی فرحت قادری کے مجموعۂ کلام "کائنات غم" کے جشن اجرا کے موقع پر)
مورخہ ۹ر نومبر ۲۰۰۷ء کہا گیا

کیا دلکش و حسین ہے یہ "کائنات غم"
محسوس کر رہا ہے یہ خود ہی ہر ایک فرد
اس کے سرود کیف کا ممکن نہیں بیاں
پنہاں ہے جس میں حضرت فرحت کے دل کا درد

ہیں پیکر اخلاص و محبت فرحت
ہیں گوہر صد لطف و عنایت فرحت
ممکن نہیں لفظوں میں بیان اوصاف
دیکھے جو انہیں بول اٹھے فرحت فرحت

عجیب چیز ہے اے ہم نفس حیات کا غم
یہ خوف و فکر کی دنیا تفکرات کا غم
کھلا یہ راز کہ کوئی نہ تھا بجز فرحت
جو اپنے دل میں سمو لیتا کائنات کا غم

کم ہوں گے اس جہان میں فرحت سے لوگ آج
دنیا کی ہو ہوس نہ جنہیں نہ خواہش ارم
ملتے ہوں سب سے جھک کے بہ عجز و انکسار
رکھتے ہوں اپنے دل میں نہاں کائنات غم

عجیب دلکش و رنگیں کلام فرحت ہے
جو دیکھتا ہوں تو دل باغ باغ ہوتا ہے
کچھ ایسا لطف ہے گویا مطالعہ اشعار
سرود کیف سے تازہ دماغ ہوتا ہے

ایک رباعی

پھولوں کی ہنسی، گریۂ شبنم بھی ہے
بجھتے ہوئے ارمانوں کا ماتم بھی ہے
کیا ایک نہیں کائنات غم میں ہے
[illegible]

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج، بھاگلپور

فرحت قادری کی غزلیہ شاعری میں تخلیقی آگہی

فرحت قادری کی غزلیہ شاعری میں تخلیقی آگہی کے دو پہلو ہیں ۔ زندگی کی بنیادی اقدار اور عملی جدوجہد حسن انسانی کے نازک تصورات سے معمور ایک نئے کلچر سے ملو کیفیات کی مصوری ــــ ان دونوں پہلوؤں کے پیش نظر فرحت قادری کی غزلوں میں تازہ کاری اور عصری مسائل سے بھرپور فضا کا احساس ہوتا ہے. اس فضا میں روایت کا احترام اور نیا سماجی اور تہذیبی شعور ملتا ہے۔ نیز گرد و پیش کے سیاسی معاشی، اخلاقی اور جمالیاتی حالات سے بے اطمینان کی جانب اشارے ملتے ہیں۔

فرحت قادری نے اظہار کے پیمانے کے لئے غزل کا جو راستہ اپنایا ہے اس میں نئی توانائی اور نئی بصیرت کا احترام، وقت اور حصول وقت کا ارتعاش دیکھا جا سکتا ہے ۔ تجربہ، مشاہدہ اور احساس کی تثلیث شاعر کو ہمہ گیری اور تنوع عطا کرتی ہے ۔ فرحت قادری کے یہاں حسیاتی شعور شاعرانہ بصیرت اور جذباتی وارفتگی کے ساتھ [illegible] اور [illegible] کا جیتا جاگتا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ایسی غزلیں دور رس اور [illegible] سود قادر و متوازن دماغ کی زرخیزی منت ہیں اور درد کی بازیافت کے عمل سے گزرنے کے لئے بھی کچھ

یہ سنگ تراشی ہے کہ آواز تراشی
ہر لمحہ نہ ہم اک کو دندا کاٹ لیتے ہیں

نکلتا کیسے کہ باہر سلگتی آنکھیں تھیں
تمام رات ٹھٹھرتا ہی رہ گیا گھر میں

مٹھی میں ہو کوہ گراں، بالو پہ بھی قابو
پانی سے بھی اٹھے دھواں، بدلے فضا، کوہ

کرچیاں سورج کی ہم چنتے رہے
یہ تماشا روز ہی ہوتا رہا

بکھری ہی جھولی جاتی ہیں تاریکیاں بتا
اٹھئے اب اور صبح کا رستہ نہ دیکھئے

حباب میرے بدن سے بھی سر اٹھاتے ہیں
میرا خیال ہے، میں بھی کوئی سمندر ہوں

فرحت قادری کی غزلیں اپنی طرف بھرپور توانائی کے ساتھ متوجہ کرتی ہیں ۔ ان کے یہاں ایک ... اور لب و لہجہ کی بدولت ایک منفرد آہنگ ملتا ... کی غزلوں میں جب الفاظ ترتیب پاتے ہیں تو

...تا پیدا کر لیتا ہے جس میں محاسن کا وفور، روایات کا پیچ
...تشبیہ و استعارہ کی ندرت کاری کی جھلک نمایاں ہوتی
ہے اور دروں بینی اور مشاہدہ ذوق کے ساتھ اپنے
...اندرون کی گہرائیوں میں گم ہو جانے کی پراسرار کشش
...ملتی ہے ؎

تنگ تابی بھی علاماتِ سحر تھی کم نہیں ہوتی
اگر خائف نہ ہو دل لذتِ انجام سے پہلے

تشکیک، التہاب، تحیر، تگلف، سراب
اک تشنگی ہے وسعتِ دریا کے باوجود

قطروں میں مرتا رہتا تھا پھر بھی تھا شادماں
وہ آدمی بھی کتنا اذیت پسند تھا

سلگتی دھوپ سے محفوظ اے خدا رکھنا
کوئی درخت وہاں میرے نام کا رکھنا!

پروا شکست و ریخت کی، ساحل کو ہے بہت
طوفان کا بار پھر بھی مگر تو اٹھائے گا

فرحت قادری کی شاعری صرف محاکات نہیں، نہ محض بیان ہے، بلکہ نئی معراج اور نئی حقیقتوں کی تخلیق ہے۔ ان کی غزلوں میں زبان کی صوتی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے مجموعی معنی خیزی پر الگ اثر مرتب ہوتا ہے۔ کنایہ خیزی، جذبات آفرینی اور دروبست الفاظ و توافق کی [illegible] ان کے فنی شعور کا درجہ بے حد بلند نظر آتا ہے ؎

ان کی یادوں کا بھی رکھ لیجئے ٹکڑا کوئی
دور تک راہ میں ملتا نہیں سایہ کوئی

خشک ساحل بھی اگر ساحل ہو
[illegible] بیاباں [illegible]

چمکا ہوں حرف و صوت کی لذت سمیٹ کر
جلتی ہوئی چتا سے وہ خوشبو اٹھائے گا

تپتی ہوئی زمین سے جب بھی قدم اٹھے
بے نام آرزوؤں نے لپٹا لیا مجھے!

پھولوں کی ہر پنکھڑی ہے زرد موسم کی سفیر
عکس کیا دکھلا رہا ہے بن کے شبنم آئینہ

فرحت قادری کا مشاہدہ اور تجربہ وسیع ہے۔ ان کی غزلوں میں شاعرانہ وجدان کا سروکار تجسیم حقائق سے ہے، لیکن اس صورت میں کہ وہ جذبے کے زیر اثر روح کے ہم طبع و ہم ذات بن جائیں۔ ان کی غزلیں ہر پہلو سے زندگی بخش اثر رکھتی ہیں اور نئے روابط و علائق کے رشتوں سے منسلک کرتی ہیں۔ نئے سلسلہ ہائے فعل و انفعال، نئے امتزاج، نئی کشش اور نئے مطالب و معانی سے ان کی غزلیں نئی حیثیت کا وجود رکھتی ہیں ؎

آدمی سے نہیں، دیواروں سے قصے سن کر
ایک انجان مسافر ہے بہت دنگ یہاں

غلطاں ہے سارا شہر ہی تشنگی صداؤں میں
اب کچھ نہیں ہے حد ادب، بولتے رہو!

جب دھوپ تھی تو قدموں سے میرے لگا رہا
سایہ ملا تو سائے کا سایہ ہوا شریک

میرے دیار کی رنگینیوں کا کیا کہنا!
شفق میں آگ ہے، شعلے میں اس دیار کے پھول

فرحت قادری الفاظ کی گلکاری سے اسلوب کا انداز پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ فکری ساخت، معنویت [illegible] اور [illegible] عناصر کو [illegible] آگاہ ہیں اور زمین سے اپنے رشتے کی حقیقت [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible]

جاتے ہیں۔ بلکہ جب وہ [illegible] کو
پہچانتے ہیں اور دھیما کے لئے [illegible] کی اہمیت
سمجھتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ وقت کی ریت کو زندہ اور سچے
لہجے کی مہک عطا کرتے ہیں۔

ہوائے تند اڑا لے گئی سبھی موسم
طوفان کی دھول تہ دامن ہیں یہ بہار کے پھول
جھنگ پہ داؤ چلی [illegible] بارش ہو گئی
اب کوئی موسم ہو [illegible] ساون نہیں
الفاظ آ گئے ہیں کہاں سے رسول کے
پلکوں سے چن رہا ہوں میں [illegible]
کرتے ہیں وہ آگے جانے موسموں کا احتساب
زندگی مجبور ہے شاخ صنوبر سے جدا
وہ بھی وقت آئے گا جب یہ ہنسی شام تاریکیاں
ساتھ اپنے ہو جائے ہم دور لے جائیں گے
تتلیاں رنگ لے کے اڑ بھی گئیں
اب ہوا کو سمجھ رہے ہیں لوگ

فرانسیسی شاعر ملارمے نے کہا تھا کہ شاعری خیالات سے نہیں الفاظ سے بنتی ہے۔

POETRY IS NOT MADE WITH IDEAS BUT IT IS MADE OF WORDS.

میلارمے کے اس مقولے کا تجزیہ کرتے ہوئے اے۔ جی۔ اشرف نے لکھا ہے [illegible] کو غور کرنے سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ بعض لوگوں کے نزدیک شاعری کی تخلیق ہی مضمون یا [illegible] الفاظ پر [illegible] اہمیت نہیں [illegible] ہے کہ [illegible] اور معانی

[illegible] اہمیت کے [illegible]
سے وہ اصل یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ معا[illegible] خیال کیسا ہی [illegible] اور غیر معیاری [illegible] الفاظ کے لباس میں آ کر وہ شاعری بن جا[illegible] میلارمے نے جو بات کی ہے وہ اپنا [illegible] ضرور رکھتی ہے، کیونکہ شاعری میں الفاظ [illegible] کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی [illegible] میں کوئی شک نہیں کہ بہترین الفاظ کی بہتر[illegible] شاعری ہے۔ مگر اس سلسلے کے بارے میں ا[illegible] موجود ہے۔ ورڈز ورتھ نے اس نظریے کو [illegible] زور و شور سے پیش کیا کہ شاعری میں الفاظ [illegible] سادے اور عام سے ہوں۔ دراصل شاعر[illegible] کا استعمال احتیاط اور ذوق کا متقاضی ہے۔ [illegible] میں عام طور پر وہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں [illegible] ساتھ روابط اور تلازمات کا ایک سلسلہ ر[illegible] کیونکہ الفاظ میں معانی کی بہت سی تہیں پوشی[illegible] ہیں۔

فرحت قادری کی غزلوں کی ایک نمایا[illegible] یہ ہے کہ الفاظ کا استعمال سیدھے سادے طر[illegible] ہے جس سے مختلف حالتوں اور کیفیتوں میں [illegible] معانی سامنے آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں لفظ[illegible] صرف میں ذوق انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ اور [illegible] اس قسم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں جسے [illegible]ED EFFECT کہا جاتا ہے۔

جو طوفان کا پیش خیمہ بنا ــــ وہی شخص عالم [illegible]
[illegible] حقیقت اور [illegible]
جس [illegible]

شاہد احمد قادری
مدیر "نو دھرتی"، گیا

فرحت قادری کی شاعری کا مزاج اور معیار

فرحت قادری، اردو شاعری کا کافی جانا پہچانا اور معتبر نام ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو شاعری میں اپنے نت نئے احساسات و جذبات کو فکر و فن کی اعلیٰ قدروں کے ساتھ پیش کر کے اردو شاعری کی عظمت، وقار اور معیار میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج کے اس گروپ ازم اور تنگ نظری کے ماحول میں فرحت قادری جیسے حساس اور بے باک شاعر کو وہ مقام نہ مل سکا، جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کرب کا اظہار خود فرحت قادری نے اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے۔ "زمین ہند" کے صفحہ ۱۸ پر وہ رقمطراز ہیں۔

"میں صوبہ بہار کا ایک گمنام اور اردو زبان کا بدقسمت شاعر ہوں۔ تقریباً پچاس سال سے گیسوئے اردو کی مشاطگی کرتے کرتے اور قومی نغمے لکھتے لکھتے میرے بالوں کا رنگ سفید ہو گیا لیکن صدر یا صلہ ... شکر گزار ... "

فنکار فرحت قادری کی تنگدستی نے اردو شاعری کو مالا مال تو کیا، لیکن اس تنگدستی نے فرحت قادری کو گمنامی کے اندھیرے سے نہیں نکلنے دیا۔ فرحت قادری اگر بہت بڑے تاجر یا افسر ہوتے اور شاعر معمولی درجے کے بھی ہوتے تو ہمارے اردو کے نامور نقاد ان کے فکر و فن پر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے اور صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالتے، کتنے مقالے کتنی کتابیں اور نہ جانے کتنے رسالوں کے خصوصی نمبر نکال ڈالتے۔ بھلا ہو ماہنامہ "سہیل" (گیا) کے مدیر جناب مسعود منظر کا جنہوں نے میری خواہش پر اپنے شہر کے گوشہ نشین شاعر فرحت قادری کی عظیم اور رنگا رنگ شاعری پر ایک خصوصی نمبر شائع کر ڈالا اور وہ کیا۔

فرحت قادری کی شاعری کی ابتداء ۱۹۴۰ء کے آس پاس ہوئی ہے۔ اس وقت کے حالات نے ... استاد ... اختیار کر لئے۔ ان

بدلتے ہوئے وقت اور رجحانات کا پرتو فرحت قادری کی شاعری میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ قومی نظریہ بڑی تیزی سے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے بعد ملک کو ملی آزادی، پھر اس کا بٹوارہ اور اس کے ساتھ ہی پورے ملک میں فرقہ واریت کے اٹھتے ہوئے شعلوں نے ہر حساس ذہن کو فکر مند کیا اور ان ہی افکار و احساس کا برملا اظہار فرحت قادری کی ابتدائی شاعری میں بڑی جذباتیت کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ فرحت قادری کی پہلی شعری کاوش کہاں اور کب شائع ہوئی۔ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن فرحت قادری کی پہلی کتاب "زمین ہند" جو قومی نظموں کا مجموعہ ہے اس میں پہلی نظم مولانا حسین احمد مدنی پر ہے۔ جو ۱۹۴۲ء کے آندولن میں ان کی گرفتاری سے متاثر ہو کر اگست ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم کا ایک بند اس طرح ہے ؎

جہاد فی سبیل اللہ مجسم جس کی تربیت
سراپا منکسر اخلاق سے معمور طبیعت
یہ دقت درس اسلامی، کوئی دیکھے تو کیفیت
تمنا ہے اسی صحبت میں گزرے زندگی فرحت

صرف اس بند کے مطالعہ سے شاعر کی خود اعتمادی اور فکر و فن پر گہری نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "زمین ہند" کا دوسرا ایڈیشن ابھی حال ہی میں یعنی ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اور اس مجموعہ کی تمام نظمیں قومی یکجہتی اور قومی نظریہ کی بھرپور تائید کرتے ہوئے فکر و احساس کی ایک پوری دنیا آباد کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک حساس... [illegible]

بے چینی اور بے قرار ہوا ہے، جب جب ملک کی اس کی تہذیب و تمدن، اس کی روایت اور [illegible] آنچ آئی ہے۔ اور اس آنچ میں شاعر پوری طرح بار ہو کر اپنے احساسات و جذبات کو نظموں [illegible] فنی اور فکری عظمتوں کے ساتھ قلم بند کرتا [illegible] نعرۂ آزادی، مجاہد حریت، ترانۂ وطن، قدم ہندوستان جنت نشان، ہندوستان کا مجبہ [illegible] ہٹ جاؤ، بھارتی نوجوانوں سے، زمین ہند [illegible] لئے، اے جنت کشمیر، للکار، ہند کی سرزمین کا ترانہ، عنادیوں سے، قومی یکجہتی [illegible] نیا سال، پندرہ اگست اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی [illegible] نظمیں ایسی ہیں جو نہ صرف حب الوطنی بلکہ [illegible] کے فکر و احساس کو معنی اور مفہوم عطا کرنے [illegible] کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ اور قوم پرستی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ "زمین ہند" کے تعارف میں علامہ [illegible] گنگوہری کی بات حقیقت سے بے حد قریب [illegible] وہ لکھتے ہیں۔

" شاعر جب قوم و وطن کو قابل اطمینان [illegible] میں نہیں پاتا تو اس کا دل تڑپ جاتا ہے [illegible] درد، خلوص اور جذبۂ سرفروشی میں ڈوبی [illegible] نظم بن جاتی ہے "

آج جب کہ ہمارے ملک میں فرقہ [illegible] بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، ملک کے ٹکڑے کر دینے کی خواہش رچی جا رہی ہے۔ فرقہ [illegible] سے ملک کے خوبصورت چہرے کو داغ [illegible] بنایا جا رہا ہے۔ علیحدگی پسند قوتیں [illegible]

روایتوں کو فراموش کیا جا رہا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں فرحت قادری جن کے دل میں امن و آشتی اور حب الوطنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، کی یہ تمام نظمیں جذبۂ قومیت اور احساس وطن پرستی کو جگانے میں نہ صرف بے حد کامیاب ہیں، بلکہ قارئین کو دعوت فکر بھی دیتی ہیں۔ "زمین ہند" پر تبصرہ کرتے ہوئے بدر اورنگ آبادی نے بڑی اچھی اور سچی بات لکھی ہے کہ "چین کی جارحیت ہو یا پاکستان کی، سقوط ڈھاکہ ہو یا قبضۂ گوا۔ امن کا اعلانیہ مصالحت تاشقند ہو یا شملہ معاہدہ، فسادیوں کی لرزہ خیز داستان ہو یا جہیز کی لعنت، پندرہ اگست کی تابانیاں ہوں یا چھبیس جنوری کی شان جمہوریت، لیڈروں کا ظلم و جور ہو یا نیتاؤں کا لبادہ اوڑھے غنڈوں کی ستم گری، اپنے وطن میں وقوع پذیر ہر سانحہ، ہر تحریک ہر واقعہ اور ہر عمل نے فرحت قادری کے دل کو تڑپایا ہے۔ جھنجھوڑا ہے، نتیجتاً فرحت قادری کی نظموں میں اپنے وطن کی خوشبو کے ساتھ ساتھ مسرتوں اور شادمانیوں کی جلوہ گری ہے تو دوسری طرف شاعر کے کرب و الم کی گہری لکیریں بھی ملتی ہیں۔

(مطبوعہ "بودھ دھرتی")

فرحت قادری کا شعری سرمایہ گزشتہ پچاس سالوں میں صرف چار شعری مجموعوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے (۱) زمین ہند (قومی نظموں کا مجموعہ) (۲) کائنات غم (غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ) (۳) شیشے اور پتھر (غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ) (۴) رقص دلکش (حمد و نعت اور دینی و ملی نظموں کا مجموعہ) ان شعری مجموعوں کے مطالعے سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے فرحت قادری کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی اور بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی و معاشرتی اقدار، یہی وہ عنوانات ہیں جو فرحت قادری کی شاعری میں پوری طرح رچ بس گیا۔ حسن و عشق کو بھی فرحت قادری نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، لیکن مدرسہ کی تعلیم، گھر کا ذہنی ماحول اور ابتدائی شاعری کے دنوں میں ملک کے بدلتے اور بکھرتے حالات نے فرحت قادری کو حسن و عشق سے غالباً فکری طور پر دور رکھا۔ ویسے جہاں جہاں پر بھی فرحت قادری نے انہیں اپنا موضوع سخن بنایا ہے وہاں پر فکر و فن کی بلندیاں تمام تر رعنائیوں اور شگفتگی کے ساتھ موجود ہیں۔ غزلوں کے چند اشعار اس امر کے ثبوت ہیں ؎

نظر میں قہر ہے، رخسار ہیں غضب آلود
سکوت لب میں ہیں فتنے ہزار پوشیدہ
یہ کس مقام پہ تم کھینچ کے آ گئے فرحت
یہاں گلوں کی قبا میں ہیں خار پوشیدہ

یہاں تو صرف میں ہوں اور تو ہے
ادا کیا، ناز کیا، شرم و حیا کیا

اُف وہ حسنِ شباب کا عالم
عشق کو جب خبر نہیں ہوتی

وہ ادا ادا میں حلاوتیں، وہ قدم قدم پہ قیامتیں
وہ حیا میں ڈوبی ہوئی نظر، تجھے سب ہے یاد کہ بھول جا
مجھ کو تنہائیوں کا گلہ کچھ نہیں
سانس میں بند کہ آپ آ جاتے ہیں

[illegible] عشق [illegible] خوبصورت تصویر
فرحت قادری کے یہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔
اس کی وجہ مندرجہ بالا سطور میں بتلائی گئی ہے۔ فرحت
قادری کی شاعری میں جو موضوع سب سے زیادہ جگہ
پاتا ہے، وہ ہے غم، کرب، گھٹن، درد، بے بسی اور
مایوسی۔ یہ تمام موضوعات بڑے جذباتیت کے ساتھ
فرحت قادری کی شاعری کے موضوع بنتے ہیں اور چونکہ
فرحت شعراء ان تمام حالات سے بذات خود نبرد آزما رہا
ہے۔ اس لئے کبھی ان حالات کا کرب رلاتا ہے،
کبھی تڑپاتا ہے، کبھی ناامید کرتا ہے۔ کبھی اندر ہی
اندر بکھرتا ہے اور کبھی ان پر قابو پانے کی انتھک
کوشش کرتا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ رلاتے رلاتے
ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔

کہاں تک جلائے گی، اے برق سوزاں
ہر اک شاخ پر ہے ہمارا نشیمن

اک قیامت تھا شب غم کا گزرنا فرحت
رات بھر پھوٹ کے رویا کئے چھالے دل کے

اتنے کھائے ہیں دوستی کے فریب
اب تو جی دوستی سے ڈرتا ہے

میں غم دنیا کا محرم ہوں مگر
میرے ہی غم کا کوئی محرم نہیں

کب ترے در سے میں خالی آیا
غم ملا، درد ملا، کیا نہ ملا

زخم کو [illegible] فرحت [illegible]
زخم پر رکھے مرہم کوئی ایسا نہ ملا

نام فرحت ہے، مگر دل میں طپش لب پہ فغاں
شاعر درد مجسم کوئی ایسا نہ [ملا]

فرحت قادری نے [illegible] خوبصورتی اور ہنرمندی سے
شاعری میں درد و غم اور کرب و گھٹن کو معنویت
ہے اور جس طرح اپنے جسم کے اندر غموں کے [illegible]
کو برداشت کیا، وہ صرف اور صرف فرحت قاد[ری]
ہے۔ غموں، دکھوں اور کربناکیوں کو اپنی پلک
سجائے رکھنا بھی بڑے صبر و تحمل کا کام ہے
کا اظہار بے حد حسین پیرائے میں کرنا فن کی عظ[مت]
بلندیوں پہ لے جانے کے مترادف ہے۔ فرحت
کی شاعری خاص طور غم و الم کی شاعری نہ ص[رف]
دماغ کو متاثر کرتی ہے بلکہ معنویت کی ایک [illegible]
آباد کرتی ہے۔ غموں کا یہ احساس اور اس ک[ا]
اظہار ہی فرحت قادری کی شاعری کو عظیم
تر بناتی ہے۔ ہمارے میر کے یہاں بھی غم و الم ک[ا]
ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری بھی [illegible]
پیداوار ہے۔ اور دوسرے کئی فرحت قادری
عصر شعراء کے یہاں بھی درد و غم کا اظہار ملتا
ان تمام شعراء میں فرحت قادری کی آواز اور [illegible]
بالکل الگ اور منفرد ہے۔ درد و کرب کا [illegible]
اور اظہار نہ صرف فرحت قادری کو عظیم بنا[تا]
اردو شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتا ہے
ایک غزل کے درج ذیل اشعار میں فرحت
نے جس طرح فرحت کو [illegible]

طور پر اردو شاعری کے معیار اور وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ اشعار سن کر شاید میر بھی اپنا غم والم بھول جاتے

ہر کے غم حیات کے کھائے ہوئے ہیں ہم
اپنی صلیب خود ہی اٹھائے ہوئے ہیں ہم
جس درد کا نہیں ہے زمانے میں کوئی نام
وہ درد اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں ہم

حاصل نہیں ہے جس کو جہاں میں گداز غم
اس کی سمجھ میں خاک نہ آئے گا راز غم

ایسے خوبصورت اور معنویت سے بھرپور اشعار کے بعد فرحت قادری اگر کچھ نہ بھی لکھتے، تو بھی ایک نہ ایک دن فرحت قادری کی شعری عظمت کا اعتراف ضرور کیا جاتا اور ان کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہتی ـــــ فرحت قادری کی شاعری میں جو حسن بیان ہے، روانی، چستی اور نغمگی ہے وہ یقینی طور پر فرحت قادری کی شاعری کو ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔ اور ایک منفرد اور معتبر پہچان بناتی ہے

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ فرحت قادری کی ابتدائی شاعری میں روایتی حسن پورے التزام کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن فرحت قادری روایت کے زیادہ دنوں تک اسیر نہیں رہے، اور بتدریج ان کی شاعری میں معیار اور وقار کا اضافہ ہوتا رہا اور وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی شاعری کو جدید لب و لہجہ بھی عطا کیا۔ فرحت قادری نے جدید لب و لہجہ والی شاعری میں صرف جدیدیت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا بلکہ فکر و فن کی عظمت کو مجروح کئے بغیر جدید شاعری کا بہتر نمونہ پیش کر کے شعراء کی اس

صف میں شامل ہو گئے جو جدیدیت کے پیداوار ضرور تھے، لیکن جدیدیت کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اور علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کو معنویت کے ساتھ ابھار کر اشعار کو ایک خاص کیفیت اور جذبہ سے دوچار کرتے تھے۔

فرحت قادری کی فنی اور فکری دسترس یکساں طور پر غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات پر ہے اور وہ تت نئے تجربات اور مشاہدات کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری فرحت قادری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" جہاں تک غزل میں فکر و نظر کی وسعت پیدا کرنے اور غم حیات اور غم دوراں کا رنگ بھرنے کی ضرورت کا سوال ہے، میں بھی فرحت صاحب کا ہمنوا ہوں۔ مگر اس کا قائل نہیں ہوں کہ غزل صرف انقلاب زندہ باد ہو کر رہ جائے۔ غزل کا مزاج نازک ہے۔ اس کی نزاکت اس کی سادگی و پُرکاری ہی اس کی جان ہے۔ فرحت صاحب کی غزلوں میں بحمد اللہ اس کا التزام کافی حد تک ہے۔ ان میں تازگی فکر بھی ہے شدت احساس بھی، دلکشی بھی اور دلدوزی بھی ہے"

فرحت قادری کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرحت قادری کی نظر عصری مسائل پر ہمیشہ گہری رہی ہے۔ اور انہوں نے اپنے احساسات و جذبات کو اپنے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ اشعار میں ڈھالا ہے۔ فرحت قادری کی حساس طبیعت ہمیشہ اپنے ارد گرد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی انقلابات سے متاثر ہوئی ہے۔ اور وہ ان تما

چھوٹی بڑی اکائیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ دکھ درد، ظلم وستم، استحصال، ناانصافی اور کرب و گھٹن ان کے محبوب موضوع رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان ا لام میں وہ خود کسی نہ کسی طور پر گرفتار رہے ہیں۔ اس طرح ان کا انفرادی کرب اجتماعی بن کر سامنے آتا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے شعری اظہار میں فرحت قادری کو خاصا عبور حاصل ہے۔ جو فنکاری اور صناعی کا نمونہ بن کر ہمارے سامنے شعری پیکر لئے نظر آتے ہیں۔ "شیشے اور پتھر" کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے ؎

وقت کے پیچھے بھاگ رہا ہے، دھرتی پر آکاشوں میں
آج کا انسان اپنے دھن میں کھویا کھویا لگتا ہے

وہی گھٹن عالم ہر سو وہی عالم تباہی
کہاں لے کے آگیا ہے میرا جرم بے گناہی

رہتا ہے میرے دل میں میری جاں کی طرح
انساں جو کوئی ملتا ہے انساں کی طرح

فرحت قادری کو انسانی اقدار، رشتوں اور روایتوں سے گہری وابستگی ہے۔ وہ حیات اور کائنات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور برتتے ہیں۔ فن پر دسترس اور فکر کی بالیدگی اور موضوعات کے انتخاب نے فرحت قادری کو ایک قادرالکلام شاعر کی انفرادیت اور اہمیت بخش دی ہے۔

فرحت قادری نے اپنی دونوں طرح کی نظموں یعنی آزاد اور پابند نظموں میں بھی اپنے فلسفۂ حیات و کائنات کو ایک خاص فکر و معنی بخشی ہے۔ اور مسائل حیات کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ داخلی پہنا[ئیوں] کے نشیب و فراز سے زیادہ معاشرے کے ع[...] موضوعات کے گرد ان کی کئی نظمیں متحرک اور سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ "آدمی" "مشین"، "بھوک"، "حیات مضمر"، "تریاق" وغیرہ نظمیں [فکری] اور فنی دونوں اعتبار سے قابل ذکر ہیں ۔۔۔ "آگہی"، "عصائے رہبر"، اور "اجنبی راہیں" وغیرہ جیسی دیگر پابند یا معریٰ نظموں میں فرحت قادری [کا] فلسفیانہ لب و لہجہ خاص طور پر توجہ مبذول کر[اتا] ہے۔ آزاد نظموں میں فرحت قادری کی داخلی کیفیت زیادہ واضح اور نمایاں ہیں اور جدید محسوسات [کا] سمندر موجزن ہے۔ "ریگ رواں"، "دائرہ"، "شکستہ فصیل کے بعد"، "رشتۂ احساس" اور "کون جانے" جیسی نظمیں فنکار کی شخصیت اور فن دونوں کو [بڑے] باوقار انداز سے متعارف کرائی ہیں۔ اور تہہ دار معنویت کی دلفریبی اور دلکشی سامنے آتی ہے۔

فرحت قادری نے اپنے اعلیٰ شعری نمونوں [سے] اردو شاعری کی عظمت اور اس کے معیار اور وقار میں اضافہ کیا ہے جس کا اعتراف نہ کرنا ادبی [بددیانتی] کے مترادف ہے !!!

گنجینۂ عرفاں

صابر آروی کے عقیدتمندانہ کلام کا مجموعہ

قیمت صرف :- ۶۰/ روپے

پتہ :- کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ - ۴

سید عبد الاحد آزاد
(گیا)

نذرِ انتخاب - فرحت بھائی

★ گیا شہر "گوتم بدھ" مندر کے سبب بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ اور بڑے ہی قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ایک دوسری حیثیت میں بھی یہ شہر اپنا ایک روشن اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور وہ مقام "اردو ادب" کا ہے۔

بہار میں پٹنہ کے بعد گیا ہی علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ جس کی فضا میں ہمیشہ شعر و نغمہ گونجتا رہا اور جس کا ماحول نت نئے افسانوں، مقالوں، خاکوں اور تنقیدوں سے مزین رہا —— اس شہر نے انگنت صاحب علم و قلم اردو ادب کو دیئے جنہوں نے ادب کی ہر صنف اور ہر میدان میں اپنے جوہر دکھائے، اپنا مقام بنایا اور اردو ادب کے ساتھ ساتھ اپنے نام کو بھی جلا بخشی۔ ان درخشندہ ستاروں میں ایک نام ایسا بھی ہے جس کا میں بے حد مداح ہوں اور احترام کرتا ہوں۔ میرے نزدیک جس کی شخصیت بڑی ہی معتبر اور قابل ستائش ہے —— اس شخصیت کا نام "فرحت قادری" ہے —— پہلے یہ "فرحت القادری" ہوا کرتے تھے۔ مگر میں انہیں "فرحت بھائی" کہتا ہوں —— "فرحت بھائی" کہنے میں جس لذت اور مٹھاس کا احساس ہوتا ہے وہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے —— الفاظ کی قید سے باہر کی چیز ہے یہ ——

جب میں نے "ماہنامہ سہیل" کے کسی شمارے میں "فرحت قادری نمبر" کا اعلان دیکھا تو مجھے دلی مسرت ہوئی۔ میں مسعود منتظر صاحب کو ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آخر انہوں نے اپنے رسالہ "سہیل" کے لئے بے پناہ شخصیت کے حامل "فرحت قادری" کا انتخاب کر کے اردو ادب والوں کی خواہشات کا احترام کیا۔ یہ کام تو انہیں بہت پہلے ہی کر ڈالنا چاہئے تھا۔

مگر یہ جو کہتے ہیں کہ "دیر آید درست آید" بالکل درست لگتا ہے۔

اعلان پڑھتے ہی، مجھ میں "فرحت بھائی" پر کچھ لکھنے لکھانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ حالانکہ میں اس لائق نہیں — نہ اہل قلم ہوں اور نہ اہل نظر — پھر بھی یہ خواہش ضرور رہی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بھی کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی عقیدت انہیں پیش کردوں — سو میں کر رہا ہوں — اس لئے تحریر کو تنقیدی نظر سے نہیں، عقیدت و احترام ہی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو بہتر ہے۔

فرحت بھائی بنیادی طور پر ایک اچھے، مخلص اور ہمدرد انسان ہیں۔ اور جب ایسے انسان کے اندر سے شعر و شاعری کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہوں تو پھر یقیناً وہ ایک تناور درخت میں تبدیل ہو کر لازوال ہو نکلیں۔ فرحت بھائی کی لگن، جستجو اور ریاضت اور ساتھ ہی جناب آبر احسنی گنوری کی ہدایت نے انہیں ایک اچھے انسان کے ساتھ ایک اچھا شاعر بھی بنا ڈالا۔

ویسے مجھے شعر و شاعری سے بس اسی قدر رغبت رہی ہے کہ بلا امتیاز کسی بھی شاعر کے اشعار جو دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائیں یا مجھے متاثر کردیں۔ اور پھر بے ساختہ منہ سے واہ نکل جائے۔ اور بس!

یہ تو ہوئی عام بات — لیکن فرحت بھائی کے اشعار کا جہاں تک تعلق ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اور جب پڑھتا ہوں تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور پھر پڑھتا ہی چلا جاتا ہوں۔ سنتا ہوں تو سنتا ہی چلا جاتا ہوں — ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا ہے یا پھر ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے جذبات میں — شاید یہی ایک عمدہ، عظیم اور قامت شاعر ہونے کی دلیل ہے — یہ میری کیفیت احساس ہے — میرا مقصد فرحت بھائی کو بلندی پہنچانا نہیں — ہوسکتا ہے ان کے بعض اشعار خامیاں بھی ہوں اور ناپسند بھی کئے جاتے ہوں۔ اب نقاد تو ہوں نہیں جو ان کے اشعار کا بخیہ ادھیڑنا شروع کردوں، یہ کام تو نقادانِ سخن کا ہے۔ وہ چاہیں تو آ کی بلندی پر پہنچا سکتے ہیں یا پھر خواہ مخواہ کی مینخ نکال اشعار کا ستیاناس بھی کرسکتے ہیں — مجھے اس کیا غرض — میں تو فرحت بھائی سے اپنے تعلقات ذکر کروں گا —

میرے تعلقات کہاں سے۔ کدھر سے اور کب شروع ہوئے یہ تو مجھے یاد نہیں — ہاں! یہ ضرور سکوں گا کہ میرے تعلقات کی بنیاد اس وقت بے حد اور مخلصانہ ہوگئی جب میں ان کے شعری مجموعہ "شب اور پتھر" کی کتابت کے لئے منتخب کیا گیا — تھی ہاں میری خوش نصیبی تھی کہ فرحت بھائی نے بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ مجھ جیسے معمولی کاتب کا انتخاب اور اپنے اہم ترین مجموعے کے خراب ہوجانے کی بھی پرواہ نہ کی — میں سمجھتا ہوں یہی ان کے بڑاپن کی دلیل۔ اور انسان دوستی اور مخلصانہ جذبات کی عکاسی بھی۔

چونکہ کاتب اور صاحب کتاب کے درمیان لین دین کا مسئلہ ایک اہم پہلو ہوتا ہے — اور یہ ہی معرکے میں "فرحت بھائی" اپنی اعلیٰ شخصیت ا بہترین انسان ہونے کا نقش مجھ پر چھوڑ گئے — یہی مسئلہ ایک میزان اور ایک پیمانہ ہوتا ہے شخصیت

کو نمایاں کرنے اور پرکھنے کا ــــ ایک دوسرے کو سمجھنے کا ــــ ہم دونوں اس کسوٹی پر یکدم کھرے اترے۔

فرحت بھائی سے متعلق جو کچھ میں نے سنا تھا وہ اس سے کہیں بہتر نظر آئے ــــ دوران کتابت، جو صاحب کتاب اور کاتب کے درمیان کا بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے اور کوئی بھی بات کسی کے لئے بھی ناخوشگوار تاثرات کی بنیاد بن سکتی ہے ــــ یہ بھی بالکل صاف و شفاف رہا۔ یہ اسی خلوص اور اعتماد کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے بلا تامل اپنے دو مجموعے (رقص و عکس اور زینہ زینہ) اور ایک شعری اور ان سے متعلق کتاب کی کتابت بھی میرے ہی سپرد کی ــــ

فرحت بھائی سے جب بھی ملاقات ہوئی انہیں سراپا "فرحت" پایا۔ چہرے پر تازگی، شادابی اور مسکراہٹ کے سوا کبھی کوئی دوسرا تاثر نہیں پایا ــــ انسان دکھوں اور الجھنوں سے خالی نہیں ہوتا مگر انہیں دیکھ کر گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ بندہ کبھی کسی دکھ یا الجھن کا شکار ہوا ہوگا۔

فرحت بھائی کے درمیان ہماری گفتگو کے بیشتر موضوعات گھریلو ہوتے ہیں۔ شعر و شاعری اور ادب سے متعلق گاہے گاہے گفتگو ہو جاتی ہے ــــ سیاست اور حالات حاضرہ بھی دوران گفتگو تلاوا زیاں کھاتے رہتے ہیں۔ عالم اسلام کے ٹوٹنے بکھرنے اور ان کے آپسی نفاق کا بھی ذکر خیر ہو جاتا ہے لیکن اصل حصہ گفتگو گھریلو ہی ہوتا ہے ــــ میں جانتا ہوں کہ فرحت بھائی کے ساتھ کیا کیا الجھنیں اور پریشانیاں ہوتی رہی ہیں ــــ جن کا وہ خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کی راہ پر گامزن ہیں ــــ آپ دیکھئے تو تمیز نہیں کر پائیں گے کہ یہ شخص کسی ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہے ــــ

بیٹی کی شادی کا سارا سامان لٹیرے لوٹ کر لے جاتے ہیں جبکہ چند روز کے بعد دروازے پر بارات آنے والی ہے مگر ــــــ اب کیا بتاؤں کہ یہ شخص "ان اللہ مع الصابرین" پر کس قدر عمل پیرا ہے ــــ اور کتنا بڑا شاکر ہے۔

فرحت بھائی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں ــــ ملازمت کے دوران وہ "سیوا نگر" کے سرکاری کوارٹر میں مقیم تھے مگر اب اپنے آبائی مکان معروف گنج میں قیام فرما چکے ہیں۔ میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں اور اتفاق سے ہم دونوں کے مکان کچھ ہی فاصلے پر ہیں۔ میں مصروفیت کے سبب اتنے قریب فاصلے پر بھی نہیں پہنچ پاتا لیکن فرحت بھائی وقت نکال کر میرے پاس آجاتے ہیں ــــ یہ ان کا خلوص ہی تو ہے ــــ بے مثال اور بے لوث ــــ

فرحت بھائی کو اس بات کا احساس ہو یا نہ ہو لیکن مجھے ضرور ہے کہ اس معتبر اور بلند قامت شاعر کو (جو شاعری کی ہر صنف میں استادانہ صلاحیت رکھتا ہے) اس کے حسب لیاقت نوازا نہیں گیا۔ نوازش و اکرام تو شاید نہیں ملتا ہے جو خوشامدی اور چاپلوس ہوتے ہیں اور فرحت بھائی اس معاملے میں نرے کورے ہیں ــــ ان کی شرافت، ان کا ضمیر اور ان کی یہ سادہ طبیعت کی اجازت نہیں دیتی ــــ وہ اپنے نام اور خداداد صلاحیت کو اچھالنا، فروخت کرنا اور کچھ حاصل کرنے کے لئے ہیرا پھیری کرنا پسند ہی نہیں کرتے ــ میں زمانے کی "گھڑ دوڑ" کا حوالہ دیتے ہوئے کچھ کرنے کی صلاح دیتا ہوں تو وہ مسکرا کر رہ جاتے ہیں اور جواباً مجھے مسکرا دینا پڑتا ہے ــــ یہ تو حال ہے ہمارے فرحت بھائی کی نیکی کا ــــ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک

منفرد مقام بن چکا ہے۔ اور سبھی ان کی عزت و توقیر اور احترام کرنے پر مجبور ہیں ـــــ ایسے میں منافقوں کی بھی کمی نہیں ہوگی مگر کیا عجب کہ وہ ان کا شاداب اور تمام بغض و عناد سے عاری چہرہ دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ہوں۔ اور انہیں بھی اپنے چہرے پر عارضی شادابی بکھیر لینی پڑ جاتی ہو ـــــ

فرحت بھائی صرف میرے لئے ہی پرخلوص نہیں۔ ان کا خلوص عام ہے۔ وہ ہر شخص کے ساتھ نیکی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں۔ مفاد پرستی، مطلب پرستی اور موقع پرستی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ ہر شخص کے کام آنا اور اس کے سرد و گرم کو محسوس کرنا ان کا شیوہ ہے۔

میں کاتب ہوں ـــ جس کا مجھے دکھ ہے ـــ یقین کریں مجھے بے حد دکھ ہے ـــ پتہ نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب اللہ میاں نے مجھے یہ طوق پہنایا تھا ـــ ورنہ میں اس وقت محکمہ "ایمرجینسی واٹر سپلائی" میں اوورسیر کے عہدے تک تو ضرور ہی پہنچ گیا ہوتا ـــ ـــ چھوڑیئے ان بیکار باتوں کو ـــ تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کاتب ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ اس پیشے میں کتنے لوٹ کھسوٹ کے مواقع ہیں ـــ لہٰذا فرحت بھائی اسے محسوس کرتے ہوئے اپنی قیمتی آرا اور تسلی و تشفی سے نوازنا اور حوصلہ بڑھانا کبھی نہیں بھولتے ـــ یہ ان کی انسان دوستی کی بہترین مثال کہی جا سکتی ہے ـــ ورنہ ـــ "کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست"۔

اب آخر میں ـــ میں یہی کہوں گا کہ "فرحت بھائی" اسی طرح کسی بھی لالچ اور ہوس کے بغیر اپنے مشاہدے، تجربات اور افکار و خیالات کو اپنے اشعار میں پرو کر قارئین کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ اپنے قلم کو رواں دواں رکھیں۔ ہمت و جرأت کے ساتھ ہر سچائی پر قلم اٹھاتے رہیں ـــ زندگی، معاشرے اور اس کے نت نئے کربوں، استحصالوں اور جور و ستم کی نشاندہی کرتے رہیں۔ اور ساتھ ہی اپنی انسان دوستی، مخلصانہ جذبات، ہمدردانہ رویہ، جو عام لوگوں کے ساتھ ہے اور جسے وہ بے لوث طریقہ پر انجام دیتے ہیں ان پر بھی کاربند رہیں ـــ گرچہ اس کا معاوضہ تمغوں کی شکل میں شاید ہی مل سکے لیکن اردو ادب کے لئے جو سرمایہ انہوں نے جمع کیا ہے وہ بذاتِ خود ایک تمغہ ہے جو کبھی رائیگاں نہیں جا سکتا۔ آنے والی نسل ان سرمایوں سے نہ صرف مستفیض ہوگی بلکہ انہیں تمغہ بنا کر اپنے سینے میں محفوظ کرے گی ـــ اور یہی ان کا بے مثال اور لازوال تمغہ ہوگا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیری یونیورسٹی
ـــ سری نگر کی نئی پیشکش ـــ

ہندوستان میں اقبالیات اور دوسرے توسیعی لیکچر

مصنف:۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد   قیمت 50/-
پتہ:۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر
راؤز ایوینیو، نئی دہلی - 110002

جمال الدین ساحل
آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ

ثبت است بر جریدۂ عالم

★ "شیشے اور پتھر" کی اشاعت سے کوئی دس سال پہلے فرحت قادری صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ فرحت صاحب محفلوں کو زعفران زار بنانے والی شخصیت رکھتے ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات تکلفات کی منزل میں رہی تھی، لیکن پھر مسلسل ملاقاتوں سے بہت اچھے اور مخلصانہ روابط قائم ہو گئے۔

اس سے پہلے فرحت قادری کو بیشتر مشاعروں کے علاوہ اردو کے معتدر رسالوں میں دیکھ اور پڑھ چکا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں شاعر کے متعلق جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ فرحت صاحب اردو کی کلاسیکی شاعری کا اتباع کرتے ہیں اور روایت کے سختی سے پابند ہیں۔ کافی دنوں کے بعد جب انھیں کی زبانی یہ شعر سنا ؎

بدل دیا روشِ عام نے مزاج اس کا
ترانۂ غمِ دوراں سنا رہی ہے غزل

تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ لاشعوری طور پر شاعر نے عہد حاضر کے مزاج سے سمجھوتہ کرنا چاہا ہے، مگر طوعاً و کرہاً۔ کیونکہ فنِ لطیف اور روشِ عام میں کوئی تال میل نہیں۔ فنونِ لطیفہ کا روشِ عام اختیار کرنا کوئی اعلیٰ و ارفع مقصد نہیں ہو سکتا۔ ادب عام افراد کے لئے تو ہو سکتا ہے لیکن عامیانہ نہیں۔ اور ادب و فن کا روشِ عام اختیار کرنا اصل میں عامیانہ ادب کو فروغ دینا ہے۔ شاعر نے یہ شعر کہہ کر دبے لہجے میں اپنی شکایت کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن فرحت قادری کا یہ مجموعہ "شیشے اور پتھر" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر نے غزل میں محض "ترانۂ غمِ دوراں" ہی کو راہ نہ دی ہے بلکہ ؎

کچھ تو حسنِ بیاں ہے فرحت کا
اور کچھ دل کی واردات بھی ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہی سب کچھ مل جل کر ایک شاعر کو بلند مقام عطا کرتے ہیں، اور "شیشے اور پتھر" کے مطالعہ کے بعد بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے ان تمام لوازم کو اشعار کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

فرحت قادری صاحب کا یہ مجموعہ غزلوں، نظموں، ہائیکو، ترائیلے اور سانیٹ پر مشتمل ہے جو شاعر کی تجربہ پسند طبیعت کی غمازی کرتی ہیں۔ اردو شاعری میں جو نئے تجربات نمودار ہوئے ان کا احساس و عرفان فرحت صاحب کو بھی ہے۔ وہ روایت کے صالح اقدار کے امین تو ہیں ہی، مگر صحت مند جدیدیت سے کنارہ کش بھی نہیں۔ "شیشے اور تیشے" کے بغور مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر روایت و بغاوت کے بیچ بیچ چل رہا ہے۔ ایک طرف اگر ؎

ان کو دیکھا بھی نہیں اور فدا ہو بیٹھا
کوئی نادان نہ ہوگا دلِ ناداں کی طرح

یا ؎

حدِ امتحاں سے آگے ترا بڑھ چلا تغافل
کہیں مار ہی نہ ڈالے مجھے تیری کم نگاہی

جیسا روایتی شعر کہا ہے تو دوسری جانب ؎

کربِ انفاس کا بے نام سفر
زندگی کوئی خلا ہو جیسے

یا ؎

پتھر کی مورتی پہ تمدن کا خول ہے
انسان کیا ہے اس کے علاوہ بتائیے!

کہہ کر فرحت صاحب عصرِ حاضر کے افکار کا ساتھ بھی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فرحت صاحب نے زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور اس کا اظہار اپنی شاعری میں بے حد فنکارانہ طور پر کیا ہے۔ زندگی کے مشاہدے میں شاعر کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا ہے اور عام ترقی پسندوں کی صف میں بھی کھڑا نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا لہجہ ان کے لاشعور کی سوچ یہ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنایا ہے اور مجموعہ میں خال خال نظر آتا ہے مثلاً ؎

صدیوں سے گندم کی تلاش
جیون روگ ہے فکرِ معاش

یا اس کے ساتھ ہی چند نظمیں، جیسے "روحِ آوارہ، بھوک" وغیرہ۔ ان نظموں میں سچی، تلخ اور سیدھی باتیں تو کہہ دی ہیں لیکن لہجہ حد درجہ جذباتی ہو گیا ہے۔ انھوں نے سماج کی کج بختی، بلکتی، بسورتی اور کراہتی ہوئی معصوم انسانیت کو گلے لگایا ہے اور ظلم و جبر اور عفریتی روش کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ایک سچا فن کار یہی کرتا ہے۔ اور قنوطی نہیں بلکہ ؎

حالات کی جبیں پہ خراشیں جب آ گئیں
میدانِ [illegible] میں فن کار اُتر گیا

کہہ کر زندگی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ دیکھیے! فرحت صاحب سماج کے بورژوا طبقہ کو اپنے طنز کا نشانہ کس طرح بناتے ہیں۔ ساتھ ہی دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں ؎

مفلسوں کی بستی میں وسعتیں ہیں دنیا کی
آپ اتر کے دیکھیں تو اپنے عرش نشینوں سے

یا ؎

یہ محل [illegible] وقت کی نظروں میں نہیں جس کا وقار
منہ کے بل وقت کے قدموں پہ یہ گر جائے گا
ریشمی پردے — فقط ایک ہوا کا جھونکا
جھونپڑی سے [illegible]، جو روز گزر جاتا ہے
یہ مجبور کے کبھی کسی برات کی چوٹی کی طرح
خاور وقت [illegible] حدّت سے پگھل جائیں گے
یہ [illegible] سیم کے انبار [illegible] جو شعلے ہیں،
شرر ہیں،
جن میں شامل ہیں غریبوں کے حقوق
اور تیری محنت کا لہو،
وقت اک روز ترے پاؤں پہ لا ڈالے گا!

فرحت صاحب کی غزلیں ہوں یا نظمیں، دونوں میں فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ ان کی بے پناہ ریاضت

خاکہ

تمنا مظفرپوری

فرحت (بخش) قادری

روشن اور گول چہرے پر گول گول
[illegible]ت آمیز آنکھیں، پیشانی کے حدود لامحدود۔ ماہ و سال
[illegible]رنے سے سر آگے سے چٹیل میدان لیکن ایسا بھی نہیں
ہے دیکھ کر اسکیٹنگ کو جی چاہے، چاندی چھوڑ کر سر
چاروں طرف سفید ریشمی گھاس کی روش، موتی جیسے
[illegible]تے دانتوں کے بیچ سے ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑتے
[illegible]ے لطیفے اور دو معنی الفاظ کے جملوں سے دوسروں کو
قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہوئے کسی محفل میں آپ کی نظر
یہ شخص پر پڑے تو آپ یقیناً فرحت محسوس کریں گے۔
ہاں! آپ [illegible] فرحت [illegible] قادری جن کی ذات
[illegible] عنوان کی طرح فرحت بخش [illegible]

فرحت صاحب [illegible] سے
[illegible] ہیں۔ لیکن سوائے چند بال اور سفید ریش مختصر
[illegible] آپ کہیں سے ریٹائرمنٹ کے لائق نظر نہیں آتے۔
[illegible] تو ان کے منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت موجود
[illegible] اور ابھی تک وہ دعوتوں میں مرغ کی ٹانگیں توڑنے سے
نہیں چوکتے۔ آنت بھی ایسی قوت ہاضمہ رکھتی ہے کہ جو کچھ
کھاتے ہیں، پچاتے جاتے ہیں۔

فرحت صاحب اپنی اولاد کی تعداد دس بتاتے
ہیں۔ تین لڑکے چار لڑکیاں اور تین مجموعہ کلام — ہر چند
کہ زمانہ نے انھیں کئی طرح سے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔
لیکن وہ ان سبھی شکنجوں کو توڑ تاڑ کر آج بھی ہشاش بشاش،
زندہ دل اور محفلوں کی جان بنے ہوئے ہیں۔ خود بھی خوش
مزاج و خوش گلو اور ان کے تلامذہ بھی اکثر ترنم سے پڑھنے
والے ہیں۔ وہ ایسے استاد فن ہیں کہ ان کے شاگردوں
میں نوجوان ہی نہیں بلکہ کئی سفید ریش بزرگ بھی ملیں گے۔
جو ان کے نزدیک اپنے زانو تہ کیے بیٹھے نظر آئیں گے۔

فرحت صاحب سے میری ملاقات ۱۹۶۸ء میں
پہلی بار ہوئی تھی جب میں گورارو سے گیا ایک ادبی نشست
میں شرکت کرنے کے لیے گیا تھا۔ اس کے بعد تو ہر محفل میں
ان سے ملاقات ہوتی رہی، کیونکہ کوئی بھی ادبی محفل ان
کے بغیر پھیکی پڑ جاتی، اس لیے منتظمین انھیں بلانا کبھی
نہیں بھولتے — ۱۹۷۵ء کی بات ہے، فرحت صاحب کا
پہلا مجموعہ کلام "کائنات غم" شائع ہوا تھا ان سے ملاقات

ہوئی۔ تو فرمانے لگے۔ "میرا مجموعہ کلام شائع ہوگیا ہے۔ بجائے اس کے کہ ڈاک سے بھیجنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک دن میرے گھر پر چائے پیجئے اور "کائنات غم" قبول کیجئے۔ میں چائے پینے کو تیار تھا لیکن "کائنات غم" کا بوجھ اٹھانے کے لئے ہرگز نہیں۔ اس لئے اس ڈر سے چائے پینے کی ہمت نہیں کی۔ مگر "کائنات غم" سے مفر کہاں تھا، ایک دن ایک صاحب گورارو میں "کائنات غم" لے کر وارد ہوگئے اور مجھ پر بوجھ لاد دیا۔ بوجھ اس لئے کہ کتاب کے ساتھ ہی یہ حکم بھی تھا کہ رسم اجرا کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور مجھے بھی کچھ لکھنا ہے۔ میں ٹھہرا طنز و مزاح نگار اور ان کا مجموعہ تھا سنجیدہ کلام کا۔ میں اپنے مزاج کو سنجیدگی سے کس طرح ایڈجسٹ کر پاتا ـــ؟ فرحت صاحب بھی عجیب و غریب آدمی ہیں۔ نام فرحت ہے اور محفل کو قہقہہ زار بنائے رہتے ہیں مگر شاعری کرتے ہیں آنکھوں کو نم کرنے والی ـــ خیریت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اچھے گلے سے نوازا کہ ان کا ترنم لوگوں کو باندھے رکھتا ہے اور سامعین کو سر دھننے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے افکار و خیالات لوگوں کو سوچنے اور داد دینے پر مجبور کر دیتے ہیں ـــ بہرحال ـــ! میں نے مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن جناب میری ایک خراب عادت یہ ہے کہ جب میں کسی شاعر کا کلام پڑھتا ہوں اور جب کوئی اچھا شعر میری سمجھ میں آجاتا ہے تو اس کی پیروڈی کر دیتا ہوں "کائنات غم" کے مطالعہ کے دوران بھی کئی شعر میری سمجھ میں آگئے۔ لہٰذا ان اشعار کی پیروڈی ہوگئی۔ جی ہاں! میرے نزدیک ایک اچھے شعر کی یہ بھی پہچان ہے کہ اس کی پیروڈی آسانی سے ہو جائے ـــ مطالعہ کے وقت جن اشعار کی پیروڈی ہوئی تھی ان میں سے کچھ آج بھی یاد ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

پھر پلٹ کر نظر نہیں آئی
طور پر صرف ایکبار گئی

یہ شعر پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ فرحت صاحب نے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ قصہ دراصل ان کے لیڈی اسٹینو کا ہے جو بڑے صاحب کے ساتھ ایک ٹور پر گئی تھی اور وہاں سے مسز صاحب بن کر واپس آئی۔ اب بھلا افسر کی دلہن بننے کے بعد اسے دفتر سے کیا؟ لہٰذا شعر کو میں نے اس طرح پڑھا۔

پھر پلٹ کر نظر نہیں آئی
ٹور پر صرف ایک بار گئی

ایک شعر تھا ؎

گھڑی بھر عشق میں جینا تجھے دشوار ہو جائے
اگر میری طرح تجھ کو بھی یہ آزار ہو جائے

اس شعر میں کوئی جان نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے دور میں انسان اتنا پاگل نہیں ہوا ہے کہ عشق میں جان سے ہو جائے۔ عشق ہی کرنا ٹھہرا تو ایک میں کامیابی نہ ہونے پر مایوس ہونے کے بجائے، دوسری کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ معشوقہ کی کمی تو ہے نہیں۔ "وہ تو نہیں اور سہی، وہ نہیں اور سہی" پر عمل کرتا ہے، ہاں، ایک مرض ایسا ہے جس میں مبتلا ہو جانے پر واقعی جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا شعر کو میں نے اس طرح پڑھا ؎

گھڑی بھر عشق میں جینا تجھے دشوار ہو جائے
اگر میری طرح تجھ کو بھی کالا آزار ہو جائے

ایک شعر اور یاد آیا ؎

یہ بھی کیا کم ہے، اس محفل ناز میں
میں نہیں ہوں مگر میرا چرچا تو ہے

ت صاحب کس غفلت میں ہیں ، اب محفلِ ناز میں چرچا ن کرتا ہے ، بیوی تو ہر جگہ شکوہ شکایت لے کر بیٹھ اتی ہے اور دوسری نازنینوں کو کیا غرض کہ آپ کی بیوی سامنے آپ کی تعریف کریں ، بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ بیوی کو خوش کرنے یا آپ کے خلاف اکسانے کی خاطر پ کی برائی ہی کرنے لگیں — ہاں ، جو چیز محفلِ ناز میں ی باقی ہے ، وہ ہے چرخا جو ہر سال گاندھی جی کی روح کو ش کرنے کے لئے ان کے جنم دن پر نازنینوں کی محفل میں پایا اتا ہے ۔ لہٰذا شعر اس طرح پڑھا جائے ۔ ؎

یہ بھی کیا کم ہے ، اس محفلِ ناز میں
میں نہیں ہوں مگر میرا چرخا تو ہے

رحت صاحب نے جہاں بہت سے شاعر بنائے ہیں (ان کی غلطیاں دور کر کے) وہاں بہتوں کو بگاڑا بھی ہے ۔ بگاڑنے سے میری مراد ہے ایسے شاعر بنانا جو ترنم سے پڑھنے کے لئے ان سے غزل لکھوایا کرتے تھے ، مگر ایک دن گلا خراب ہو جانے کی وجہ سے زندہ رہتے ہوئے بھی مرحوم ہو گئے ۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو کثر نثر شاعری کرتے تھے اور فرحت صاحب اس امید پر کہ کسی دن سدھر جائیں گے اور از خود شعر کہنے لگیں گے ۔ ان کے اشعار نئے سرے سے کہہ کر دیدیتے تھے ۔ لیکن ایسے حضرات آج تک خود سے شاعری نہیں کر سکے اور آج بھی ریڈیو پر پڑھنے اور معاوضہ لینے کی غرض سے ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتے ہیں ۔ حالانکہ فرحت صاحب ان پر کئی بار خفا بھی ہوئے مگر وہ لوگ کسی نشست یا مشاعرے کے لئے دی ہوئی چیز ریڈیو تک پہنچا ہی دیتے ہیں ۔ ایسا صرف فرحت صاحب کی سادگی اور خلوص کی وجہ سے ہو جاتا ہے اور لوگ اس خلوص کے پیکر کو بے وقوف بنانے میں لگے رہتے ہیں ۔

آخر میں فرحت صاحب سے انہیں کے الفاظ میں گزارش کروں گا کہ

" اِس قدر بھی سادگی اچھی نہیں ! "

بقیہ — جمال الدین ساحل

کی دین ہے ۔ خاص طور پر ان کی چھوٹی نظمیں ، جنہیں ہائیکو کا نام دیا گیا ہے ۔ قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں ۔ ان کی اس قسم کی نظموں میں نہ تو ابہام ہے اور نہ الفاظ کا گورکھ دھندا بلکہ کم سے کم لفظوں میں فنی چابکدستی کی عمدہ مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔

فرحت قادری صاحب لکیر کے فقیر نہیں ، بلکہ لکیروں پر اپنا نقش بنانے کے عادی ہیں ۔ ان کی شاعری نہ تو جدید شاعروں کی طرح معمہ ہے اور نہ اقلیدس کے بے معنی دائرے ، وہ شاعری کی آفاقی قدروں سے مانوس اور نئے رجحانات سے آشنا ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وصف ان کی شاعری کو وقت کی دہلیز سے باہر نہ ہونے دے گا ۔ اس حقیقت کو خود شاعر کی دوررس نگاہوں نے بھی دیکھ لیا ہے ؎

میں گئے وقت کا اخبار نہیں ہوں فرحتؔ
طاق لنیا نہ یہ سمجھا یا ہو تحق پارہ ہوں

غرض یہ کہ فرحت صاحب کے مجموعہ کلام کی روشنی میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ زندہ رہنے والے شاعر ہیں ۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ کئی نسلوں کو زندگی عطا کرے گا ۔

● جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

ش. م. عارف ماہر آروی
بڑہ بتراہ، آرہ - ۸۰۲۳۰۱

فرحت قادری اور ان کی شاعری

★ بعض محاورے اور ضرب الامثال زندگی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر متشکل ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اب "نظر سے دور تو دل سے دور" کو لے لیجئے، اس سے اکثر ہم اور آپ دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک محاورہ ہے "ہم پیالہ و ہم نوالہ" اسی کی وضاحت کرتے ہوئے مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ مجھ پر اور فرحت قادری پر چسپاں ہے، کیونکہ میں اور فرحت صاحب "ہم پیالہ" بھی رہے اور "ہم نوالہ" بھی۔ ہم پیالہ اس معنی میں کہ شراب شاعری ہم دونوں نے پی ہے وہ مستانہ وار جھومے مگر مجھ پر نشہ نہ چڑھا ہند و پاک کے بے شمار چھوٹے بڑے رسالوں اور اخبارات میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ اور میں چھپتا رہا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ ریڈیو کے پروگراموں میں مجھے ان کے سامنے اکثر "بے نقاب" ہونا پڑا۔ جہاں تک "ہم نوالہ" ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ چند سال آگے پیچھے ہم دونوں محکمۂ قانون سے وابستہ ہوئے، وہ سول کورٹ میں آئے اور میں پٹنہ ہائی کورٹ میں۔ ملازمت کا بن باس کاٹ کر سنہ ۱۹ء میں گھر لوٹ آیا اور وہ گھر پر ہی قید ملازمت میں ہو کر پچھلے سال رہا ہوئے۔ ہم دونوں ادب بھی کرتے رہے اور شکم پر پیچ کے تقاضے بھی پورے کرتے رہے۔

فرحت قادری سے اردو دنیا آشنا ہے۔ سید ابو الفرح ذوالنون محمد جاہ سے انگلی پر گننے والے ہی آشنا ہوں گے۔ اسی طرح بہت کم لوگ ہوں گے کہ وہ نجیب الطرفین سادات خاندان سے ہیں۔ ان کی گیارہویں پشت میں سید احمد جاجنیری مدینہ کے محلہ جاجنیر سے عباسیوں کے دور حکومت میں آکر سلطان محمد تغلق کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ بہادری اور فتوحات سے خوش ہو کر سلطان نے مونگیر کے چودہ مواضعات ان کو عطا فرمائے۔ مواضعات میں ایک موضع رسوں پور کشن گول ہے جو ریلوے اسٹیشن سے متصل پہاڑی سلسلہ کے جنوب آباد ہے۔ یہی فرحت قادری کا آبائی وطن ہے۔ ان کے محترم حکیم سید [illegible] قادری [illegible]

طبابت گیا تشریف لائے اور گیا میں ہی بود و باش اختیار
کرلی۔ فرحت صاحب آپ کی دوسری اولاد یعنی منجھلے صاحب
زادے ہیں۔ فرحت صاحب کی ولادت اپنے ننھیال موضع
اوگانواں ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ انہوں نے اردو، فارسی کی
تعلیم گیا کے مکتب اور مدرسے سے حاصل کی۔ گیارہ بارہ
سال کی عمر میں وہ ریاست ٹونک اپنے ماموں مولانا فصیح احمد
صاحب کے یہاں حصولِ علم کے لئے چلے گئے۔ ایک سال تک
وہاں رہنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں عربی کی اعلیٰ تعلیم
حاصل کی۔ اور پھر انگریزی تعلیم آئی۔کام تک گیا میں حاصل
کی۔ دو چار سال کلکتہ کی سیر کی اور چھوٹی موٹی ملازمت میں
گزارا، حتیٰ کہ ۱۹۵۶ء میں مستقلاً سول کورٹ گیا سے وابستہ
ہو گئے۔ دورانِ تعلیم دیوبند شاعری شروع کی اور ۱۹۶۲ء
تک یعنی تقریباً بیس برسوں تک مشقِ سخن کرنے کے بعد مشہور
عروض داں علامہ ابر احسنی کی شاگردی اختیار کی۔ پانچ
سال بعد ۱۹۶۸ء میں فارغ الاصلاح ہو گئے۔ فرحت صاحب
نے اردو شاعری کی تمام مروجہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی
ہے۔ مگر غزلوں میں ان کا جوہر کھل کر سامنے آیا ہے۔ وہ اصولاً
طور پر روایت کے دائرے میں رہ کر ہی غزل سرا ہیں۔ مگر ایسی
بات نہیں کہ ان کی غزلوں میں موجودہ دور کا کرب، ناآسودگی
اور ٹوٹتی بکھرتی قدروں کا احساس نہیں ملتا۔ مندرجہ ذیل
اشعار سے ان کے کلام کی خوبیاں واضح ہو جائیں گی۔

فضا مسموم گل افسردہ مرجھائی ہوئی کلیاں
یہ انعامِ بہاراں ہے تو ہم انعام سے گزرے

جس کی تعبیر ہے غم پیہم ۔ زندگی کا وہ خواب ہیں ہم لوگ

ہم نوائی، غم گساری بھولی بسری بات ہے
اب کہاں غیروں کا غم، اپنوں کی قربانی کہاں

شاخِ گلِ تر سرو و سمن بیچ رہا ہے
ہر اہلِ چمن اب تو چمن بیچ رہا ہے

دشمن کے پتھروں نے بھی بخشا نہ تھا وہ درد
اپنے چمن کے پھول جو نشتر چبھو گئے

یہ اور اس طرح کے بہت سارے اشعار "کائناتِ غم"
مطبوعہ ۱۹۷۵ء میں آپ کو مل جائیں گے۔ فرحت صاحب کا
یہ مجموعہ کلام ان کی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۲ء یعنی ۲۰ برسوں کی
مشقِ سخن کا انتخاب ہے جس میں اساتذہ کی زمینوں اور
اور طرح میں کہی گئی غزلوں کا دیدہ زیب انتخاب ہے۔
مگر ۱۹۸۳ء میں "شیشہ اور پتھر" کے عنوان سے جو
غزلیں شائع ہوئیں ان میں سے "غزل برائے غزل کا
زمانہ بیت گیا۔ غمِ حیات کی منزل پہ آ رہی ہے غزل"
مجسم ہو کر شعر کا لباس پہن لیتی ہے۔ ان غزلوں میں اس
بات کی نشان دہی ملتی ہے کہ شاعر اپنے اردگرد کے ماحول کی
کثافت اور قدروں کی شکست و ریخت سے بے حد متنفر ہے۔
اس دور کی غزلوں میں انفرادیت بھی ہے اور فکر کا عنصر بھی،
جو ایک صاحبِ کردار کا غماز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پتھر کی مورتی پہ تمدن کا خول ہے انسان کیا ہے اس کے علاوہ بتائیے

معنی کے سمندر سے افکار کے سورج تک
احساس سے عاری ہیں لفظوں کے غوا کتنے

یہ تشنگی کا زور، یہ تپتا ہوا بدن
فرحت یہاں قریب سمندر ضرور ہے

۱۹۷۲ء کے بعد کی غزلوں میں رفو، مصلوب، برگد، پیڑ
پتھر، سورج، موسم، انحصارِ ذات کے لفظیات جدیدیت سے
متاثر ہونے کا اشارہ کرتے ہیں، مگر جدیدیت کی بے راہ روی
میں گم کردہ راہ نہیں ہوئے۔
میں بہ بانگِ دہل یہ کہتا ہوں کہ فرحت قادری کی غزلوں
میں ان کی شرافت اور نجابت کی بازگشت گونج رہی ہے۔

فرحت قادری

(گیا)

کشاکشِ غمِ دوراں سے چور رہتا ہے
عذاب ہی میں دلِ ناصبور رہتا ہے

ہراس و خوف، توہم، شکوک، حیرانی
کوئی نہ کوئی مسلط ضرور رہتا ہے

عجب ہے لمحۂ نامعتبر کہ ہر پیکر
قریب رہ کے بھی نظروں سے دور رہتا ہے

فرازِ شب سے کوئی چاند اتار کر لاؤ
اندھیری رات کے سر میں غرور رہتا ہے

بڑھے ہی جاتے ہیں بے خوف، بے تکانِ قدم
طلب کی راہوں میں کیسا سرور رہتا ہے

اسے بھی پڑھنے کی کوشش کرو کبھی فرحت
وہ اک صحیفہ جو بالائے طور رہتا ہے

قدم قدم پہ اُدھر نازِ کج ادائی ہے
اِدھر لبوں کو غرورِ شکستہ پائی ہے

مجھے تو نام و نمائش کی کوئی فکر نہیں
مرا نصیب ازل ہی سے جگ ہنسائی ہے

ترا پتا کہیں ملتا نہیں زمانے میں
نہ جانے کتنے سرابوں کی دھول اڑائی ہے

میں کس کو اپنا کہوں، کس پہ اعتبار کروں
یہاں تو سانس بھی اپنی نہیں پرائی ہے

نہ کوئی ربط نہ رشتہ نہ گرمیٔ احساس
مری حیات کہاں مجھ کو کھینچ لائی ہے

بجز متاعِ قلم میرے پاس کچھ بھی نہیں
تمام عمر کی، فرحت یہی کمائی ہے

کیسے بڑھے شعلوں کی رفاقت سے سفر میں
ٹھہرو تو غضب، پاؤں بڑھاؤ تو قیامت

ڈوبتے سورج کی کرنیں ہیں ستم پیشہ بہت
جاتے جاتے بھی کوئی تہمت لگا کر جائیں گی

بس لہو رنگ سا میں نے سرِ مژگاں دیکھا
پھر نہ گلزار نہ صحرا۔ بیاباں دیکھا

فرحت قادری کی شاعری میں الفاظ کی دو قدریں نمایاں ہیں۔ ایک الفاظ کی تصویری قدر (PICTORIAL VALUE) اور دوسری جذباتی قدر (EMOTIONAL VALUE) جن سے خیال اور جذبے کو تحریک ملتی ہے، زندگی کے مسائل کی طرف ان کی ہمہ جہتی سامنے آتی ہے، عہد حاضر کے بے ہنگم بکھرے مناظر سامنے آتے ہیں اور وحدت آمیز حسیت کا مظہر سامنے آتا ہے۔ حسیت اور تفکر کے امتزاج سے ان کی غزلیہ شاعری میں تخلیقی آگہی نمایاں نظر آتی ہے۔ فرحت قادری دل کی شوریدگی سے رشتے کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں اور اپنے زمانے کی بے ستون زمین کو پہچاننے کے لئے بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی، جذبے کو گرم اور جولاں رکھنے کے امکانات پر غور و فکر میں ڈوبے اور گم نظر آتے ہیں۔!

▲ اپنے مضامین صاف اور خوش خط ارسال کریں۔ خطوط مختصر ہوں۔ گنجلک تحریر باعث پریشانی ہوتی ہے —— (ادارہ)

مظہر امام کی تازہ ترین تصانیف

٭

جمیل مظہری:۔ شخصیت اور فکر و فن کا مطالعہ
قیمت:۔ ۱۵ روپے
ناشر:۔ ساہتیہ اکیڈمی، سواتی بلڈنگ
سندر مارگ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۱

●

بند ہوتا ہوا بازار:۔ منتخب نظموں کا مجموعہ
قیمت:۔ ۱۴ روپے
ناشر:۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

●

اکثر یاد آتے ہیں:۔ جگر مراد آبادی، عبدالرزاق ملیح آبادی
اشک امرتسری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر، اختر قادری، اور خلیل الرحمن اعظمی سے متعلق ادبی یادداشتوں کا مجموعہ
قیمت:۔ ۲۵ روپے
ناشر:۔ ادب پبلی کیشنز ۳۶۴ اے،
چراغ دلی، نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۷

● سہیل میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں ●

ـــ بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام ـــ

ـــ حصولیابی کے نئے اقدامات ـــ

۲۰ نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غریبی کے خلاف شدید جنگ، ریاست میں اس پروگرام کے اہم نشا
کئے گئے ہیں اور پوری توجہ کے ساتھ ہر سطح پر اس کی حصولیابی کی کوشش کی جا رہی ہے اس پروگرام کے تحت ۹۳-۹۲
میں حاصل شدہ کامیابیاں اور حصولیابیاں درج ذیل ہیں۔
تحت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 2،67،252 خاندان کو مستفیض کیا گیا ● جواہر روزگار یوجنا کے تحت
036،16 لاکھ مانو دیوس کا انتظام کیا گیا ● 0239 الگ گرامین اور ضلعی کرکٹ اکائیاں تشکیل دی گئیں ● بھومی سدھار
کے تحت ایکڑ فالتو زمین تقسیم کی گئی ● ریاست کے 188،5 گاؤں میں صاف پینے کے پانی کی سپلائی کا انتظام کیا گیا ● د
کا خاندان کے منصوبہ کے تحت 303656 لوگوں کی نسبندی کرائی گئی ● بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی-پی-ٹی کے
202852 پولیو کے 205470، بی-سی-جی کے 2273722 اور میزیلس کے 1951592 ٹیکے لگائے گئے۔ 30
آنگن باڑی مراکز کی تشکیل کی گئی ● مختلف یوجناؤں اور پروگراموں کے تحت 63183 انوسوچت جاتی اور 33267 انوسو
چت جاتی کے خاندانوں کو مستفیض کیا گیا ● بے گھر لوگوں کے درمیان 628،2 مکانات تعمیر کئے گئے ● اندرا آواس یوجنا
انوسوچت جاتی اور جن جاتی لوگوں کے لئے 27858 مکانات تعمیر کئے گئے ● اقتصادی نقطۂ نظر سے کمزور اور اقلیتی
لوگوں کے لوگوں کے لئے 496 اور 268 بالترتیب مکانوں کی تعمیر اور تقسیم کی گئی۔ تنگ بستیوں میں سدھار پروگرام
گندی بستیوں میں رہنے والے 7،467 لوگوں کے لئے پینے کا پانی، ملواہ انتظام، نالی سدھار، اشنان گھر، پا
گلی کی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولیتیں مہیا کرائی گئیں ● ـــــ 20337 ہیکٹر میں 979،20
پودے لگائے گئے ہیں ـــــ جن وترن پرنالی کی 686 دکانیں کھولی گئیں ـــ

258 گاؤں کا بجلی کرن، 2592 پمپ سیٹوں کو بجلی سے جوڑنا
اور اچھے قسم کے چولہوں کی تعمیر
نیز 3502 بایو گیس لگائے گئے

42 सं० (सं० -12) 94-95

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ۔ بیادگار :- زین العابدین آثم و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
- ایڈیٹر :- جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی

معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

- شمارہ ۷ جلد ۱۷
- بدلِ اشتراک
- فی شمارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵ روپے
- زرِ سالانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۰ روپے
- لائف ممبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰۰۰ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل
دلوا ساؤتھ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

آپسی میل۔ ایکتا۔ اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا۔ یہ سبھی فرقوں کا زبانوں، مذہبوں اور تہذیب و تمدن کا ملک ہے، ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے بنا ہے۔ گوبند، رابندر، قاضی نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت ہر گاؤں گھروں میں گائے جاتے ہیں۔

کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے۔

آئیے۔ ہم سب اس قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ:۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

60 स. (सं०-18) 94-95

نمود

ادبی رسائل و معیاری ادب

کسی دور کے ادب کا معیار اس کے ادبی رسائل سے متعین ہوتا ہے اس لئے ادبی رسائل کی بقا کا مسئلہ اپنی جگہ بے حد اہم ہے۔ یہ بات کسی نہ کسی طرح سامنے آتی رہی ہے۔ ادبی رسائل ہم عصر معیار ادب کی جو آئینہ برداری کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس سے بے اطمنانی پائی جاتی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے آج لکھنے پڑھنے والوں کی کمی نہیں لیکن جو ادب سامنے آرہا ہے وہ کیا ہے۔ افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں، ناول بھی آرہے ہیں، نظمیں، غزلیں بھی رسالوں میں اشاعت کی غرض سے آتی ہیں اور انہیں میں سے کچھ شائع بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہمارے یہاں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ قرۃالعین حیدر کے بعد اردو ناول نگاروں کی جو کھیپ سامنے آرہی ہے اس میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے آگے جانے کا سوال ہی نہیں ان سے ہمسری کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ بیشتر ناول مسائل کو سامنے رکھ کر ACADEMIC انداز سے لکھے جا رہے ہیں جہاں فن کار کے SCHOLARSHIP کا پتہ تو چلتا ہے مگر تخلیقی ہنرمندی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ افسانے چند ایک موضوعات کے گرد گھوم رہے ہیں۔ موضوعاتی تنوع یا موضوع مخصوص سے متعلق احساس و خیال کی متعدد شاخیں ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔ غزلوں میں نئے تجربات تو ہو رہے ہیں مگر بالعموم تجربہ تخلیقی ابال سے محروم ہو جاتا ہے۔ نظمیں مشاہدے اور قوت اظہار کی کمزوری کا مظہر بنتی جاتی ہیں۔

ادبی رسائل و جرائد تو ظاہر ہے وہی تخلیقات پیش کریں گے جو آج لکھی جا رہی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کے معیار کی طرف تو بہر حال اہل قلم حضرات اور شعراء کو ہی متوجہ ہونا پڑے گا۔ ادب و ثقافت کی تاریخ بنانے والے تو ہمارے فنکار ہی ہوتے ہیں۔ ادب و رسائل تو محض اس تاریخ کی ترتیب و تدوین کرتے ہیں۔ ادبی رسائل آئینہ تو دکھا سکتے ہیں مشاطگی نہیں کر سکتے۔

مسعود منظر

غزلیں

کافر بھی نہ تھے صاحبِ ایماں بھی نہیں تھے
ہم راہ سے بھٹکے ہوئے انساں بھی نہیں تھے

ہر شخص کو مانا کہ نظر آ نہ سکے ہم
ہم دیدۂ مشتاق سے پنہاں بھی نہیں تھے

جو تو نے کئے ہم سے سوال اے دلِ پُرفن
مشکل تو نہیں تھے مگر آساں بھی نہیں تھے

ہم جتنے پریشان بظاہر نظر آئے
ہم اتنے بہر حال پریشاں بھی نہیں تھے

کانٹوں بھرے رستے سے تو بیگانہ رہا میں
لیکن مرے رستے میں گلستاں بھی نہیں تھے

بالا نہ ہوا گرچہ کبھی نرخ ہمارا
بازار میں لیکن کبھی ارزاں بھی نہیں تھے

جگن ناتھ آزاد
(جموں)

ہر قدم پر طے شدہ رستے کو مڑ مڑ کر نہ دیکھ
صبحِ فردا کے مسافر میل کا پتھر نہ دیکھ

دل سراپا نور ہے اس کے سوا ظلمت ہے سب
نور پر نظریں جما ظلمات کا منظر نہ دیکھ

اک ذرا تو خاک کے ذروں پہ ڈال اپنی نظر
یہ جو ہیں افلاک پر مہر و مہ و اختر نہ دیکھ

اے کہ تو نقادِ علم و فن ہے میری بات سن
علم و فن گہرا سمندر ہے بہت جھک کر نہ دیکھ

زندگی اک آئینہ ہے جس کا پس منظر ہے زنگ
تو فقط منظر کو دیکھ آزاد! پس منظر نہ دیکھ

ڈاکٹر عبدالمنان
کلکتہ

مظفر حیدری کی شاعری

ولادت حسین مظفر حیدری ۱۹۴۴ء میں کلکتہ کے شعر و سخن کی محفل میں وارد ہوئے اور ایسا مقام بنایا کہ کوئی شعری نشست ان کی شرکت کے بغیر رونق افروزی کا سبب نہیں بن سکی۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ مظفر حیدری کے دور میں ترقی پسند تحریک شباب پر تھی۔ کلکتہ میں بیشتر فنکار اسی بینر کے نیچے آنا پسند کرتے تھے۔ شاعروں کا ایک قافلہ رواں دواں تھا۔ مظفر حیدری بھی اسی حلقے کے تھے۔ فی الحال یہ تحریک ماند پڑ گئی ہے۔ لیکن اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں —

جب ہمارے ملک کی عروس آزادی نے ہم سے حد درجہ ہولناک تباہ کاریوں اور بربادیوں کا اپنی رونمائی میں نذرانہ لے کر رخ روشن سے گھونگھٹ اٹھایا ہے اس کے بعد سے ابتک ملک کے جو اندرونی اور بیرونی حالات رہے ہیں ان سب نے اردو زبان کے حساس اور دیدہ ور شاعر کی شاعری کو ایک نیا آہنگ اور مخصوص قسم کی علامت ([illegible]) اور ایک جدید اسلوب و انداز عطا کیا ہے اور جناب مظفر حیدری اس کے بہترین ترجمان ہیں۔ اگر باغ میں گل خندہ جبینی کا روپ دکھاتا ہے تو خزاں کا خوف طاری ہوتا ہے تو بہار کی امید بے دست و پا نہیں ہونے دیتی۔ گویا دونوں صورتیں لازمۂ حیات ہیں۔ اسی کے درمیان موصوف کی شاعری کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

بقول کرشن چندر — دنیا میں شاعر تو بہت ملتے ہیں مگر شعر کہنے والے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ میں مظفر حیدری کا شمار شعر کہنے والوں میں کرتا ہوں۔"

کلکتہ ایک ایسا شہر ہے جہاں نت نئی تحریکیں جنم لیتی رہی ہیں۔ ادب کا میدان اس سے خالی نہیں رہا ہے۔ بنگلہ کے ساتھ اردو ادب نے بھی اس راہ میں ہم قدمی کا ثبوت دیا ہے۔ کلکتہ میں اردو کے فنکاروں نے بھی اس کی طرف توجہ دی اور ایسا چراغ جلایا کہ دوسرے خطوں سے کم روشن نہیں رہا۔ مظفر حیدری

جہاں سہیل گیا

ے پایۂ استقلال میں جنبش نہیں دی لیکن اپنے دل لفظ دریچے وا کئے۔ لیکن ان کے یہاں محض اس تحریک سے انداز نہیں ہے بلکہ فن کا امتزاج بھی ہے۔ کہیں کہیں آئیڈیولوجی کی آواز تیز ہو گئی ہے۔ مثلاً ——

وہی رہرو جہاد زندگی میں کامراں ہوں گے
ارادے جن کے پختہ حوصلے جن کے جواں ہوں گے

انسانی آزادی جو خلوص کی متقاضی ہے وہ قیود و بند اور کسی دیار سے منسلک ہو کر محدود رہنا نہیں چاہتی کہ وفا سے ہاتھ اٹھانا دل والے کا فعل نہیں۔

ہر ایک ساقیٔ محفل کا اعتبار نہ کر
سبوئے بادۂ رنگیں میں سم بھی ممکن ہے

اس قدر متین لہجے میں امید کی کرن پیدا کی ہے جس میں تبدیلی کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔

ساغر و جام ہٹاؤ کہ سحر ہوتی ہے
میکشو! ہوش میں آؤ کہ سحر ہوتی ہے

امید کی کرن پیدا کر کے نئی صبح کا روپ دکھانا ترقی پسندوں کا وصف رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس صبح کی امید تھی وہ نہیں آئی۔ یہاں حقیقت سے پہلو تہی کرنے کا اندازہ پردے کی اوٹ لئے ہوئے تھا۔ حقیقت کی تلخی اور نئے سویرے کی امید دھوپ چھاؤں کی طرح اپنا روپ دکھا رہی تھی۔ نیئطی کے یہاں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مضطر حیدری اس کی طرف انہماک کے ساتھ توجہ نہیں دے سکے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کا جو خاصہ تھا اسی طرف توجہ دینے میں کہیں کہیں آواز تیز کر دی۔

نور بکھرے گا زمانے میں اُجالا ہو گا
محفلِ عیش سجاؤ کہ سحر ہوتی ہے

سرمایہ داروں کے مظالم شگفتگی لئے ہوئے اس طرز کے ہوتے ہیں کہ باغباں کا انتظام ایسا ہوتا ہے کہ پھول کھلنے سے قاصر ہوتا ہے۔ چراغ جلے لیکن روشنی نہیں مل سکے۔

کلی کا عزم گلوں کا شعور بیچ دیا
جسے بھی آپ نے چاہا حضور بیچ دیا
خدا گواہ کہ دن تیرگی پرستوں نے
بجھا بجھا کے چراغوں کا نور بیچ دیا

سرمایہ داروں کے اشارے کارخانۂ گیتی پر اس قدر حاوی ہیں کہ آنِ واحد میں دنیا بدل جاتی ہے۔ مے خانے میں جام کی گردش ساقی کے اشارے کی محتاج ہے جو ایک ضابطے کے طور پر چلتی رہتی ہے۔ میخانہ اور ساقی اشاریت کا ایک انداز ہے جس میں بالواسطہ طریقہ شاعری کی جان بن گئی ہے۔

مظالم پیشہ افراد کی کارستانی انسان سوز ہوا کرتی ہے جس کی شکایت زبان پر لانا زبان کٹنے کے مترادف ہے۔ دامنِ شب پر تارے ٹانکنا اور نور سحر کا نام نہیں لینا۔ ایسی وفاداری ہے جو سرمایہ داروں کے حق میں جاتی ہے۔

حرفِ شکایت لب پہ نہ لاؤ دردِ جگر کا نام نہ لو
دل کی چوٹ چھپائے رکھو ان کی نظر کا نام نہ لو
کوہ کنی جب پیشہ ٹھہرا قسمت ہے پتھر کی لکیر
تیشہ چلاؤ خاک اڑاؤ لعل و گوہر کا نام نہ لو

مضطر حیدری نظموں کی طرف بھی اپنا موقف برقرار رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں ترقی پسند نظریات سے دور نہیں ہیں طویل اور مختصر دونوں انداز کی نظمیں ہیں۔ طویل نظموں میں "میری زمیں کے ساتھیو، مرگِ آوارہ، احساسِ شکست

ب وطن، اور مختصر نظموں میں سیل رواں، اردو،
ل اور خوف قابل ذکر ہیں۔ نظموں میں دو انداز کے
بے کارفرما ہیں۔ غیر پابند نظموں کا ڈانڈا دو سطحوں سے
یا جاسکتا ہے۔ جدید لب و لہجہ اور نظم معریٰ۔ پابند
یں عام روایت سے دور نہیں ہیں۔ جس ادب میں نت
اور صحت مند تجربے ہوتے رہتے ہیں وہ ہر زمانے
زندگی کا ثبوت دیتا ہے۔ بدلی ہوئی ہیئتی صورت دیکھ
یہ اندازہ کرنا کہ دوسری ڈگر پر چلنے کی کوشش کی گئی
، تعجب خیز امر ہے۔ مضطر حیدری کے یہاں فنی تجربے
ز ہیں لیکن آئیڈیالوجی میں تبدیلی نہیں ملتی۔ تجرباتی تبدیلی
ان کی ڈگر سے الگ نہیں ہے بعض لوگوں کی نظر میں
انداز کی تبدیلی سے عبارت ہے۔ یہ محض ہیئتی تجربہ ہے۔
ں میں اجتہادی رنگ پوشیدہ ہے۔ مثلاً کنول، نہرو،
مایہ وغیرہ یہاں فن کی ربودگی، فکر کی لذت، دھیمی
یمی آنچ، سلگتے رہنے کا تیور ملتا ہے۔ نظم فن، ان
شاعری پر صادق آتی ہے۔

تین مصرعے میں ایک پوری نظم
کتنا بھرپور مختصر ہے یہ فن
جیسے دریا بھرا ہو کوزے میں

افسوس ہے کہ کم عمری میں پروانہ اجل آگیا۔ ان کی
وت کا سبب افلاس تھا۔ موصوف عسرت کے دن
زار رہے تھے لیکن ڈگر بدلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔
انداز شاعر کے بلند کردار کی نشانی تھی۔ اس کی دو وجہیں
قیں۔ ایک وجہ عصری میلانات سے متعلق تھی۔ زیادہ
ر شاعر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اشتراکی عینک
ے ساری چیزوں کو دیکھنا ان کا شعار ہوگیا تھا۔

جس نے دھیما لہجہ اختیار کیا تھا ان میں مضطر حیدری
بھی تھے۔ اس انداز کو بعضوں نے ڈگر بدلنے سے
عبارت کیا تھا لیکن جو تبدیلی ملتی ہے وہ ہیئتی تجربہ
کی ایک جھلک ہے۔

اردو کے ایک اہم دانشور افسانہ نگار
—— اور صاحب طرز صحافی ——

کلام حیدری

کی شخصیت اور فن پر
ایک ضخیم اور باوقار پیش کش

ماہنامہ سہیل کا کلام حیدری نمبر

کم و بیش ۳۰۰ صفحات کے اس وقیع مجلے کی تیاریاں
بہت کچھ ہو چکی ہیں
بہت کچھ ہو رہی ہیں
ہندو پاک کے نامور قلم کاروں سے
تعاون کی اپیل ہے

ایڈیٹر: ماہنامہ سہیل، ریلوے سائڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ

راز اعظمی
گورکھپور

علامہ اقبال اور ان کی شاعری

★ اُردو شعر وادب میں اقبال کی حیثیت بڑی عظمت کی حامل ہے۔ اردو کے تین بڑے شاعروں کا اگر انتخاب کیا جائے تو بلاشبہ میر، غالب اور اقبال کا نام آئے گا تاریخی اعتبار سے علامہ اقبال کا مقام تیسرے نمبر پر آتا ہے، لیکن اگر معیار اور مرتبہ کی میزان پر رکھا جاوے تو یہ ترتیب برعکس ہو جائے گی۔ یعنی اقبال اولین مقام کے حقدار ہو جائیں گے۔ میر اور غالب کی موجودگی میں اقبال کو اولین مقام پر بٹھایا جانا اقبال پرستی پر مبنی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن عشق پرستوں کے نزدیک اقبال کو عظیم ترین شاعر قرار دینا انصاف پرستی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

اقبال کسی درجہ کے عطا کئے جانے کے محتاج نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری خود پکار پکار کر ان کی عظمت و بلندی کا اظہار کرتی ہے۔ اقبال اسلام پرستوں کے اتنے ہی اہم ہیں جتنے کی ادب پرستوں [illegible]

ہیں جتنے کے سیاسی رہنماؤں کے لئے، ہندوستان، پاکستان کے کسی بھی عالم دین و سیاسی لیڈروں کی تقریر اقبال کے اشعار کا سہارا لئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اقبال کی عظمت کا یہ پہلا ثبوت ہے۔

اقبال کی عظمت کا راز صرف اس میں پوشیدہ نہیں کہ انہوں نے ہمیں ترانۂ ہندی، بلبل کی فریاد، مکالمہ جبرئیل و ابلیس، مسجد قرطبہ، نیز شوالہ، ساقی نامہ، لینین خدا کے حضور میں جیسی قومی اور ملی نظمیں پیش کیں۔ ان کی عظمت کا راز صرف اس نقطۂ نظر میں پوشیدہ نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیں خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کی، بلکہ ان کی عظمت کا راز ان کی شاعری کے پیغام اور فکر میں پوشیدہ ہے۔ اقبال کی شاعری پیغمبرانہ شان رکھتی ہے۔ انھوں نے فکر وفن کے ایسے چراغ روشن کئے جن کی روشنی سے اردو شاعری پہلے یکسر محروم تھی۔ غالب نے اردو [illegible] ضرور روشن

کی تھی۔ لیکن ان کی شاعری (میں) فکری بصیرت سے جلوہ آرا نہ تھی، بلکہ یہ روشنی دور دور، اور خال خال نظر آتی تھی۔ اقبال کے اس فکری بصیرت میں جلوہ عام ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو حسین و دیدہ زیب الفاظ سے آراستہ ہی نہیں کیا بلکہ انھوں نے ایک منظم اور پختہ عزائم کے ساتھ اردو شاعری کے دامن کو معانی و مفاہیم کے گل بوٹے سے آراستہ و پیراستہ کیا۔

ان کی شاعری اعلیٰ مقصد کی شاعری ہے ان کی شاعری چیدہ چیدہ خیالات کی عکاسی نہیں بلکہ ایک مربوط و منظم نظریۂ حیات کی مستند دستاویز ہے۔

اقبال کی شاعری کے بارے میں اس سے پہلے جو بات کہی گئی ہے کہ اقبال کی شاعری "پیغمبرانہ شان رکھتی ہے" وہ کسی جذباتی لگاؤ یا شاعرانہ اظہار خیال کے طور پر نہیں کہی گئی ہے، بلکہ اس لئے کہی گئی ہے کہ اقبال کی شاعری واقعتاً ہمیں ایک فلسفۂ حیات، ایک طرز زندگی، اور ایک پیغام سے روشناس کراتی ہے۔ ہمیں اپنی پہچان نہ تھی، اپنی حیثیت کا کچھ اندازہ نہ تھا، اپنی وقعت کا کچھ احساس نہ تھا اور ہم احساس خودی اور خودداری سے یکسر محروم تھے۔ اقبال نے ہمیں اپنی دردمندانہ آواز سے نہ صرف چونکایا بلکہ خواب و غفلت سے بیدار کردیا۔

اقبال کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

اقبال جذبۂ انسانیت سے سرشار تھے ان کے سینے میں ایک مومن کا دل دھڑکتا تھا انسان کی عظمت کا راز ان کے دل میں بدرجۂ اتم موجود تھا ان کی خودی کا سلسلہ خدا سے ملتا تھا۔ اس لئے وہ بندے کے خودی کے آگے خدا کی خوشنودی کو ثانی درجہ دیتے ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے اپنی شاعری کو کچھ علامتوں اور پیغاموں کے ذریعہ آراستہ و پیراستہ کیا۔ مومن، خودی، شاہین، مرد کامل اور عشق جیسے اصطلاحات سے انھوں نے نہ صرف اپنی شاعری کو ایک نئے ذخیرہ الفاظ سے آشنا کیا بلکہ ان سے اقبال نے نئے مفاہیم اور معنی کے گوشے نکالے اور ان کی مدد سے انھوں نے اردو شاعری کو ایک فلسفیانہ فکر و مذہب عطا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کی خودی، بے خودی سے الگ ایک چیز، دیگر شاہین حرکت و علم کا پیکر ہے جو عاشقانہ بنا کر رہنے کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اقبال کا عشق جذبۂ توانائی کا دوسرا نام ہے۔ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم اقبال کے نزدیک وہ حربہ ہیں جو دنیائے علم کو تسخیر کرسکتے ہیں اور علامتوں کے ذریعہ اقبال نے اردو شاعری کو ایک مکمل آئینہ حیات" اور فلسفۂ زندگی سے نہ صرف آشنا کیا ہے بلکہ مالا مال کردیا ہے۔ یہی وہ موضوعات ہیں جو اقبال کو اپنے قبل، بعد اور ہم عصر شعراء سے ممتاز و منفرد کردیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری فکر و فن کا حسین سنگم ہے، تاہم اقبال فن کے لئے فکر کو قربان نہیں کرتے وہ موضوعات کو اپنی توجہ کا اولین حقدار ٹھہراتے ہیں۔ بقول مسعود حسین خاں، "اقبال کی شاعری اتنی عجیب ہے کہ تنقید کی کتنی ہی کمندیں کیوں نہ پھینکیں جائیں اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کی جھلکیاں مندرجہ ذیل اشعار میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

پریشاں ہو کے مری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

شکتی بھی، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

نہ مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
قدرت کا اشارہ ہے ہر شب کو سحر کر

علامہ اقبال کے فکر و فن پر
جگن ناتھ آزاد کی عالمی شہرت یافتہ کتاب
اقبال اور اس کا عہد
پاکستانی ایڈیشنوں سمیت ساتواں ایڈیشن
قیمت — ۴۰ روپے
اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی پیشکش
ہندوستان میں اقبالیات
اور دوسرے توسیعی لیکچر
دوسرا ایڈیشن
مصنفہ
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
قیمت — پچاس روپے
ملنے کا پتہ
[illegible]

شرون کمار ورما

دلّی جو—

ایک زمانہ تھا جب ہر سڑک روم کو
۔ اچانک دنیا والوں کی نظریں اور نظریہ دونوں
۔ جب روم کی کچھ خوبصورت لڑکیوں نے
کو اپنا وطن بنا لیا تو لوگ روم سے مایوس
اور بآواز بلند کہنے لگے کہ اب وہاں پوپ
کے علاوہ رہ کیا گیا ہے۔

آج کل ہر سڑک اور ہر نظر دلی کی طرف جاتی
ں طور پر پڑی — اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں
شاہ سوری نے جرنیلی سڑک کو پشاور سے
ا۔ اور اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے
، مسافر خانے بنوا کر دور دور سایہ دار [illegible]
ے تھے اس سے پہلے بھی کئی ہمت والے اس
ستے سے دلی پہنچ گئے تھے۔ محمود غزنوی کو
، اس کی آب و ہوا اور یہاں کے برہمن زادے
پسند آئے کہ وہ سترہ بار جوکھم اٹھا کر
یا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اس سیاحت
ق میں یہاں جان و مال کا نقصان ہوا۔ خیر

وہ ہم نے خود ہی پورا کر لیا۔ ملک کی تباہی اور بار
بار کے حملوں نے ہمیں بہت اچھی نظمیں دی ہیں
جنہیں ہم آج بھی سر اٹھا کر گاتے ہیں۔ باقی مگر
ہے اب تک۔ نام و نشاں ہمارا — اور — اور
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری۔

اگر گھوڑ سوار جو سیاحت کے شوق میں
اپنے لشکر لے کر ادھر آ نکلتے تھے، اپنی تلوار [illegible]
توپ خانوں اور گھوڑوں کی وجہ سے حملہ آور کہلائے
ہم آج بھی اپنے بچوں کو ان حملوں کے فوائد بتا بتا
کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ لوگ درۂ خیبر کو دلی
تک لے آئے۔ اور یہ خیبر پاس — آج بھی دلی میں
موجود ہے۔ دراصل درۂ خیبر کے آگے والے علاقوں
کا حال یہ تھا کہ — مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت
خرابی کی۔ ان غیور سپاہیوں کے اعلیٰ نسل
گھوڑوں نے جب دریائے سندھ اور گنگا جمنا
کے میدانوں کی ہوا سونگھی اور ہری ہری دوب
دیکھی تو بے قابو ہو گئے۔ بالکل یہی حال ان بھولے

بھالے گھوڑ سواروں کا بھی ہوا، جنھیں یہاں کے محلوں
مندروں سونے چاندی کے ڈھیر نظر آئے اور لوگ
بھوکے ننگے مدتوں ملے۔ وہ لوگ جذبۂ ہمدردی سے
مجبور ہو کر ادھر بڑھتے چلے آئے۔ گھوڑے تو بے
بے زبان اور بے زبان پر ظلم کسی صورت جائز نہیں۔ گھوڑے
زبان والوں کو روندتے چلے گئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا
کہ دلی کی تاریخی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ خلجی، لودھی
غلام، مغل، ڈچ، فرانسیسی، انگریز سب اپنی
تلواروں، بندوقوں اور ٹاپوں کے نشان چھوڑ گئے۔

یہ اعلیٰ نسل گھوڑے اپنے سواروں کو پانی پت
تک بڑے آرام سے لے آتے تھے۔ مہابھارت میں
کوروکشیتر کی جنگ کے بعد، میدان جنگ بہ متفقہ
رائے سے پانی پت میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ دلّی
والے جو نہایت نازک مزاج اور آرام پرست تھے،
زیادہ دور تک آنے کی تکلیف نہ اٹھائیں۔ یوں
بھی وہ گھروں اور کوٹھوں پر لڑنے کے عادی ہو چکے
تھے۔ تین گھمسان لڑائیوں کے بعد میدان بھی اب
اس قابل نہیں رہ گیا ہے۔ اس لئے اب یہاں دریاں
اور چادریں بنتی ہیں۔ اس دھرتی نے اتنا خون پی
لیا ہے کہ ٹیسو کے پھول بھی سرخ ہونے لگے ہیں۔ دلی
والے بھی — کون جائے ذوق۔ یہ دلی کی گلیاں
چھوڑ کر — کے سختی سے قائل ہیں۔ صرف ۱۸۵۷ء میں
انھوں نے اپنا یہ اصول توڑا تھا اور آج تک پچھتا
رہے ہیں۔ اپنی اس عادت کے سبب، وہ حملہ آوروں
کا انتظار اپنی گلیوں میں ہی کیا کرتے تھے۔ اگر سونا
چاندی کم پڑ جاتا تو اپنی سورتیں دے کر اپنے جان و
مال کی حفاظت کرتے تھے — ویسے بھی مہمان جو
پیارا ہوتا ہے، وہ جان سے پیارا ہوتا ہے۔

پانی پت پہنچ کر ان گھوڑ سواروں کی آنکھ
کا پانی مر جاتا اور یہاں والوں کی پت بھی بھر کر لوٹتے
اور دلی والے۔ موری پت رکھو گردھاری گاتے رہتے۔
کہتے ہیں مصیبت کے وقت بھگوان کو یاد کرنا چاہئے۔
دروپدی کا چیر بڑھانے کے بعد شاید گردھاری
کو اس تھکا دینے والے کام میں کوئی دلچسپی نہیں
رہی۔ لہٰذا یہ کام پولس کو سونپا گیا لیکن انھیں بھی
یہ بورنگ اور غیر دلچسپ معلوم ہوا۔ دلچسپ تو

ہم بھارت واسی موہ مایا کو تیاگنے میں یقین
رکھتے ہیں اس لئے ہم آج کل غیر ملکی کمپنیوں کو یہاں
بلا کر خوشی محسوس کرتے رہے ہیں۔ سالے موہ مایا کے
جال میں پھنس کر خود ہی برباد ہو جائیں گے۔ ہم تو اس
اعتماد اور اعتقاد پر زندہ ہیں کہ مٹی کو آخر مٹی ہونا
ہے۔ دکھ کس بات کا۔ اس دنیا سے کون کچھ لے کر
گیا ہے۔ شمشان گھاٹوں پر۔ سکندر اعظم کی وہ تصویر
دیکھ لیجئے جو میں اس کے دونوں خالی ہاتھ کفن سے
باہر نظر آتے ہیں۔ یہ غیر ملکی کمپنیاں بھی کیا لے جائیں
گی۔ یونان، مصر، روما سب مٹ گئے جہاں سے۔ ان
بے چاروں کو معلوم نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ سو
انہیں معاف کر دو۔ معاف کرنے والا ہی عظیم ہوتا ہے
اگر وہ ایک گھر لوٹتے ہیں تو دوسرے کے دروازے
ان پر کھول دو۔ یہ سب سوچ کر ہم اپنی پت، اتروا
کر پانی پانی ہوتے رہے ہیں۔ آج بھی ہم اپنی
عظمت پارینہ کے قائل ہیں۔ یقین نہ ہو تو پچھلے
چھیالیس سالوں کی کارگزاری پر نظر ڈال لیں۔
گھوڑے جب سے میدان جنگ سے ہجرت

کرکے ولیسی کے میدان میں دوڑنے لگے ہیں ہم نے اپنی پت اتارنے کا کام ورلڈ بینک، بین الاقوامی اداروں اور امریکہ کو سونپ دیا ہے۔ امریکہ میں آبادی نہیں بڑھی اس لئے وہاں کمپنیاں زیادہ ہیں اور فوج کم ہے۔ ایک ایسٹ انڈیا کمپنی نے دو سو سال ہماری ایسی کی تیسی کی اور آخر ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اب یہ نئی کمپنیاں ہمارے چوبیس ٹکڑے کریں گی۔ روس کو دیکھ لیجئے۔ چرخہ جائے گا بھاڑ میں۔ ترشول اتریں گے بے گناہوں کی چھاتیوں میں۔ بھکاریوں کا کہنا ہے کہ مانگ کر کھانے کا اپنا ہی مزہ ہے۔

دلی کی تاریخی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ یہاں کے تعلیمی اداروں میں تاریخ بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی ہے یا کہ یہاں کے مقبروں اور کھنڈروں کی دیواروں پہ یہاں آنے والوں کے نام ہیں اور تاریخ نزول کندہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے تاریخ سے سوائے کلنڈر چھاپنے کے اور کچھ نہیں سیکھا۔ ہم ایسی محبت اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے لئے سیمینار منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اور اشتہار چھاپتے ہیں۔ اور جب ادھر سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کی مقدس، مذہبی عمارتیں مسمار کرتے ہیں، گھر جلاتے ہیں، لڑکیاں اٹھاتے ہیں اور بچوں کو قتل کرتے ہیں۔

دلی کی بستی عجیب بستی ہے۔ جو بھی گزرا اس نے لوٹا ہے۔ خیر سے اب تو لوٹنے والے نہیں بستے ہیں۔ ان سے یہ حق چھین لیا جائے تو [illegible]

نہیں کرتے۔ چور دروازوں سے اندر آجاتے ہیں۔ ہم اس ناجائز قبضہ کے شروع ہی سے عادی ہیں۔ ان قیوں کو آج کل سیاست دان کہا جاتا ہے۔ ان کی اپنی فوج ہوتی ہے جو اسکولوں، کالجوں، سڑکوں پر دنگے کراتی رہتی ہے۔ پولس کو ادھر سے خاص ہدایت ہوتی ہے کہ ان کے کام میں نہ تو اپنی گندی ناک گھسیٹے اور نہ اپنی ٹانگ اڑائے۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔

ہم نے اولین لشکروں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے دلی کے ایک بازار کا نام ہی اردو بازار رکھ دیا ہے۔ دوسرے گزرنے والوں کی سہولت کے لئے سڑک پر پیروں کا قالین ہر وقت بچھا رہتا ہے۔ لشکر اور لشکری تو اب یہاں نہیں ہیں۔ بھیڑ بکریاں اور مرغیاں ان کی دہائی دیتی سنی جا سکتی ہیں۔ سنا تو یہ بھی جاتا ہے کہ دلی میں مرکزی حکومت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔

دراصل ہم بنانے میں اتنے محو ہو گئے کہ تاریخ بنانا اور لکھنا بھول گئے۔ لیکن تاریخ ڈھیٹ چیز ہے کہ خود بہ خود بنتی چلی جاتی ہے۔ لکھنے لکھانے اور بنانے کا کام بھی ہم نے کچھ غیر ملکیوں کو سونپ دیا۔ ہستنا پور سے کناٹ پلیس تک کا سفر ہم نے باہر والوں کی مدد سے ہی طے کیا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔

میر جی جب عطار سے دوا لے کر سلسلۂ دیوار میں پڑے تھے تو پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا۔ دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب، دلی کی یہ حیثیت آج بھی [illegible]

اور الیکشن کے منتخب ہی رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی سہولت اور انتخابی مہم کی خاطر جھگی جھونپڑی والوں کو بھی یہاں رکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ ایجیٹیشن تقریر عریبی مظاہرے پروگرام اور جلسے جلوسوں کی رونق بڑھانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ طے تو یہ ہوا تھا کہ ہر پانچ سال بعد انہیں "آدمی" ہونے کا احساس دلایا جائے گا لیکن اب ان کی حالت سدھارنے کے خیال سے یہ کام دوسرے تیسرے سال بھی کر لیا جاتا ہے۔

دلی کی اہمیت ان دنوں درس گاہوں کے جرس گاہوں میں تبدیل ہو جانے کے کارن بھی ہے۔ سیاسی بازیگر اپنے گرگوں کے ذریعہ پہلے تو یہاں بد امنی پھیلاتے ہیں پھر امن بحال کر کے ووٹ، نوٹ اور عزت بٹورتے ہیں۔ یوں تو یہ شہر مزاروں اور مقبروں کے لئے مشہور ہے، آج کل اسے قبرستان بنانے کی دھن سوار ہے نیتاؤں پر۔ شاہ جہاں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ روضۂ تاج محل آگرہ میں بنوا دیا حالانکہ جمنا دلی میں بھی تھی اور ہے۔ خیر بادشاہوں کی غلطیاں اب سدھاری جا رہی ہیں۔ اب یہاں جمنا کے کنارے سمادھیاں دھڑا دھڑ بن رہی ہیں۔ خدا نے چاہا تو یہ کام اسی تیزی سے چلتا رہے گا اور بہت جلد یہ سلسلہ الہ آباد تک پہنچ جائے گا کیوں کہ ہر سیاسی جماعت اپنے نیتاؤں کے لئے جمنا کے کنارے پلاٹ الاٹ کرانے کے درپے ہے۔ مرد اور مرنے دو کا اصول بناتے ہوئے ایک مشکل ضرور پیش آئے گی کہ جمنا الہ آباد سے آگے اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ خیر کی طرف توجہ دیا جا سکتا ہے۔ الٹے بانس بریلی کو،

استاد ذوق دلی کے بارے میں بے حد جذباتی ہے۔ گھر سرم گھسار ٹھک کے لئے تیار ہے۔ مرزا غالب نکتہ چیں تھے۔ بولے۔ یہ دلی کی گلیوں سے نہیں، قلعۂ معلیٰ سے حاصل ہونے والی مراعات اور اسائش کے عشق کے سبب ہے۔ جب ان سے دلی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔ ع ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا۔ کہنا تو وہ پیچھے لگے کہا۔ چاہتے تو کھانے کے معاملہ میں تو پوری طرح خدا پر بھروسہ رکھتے تھے۔ مجاز دلیؔ سے رخصت ہونے لگے تو شعر میں کہدیا۔ لالہ زار رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا کیا کیا جائے دلی کی قسمت ہی ایسی ہے۔

دلی بھی کسی فاحشہ سے کم نہیں۔ بار بار لٹی گئی۔ اف تک نہیں کی۔ آج کل صورت حال قدرے مختلف ہے۔ آباد بھی ہے۔ لٹ بھی رہی ہے۔ کوئی نادر شاہ یا ملکۂ انگلینڈ نہیں۔ ہم خود یہ کام کر رہے ہیں۔ اور اس کام میں اپنے امریکی آقاؤں کی مدد لے رہے ہیں۔ جہاں جہاں یہ امریکی قبضہ رنجاں ہوئے۔ وہ دھرتی پھر ہری نہیں ہو سکی۔ افغانستان کا حال دیکھ لیں۔ سبھی زخم ہرے ہیں۔

سوائے عروس البلاد انتظار کرتا ہے کہ ایک بار اپنے ہی ہاتھوں۔ کم از کم یہ تجھے پیار سے لوٹیں گے۔

٭

براہ کرم اپنے مضامین خطوط اور دیگر تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں —

سات نظمیں

صابر فخرالدین، یادگیر

(۱)

یہ سوچ کر وہ
قید بدن سے
نکل گیا
خیمے اکھڑ گئے ہیں
طنابیں تو
بچ گئیں !!

(۲)

قافلے
منزل کی جانب
بڑھ گئے ہیں
راستے
اب آئینے میں
اپنا منہ
دیکھا کریں !!

(۳)

وہ ایک ساعت
جو میری آنکھوں کی
روشنی تھی
بصارتیں
چھین کر نہ جانے
کہاں گئی ہے !!

(۴)

یہی خطرہ
مجھے بھی ہے
کہ میں
حالات سے مجبور ہو کر
بھول سکتا ہوں
تمہیں بھی !!

(۵)

نیلے بادل ہیں
آسمانوں پر
اور
پرچھائیں
کالی کالی سی !!

(۶)

دھوپ کے
سائے
جواں ہیں
اور
بوڑھا ہو گیا ہے
آسماں !!

(۷)

جزیرے
دشت امکاں سے
پرے ہیں
پھر بھی کیوں
نیند کے ماتے
خواب آگہیں خواہشوں کی
قید میں ہیں !!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بھاگلپور)

کھیل

بنتے بگڑتے بلبلے
بڑھتے سمٹتے دائرے
پھیلی ہوئی خواہش کی آگ
بیتی عمر کی کتھا
میٹھی سی گنگناہٹ
گل مہر کی پنکھڑی
سوکھے پتوں پر چل کر
آنے کی آہٹ
موسم کا یہ کھیل عجب ہے

خورشید طلب

نظم

بال الجھے ہوئے
جھکی گردن
جسم بوجھل
تھکی تھکی سانسیں
زندگی سے تہی تہی آنکھیں

چہرے
جیسے شکستہ قبریں ہوں
جیسے دھبے
سفید کپڑوں پر
ریت پر جیسے چیونٹیوں کی قطار
پیٹھ پر لادے اپنا اپنا مزار
لوگ ہیں کون ؟
جا رہے ہیں کدھر ؟
اک تجسس
فضا میں تیرتا ہے !!

غزلیں

محمد کمال جعفری
ذاکر نگر، نئی دہلی

گلشن کا رنگ زرد ہوا جا رہا ہے دوست
ہر گل خزاں نورد ہوا جا رہا ہے دوست
اس نجمد فضا کی بیاں کیفیت ہو کیا
دل میرا سرد سرد ہوا جا رہا ہے دوست
ماحول پر گناہ کی چھائی ہیں بدلیاں
بے حس ہر ایک فرد ہوا جا رہا ہے دوست
روشن وجود جس کا زمین و فلک میں تھا
وہ راستے کی گرد ہوا جا رہا ہے دوست
ہر سمت کشت و خون کا بازار گرم ہے
قاتل ہر ایک فرد ہوا جا رہا ہے دوست
تیرِ ستم کی بارش پیہم ہے ہر طرف
زخمی ہر ایک فرد ہوا جا رہا ہے دوست
جی چاہتا ہے کر دوں بیاں داستانِ ظلم
دل میں کچھ ایسا درد ہوا جا رہا ہے دوست
بزدل کمالؔ جس کو سمجھتا تھا کل تلک
وہ آج "شیر مرد" ہوا جا رہا ہے دوست

ڈاکٹر ظہیر ناشاد دربھنگوی
دربھنگہ

زندگی بھر سب تلاش رنگ و بو کرتے رہے
ہم مگر ہر شے میں تیری جستجو کرتے رہے
دے سکے وہ بھی نہ ہم کو آنسوؤں کی ایک بوند
صرف ہم جن کے لئے اپنا لہو کرتے رہے
محو دل سے ہو گئی احباب کے میری وفا
لیکن مدتوں مجھ کو عدو کرتے رہے
پیٹھ پیچھے شکوہ کرنے میں وہی تھے پیش پیش
جو میری تعریف میرے روبرو کرتے رہے
جیب و دامن کی سبھی کو فکر تھی اپنے مگر
ہم سبھی کے چاک داماں کو رفو کرتے رہے
صاف گوئی جرم تھی جس بزم میں ناشادؔ ہم
استعارے کی زباں (یہ) گفتگو کرتے رہے

جمالؔ اویسی
(دربھنگہ)

ناریل کے پیڑ، ساحل اور سمندر دیکھنا
پھر انہی کے درمیاں مجھ کو بھی اکثر دیکھنا

کنکری کے فرش پر چلتا ہوں ننگے پاؤں میں
میرے تلووں سے لپٹتے ہیں جواہر دیکھنا

کوئی ویرانہ ہے میری ذات اور میرا وجود
خامشی کی سلطنت تم میرے اندر دیکھنا

مشغلہ ہے رات بھر آوارہ پھرنا ہر طرف
اور اچٹتی آنکھ سے تاروں کا لشکر دیکھنا

ڈوبتے سورج نے پانی سرخ کر ڈالا جمالؔ!
کس قدر پیارا ہے ساحل سے سمندر دیکھنا

عمرانؔ اعظم
(دہلی)

شرحِ تعلقات کی روشن مثال دے
آئینہ نفاق کو پتھر پہ ڈال دے

سُن لے ذرا سی دیر میں قسمت کا فیصلہ
ماحول سازگار رہے سکّہ اچھال دے

سڑکیں بھی اب تو شہر کی اپنی نہیں رہیں
اک معتبر سفر مجھے [illegible] دے

ہاں! اتنی احتیاط ضروری ہے آجکل
دولت لٹا خوشی کی نہ رنج و ملال دے

اپنے عظیم سے یہ ترا دشمنی کا شوق
بامِ عروج پر ہے اب اس کو زوال دے

حسرتؔ مونگیری
(مونگیر)

وہ ظلم کرتے رہے ان کی کچھ سزا ہی نہیں
ہمارے دور میں منصف کوئی ہوا ہی نہیں

مری اڑان پہ کرتے تھے رشک دونوں جہاں
میں آسماں سے گرا کب پتہ چلا ہی نہیں

وہ طاق طاق بجھاتے رہے چراغ مگر
بساطِ دل کا بھڑکتا دیا بجھا ہی نہیں

مرے وقار کو اکثر لگی ہے ٹھیس یہاں
جو سر جھکا ہے بظاہر وہ [illegible] ہی نہ تھا
ورق ورق سے مری [illegible] ہے
حدیثِ قلب کا حرفِ شرر مٹا ہی نہیں
مری یہ ذات سمندر سے کم نہیں لیکن
ابھی تلک مری تہہ میں کوئی گیا ہی نہیں
ہمارے شہر کی مسموم ہے فضا حسرتؔ
ہمارے شہر میں کوئی شجر ہرا ہی نہیں

غزلیں

غزلیں

صابر رومانی
(گوپال گنج)

زخم خوردہ شخص وہ داغِ جدائی دے گیا
اس جہانِ بے مروت کی دہائی دے گیا

ایک بیوہ چند بچے اک چٹائی دے گیا
خوش رہیں اپنے جہاں وہ سب کمائی دے گیا

جس کو اپنے بھی وفا ناآشنا سمجھا کئے
وہ گیا تو سب کو دردِ آشنائی دے گیا

کہہ گیا جینا پڑے گا ہے تقاضا وقت کا
تفرقے کا تلخ بادہ میرا بھائی دے گیا

اس کے احسانوں کا بدلہ دے نہ پاؤں گا کبھی
میرے ہاتھوں میں جو کشکولِ گدائی دے گیا

شہرِ ناپرساں میں صابر مسکرا کر رہ گئے
آشنا چہرہ کوئی جب بھی دکھائی دے گیا

اظہر نیر
(دربھنگہ)

زندہ ہیں آج بھی اسی شہر پناہ میں
تبدیل ہو کے رہ گیا جو قتل گاہ میں

میں آ گیا ہوں جانے کہاں شہر چھوڑ کر
نقشہ بھی گھر کا اب تو نہیں ہے نگاہ میں

قاتل ضرور آئے تھے میرے مکان تک
ہر ہر قدم پہ خون کے دھبے ہیں راہ میں

بچوں کا کھیل جان کے سب کچھ جلا دیا
منظر وہ آج تک ہے ہماری نگاہ میں

سب کچھ جلا کے رکھ دیا نفرت کی آگ نے
محفوظ ہوں مگر میں خدا کی پناہ میں

گھر کا کبھی نہ لطف میسر ہوا ہمیں
عمرِ عزیز بیت گئی غم کی راہ میں

[illegible]
اک سایۂ ببول جو مل جائے راہ میں

نثار جیراجپوری
(اعظم گڑھ)

دل کو یادوں کے تہہ خنجر اتار
اب نہ وہ بھولے ہوئے منظر اتار

تھی نمائش چار سو سب رات کی
صبح سارے لے گئی زیور اتار

صبح دم بولیں جو میٹھی بولیاں
ان درختوں پر وہی طائر اتار

پھر انہیں یادوں کا لے کر قافلہ
اس جزیرے پر کوئی لشکر اتار

اے خدا تو اس ہوا کے دوش سے
اک گھٹا رحمت کی پھر ہم پر اتار

آتے جاتے راستوں سے اے نثار
وقت کے بدلے ہوئے تیور اتار

غزلیں

ابوالخیر کشفی
(بھٹیا)

یہ نیا خواب اور تعبیریں
وقت کے پاؤں میں ہیں زنجیریں
جھوٹی شہرت، انانیت، افراط
شہرِ مقتل کی ساری جاگیریں
گھر ہی کا عذاب نازل ہے
مٹ نہ جائیں رضا کی تحریریں
جن سے روشن ہے یاد ماضی کی
میری آنکھوں میں ہیں وہ تصویریں
دل سے ٹوٹا زبان کا رشتہ
خاک ہوں گی دعا میں تاثیریں
شہر در شہر خوف کا منظر
کوئی رعنائی ہے نہ تنویریں
دشت امکاں میں تازگی جیسے
لفظ و معنی میں قید تفسیریں
دیکھ کر میرا حوصلہ نشترؔ
ہاتھ باندھے کھڑی ہیں تقدیریں

خالد عباسی
(پٹنہ)

کسے پہچان ہے اچھے برے کی
یہاں دریا میں ڈالو کر کے نیکی

تری یادیں یہاں تک کھینچ لائیں
یہ رسی بن گئیں میرے گلے کی

یہ دل پہلے کہاں ماتم کدہ تھا
سزا آخر ملی اپنے کیے کی

یہ اپنا شہرِ جاں ہے یا ستم گہہ
ضرورت ہی کہاں تھی پوچھنے کی

انہیں وہ جانتے ہوں گے عباسیؔ
جنہیں پہچان ہے کھوٹے کھرے کی

ضیا آزاد
(آرہ)

ہر قدم پر رونما دشواریاں ہونے لگیں
رنج و غم کی پھر وہی بیماریاں ہونے لگیں
سب نے سمجھا تھا کہ شبنم نے بجھا ڈالا انہیں
راکھ سے روشن وہی چنگاریاں ہونے لگیں
بیچ کر سونا کھلونے ہم نے لوہے کے لئے
کھیلنے کی اب نئی تیاریاں ہونے لگیں
مسجد و مندر کلیساؤں کے گنبد چیخ اٹھے
بندگی کے نام پر عیاریاں ہونے لگیں
کعبۂ دل کس کو سمجھوں کس کو میں قبلہ کہوں
اب تو اپنے آپ سے غداریاں ہونے لگیں
چند لمحے کے تزلزل سے خموشی مٹ گئی
ہر طرف ہر گھر میں آہ و زاریاں ہونے لگیں
اے ضیا آزاد جب سے امن کا قصہ چھڑا
فوج میں بھرتی وطن کی ناریاں ہونے لگیں

نسیم بن آسی
مظفرپور

ناگ پھنی کا جنگل

کسی کسی نوجوان کے جسم کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ آنکھیں اپنے آپ اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اور اسے اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتی ہیں۔ ولیشیا کی زندگی میں جتنے مرد آئے تھے۔ ان میں بھکشو ایک تھا۔ آج تک اس نے ایسا مرد نہیں دیکھا تھا۔ سفید دھوتی میں اس کا دراز قد، سڈول باہیں اور کھلی کشادہ چھاتی اس کے مردانہ وقار کی شناخت کر رہی تھی ـــ گورے چہرے پر صحت کی سرخی کی وجہ سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں جو کبھی کبھی ہی کسی چہرہ پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس کی بڑی شفاف اور معصوم آنکھیں جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ اپنے اس جرم کا اعتراف کر رہی ہوں کہ انہوں نے واقعی اس دنیا کو نہیں دیکھا ہے ـــ جس میں عورت نام کی کوئی مخلوق رہتی ہے اور جس کے بغیر دنیا کا کوئی معنی نہیں ـــ! اس کے بالوں کو خوب حیائیں آمیز غذائیں ملی تھیں جن سے وہ گھنے اور کالے نظر آ رہے تھے ـــ!

بھکشو ایک تھا تو وہ بھی ایک ہی ولیشا تھی۔ جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا نام سن کر لوگ دیوانہ وار اس کی طرف بھاگے چلے آتے تھے اس پر بھی وہ جلدی کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ لیکن بھکشو کو دیکھ کر اس کی ساری انانیت جانے کہاں سنک گئی۔

"بھکشو جی! آج رات میرے یہاں ہی آرام کر صبح چلے جانا ـــ"

جب ہی بھکشو کو تتھاگت کے الفاظ یاد آ گئے

بندھوؤ! ناری کی طرف مت دیکھنا، ناریاں اپنے جال میں پھنساتی ہیں اور دکھ دیتی ہیں۔ جوانی اور خوبصورتی کا اصل روپ دیکھنا چاہتے ہو تو کسی مرگھٹ میں جاؤ ـــ اور وہاں اس شریر کا انت دیکھو ـــ

بھکشو نے ولیشیا کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔

"آج نہیں وقت آنے پر میں ضرور ٹھہروں گا!"

ولیشیا کو بھکشو کی بات عجیب معلوم ہوئی لوگ صرف اس کی ایک جنبش نگاہ کے لئے ترستے ہیں، اور یہ بھکشو کیسی باتیں کر رہا ہے ـــ؟

" بھکشو جی! اس سے اچھا وقت کب آئے گا۔
ابھی تو میں جوان اور خوبصورت ہوں!"
" ناری! مجھے بھکشا دو۔۔ شام ہو رہی ہے۔۔
اور مجھے دور جانا ہے۔۔ وقت آنے پر میں ضرور آؤں گا۔
وعدہ کرتا ہوں۔۔!"

ویشالی دکھی من سے اندر گئی۔۔ بھکشا لیا اور بھکشو کے پاتر میں ڈال دیا۔۔۔

" لیکن بھکشو جی! اپنا نام اور پتہ بتاؤ۔۔۔"

" آنند۔۔۔ دور جنگل میں رہتا ہوں۔۔!"

سورج مغرب کی آغوش میں اپنے انجام پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جس سے سارا افق سرخی مائل ہو گیا تھا۔ اور دن کے اجالے اندھیروں کا شکار ہو کر دبے پاؤں کہیں نکل گئے تھے۔ سامنے پیڑوں کا جھرمٹ ہونے کی وجہ سے بھکشو کی بجائے صرف دھبے نظر آ رہے تھے۔ ویشالی نے دروازہ بند کر دیا اور اداس نگاہوں سے صحن میں آم کے پیڑ کے ساتھ لٹکے ہوئے پنجرے کو دیکھا جس میں سیتارام خاموش بیٹھا شام کو اور اداس مضمون بنا رہا تھا۔ جب کوئی دم دار گاہک آتا تھا، جب ہی وہ پڑھائے گئے سبق کی طرح سیتارام کی رٹ لگاتا تھا۔۔ ایسا کسی نیک شگن کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس گناہ کے ازالہ کے لئے بھی جس کی وہ مرتکب ہوتی تھی۔۔!

ویشالی کے اندر جو دھواں اٹھ رہا تھا، وہ ابھی شانت نہیں ہوا تھا۔۔ وہ کمرے میں گئی اور مغموم پلنگ پر گر پڑی۔۔ بھکشو کی بات سے اس کا سارا پندار ٹوٹ گیا تھا۔۔ آخر اس میں کیا کمی ہے۔۔ یہ عمر یہ جوانی اور یہ خوبصورتی۔۔ اس پر بھی بھکشو نے اسے اس قابل نہیں سمجھا۔ وہ جو کچھ اپنے آپ کو سمجھتی ہے، کہیں وہ اس کا وہم تو نہیں ہے۔۔ وہ پلنگ سے اٹھی جس سے چرچر کی آواز ہوئی جو اسے بہت بری معلوم ہوئی۔ وہ قدآدم آئینہ کے سامنے جاکر کھڑی ہو گئی۔۔ اب اس کے سامنے اس کا ہی ہمزاد تھا۔۔ اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ گورے گداز بدن پر سرخ رنگ کا بلاؤز چست تھا۔۔ کمان کی طرح آنکھوں کے ابرو ۔۔ گیندے کے پھول کے رنگ کی ساڑی کا آنچل ڈھلک کر شانے پر آگیا تھا۔ جس سے سر کے بال کمر تک کالی گھٹا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔۔ نظر آ رہے تھے۔ جنہیں قدرت نے آزادی سے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے کبھی منع نہیں کیا تھا۔۔ پھر پاؤں میں رچی ہوئی مہندی جو اسے کچھ سے کچھ بنا رہی تھی۔ ایک طرف آئینہ ۔۔۔ دوسری طرف بھکشو۔۔۔ اور وہ ان دونوں کے درمیان کبھی ادھر، کبھی ادھر ہو رہی تھی۔۔۔

باہر کا اندھیرا کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔۔۔ اور بلاوجہ اس میں قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ہی وہ لالٹین کی طرف بڑھی۔ جو پرانی ہونے کی وجہ سے دیوار پر لکڑی کی کھونٹی میں کسی فالتو سامان کی طرح نظر آ رہی تھی۔ کمرے کی دیوار پرانی تھی اس لئے اس کی سفیدی جگہ جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ جیسے بڑھاپے میں جسم کے اعضا اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس پر لالٹین کے آس پاس کی دیوار دھواں آلود ہو کر اس کی بدصورتی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔۔ اس نے جھٹکے سے لالٹین اتاری جس سے اس کا تیل چھلک گیا۔۔ اور اس نے اسے جلایا تو وہ بھک بھک کرنے لگی۔۔ یعنی۔ بھاگ۔۔۔ بھاگ۔
کچھ دیر بعد لالٹین کی لو ٹھہر گئی اور اس کی

رقانی روشنی کمرے میں پھیل گئی۔ جس میں کمرے کی چیزیں
اضح نظر آنے لگیں۔ دو دیواروں سے لگی رسی کی الگنی
پر اس کی ساڑیاں، پیٹی کوٹ باڈی اور بلاؤز لٹک
رہے تھے۔ جنہیں وہ وقت اور موسم کے مطابق استعمال
کرتی تھی۔ لیکن یہی کپڑے اسے فضول نظر آ رہے تھے۔
ان کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ یا تھا تو جسم ڈھانکنے کے
لئے۔ دیوار پر لگی دوسری کھونٹی پر اس کا کالا چوٹیلا
لٹک رہا تھا۔ جسے لگا کر وہ اپنے عورت ہونے کا
اعلان کرتی تھی۔ لیکن وہی اب اسے کالے ناگ
کی طرح پھنکار رہا تھا۔ ایک الماری میں تیل کی شیشی،
صابن، عطر اور اگربتی کا پیکٹ رکھے ہوئے تھے جو
اسے عجیب نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور چڑا رہے تھے۔
الماری کے دوسرے خانہ میں ٹن کے ایک چھوٹے بکس
میں اس کے سونے کے زیورات تھے جنہیں پہن کر وہ کوئی
طلسمی عورت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت وہی زیور
اس کے لئے مٹی کے ڈھیر تھے اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں
بند کر لیں جس سے اس کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا۔
اور اس اندھیرے میں کمرے کی ساری چیزیں معدوم ہو گئیں۔

رات اس نے کھڑکی کھلی رہنے دی جو پورے کمرے
میں ایک ہی تھی جس سے ہوا کے ہلکے اور ٹھنڈے جھونکے
آ رہے تھے اور شروع جاڑے کی آمد کا پتہ دے رہے
تھے۔ اس کے باوجود اس کے اندر جو آتش فشاں
تھا، وہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوتے وقت
پلنگ کا جائزہ لیا، کہیں وہ ڈھیلی تو نہیں ہو گئی ہے
اور بستر پر شکن تو نہیں ہے۔ ڈھیلی اور شکن آلود بستر
پر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کہیں پلنگ کی چھپی تحت
کا [illegible] شکنیں تھیں جنہیں اس
نے دریافت کر دیا۔ لیکن جب وہ سونے کے لئے لیٹی تو
خیالات کے ہجوم اس پر یکایک حملہ آور ہوئے۔ اور ان
سے وہ نبرد آزما ہونے لگی۔ اس نے بھکشو کو اپنے
دماغ سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب وہ
آنکھیں بند کرتی، بھکشو کا پورا شبیہہ اس کے سامنے
آ کر کھڑا ہو جاتا اور اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔ کچھ
دیر بعد وہ پھر آنکھیں بند کر لیتی لیکن آنکھیں بند کرتے
ہی وہ ادھر ادھر سے آ کر پھر براجمان ہو جاتا۔ اس
طرح کافی رات گزر گئی۔ جب ہی دیوار گیر نے ٹن ٹن ٹن
کے تین بجائے۔ گھڑی کی اس آگاہی کے بعد اس کے
اضطراب میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور اس نے سونے
کی کوشش میں پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن بھکشو خوابوں
کے ذریعہ نقب لگا کر اس کے وجود میں داخل ہو گیا۔
جس سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ جیسے نیند کو اس
سے کوئی ازلی دشمنی ہو اور اس سے کھو لینا چاہتی ہو۔
اب وہ مایوس اور ناکام کمرے کی چھت دیکھ رہی تھی۔
جہاں اسے کوئی نیند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دھیرے
دھیرے رات کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو گئی۔
اور اندھیرے اجالوں سے گلے مل کر وداع ہونے لگے۔

کبھی لمحوں کا انتظار صدیوں پر محیط ہو جاتا
ہے۔ کبھی برسوں کا سفر انتظار لمحوں میں سمٹ آتا ہے
لیکن یہ کیسا انتظار تھا۔ جو نہ لمحوں میں گزر رہا تھا نہ
برسوں میں۔ ویشیا کی نگاہیں برابر باہر لگی رہتی تھی۔
شاید بھکشو آ ہی رہا ہو۔ جب کہ وہ آ بھی رہا تھا نہیں
بھی۔ جب بھی کوئی سرکش ہوا دروازے پر دستک
دیتی، وہ چونک پڑتی۔ لیکن جب وہ دروازہ کھولتی
تو باہر کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ ہوا بھی نظر نہ آتی جو

اسے کسی کے آنے کا پیغام دے رہی تھی ـــــ
اس دن آئینہ کے سامنے یکایک اسے اپنے بالوں میں سفید تار نظر آ گئے جو اسے بڑھتی ہوئی عمر کی یاد دلا رہے تھے۔ چہرہ پر بھی عمر کے ماہ و سال بے تحاشہ دوڑ لگا چکے تھے اور خوب زعفران اڑائی تھی جس میں اس کا اصل چہرہ کہیں گم ہو گیا ـــ بھکشو ابھی تک نہیں آیا ـــ وہ کب آئے گا ـــ جب وہ ......

اب وینشیا کا جو آدمی بھکشو کے پاس جا رہا تھا، وہ ادھیڑ عمر سے بھی کم تھا، لیکن دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں کیا ہے اور بری لتوں میں پڑ کر اسے بے دریغ ضائع کیا ہے۔ وہ ہڈیوں کا صرف ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ ایسی صحت کے لوگ اکثر کام چور اور کاہل ہوتے ہیں۔ لیکن وینشیا کے معاملہ میں وہ بہت چاق و چوبند تھا۔ اس لئے کہ وینشیا مغلظات کی ماہر تھی۔ اور ایسی گالیاں اختراع کرتی تھی کہ سننے والوں کی طبیعت صاف ہو جاتی تھی۔ وہ پاپیادہ تھا جس سے اس کے پاؤں چلنے سے انکار کر رہے تھے۔

اس پر بھی وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ اور رو رہا تھا.....
اس لئے کہ وینشیا کے حکم کے مطابق اسے شام تک واپس بھی لوٹنا تھا۔ آسمان کھلا ہونے کی وجہ سے سورج کی شعاعیں سیدھی زمین پر پڑ رہی تھی ـــ اور اپنا پورا اثر دکھا رہی تھی۔ جب شدید دھوپ اور گرمی ہو تو پیاس اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے ـــ اب وہ حیران و پریشان صرف پانی کو تلاش کر رہا تھا۔ جو اسے کہیں نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اور گرمی سے زبان نکال کر ہانپ رہا تھا۔ وہ ہمدردی میں کتے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن کتا بھی وہی کرتا ہے جو آدمی کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے نوکیلے دانت نکال کر غرانے لگا ـــ جیسے اسے اپنا کوئی ہم جنس نظر آ گیا ہو ـــ اب وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا تو پیچھے بھی مڑ کر دیکھ رہا تھا ـــ کہیں کتا آ تو نہیں رہا تھا ـــــ ؟

پیڑوں کے جھرمٹ سے آگے جانے پر اسے ایک رہٹ دکھائی دیا جو پیاس کی شدت کی وجہ سے قریب نہیں آ رہا تھا۔ کھانا انسان کے لئے ضروری تو ہوا اور پانی بھی ـــ جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس لئے قدرت نے اسے وافر مقدار پیدا کیا ہے ـــ اس پر بھی انسان ان کے خالق کو بھول جاتا ہے ـــ!

پیاس کی شدت میں اب جو اس کے قدم اٹھ رہے تھے وہ پہلے سے تیز تھے ـــ جس سے رہٹ اور اس کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا ـــ کچھ دیر بعد رہٹ کا اجلا پانی اس کے سامنے تھا جو نالی میں سے ہو کر بڑی سرعت کے ساتھ کھیتوں میں جا رہا تھا۔ جہاں اسے مٹی کے ساتھ اختلاط کر کے افزائش کی جلدی تھی۔ جس کے نتیجے میں فصلیں تیار ہوتی ہیں۔ یہ بے شمار گھاس اور کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں جو تعداد میں نسل انسانی سے ذرا بھی کم نہیں ہوتے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا اوک بنایا ـــ اور غٹ غٹ بہت سارا پانی اپنے اندر انڈیل لیا ـــ پینے کے بعد اس کے جسم کے اندر کوئی تراوت آ گئی۔ یہ تراوت نیچے سے اوپر اس کی آنکھوں میں چلی آئی جس سے سامنے کی چیز بھی جو اب سے پہلے دھندلی مری مری سی نظر آ رہی تھیں اب وہ واضح دکھائی دینے لگیں۔ رہٹ کی روں ـــ روں اب بھی

تی — اور بلاوجہ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا — یہ رحمت کی نہیں اس کی اپنی آواز ہے جو اس کے اندر کہیں سے آ رہی ہے — روں — روں . . . . . روں . . . .

یکایک اسے انگنت درختوں کا لامتناہی سلسلہ دور تک نظر آیا جس میں سورج کا کہیں گزر نہیں تھا۔ جب ہی اسے جبڑا کھولے جنگلی جانوروں کا خیال آیا جو صرف اپنے وجود ہی سے اُسے ڈرا رہے تھے۔ لیکن اس جنگل میں وہ بھکشو اور اس کے ساتھی بھی تو رہتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس کے اندر کا خوف اپنے آپ غائب ہو گیا۔ اب وہ جنگل میں اس بھکشو کو تلاش کرنے لگا۔ جب ہی اسے ایک گھنے برگد کے نیچے کچھ بھکشو نظر آئے۔ جن کے درمیان ایک خوبصورت اور صحت مند بھکشو کھڑا تھا — معلوم ہوا جو بھکشو کھڑا ہے۔ وہی آنند ہے، بھکشو اس سے سوال کر رہے تھے — "بندھو! تم تو ہم میں سب سے گیانی اور بہتر ہو — من بہت بیاکل ہے۔ ہمیں وہ دکھا کر شانتی ملے —"

"بندھوؤ! ہم تتھاگت کے بتائے ہوئے راستوں کو بھول گئے ہیں۔ اسی لئے دکھ پا رہے ہیں۔ جنگل کے جانور جو کبھی ہمارے اپدیشوں کو سنا کرتے تھے، اب ہم پر ہنستے ہیں۔ اور چڑاتے ہیں —"

اپدیش جب ختم ہو گیا تو اس آدمی نے ولیشیا کا پیغام اسے سنایا — بھکشو کو اپنا وعدہ یاد آیا۔ ہاں میں ضرور آؤں گا۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔

ولیشیا کا آدمی جب جنگل سے واپس لوٹا تو اس شام کی قتل گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ولیشیا کتنے

شوق سے ماتھے پر بندیا سجائی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کی ساڑی کے ساتھ اس رنگ کا بلاؤز اس کے بدن پر کیا حسین نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے پاؤں میں رچی مہندی اس کے پاؤں کو کیا کچھ نہیں بنا رہی تھی۔ لیکن جب اس نے بھکشو کو نہیں دیکھا تو ان سب پر یکایک کوئی گرد پڑ گئی . . . . . . وہ اب بھی نہیں آیا — کیا وہ وقت آئے گا جب میں ایک دم بوڑھی ہو جاؤں گی اور میرا روپ رنگ ڈھل جائے گا — ؟

انتظار اور غم سے ولیشیا ڈھے رہی تھی۔ اور اسے خود پر کسی دوسرے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ جس سے اس کی رعنائی اور سرخی کا کہیں پتہ نہیں تھا — آنکھیں جو کبھی شگفتہ تھیں، سمٹ کر چھوٹی ہو گئی تھیں — اور ان کے نیچے سیاہ گڑھے نظر آ رہے تھے۔ پھر اسے کئی بیماریوں کے علاوہ سیلان الرحم بھی ہو گیا تھا۔ جو کسی علاج سے جا بھی نہیں رہا تھا۔ شاید اس کا ایک ہی علاج تھا — بھکشو —— جو آ بھی نہیں رہا تھا۔

اب اس کے کھانسنے اور کراہنے کی آوازیں ہر وقت آتی رہتیں — جس سے ہمسایوں کے سکون و آرام میں خلل پڑنے لگا — رامو دھوبی — جس کے گدھوں کی مکروہ آوازیں بلاوجہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی رہتی تھیں، وہ بھی ولیشیا سے بیزار رہنے لگا — اور رام چندر لوہار — جس کے ہتھوڑے کی آوازیں زبردستی لوگوں کے کانوں میں آنے کے لئے مصر رہتی، وہ بھی طبع نازک کا مالک ہو گیا تھا اور اسے ولیشیا کا وجود ناقابل برداشت ہو رہا تھا —— !

بڑھاپا اور بیماری جب ایک ساتھ حملہ آور ہوں تو نحیف و نزار صرف چارپائی پر پڑا رہنے کے کوئی چارہ

نہیں رہ جاتا ہے کہ پھر بول و براز پر بھی انسان کا کوئی بس نہیں چلتا ہے۔ ولیشیا جب بھی بول و براز کو روکنے کی کوشش کرتی، وہ بے قابو ہو جاتے۔ اور سارے بستر کو گیلا اور گندہ کر دیتے جس سے ہر وقت اسے مکھیاں گھیرے رہتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا، جب وہ انہیں اٹھا نہیں سکتی ہے تو وہ کیوں بلا وجہ آجاتی ہیں —؟ اس کے علاوہ اس کے جسم سے تعفن پیدا ہو کر آس پاس کے ماحول میں پھیل جاتا اور محلے والوں کو کسی بدبو کا احساس دلاتا رہتا۔ جو لوگ صرف اس کی بو سے اپنی شہوانی جذبات کی تسکین پا جاتے تھے، وہی اب ناک دبا کر گزر رہے تھے۔ ولیشیا کے جسم سے کسی سڑاند اور تعفن تھا جو محلے والوں کو برداشت نہیں ہو رہا تھا؛ اور وہ جلد از جلد اس سے نجات پانا چاہتے تھے —!

اب محلّے والوں نے ولیشیا پر جو نگاہیں ڈالیں، وہ کسی ہمدردی اور انسانی جذبے سے بالکل عاری تھیں۔ وہ کسی امید میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی — جب ہی لوگوں نے ناک پر کپڑا باندھ کر اس کی چارپائی اٹھالی — اور اسے اپنے کندھوں پر رکھ کر لے جانے لگے — یہ کیسی لاش تھی جس کے لے جانے کا کوئی غم تھا نہ خوشی — اس نے احتجاج بھی کیا — لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں —؟ لیکن لوگوں کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا — یا تھا تو لوگ دینا نہیں چاہتے تھے — لوگوں نے اس کی چارپائی محلہ سے بہت دور لق و دق میدان میں ایک پیڑ کے نیچے رکھ دی — اس کے بعد لوگوں نے اس پر جو نگاہیں ڈالیں وہ آخری تھیں —

سورج سر پر آکر جوان ہو رہا تھا — جس کی تمازت سے چرند و پرند سب اپنے حواس کھو رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے ولیشیا کا حلق خشک رہا تھا — اس نے اپنے آس پاس دیکھا بھی — کوئی نظر نہیں آیا — کبھی لوگ اس کے پاس خود تھے، اور وہ انہیں نظر انداز کر دیتی تھی — لیکن وقت آگیا تھا — جب وہ لوگوں کو چاہ رہی تو لوگ اس سے دور بھاگ رہے تھے —؟

پانی کے بغیر وہ حیات و ممات کے درمیان تھی۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا، اس زندگی سے نجات تو مل رہی ہے جو زندگی بھی نہیں ہے — پر بھی اس کی نگاہیں کسی پانی کی تلاش میں تھیں جو اسے مل بھی نہیں رہا تھا — جب ہی کہیں سے نووارد آگیا — اس نے دیکھا، بوڑھی ولیشیا پیاس لئے تڑپ رہی ہے۔ پاس ہی کنواں تھا جہاں ڈول اور رسی بھی تھی — اس نے ڈول سے پانی نکالا ولیشیا کو سہارا دے کر اسے پانی پلایا — پانی پینے کے بعد بوڑھی ولیشیا کے اندر زندگی کی رمق پیدا ہوئی اور اس کی آنکھوں میں خنکی اور روشنی عود کر آئی اب وہ نووارد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ حواس اس کا ساتھ دینے سے انکار کر رہے تھے جب ہی نووارد نے اپنا تعارف کرایا —

"میں بھکشو آنند ہوں!"

"بھکشو جی! تم — اتنے دنوں بعد —"

"جب وقت آیا ہے تو آیا ہوں۔ وعدہ جو کیا"

"لیکن بھکشو جی۔ اب تو میں کسی قابل نہیں رہی۔ جب وقت تھا تو تم نہیں آئے۔ میں نے بہت انتظار کیا —"

سہیل جامعی
دربھنگہ

بیتا ہوا لمحہ

وقت کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ مگر میری
ـــــ وہ ایک سال کے اندر ہی اپنے پیروں پر
سیکھ گئی ۔ ایک دن میں اسے اپنے ساتھ یونیورسٹی
تو میری ہی ماتحتی میں ریسرچ کرنے والی لڑکی ریشما
س کو میرے سامنے ہی اپنی بانہوں میں بھر کر
لیا اور کہہ اٹھی ۔

" سر! بڑی پیاری بچی ہے
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی
" کیا نام رکھا ہے اس کا آپ نے "
ابھی تک کچھ بھی نہیں
" کیا میں اس پیاری بچی کا نام رکھ سکتی ہوں "
نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا
ایک بار میں جھجک سا گیا ۔ پھر ایک بھرپور
اس پر ڈالی ۔ وہ بالکل گھبرا سی گئی ۔ تب میں نے
ہوئے کہا " میرے ذہن میں تو ابھی تک کوئی
آیا ۔ تم کوئی اچھا سا نام چن دو تو بہتر ہوگا "
پل بھر کے لئے گھبرائی ہوئی وہ لڑکی پھر یکساں ...

ہوئی اور خوش ہو کر بولی ۔ " سر! اس کا نام منیکا
کیسا رہے گا ؟ منیکا جیسی ہی تو صاف اور سلجھی
ہوئی دکھتی ہے "
اس کے منہ سے نکلا ہوا نام مجھے اتنا پسند
آیا کہ میں بے اختیار ہو گیا اور فرط جذبات سے اس
کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چوم لئے ۔ اس کا چہرہ شرم
سے لال ہو گیا ۔

" مجھے تمہارا بتایا ہوا نام بہت پسند آیا ! میں
.... میں کئی دنوں سے ایک اچھے ..... پیارے سے
نام کی تلاش میں تھا آج وہ تلاش پوری ہوئی ریشما "
اب میں اکثر اسے اپنے ساتھ یونیورسٹی لاتا ،
لکچر کے وقت اسے ریشما کے پاس چھوڑ جاتا ۔ ریشما کے
ساتھ منیکا بہت خوش رہتی ۔
ایک دن جب میں لکچر دینے کے لئے جانے لگا
تو ہمیشہ کی طرح منیکا کو ریشما کے پاس چھوڑ آیا ۔
جب کلاس سے لوٹ کر آیا تو چپراسی نے ایک سلپ تھما
دی ۔

"سر! میں آپ کی بچی کو اپنے ساتھ لئے
جا رہی ہوں۔ آپ لوٹتے وقت اسے میرے
گھر سے لے لیجئے گا۔"
آپکی شاگرد ـــ رشیما"
واپسی پر میں جب رشیما کے گھر پہنچا تو دیکھا،
رشیما گھر کے سامنے کے لان میں منیکا کو ٹہلا رہی ہے
اس کے ہاتھوں میں پھولوں کے گچھے تھے اور وہ اپنی
ہی دنیا میں مگن تھی۔ اس کو اس طرح خوش دیکھ
میرے اندر ایک کسک سی پیدا ہو گئی۔
مجھے دیکھتے ہی بول پڑی۔ "آیئے سر! معافی
چاہتی ہوں کہ میں بغیر آپ کی اجازت کے منیکا کو اپنے
ساتھ لے آئی۔"
"نہیں رشیما! میں جانتا ہوں کہ تم میری بچی کو
بہت چاہتی ہو۔"
"صرف بہت چاہتی نہیں بلکہ آپ سے زیادہ
چاہتی ہوں ـــ سر! پلیز بیٹھ جائیے۔ چائے پیئے
بغیر میں آپ کو جانے نہ دوں گی۔ نہ چاہتے ہوئے
بھی میں اس کی بات کو ٹھکرا نہ سکا اور وہیں کرسی
کھینچ کر لان میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ اچانک مجھ سے
مخاطب ہوئی۔
"سر! میں آپ سے ایک بات کئی دنوں سے
کہنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہ کر سکی"
میرے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا اور میرے
سامنے منیکا کا چہرہ گھوم گیا۔ پھر اس کی آواز میرے
کانوں سے ٹکرائی ـــ "سر! میں آپ سے بہت پیار
کرتی ہوں۔ اور میں یقین دلاتی ہوں کہ منیکا کی پرورش
میں کسی طرح کی کوتاہی نہ آنے دوں گی، اسے کبھی اپنی
ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دوں گی۔
اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج
میں نے ایک لمحہ بھی اس کے چہرے کی طرف نہ
اور بہت فیصلہ کن الفاظ میں اس سے کہا "رشی
جہاں تک منیکا کی پرورش کا سوال ہے
اختیارات اپنے سوا کسی دوسرے کو نہیں د
تم نہیں جانتی کہ میں اپنی کلپنا یعنی اپنی بیو
چاہتا تھا؟ اور منیکا کلپنا کی آخری نشانی۔
اپنی بچی کی پرورش کی تمام دشواریاں، میں
میں ہی جھیلنا چاہتا ہوں۔ اب میری بچی ہی م
شکیہ کی ساتھی ہے۔ میں اس کے درمیان
کے پیار کو حائل نہیں ہونے دے سکتا اور جہاں تک
مجھے چاہنے کا سوال ہے۔ میں تمہیں اپنی بیو
میں قبول نہیں کر سکتا ـــ معاف کرنا رشی
لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تمہاری چاہت کو ٹھکر
اپنے اندر بہت بڑا بوجھ محسوس کر رہا ہوں
تمہاری چاہت پر فخر ہے اور دل کا کوئی حصہ
محسوس بھی کر رہا ہے۔ پھر بھی میں مجبور ہوں
یہ کہہ کر میں بغیر چائے پیئے اٹھ کر
اس نے مجھے نہیں روکا، میں نے منیکا کو
اٹھایا اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔ جب میں
کر دیکھا تو وہ اپنے چہرے کو دوپٹہ میں چھ
شاید وہ رو رہی تھی۔

کئی دنوں تک وہ یونیورسٹی نہیں آ
بار دل میں آیا چل کر اس کے حالات معلوم
لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی غیر حاضری کی و

ون - ایسے حالات میں، دل اس کے گھر جانے کو
...

چھٹے دن جب میں لکچر دے کر اپنے چیمبر میں
پہنچا تو دیکھا رشما میری چیئر پر بڑے آرام سے
بیٹھی ہوئی ہے۔ میں سیدھا اس کے پاس پہنچ کر بلا
جھجک اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ اس نے اپنے
سر کو جھکا لیا۔ پھر میں وجہ جانتے ہوئے بھی اس
سے پوچھ بیٹھا۔

" رشما! تم اتنے دن غیر حاضر کیوں رہیں؟"
وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی ــــ
ــــ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس کے ہونٹ ہلے
[illegible] ان پانچ چھ دنوں میں، میں اپنے آپ کو سمجھاتی
رہی - اور جب دل پر پوری طرح قابو پالیا۔ تب آج
آئی ہوں۔ لیکن آپ نے میرے ہاتھوں کو چھو کر پھر
[illegible] میرے وجود کو پگھلا دیا ... سر! میں اپنے
آپ کو کمزور محسوس کرنے لگی ہوں۔"
حوصلے سے کام لو ــــ تم خود سوچو رشما!
تمہارے سامنے زندگی کا ایک پورا باب پڑا ہوا ہے۔
میری زندگی میں تمہیں آکر آخر کیا ملے گا۔ میں اپنی پرانی
زندگی بھول نہ پاؤں گا - آج جذبات میں تم فیصلہ
کر رہی ہو - کل میری ویران آنکھیں، ویران دل، ویران
[illegible] جب تمہارے جذبات کا خیال نہ رکھ پائیں گی تو
شاید میں اس وقت اپنے آپ کو دوشی محسوس نہیں
کروں گا۔

تم ذرا جذبات سے ہٹ کر سوچو گی تو خود
ہی اپنے فیصلہ پر شرمندہ ہو جاؤں گی، پھر ہمارے
رشتے اچھے دوستوں کی طرح تو ہو ہی سکتے ہیں۔

پھر رشما نے سچائی کو محسوس کرتے ہوئے،
ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔

اب وہ اکثر میرے بنگلے پر آجاتی۔ گھنٹوں
وہ منیکا کے ساتھ کھیلتی رہتی ــــ ایک دن جب
لنچ پر میں اپنے بنگلے پر تھا تبھی کال بیل بجی اور میں نے
سامنے رشما کو پایا۔ وہ بہت خوش تھی۔
" سر! میں آج بہت خوش ہوں"
" پوچھ سکتا ہوں۔ کیوں؟"
" کیونکہ کل میری انگیجمنٹ ہوگئی - اگلے مہینے میری
شادی ہونے والی ہے - میری شادی بمبئی کے ایک بڑے
بزنس مین سے طے پائی ہے ــــ اور شادی بھی وہیں سے
ہوگی ــــ لیکن سر! مجھے دکھ بھی ہے" یہ کہہ کر اس
نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور دوسری طرف
چہرہ گھما کر اداس ہو پڑی۔
" پگلی! میں بھی تو دکھ اور اداسی کی وجہ جانوں؟"
" میں آپ سے سدا کے لئے دور ہو جاؤں گی۔"
" بس اتنی سی بات ہے؟ ــــ یہ تو طے اسی دن
ہوگیا تھا جب میں نے تم سے شادی کرنے سے انکار
کر دیا تھا ــــ نادان لڑکی، حالات کا مقابلہ کرنا
سیکھو، اپنی زندگی آپ جیئو - بے وقوفوں کی طرح
اس کے لئے آنسو مت بہاؤ جو حاصل نہیں ہو سکتا۔
رشما۔ صرف کسی کی بیوی بننا ہی زندگی کا مقصد نہیں۔
پھر تمہارے سامنے پورا سنہرا مستقبل پڑا ہے جو
تمہیں پکار رہا ہے پھر تم میری بیوی بن کر کیا پاؤ گی
ہر طرف نراشی اور باہری بدنامی، ہمت سے کام
لو اور زندگی سے سمجھوتہ کرنا سیکھو۔"

"سر! میں اپنی شادی میں آپ کو بلا نہیں پاؤں گی، جانتے ہیں کیوں؟"

میں نے جانتے ہوئے بھی جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

"کیونکہ اس موقع پر آپ کو دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں گی" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔

"پگلی!" میں نے اس کے گالوں کو تھپتھپا دیا۔۔

تب وہ بلا جھجھک مجھ سے لپٹ گئی۔ اور میرے چہرے پر اپنے بوسوں کی بوچھار لگا دی ـــ "سر کتنا اچھا لگتا ہے، اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دینا ـــ تہذیب، اخلاق اور دنیا کے ریت و رواج کو پیچھے چھوڑ اپنے جذبات کی زد میں بہہ جانا۔ کتنا اچھا لمحہ ہے جب میں آپ کی باہوں میں ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ کل آپ سے بہت دور چلی جاؤں گی۔ کسی اور کی زندگی میں داخل ہو جاؤں گی۔ تب میں شاید آپ سے ملنے سے بھی کترا‌ؤں ـــ اس بے رحم سماج میں ہمارے رشتوں کا انجام کتنا بھیانک ہے۔"

"ہاں! جہاں تک میرے اور تمہارے رشتوں کا سوال ہے۔ ممکن ہے کہ تم مجھے بے انتہا چاہتی رہی ہو لیکن میں نے تو اتنا ہی چاہا کہ میں تمہارے ہونٹ چومنے سے نہ جھجکوں۔ تمہیں اپنی باہوں میں کستے وقت اپنے آپ کو گنہگار نہ محسوس کروں۔"

"پھر بھی سر! لگتا ہے دل پر ایک بوجھ سا لئے جا رہی ہوں، میں نے آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے سر!"

"میں نے بھی ریشما! کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہے۔ لیکن میرا پیار، میری بچی کا مستقبل تمہارا رشتہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اسے جتنا سمجھ کر جیا جائے تو بہتر ہے ورنہ ادھر تم ر[illegible] اور ادھر میں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کر[illegible] ریشما ان کی باہوں کو میری باہیں سم[illegible] کے جسم پر میرے جسم کا گمان کرنا۔[illegible] ایک راہ ہے تمہارے اچھے مستقبل کی۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ[illegible] بس جاتے وقت میں نے اس کی دونوں آنکھی[illegible] چوم کر اپنی نظروں سے وداع کیا ـــ ریش[illegible] تھی۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے[illegible] وجود میں سما گئی ہو ـــ شاید وہ مجھ سے میرے بالکل قریب آ گئی ہو۔ میں بوجھل قدم[illegible] واپس ہوتے ہوئے سوچ رہا ہوں ـــ جی[illegible] دوسری لو جو اچانک روشن ہو گئی ہے ـــ بجھ سکے گی؟ لگتا ہے اب ہم ساری عمر صرف[illegible] کو تلاش کریں گے۔

ـــ بقیہ: ناگ پھنی کا جنگل ـــ

اصل وقت تو یہی ہے جب تم بوڑھی ہو گئی ہو ـــ اور لوگ تم سے نفرت کر رہے ہیں جب جوان اور خوبصورت ہوتی ہے تو سب ا[illegible] کے بھوکے ہوتے ہیں ـــ لیکن جب وہ بوڑھی اور بیم[illegible] ہے تو اس کا جسم ناگ پھنی کا جنگل ہو جاتا ہے۔

بوڑھی ولیشا نے اپنے گزرے ہوئے دلنو[illegible] جب بھی کسی ناگہانی سیلاب سے اس کی آنکھوں[illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

نام کتاب :- **ایک اور نیا پل**
جدید اردو، تلگو ادب میں پہلا دولسانی شعری مجموعہ
مدیر :- ڈاکٹر امتنگی وینو گوپال
معاون مدیر ـــ تلگو، وینو سنکو جو
" " " ڈاکٹر پی لکشمی ناراینا
" " ـــ اردو، علی اصغر
" " ـــ بشارت علی
صفحات :- ۲۰۴ قیمت :- چالیس روپے
پہلی اشاعت :- ۱۹۹۳ء تعداد، دو ہزار

یہ کتاب تلگو یونیورسٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ ایک اور نیا پل۔ دولسانی شعری مجموعہ ہے جو بہت ہی اعلیٰ اور معیاری کہلانے کا مستحق ہے۔ کسی بھی زبان کی تخلیق کو ترجمہ کے ذریعہ قارئین تک پہنچانا بہت ہی مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام بڑے ہی جگر سوزی کے ساتھ ڈاکٹر امتنگی وینو گوپال نے انجام دیا ہے اور معاون مدیر کی حیثیت سے تلگو زبان کے شاعر جناب وینو سنکو جو۔ ڈاکٹر پی لکشمی نارائنا اور اردو میں معاون مدیر کا ذمہ جناب علی اصغر اور بشارت علی نے اٹھایا۔ اور پوری ادبی و صحافتی ایمانداری کے ساتھ اپنی علمی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اس کام کو بخوبی نبھایا ہے۔
دو کنارے ایک دھارا، کے تحت اداریہ میں بڑی اچھی اور سچی باتیں کہی گئیں ہیں اور اس کتاب کی ضرورت کیوں پڑی اس کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے۔ اس مجموعہ کے پس پشت تین مقاصد کار فرما ہیں۔

(۱) قومی یکجہتی اور سیکولر جذبات کو فروغ دینا
(۲) شہر حیدرآباد کے چار سو سالہ اندھیرے اجالے کی عکاسی کرنا۔
(۳) اردو قارئین کو دور حاضر کی تلگو شاعری اور تلگو قارئین کو اردو شاعری سے متعارف کرانا ـــ

ایک اور نیا پل، جس کو تلگو زبان میں (مرد کو تاوتمنا) کہا جاتا ہے۔ اردو اور تلگو ادب کی تاریخ میں جہاں تک مجھے علم ہے کہ یہ پہلا دولسانی شعری مجموعہ ہے

دیباچہ جناب نریندر لوتھر نے لکھا ہے اور
خوب لکھا ہے۔ جناب نریندر لوتھر کا نام ادبی دنیا
میں محتاج تعارف نہیں۔

اپنے دیباچہ میں لوتھر صاحب رقم طراز ہیں
کہ جب کسی شہر میں عام انسانی وجود خطرے میں
پڑ جائے تو شہر کی موت کے آثار نظر آنے لگتے
ہیں، شہر گویا ہماری ماں ہے۔ وہ ماں جو ہمیں جنم
دیتی ہے ہمیں پالتی پوستی ہے اور ہمیں ہی دیکھ
دیکھ کے زندہ رہتی ہے ـــ

شہر حیدرآباد دریائے موسی کے کنارے
آباد ہے قلعہ سے شہر تک جانے کے لئے موسی پر
ایک پل بنایا گیا جو آج بھی موجود ہے اور جسے پرانا
پل کہا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق اسی پل نے ہی
بانی شہر محمد قلی اور بھاگ متی کے دلوں کو ملانے
کا کام کیا۔ بعد میں اس پر چار اور پل بنائے گئے
آخری پل کا نام "نیا پل" ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے
کہ شاید پل اپنا منصب، اپنا کام بھول گئے۔ ان
پانچ پلوں کے ہوتے ہوئے بھی اس شہر میں بیسویں صدی
کے آخری دہوں میں فسادات ہوئے۔ [illegible]
ہوا اور فرقہ پرستی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ [illegible]
میں حیدرآباد کا وہ تمدن جو برسوں سے سارے
ملک میں ضرب المثل بنا ہوا تھا اس کا شکار ہوا
اور اس سے [illegible] شہری کا دل دہل گیا۔ فن کار جو حساس
ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی ملک کا ہو۔ کسی بھی زبان
کا ہو۔ فن کار جو سارے جہاں کا درد اپنے دل میں
رکھتا ہے اس المیہ کو وہاں کے فن کاروں نے خاص
طور سے محسوس کیا۔ جیسے مترا، دوستی زندہ یاد

کے فن کاروں نے جو خود بھی تلگو زبان کے ا[illegible]
شاعر ہیں نے یہ محسوس کیا کہ شاید ایک نیا پل
تو ہو سکتا ہے کہ اس عصبیت میں کچھ کمی ـ
پل سمنٹ اور پتھر کا نہیں بلکہ احساسات
پل ہو جو دریا کو نہیں بانٹتا، یہ پل دو ذہنو
ملانے کے لئے ہے۔ یہ پل دو زبانوں، دو
دو فرقوں کی خلیج کو پاٹتا ہے۔ یہ ان زبا[نوں]
بولنے والے اور ان زبانوں میں گانے وا[لے]
دلوں کو پاس لانے کی ایک عمدہ کوشش
ایک اور نیا پل میں محمد قلی قطب شاہ سے لے
کے ہم عصر شعراء کا منتخب کلام موجود ہے۔
لسانی شعری مجموعہ میں ہر قسم کے موڈ، مزاج
موسم کی جھلک ملتی ہے ـــ ۔ چار مینار
مادہ تاریخ سے "یا حافظ" نکلتا ہے۔ آد
سے سر جھکائے کھڑا ہے۔ اور شہر ایک سد
قبرستان بن گیا ہے۔ فن کار کے آگے مو[ت]
پشت پر خنجر ہے۔ اب یہاں مذہب
آدمی نہیں۔ اب یہاں آسمانوں سے بارش
ہوتی بلکہ لہو برستا ہے۔ یہ بات صرف حی[درآباد]
پر ہی موقوف نہیں بلکہ ہندستان کے ہر
قصبہ کی یہی روداد ہے اور یہ سب سے بڑ[ا المیہ]
ہے ـــ اداریہ اور دیباچہ کے بعد محمد [قلی قطب]
شاہ کی ایک مناجات دیا گیا ہے۔ اور اس[کا]
تلگو زبان میں اور تلگو نظموں کا ترجمہ ار[دو]
میں ہر دوسرے صفحہ پر موجود ہے ـــ تلگو
ایک نظم "ہمارا گاؤں بہتر ہے" جو
بڑے ہی خوبصورت انداز میں جناب علی ا[حمد]

ہے اور جس کے خالق سری شیلم ڈونیکنا ہیں ۔
قارئین کی خدمت میں یہ نظم پیش کر رہا ہوں۔ دیکھیں اور
بغور مطالعہ کریں اور محظوظ ہوں ۔

" ہمارا گاؤں بہتر ہے ۔"

تمہارے شہر سے ہمارا گاؤں بہتر ہے
یہاں !
نہ کرفیو ، نہ خوف و ہراس
نہ دیکھتے ہی گولی مار دینے والے وحشی
سلام حضور کے جواب میں)
جینے رہنے کی اجازت تو دیتے یہاں کے
بڑے لوگ
شیر خواروں ضعیفوں،
حاملہ عورتوں اور نئی ماؤں کو
اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والے درندے
یہاں نہیں بستے
چاہے کوئی شخص ہو، کسی بھی مذہب کا ہو
یہاں ہر جنازے کو کاندھا دیا جاتا ہے
پیار بھرے دل سے دلاسا دے کر
خود تسلی پانے والا
یہ میرا گاؤں ہی بہتر ہے
میرے مہذب دوست
پیڑھیاں گذر گئیں
پتہ نہیں کاتب تقدیر کون ہے
انیشور یا انسان ؟ !

اس طرح اردو کے شاعر مصحف اقبال توصیفی اور جناب علی اصغر کی نظمیں بھی قارئین کو متاثر کرتی ہیں۔

اس طرح کی اور بھی بہت سی خوبصورت نظمیں اس کتاب میں موجود ہیں جو یقیناً دلوں کو پاٹنے کی ایک بہترین کوشش ہے ۔ اور ڈاکٹر امشنگی وینو گوپال اور معاون مدیران مبارک باد کے مستحق ہیں ساتھ ہی تلگو یونیورسٹی بھی جس کے مالی تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آئی ۔

سرورق جاذب نظر ہے ۔ کاغذ عمدہ اور نفیس طباعت و کتابت صاف اور اغلاط سے پاک ہے ۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ اردو اور تلگو قارئین میں یہ کتاب بڑے ہی جوش و خروش اور شوق سے پڑھا جائے گا ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب دونوں قارئین کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے اور اس کی قدر بہرحال ہونی چاہئے ۔

● ——— فردوس گیاوی، گیا

تخلیق ، اکتساب نظر (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
خالق :- ظہیر احمد باقوی راہی فدائی
قیمت :- چالیس روپے
تقسیم کار :- کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار دہلی ۶

" اکتساب نظر " جناب فدائی کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ثمرہ شیریں ہے، جو تحقیق کی عالمانہ سوجھ بوجھ، بحر علمی، فکری گیرائی و گہرائی، جستجو کی عرق ریزی اور اس سے ان کا دلی لگاؤ اور قوت فیصلہ کا مظہر ہے۔ راہی جو بنیادی طور پر ایک کہنہ مشق شاعر ہیں میدان تحقیق و تنقید میں اس فن کے صف اول کے شہسواروں میں اپنا نمایاں ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ راہی کو یہ انفرادیت ان کی محققانہ

کا دشواں اور تحقیق کے بحر بیکراں میں دشوار کن
غوطہ خوری کی ہمت کے سبب ہی ملی ہے۔ "اکتساب
نظر" کے مضامین اس بات کی شاہد ہیں کہ انہوں نے
اپنی جستجو اور تحقیق کے مراحل میں خون سوزی سے
کام لیا ہے اور زبردست جانفشانی اور عرق ریزی
کی ہے۔ گرچہ اس امر سے بھی انکار نہیں کہ قلم ناقد
کے پوسٹ مارٹم اچھے اچھوں کے تحقیقی اور ناقدانہ
مضامین کا اس طرح بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں
کہ یہ اک نقرودہ شہ پارہ بیکار محض نظر آنے لگتا
ہے تو پھر انہیں اس سے کہاں تک بچ سکیں گے۔

"اکتساب نظر" میں نو مضامین ہیں۔ جن
میں اول پانچ مضامین ولی ویلوری، مثنوی یوسف
زلیخا، در مدح ٹیپو سلطان، وشارم میں اردو
اور جنگ آزادی اور علمائے جنوب خالص تحقیقاتی
مضامین ہیں۔ ان مضامین میں فدائی نے مواد کے
سلسلے میں تو بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا
ہے مگر آغاز مضمون کا اظہار بیان گراں بر گوش ہے اور کوئی خاص
تاثر قاری پر نہیں چھوڑتا۔ تحقیقی مضامین کے اپنے انداز اظہار بیان
اور الفاظ ہوتے ہیں۔ میں اس پر توجہ کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ہر
مضمون کے آخر میں اس کا ماخذ دے کر صاحب
مضمون نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ بے پر کی نہیں اڑاتے۔
"جنگ آزادی اور علمائے جنوب" میں جہاں ایک
طرف بہت سی کار آمد باتیں کہتے ہوئے راز ہائے
سربستہ اور اس سلسلے میں [illegible] ہوئے محقق
کے پرواز قلم سے ہیرے رہے ہیں۔ گرچہ مضمون کے
بعض حصے سے قاری کے اختلاف کی گنجائش
ہے۔ بقیہ تحقیقی مضامین جامع ہیں۔ "مضمون" خطوط
نگاری" فنی نوعیت کا ہے۔ "اکتساب نظر"
کے آخری تین مضامین شہنشاہ تشبیہات ساغر
حیدری۔ علیم صبا نویدی کی نعت گوئی اور اختر خامہ
علیم صبا نویدی تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں۔ ان
مضامین میں بڑے کام کی بات کہی گئی ہے۔ یہ مضامین
ہر طرح قابل مطالعہ ہیں۔ ادب کے ہر باذوق قاری
کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ مشمولہ تمام مضامین سے
حقائق کے بہت سے پردے اٹھتے اور گوشے وا ہوتے
ہیں۔ جو محققین وناقدین ادب کے میدان کار کے لئے
بڑے سودمند ہیں۔ ادب اور تحقیق جدید اس قابل
قدر اثر کے لئے مصنف کا ممنون ہے۔ باوجود اس
کے کہ مرصع اور مرجع عبارت سادگی سے کام لیا
گیا ہے تحریر میں شگفتگی سلاست اور روانی ہے۔
کتاب کی طباعت قابل قبول ہے۔ سرورق جاذب
نظر ہے۔ آخری صفحے پر علیم صبا نویدی کا راہی
کے متعلق تاثراتی حصہ اہم اور حقائق پر مبنی ہے۔
محمد علی اثر اور ڈاکٹر غیاث اقبال کا تعارفی نوٹ
بھی باوزن اور اہمیت کا حامل ہے اور ان سے مشمولہ
مضامین کے نفس مضمون وماحصل کو سمجھنے میں آسانی
ہوتی ہے۔ کتاب کی قیمت مناسب ہے۔

ادب وفن اور تحقیق وتنقید سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لئے اس کا مطالعہ سودمند ہوگا۔

— ڈاکٹر ابوالفیض سیدا بادی

پرنٹر پبلشر ریحانہ منظر نے لیبل آرٹ
پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل
ریورسائڈ روڈ گیا سے شائع کیا

شہرِ خیال

سہیل نے ادبی دنیا میں اپنا ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی لگن، محنت، محبت اور ایثار کا نتیجہ ہے میری جھولی میں تو ندامت کے ہیں کہ بہت دنوں سے پرچے کی کوئی خدمت نہیں کر سکی۔

ذہن کے جالے اور قلم کا زنگ صاف ہو سب کے آگے سرخ و رو ہوں۔ آج ش تو بے جا خلوص اور بے وجہ ہمدردی کے نتیجے میں سارا وقت پدیا ترا کرنے اور فون گھمانے میں گزر جاتا ہے۔ مگر نتیجہ صفر — کہ دل دریا اور جیب تنگ اور اقتدار کے نام پہ ٹوٹا پھوٹا ڈھائی تین پاؤں کا اسٹول بھی نہیں۔ خیر۔

نئے شمارے میں جناب تارا چرن رستوگی کے مضمون "رباعیات سرمد"، ناخر جلالی پوری کی نظم "سیہ بر سفید" اور بلڈی ٹلک کی کہانی "جو سچ تھا" نے بہت متاثر کیا۔

اور وہاب اشرفی صاحب کے خط نے۔ ان کے اعلان نامے نے ہم جیسے "کم علموں" کی معلومات میں بہت اضافہ کیا۔ انہیں ہم سب کی طرف سے بہت بہت مودبانہ مبارک باد دیجئے گا۔ ایک بات اور — سہیل ادبی پرچہ ہے۔ ہر قسم کے اشتہارات اس میں شائع نہ ہوں تو بہتر ہے۔ معیار کی خاطر مال کا نقصان تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

شفیقہ فرحت، بھوپال

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔

آپ نے میرا طویل خط بطور مضمون شائع کر دیا۔ اس کے لئے تہہ دل سے شکریہ! کچھ خطوط بہار اور دلی سے آئے ہیں جن میں اس مضمون کو پسند کرنے کی اطلاع ہے۔ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ مبتدی شاعر کو تنقیدی شعور یا اسی قسم کا کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ سہیل ہندوستان کے ان ادبی رسائل میں ہے جو پابندی کے ساتھ برسوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ادبی و سیاسی کردار بڑے کام کی چیز ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر کتابت کی غلطیوں سے اس کو پاک کرنے کی آپ لوگ کوشش کرتے۔ طباعت کے معاملے میں اب پہلے جیسا معاملہ نہیں رہا۔ لہٰذا اس کی طرف سے دیگر قارئین یقیناً اسی طرح مطمئن ہوں گے جس طرح خاکہ

ہے ـــ بہرحال میں بہت عجلت میں خط لکھ رہا ہوں۔ چند ضروری جملے لکھ کر فی الحال میں رخصت ہونے کی اجازت چاہوں گا۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کا مضمون اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ مثنیٰ صاحب نے نہیں معلوم کیوں کم بہت ہی کم لکھا ہے عطا محمد شعلہ (مرحوم) دل میں سما گئے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ کے جادو نگار قلم نے پرویز شاہدی کی مشہور نظم "اے قلم پھول کھلا" کے مصداق واقعی پھول کھلا ڈالا۔ ان کو میری طرف سے مبارکباد!

ـــــ میں نے غلطی سے لکھ دیا کہ دیلیلی اسٹریٹ میں واقع موجودہ ڈائمنڈ ہوٹل کا نام پہلے پنجاب مسلم ہوٹل تھا۔ میرے بھیا (احسان دربھنگوی) نے کہا کہ پنجاب مسلم ہوٹل نہیں بلکہ کشمیر ہوٹل نام تھا۔ یہ ایک ضروری تصحیح ہے۔ امید ہے کہ آپ اس خط کو چھاپ کر میری غلطی کا ازالہ کر دیں گے۔ میں انسان ہوں اور غلطی کرنا ہر انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ غلطی کوئی بھی کر سکتا ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ البتہ اس کا اعتراف اور اس کی تصحیح نہیں کرنا جرم ہے۔ اسٹالن نے لکھا ہے اگر تم غلطی کرتے ہو تو اس کا اعتراف کرلو۔ اور کوشش کرو کہ دوبارہ غلطی نہ کرو۔

"شاعر" بمبئی مسلسل شائع ہو رہا ہے اس نے ایک شاندار ادبی تاریخ قائم کی ہے "سہیل" کی بھی ایک ادبی تاریخ ہے "شاعر بمبئی" "عصری ادب" "مسہیل" وغیرہ کی آبیاری خون جگر سے کی گئی ہے۔ اس خون جگر کی قیمت کون دے گا۔ حکومت وقت دینے سے رہی۔ پیسے والوں کو اردو زبان و ادب سے ہمدردی نہیں ہے۔ حکمراں طبقہ سے وابستہ سیاستداں مجرم ضمیر والے ہیں۔ ان کو اور او اور کی وہ انسانیت سوز ہوس ہے کہ خدا کی ان میں سے کوئی کیرالا کا کمیونسٹ چیف منسٹر نمبودری پا جیسا نہیں ہے۔ عطا محمد شعلہ (مرحوم) نے بالکل درست کہا تھا کہ ہمارے وزیر اعظموں اور وز اعلیٰ میں سے کسی نے سائکل پر سوار ہو کر اسمبلی کارروائیوں میں شرکت نہیں کی۔ میں ماضی کی مثا اس لئے نہیں دوں گا کہ ان کی سادہ طرز زندگی بیانات سے اسلامی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ا کے علاوہ وہ ہستیاں بہت پاک اور مبارک ہستیاں تھیں۔ مجھ جیسا ہیچ اور کم مایہ آدمی متبرک ہستیوں پر قلم اٹھانے کا خود کو اہل نہ سمجھتا۔ پھر بھی اتنا لکھے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ان کارنامے واقعی عظیم تھے اور وہ غریبوں کے خود کو وقف کئے ہوئے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ سادگی اور اس سادگی میں جلال و جبروت اُف کیا چیز تھی وہ سادگی اور کیا چیز تھی وہ درویشی جو نے غریبوں کے دل موہ لئے تھے۔ سیدنا حضرت فاروقؓ نے جن سے انسپریشن حاصل کیا تھا ا اللہ وہ کیا تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت بی بی حب ملنے آئیں تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے او مادر مہربان آپ تشریف رکھئے۔ اور اپنی اکا چادر مبارک بچھائی تاکہ تاریخ کی اس عظ کی دلجوئی کریں جس کی گود میں ان کا بچپن گ بہرحال میں حکمراں طبقہ کی بات کر رہا تھا جب

ہی کسی دور میں لوح و قلم اور ادبی رسائل کی خون
سے پرورش کرنے والوں کی طرف بھول
ی نگاہ قصداً نہیں ڈالی اس لئے کہ خون
پلانے والے ہمیشہ حکمراں طبقہ کی ظالمانہ
حکومت کے خلاف رہے۔ ان کا تیور خوشامدانہ
نہ باغیانہ رہا اور باغیوں کی سزا یا تو کال
ٹھری ہے یا پھانسی کا تختہ۔ مگر کال کوٹھری
پھانسی کے تختے پر چڑھنے والوں ہی نے خدا
س خوبصورت دنیا کو اپنے خون سے سینچا
سنوارا ہے۔ حکمراں طبقہ لٹیرا طبقہ ہے۔ اس
ہمیشہ خدا کے معصوم اور سادہ لوح بندوں کو لوٹا
دنیا کے لہلہاتے گلستاں کو اجاڑا ہے۔ مگر
کے ننگے اور کمزور عوام نے بھی ان کو ہمیشہ
رتناک سزائیں دی ہیں۔

——— اویس احمد دوراں، دربھنگہ

سہیل کا تازہ شمارہ ملا
محترم تاراچرن رستوگی صاحب کا مضمون
اعیات سرمد اور منظوم ترجمہ بہت محنت سے
کیا ہے۔ نہ جانے کتنے فقیر، سادھو، سنت
رکھے اولیاء اللہ قومی یکجہتی کے نام پر اسلام کو
نقصان پہنچاتے رہے۔ اگر دارا شکوہ بھی بادشاہ
جاتا تو ہندوستان میں اسلام کو زبردست
نقصان پہنچتا۔ اکبر نے کافی نقصان پہنچایا تھا۔
مجذوب اور پاگل کو ولی اللہ سمجھنے والا مسلمان۔
خدا اس پر رحم کھائے ——— سرمد جیسے گمراہ کو
شہید سمجھنے والا مسلمان کتنا سادہ لوح ہوتا
ہے۔

یک قبلہ گزیں سجدہ سر غیر ممکن / گویا
شیطان اور شیطانیت کی حمایت پھر شہدا ر
رحمت اللہ ——— ماشاء اللہ ——— ایسی
باتوں کی ہمت افزائی نہیں ہونی چاہئے۔

——— روف خیر، حیدرآباد

ماہنامہ سہیل کا شمارہ ۳ جلد ۵ زیر مطالعہ
رہا۔ بموضوع بعنوان "عصری ادب: کیوں اور کیا"
ادب کے جدید تقاضوں پر مختصر مگر تاثر اداریہ پسند
آیا۔ محترم تاراچرن رستوگی کا مضمون بصیرت افروز
ہے۔ فاخر جلال پوری کی نظم حقیقت کی عکاسی
کرتی ہے اور کہانی "جو سچ تھا" اچھے انداز
میں پیش کی گئی ہے۔ شہر خیال میں محترم
وہاب اشرفی کے مراسلہ نے تحریر کی تحریک پیدا
کی۔ موصوف کی ادبی حیثیت کسی تعارف کی
محتاج نہیں۔ ایک لمبے عرصے سے وہ اردو ادب
کی آبیاری کرتے آرہے ہیں۔ ابتدا میں "ماہنامہ صنم"
سے ان کی ادبی شخصیت کو جلا ملی تھی۔ جبکہ اسی
زمانہ میں وہ کسی اعلیٰ منصب پر معمور نہیں ہو سکے
تھے۔ اور لائف انشورنس کارپوریشن کی ملازمت
کر رہے تھے۔ مگدھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو
سے وابستہ ہونے پر انہیں اعلیٰ منصبی حیثیت ملی
"مورچہ و آہنگ" کے صفحات نے انہیں ملک گیر
شہرت حاصل کرنے میں بھرپور تعاون کیا اور ان کی
ادبی صلاحیت کو منوایا جن میں محمود ہاشمی سے
ان کے معرکہ کی، ہم جو میکا ... تھی۔ محترم کی تحریر سے
پتہ چلتا ہے کہ وہ پروفیسری کے منصب سے پوری
طرح مطمئن نہیں تھے اور نام نہاد اقتدار کے خواہاں

تھے۔ چونکہ وہ اس عہدہ کے ذریعہ کسی تقرری کا حق نہیں رکھتے تھے اسی لئے اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے قلم کی سیاست کو شعار بنایا۔ مذکورہ تحریر کے ذریعہ وہ قاری پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ چیرمین کے اختیارات کتنے وسیع ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قاری چیرمین کے اختیارات سے نا آشنا ہیں اور جناب اشرفی لوگوں کو اپنے دائرہ کار سے باخبر کرانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس عہدہ پر پہلے اردو داں اور مسلمان کی حیثیت سے متمکن ہونے کے فخر کو بھی جتانا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹی پروفیسر کا عہدہ چیرمین کے عارضی اقتدار سے کہیں بلند و بالا ہے تعجب اور افسوس ہے کہ جناب وہاب اشرفی کے نوک قلم سے اس طرح کے سطحی جملے جس میں خودنمائی و خودستائی کا جذبہ کارفرما ہے کس طرح تحریری شکل اختیار کر سکے، موصوف کے لئے زیب نہیں دیتا۔

میں جناب وہاب اشرفی کی ادبی و علمی صلاحیتوں کا قائل و قدر داں رہا ہوں۔ عہدے کی حصولیابی کا انہوں نے جو بھی طریقہ مناسب سمجھا اپنایا لیکن ذاتی فائدے سے ساری مسلم اور اردو آبادی کو متاثر کرنا غیر ادبی طریقہ نظر آتا ہے۔

——— فیاض حالی، گیا

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔

اس بار (نومبر) آپ کا یہ جملہ کہ جدیدیت کا نام لے کر ادب میں جو گھس پیٹھا جماعت داخل ہو گئی تھی بالآخر ہم نے اسے مار بھگایا ہے، خوب ہے۔

——— سید احمد سحر، شاہجہانپور

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

سہیل کا شمارہ ۱۰ جلد ۲۲ دستیاب ہوکر مطالعہ سے گزرا۔ گیان چند صاحب کا اردو زبان کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دین معلومات کا ذخیرہ پیش کرتا ہے۔ فضا ابن فیضی صاحب کی غزل پسند آئی ہر شعر گہرے مطالعہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایلاف خیری کی تحریر "نوجوان قلم کاروں سے" اچھی لگی۔ ہر قلم کار کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے اور جن نصیحتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر عمل کرنا چاہئے۔ نذیر فتح پوری کی ماہیا نظمیں پسند آئیں۔ فیروز نظامی، متین نیاز، راز اٹاوی، نشتر اکبرآبادی کی شعری تخلیقات قابل ذکر ہیں۔ شہاب دائروی کا افسانہ "خاموش نگاہیں" دلچسپ کا سامان ہے۔ پیش نظر شمارے کے صفحہ ۳۲ پر جناب کلام حیدری کے متعلق خصوصی شمارہ شائع کرنے کا اعلان ہے اس سے قبل بھی آپ نے سہیل کے کئی خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔ آپ کی حوصلہ مندی پر میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ سہیل کے پچھلے شمارے جو خصوصی شمارے کی صورت میں منظر عام پر آئے وہ جتنے شاندار رہے کلام حیدری نمبر بھی اتنا ہی ضخیم اور وقیع شائع ہو کر آپ کی قدر اور شخصیت کے تئیں نذرانۂ عقیدت پیش کرے گا۔ "شہر خیال" کے تحت بزرگ و اعلیٰ مرتبت جناب تارا چرن رستوگی صاحب کا مکتوب بہت ہی معلوماتی ہے۔

——— مدہوش بلگرامی، ہردوئی

○ سہیل پابندی سے مل رہا ہے جس کے لئے ممنون ہوں۔ میں ان دنوں کچھ اپنی صحت اور کچھ اپنی بینائی کی کمزوری سے ایسا مجبور ہو رہا ہوں کہ لکھنا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے۔ شاید اگلے ماہ آپریشن سے اس قابل ہو جاؤں کہ آپ کی فرمائش پوری کر سکوں۔ دعا فرمائیں۔

——— سید شہاب الدین دسنوی

○ سہیل مل گیا۔
سہیل کے کاتب صاحب سید عبدالاحد صاحب چونکہ سید ہیں اور میں صوفیاء کرام کا خادم، سیدوں کا احترام کرنے والا۔ لہٰذا کچھ مودبانہ ہی گذارش کر سکتا ہوں۔ محترم نے میری رباعیوں کے ۱۴ مصرع غلط دیے ہیں۔ اگرچہ آئندہ میرے معاملے میں موصوف محترم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں ان غلط مصرعوں کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ اب اس فہرست کو سہیل کے آئندہ شمارے میں چھاپ دیجئے گا۔ سہیل کا ٹائٹل اس کے اندرونی وقار کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ہی خود اس کی آراستگی پر غور کر لیں۔

——— فیروز نظامی، لکھنؤ

○ سہیل کا تازہ شمارہ نمبر ۶ بصارت نواز ہوا۔ میری غزل کی کتابت میں تین جگہ غلطیاں ہوئیں۔ قارئین باذوق نے درست کر کے پڑھا ہوگا۔ شکر کا مقام ہے کہ اب آپ پابندی سے سہیل نکال رہے ہیں۔ اور ہمت و حوصلہ کے ساتھ غور طلب اداریہ سپرد قلم کر رہے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اس شمارے میں ذوماجی کا افسانہ پسند آیا۔ میرے دوست اور عزیز مظہر امام کا مقالہ غالباً مکمل نہیں چھپ سکا ہے۔ کیا اس میں بھی کاتب کی تراش کو دخل ہے۔ اس مقالہ کو مکمل شائع ہونا چاہئے تھا۔ براہ کرم کتابت کے بعد مستعدی سے پروف ریڈنگ کر لیا کیجیے یا کسی ذمہ دار دوست سے کرا لیا کریں۔

——— ڈاکٹر ظفر حمیدی، مظفرپور

○ تازہ شمارہ سہیل نظر نواز ہوا۔ شکریہ
جدید شعر و ادب سے فن کاروں کی وابستگی عصری مسائل پر ان کی فکری مرکوزیت نیز معنویت کی بازیافت کے تعلق سے آپ نے سہیل میں جو اداریہ سپرد قلم کیا ہے وہ اختصار کے باوجود بے حد جامع اور خاصہ کی چیز ہے۔ اجتماعی مسائل سے اہل فن کی قربت کا جو احساس آپ نے کیا ہے وہ بالکل درست ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی ادب اپنے عصر کی طاقتور آواز نہیں بن سکتا۔
البتہ اس بات سے مجھے تھوڑا اختلاف ہے کہ آپ نے جدید شعر و ادب کو نئے تجربات سے مالا مال کرنے اور پرانے سانچوں کو توڑنے والے فنکاروں کو گھس بیٹھیا کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ادب میں کسی بھی تبدیلی کے عبوری دور پر نظر ڈالیں تو انتہا پسندی کے نمونے مل جائیں گے اعتدال تو آتے آتے آتا

ہے۔ اردو ہی نہیں دنیا کی ہر زبان کا ادب عبوری دور میں انتشار کا شکار رہا ہے اردو کے ساتھ یہ خرابی رہی کہ اس نے تبدیلیوں کو مغربی فکر کی طرز پر برتا یہ بات بعد میں فن کاروں کی سمجھ میں آئی کہ کوئی بھی ادب اپنے اپنی جڑوں کے بغیر ہوا میں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

مشرقی ادب اپنے مشرقی مزاج و اصناف کی بنیادوں پر ہی زندگی پائے گا۔ اس کا واضح نمونہ جدید ادبی توڑ پھوڑ کے سب سے بڑے حامی اور ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کے یہاں نظر آتا ہے جنہوں نے اپنے بعض خیالات، کو مسترد کیا ہے اور خود ادب کے مشرقی پیمانوں اور معیارات کو ہی اولیت دینے کی سفارش کی ہے ـــــ بہر حال مجموعی طور پر آپ کا اداریہ پسند آیا۔

ـــــــ عبد المتین نیاز۔ بھوپال

فہمی ہوئی ہے۔ اس نکتے کو چھوڑ کر انہوں نے کے تعلق سے گراں قدر باتیں کی ہیں۔

ـــــــ ضیا آزاد۔ آر

○ سہیل، شمارہ ۱۲۔ جلد ۱۵ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔

زیر نظر شمارے کا سرورق کافی دید تھا۔ منظر امام اور عبد القوی دسنوی صاحبان تخلیقات کافی جاندار اور معلوماتی تھیں کمار ورما اور ثمینہ کے افسانے کافی دلچسپ ہیں ظفر حمیدی، اختر شاہجہاں پوری اور نثار اپنی شعری کاوشوں میں بے حد ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

امید ہے آئندہ شمارہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور جاذب نظر ہوگا۔

ـــــــ ایس شمس الحسن گیاوی۔

○ سہیل گیا کے شمارہ ۲ جلد ۱۵ میں لقمان شوق کی غزل کے ایک شعر سے

کسی دن ان سے ہندوستان بھی خالی کرا لیں گے
چلو مسجد تو دینے کو ہوئے تیار مولانا

پر عبد السلام کوثر کا خط مطالعہ سے گزرا۔ ان کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ مذکورہ شعر "بابری مسجد ایکشن کمیٹی" کی روداد بیان کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ شعر مولانا وحید الدین مدیر "الرسالہ" کے نام سے منسوب ہے۔ جس کی وضاحت منصور اعجاز کے خط جو سہیل کے شمارہ ۱۲ جلد ۱۵ میں شامل ہے سے ہو جاتی ہے۔ کوثر صاحب کو خواہ مخواہ غلط

"یادوں کا سفر" کی شاندار
ـــ مقبولیت کے بعد ـــ
قیص عثمانی
کی
ـــ ایک اور تصنیف منظر عام پر
"یادوں کے سائے" (مصور
نرگس، مینا کماری، مدھوبالا، موتی لال، جیندر موہن
سہراب مودی اور دیوندر گوئل وغیرہ کی یادیں
صفحات: ۱۲۸ ـ طباعت آفسیٹ، سرورق رنگین
پتہ :- قیصر عثمانی، ۷ جمیلہ بلڈنگ
نیشا پارک، ملاڈ ایسٹ بمبئی

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- نصر غزالی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد [illegible]
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر۔ مسعود منظر
- ایڈیٹر۔ جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر۔ خورشید ہاشمی

معاونین۔ شکیل احمد [illegible]، [illegible]

کتابت۔ [illegible]

[illegible]

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام

حصولیابی کے نتائج

بیس نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غریبی کے خلاف مسلسل جدوجہد۔ ریاست میں اس پروگرام کے ذریعہ مشفقانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور پوری سنجیدگی کے ساتھ ہر سطح پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔
پروگرام کے تحت سال ۹۳-۹۴ میں حاصل شدہ کامیابیاں درج ذیل ہیں۔

سمے کرت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 3,35,908 خاندانوں کو مستفیض کیا گیا — جواہر روزگار یوجنا کے تحت 321,04 لاکھ مانو دیوس کا سرجن کیا گیا — 14990 لگھو گرامین اور سینچائی کرت یاں قائم کی گئیں ● بھومی سدھار یوجنا کے تحت 17452.68 ایکڑ زمین کی تقسیم کی گئی ● ریاست کے 3 620 گاؤں میں صاف پینے کے پانی کا انتظام کیا گیا ● دو بچوں کے خاندانوں کے اصول کے تحت [illegible] لوگوں کا بندھیا کرن کیا گیا ● بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی۔ پی۔ ٹی، پولیو، بی سی جی کے 2163385 ٹیکے لگائے گئے ● 21214 آنگن باڑی سینٹرز قائم کیا گیا —
یوجناؤں اور پروگراموں کے تحت 1,79,385 انوسوچت جاتی اور 51309 انوسوچت جن جاتی خاندانوں کو مستفیض کیا گیا ● بے گھر لوگوں کے درمیان 88960 رہائشی مکان تقسیم کئے گئے۔ اندرا آواس یوجنا کے تحت انوسوچت جاتی اور جن جاتی کے لوگوں کے لئے 88960 مکانات تقسیم کئے گئے
اقتصادی طور سے کمزور اور کم آمدنی والے طبقہ کے لوگوں کے لئے 58 نیز 206 مکانوں کی تعمیر اور تقسیم کی گئی۔ تنگ بستیوں میں اصلاحی پروگرام کے تحت گندی بستیوں میں رہنے والے 2810 لوگوں کے لئے پانی پینے کا، علاوہ انتظام، نالی سدھار، غسل خانے و پاخانے، گلی کی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرائی گئیں — ● 56956.94 ایکڑ میں 55.820 لاکھ پودے لگائے گئے ● حفظانِ صحت کی 1737 دوکانیں کھولی گئیں — ● 205 گاؤں کی بجلی کاری، 1909 پمپ سیٹوں کا بجلی سے رابطہ، 64782 اچھے قسم کے چولہوں کی تعمیر اور 2640 بایو گیس سپلائی کی تشکیل کی گئی۔

PRD-475 (21-25) 94-95

تحریک

ہم کیا لکھیں؟

ادب و شعر کی تخلیق کے ضمن میں یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ ہم کیا لکھیں؟ یہ مسئلہ بہت
ہے۔ ایک جماعت کو یہ شکایت رہی ہے کہ ہمارے سابقین تو سب کچھ لکھ چکے ہیں۔ محسوسات و مشاہدات کی
نیرنگیوں اور ان کے تنوعات سے ماضی کا سرمایۂ ادب بھرا ہوا ہے۔ اب ہمارے لئے چھوڑا ہی کیا ہے۔ اب کوئی
بات رہی ہی نہیں۔ لیکن دوسری جماعت کو ہمیشہ یہ اطمینان رہا کہ ادب کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ تخلیق کسی کونے
بند نہیں رہ سکتی۔ یہ جوہڑ کم آب نہیں ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ سمندر کی لہروں کے جوش خروش
ان کے تصادم سے پیدا ہونے والی جھاگ کیا کبھی ختم ہو سکتی ہے۔ تخلیق اسی ابالی، اضطراب اور [illegible]
کا نام ہے جو انسانی آبادی کا خاصہ ہے۔ یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

اگر مؤخر الذکر بیان ایک حقیقت ہے تو پھر شعر و ادب کی تخلیق میں موضوع کی یافت
کی تلاش اور اس کے ترک و انتخاب کے سوالات پیدا کرنا بھی عجیب سی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر وہ واقعہ
ہمارے شعرا اور ادبا میں قلزمی لہروں کی توانائی پیدا کرے ہمارا آپ کا موضوع بن سکتا ہے۔

مگر ابھی ایک سوال رہ جاتا ہے ۔۔۔ وہ یہ کہ کیا یہ ذمہ داری خارجی واقعات و واردات
کہ اس حد تک قوی الاثر ہوں کہ فن کار کو جھنجھوڑ دیں۔ کیا فن کار یا تخلیق یا مقدور اور مجبور اجزا کی طرح
جب تک شدید جھٹکے سے متحرک نہ کیا جائے وہ ساکت و صامت بلکہ بے جان پڑا رہے۔

نہیں ہے ۔۔۔ یہ تصور غلط ہے ۔۔۔ سمندر کی لہریں اپنی تشکیل کے لئے کسی جہاز کے
کا انتظار نہیں کرتیں۔ تحریک تخلیق کار کے اندرون میں ہوتا ہے جو معمولی سے معمولی خارجی اشارے پر اکسا
دینے لگتا ہے۔ سچا فن کار بڑے بڑے عظیم واقعات و سانحات کا منتظر نہیں رہتا۔ کائنات کے کسی گوشے
اٹھنے والی خفیف ترین حرکت اس کے RECEPTION SYSTEM میں ہزاروں لاکھوں گنا [illegible]
ہو کر تخلیق کا سبب بن جاتی ہے۔ شاید اسی لئے غالب نے کہا ہے کہ ؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

مسعود منظر

ڈاکٹر آغا سہیل
(لاہور)

جگن ناتھ آزاد کی ترقی پسندی

"بنے بھائی" (سید سجاد ظہیر) جب ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالنے کے لئے برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں ایک ایک دانشور کا دروازہ کھٹکھٹا لیے پھرتے تھے تو پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے والد محترم پروفیسر تلوک چند محروم سے بھی ملے تھے اور آزاد کے والد محترم نے جو کلمات خیر بنے بھائی اور انجمن کی نسبت فرمائے تھے ان کا ذکر بطور خاص ایک مضمون میں محفوظ ہے (دیکھئے کتاب "بنے بھائی" مرتبہ پروفیسر عتیق احمد، کراچی) اس وقت آزاد کا عنفوانِ شباب تھا۔ لیکن ترقی پسند تحریک اور اس کی تنظیم کا کل حال احوال ان کے سامنے طے ہوا اور انھوں نے اس تحریک کی تنظیم کو اس وقت سے دیکھا جب اس کا خمیر اٹھ رہا تھا۔

آزاد ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے بھارت پہنچے تو ان کی عمر ۲۹ سال کی تھی اور اس وقت سے اب تک کسی نہ کسی شکل میں وہ اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ متعدد کتابوں، مقالوں اور شعری مجموعوں کے مصنف ہیں اور ان کی ہر تحریر میں ان کے علمی و ادبی عقائد، نظریات اور مسلمات موجود ہیں۔ ہر چند کہ وہ اقبال کے والہ و شیدا اور ان کی شاعری کے گرویدہ اور ان کی اسلامی مابعد الطبیعات کے وکیل ہیں لیکن انسان کی انسانیت اور کائنات کی تفہیم کے سلسلے میں ان کا نقطہ نظر ترقی پسندانہ ہے یعنی مادی جدلیاتی فلسفہ حیات پر ان کا یقین ہے۔ آزاد پر کیا موقوف ہے، اکثر ترقی پسند جن میں احتشام حسین اور علی سردار جعفری کے علاوہ آل احمد سرور تک شامل ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے قائل، معترف اور موئید ہیں۔ اقبال کی شاعری میں تفکر و تعقل کا وہ عنصر جو اذہان کے افق کو وسیع کرتا ہے اور دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ انسان اور کائنات کے فطری رشتوں کو استوار کرتا ہے۔ اس کے سبھی ترقی پسند قائل ہیں۔ اور تصوف کی وہ مجہول بر خود غلط اور مریضانہ روش جس میں انسان گم کردہ راہ بن جاتا ہے، نہ اقبال کو پسند ہے اور نہ اقبال شناسوں کو چنانچہ آزاد سمیت تمام ترقی پسند دانشور انسان کے ذہنی ارتقا اور معاشرے کے صحت مند اقدار کے قیام کے لئے ہیگل کے اس نظریے کے قائل نہیں ہیں جس میں وہ مادے پر

شعور کو ترجیح دیتا ہے بلکہ مارکس اور اینگلز کے اس نظریے کو ترجیح دیتے ہیں جس میں حرکت اور مسلسل حرکت ارتقا کا قانون ہے۔ اس کے ذیل میں کائنات بھی ہے اور انسانی ذہن بھی

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

انسان اور کائنات کی تفہیم کے معاملے میں دانشوروں کے مابین جزوی اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ انسان اور انسانیت کی استحصال کنندہ تخریبی طاقتوں نے جب بھی معاشرے میں مواقع پیدا کئے، انسان اور کائنات کے فطری ارتقا کی رفتار کم گئی —— جگن ناتھ بھی اسی فلسفۂ فکر کے حامی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود آزاد کی زندگی میں جو بحران اور آشوب آئے ان کا سائنٹیفک اور معروضی تجزیہ کر کے اور منطقی استدلال کر کے وہ وقت کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنے لگے۔ سب سے پہلے ان کی پہلی اہلیہ کا سانحۂ ارتحال رونما ہوا جس نے ان کے اعصاب پر اثر کیا اور اس داخلی واردات (قلبی) کو سہارنا، خصوصاً جوانی کے زمانے میں، ایک بہت بڑا مرحلہ تھا، لیکن رفتہ رفتہ آزاد سنبھلے اور سنبھل کر اس وار کو سہہ گئے پھر ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہجرت کا روح فرسا مرحلہ درپیش ہوا جس میں اِدھر سے اُدھر جانے والوں اور اُدھر سے اِدھر آنے والوں نے جسم و جاں پر جو زخم کھائے وہ زخم آج تک مندمل نہ ہو سکے۔ میر تقی میر

کو بھی یہ مرحلے مختلف انداز میں درپیش ہوئے تو وہ ایسے ٹوٹے کہ کبھی نہ سنبھل سکے کہ اکبرآباد سے چلے تو وہ درو بام پر چشم حسرت ڈالتے ہوئے اور دلی تاخت و تاراج ہوئی تو دلی اور دل کے مرثیے لکھتے رہے۔ لکھنؤ میں رہے تو دل پر خوں کی اک گلابی سے تا عمر سرشار رہے۔ یہ صرف مثالیں درونی واردات کی ہیں۔ مرزا غالب بھی اکبرآباد سے دلی گئے۔ متعدد آشوبوں اور بحرانوں سے گزرے لیکن دونوں میں جو فرق ہے وہ افتاد طبع اور فطری مزاج اور مذاق کا فرق ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

مرزا غالب کا ارشاد ہے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دونوں بزرگوں کے مزاج اور مذاق کا جو بین فرق ہے وہ اگرچہ زمانی اور مکانی بھی ہے لیکن میر صاحب جذبے، خیال اور وجدان سے تحریک پاتے ہیں۔ غالب اپنی تخیل کی اٹھان تفکر و تعقل پر قائم کرتے ہیں۔ میر صاحب کی متخیلہ ماورائی رومانی اور تاثراتی فضا میں سانس لیتی ہے۔ غالب کی متخیلہ میں ارضیت ہے۔ میر صاحب تجزیہ اور تحلیل نہیں کرتے۔ غالب تجزیہ اور تحلیل کر کے نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ آزاد کا ذہن غالب اور اقبال کے اذہان سے زیادہ قریب ہے اور یہ بھی فرق ہے جس کی طرف علمائے تاریخ، علمائے عمرانیات اور علمائے نفسیات بلیغ اشارے کرتے رہے ہیں تاریخ سے زیادہ تاریخیت یعنی روح عصر جسے طین (TAINE) نسل، وقت اور زمانے کے سیاق

[illegible] جمالیات کے علاوہ [illegible] اور ان کا معنی [illegible] نوٹ [illegible] محرکات، معاشرتی عوامل کو تاریخی مادی جدلیات کے ذریعے اس شعور کے حوالے سے دیکھتا ہے جو ان محرکات اور عوامل سے پیدا ہوتا ہے یعنی اپنے زمانے میں جو شعور غالب کو حاصل تھا تو اس کے اسباب و علل میراث پرستوں اور ماضی کے روایت پسندوں کی نگاہ میں نہیں تھی جو کلام غالب پر اعتراض کرتے اور کہتے تھے ؎

کلام میر سمجھے اور کلام مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں اور خدا سمجھے

بیچارے غالب کو ان ناسمجھوں سے کہنا پڑا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

(ان کا اعتماد کا عالم یہ تھا اور یہ اعتماد اسی شعور کے حوالے سے تھا جو غالب کو تاریخ کے مادی جدلیاتی مطالعے سے حاصل ہوا تھا)

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہہ گئے ؎

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اکبر آباد سے دلی اور دلی سے کلکتہ تک کے سفر میں اور پھر ۱۸۵۷ء کے آشوب نے غالب کے ذہنی افق کو بدلا اور اس انقلاب اور آشوب میں غالب کے تفکر و تعقل کی تنظیم نے اہم کردار ادا کیا۔ بعینہٖ آزاد جن آشوبوں سے گزرے اور بیسویں صدی کے جن انقلابات نے ان کے ذہن و دماغ کو متاثر کیا۔ ان سے ان کے فکری اور تہذیبی تجربوں کو تقویت ملی وہ ایک ترقی پسند مفکر ادیب کی حیثیت سے ان مقامات سے بخیر و عافیت گزر گئے اگر انہیں ازل اول تا آخر یہ شعور اور آگہی نصیب نہ ہوتی تو پہلے ہی مرحلے میں وہ ٹوٹ پھوٹ گئے ہوتے یا زندگی بھر فانی کی طرح نالہ و بکا کرتے رہتے۔ اور خود اپنی ذات میں گم رہتے۔ اپنی ایک الگ دنیا اپنے درون میں تخلیق کر کے بیٹھ رہتے اور ہمیں ان کی شاعری میں میر اور فانی کی آواز بازگشت کے سوا کچھ نہ ملتا۔

ہمارے اس زمانے میں بھی بعض شعراء لسیم الد[illegible] کے گنبد میں بیٹھے ہوئے تخلیق شعر کا وظیفہ تو ضرور پڑھ رہے ہیں لیکن اپنے زمانے اور وقت سے کٹے ہوئے ہیں وقت کے دائرے میں خود کو داخل کرنے کے لیے جتن نا[illegible] آزاد نے بڑے جتن کئے خصوصاً اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد جو ایک لمبا عرصہ انہوں نے گزارا وہ اپنے آپ سے طویل ہم کلامی کا زمانہ تھا۔ ہمارے اسی دور میں برصغیر پاک و ہند میں ایسے بہت سے شعراء ہیں جو مادیت کے گرداب میں ہچکولے کھا رہے ہیں اور اپنے گرد و پیش سے مطلق کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس مفروضات کے چند بندھے ٹکے موضوعات ہیں اور تحریک نشاۃ الثانیہ کی تکرار کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ عصری حسیت ان کے کلام میں مفقود ہے کیونکہ وہ ارضیت ماحول اور زمان و مکان کے حقائق کو نظر انداز کر کے مفروضوں کی مصنوعی اور طلسمی دنیا میں سانس لیتے ہیں۔ اور جعلی دانشوروں کے شعبدہ بازی اور طلسم سامری کے سے اڑائے ہوئے صابن کے رنگین جھاگ کے غباروں سے کھیلتے رہتے ہیں اور اپنے زمانے کی نسل کو بہلاتے اور بہکاتے رہتے ہیں۔ آزاد نے حقیقی اور جعلی دانشوروں کے مابین تمیز کی اور حقیقی اور ترقی پسند [illegible]

ترقی کو سمجھ کر اپنے لئے ان موضوعات کا انتخاب کیا جو
ن میں بھی بکھرے اور کھرے ہیں اور مستقبل کی طرف ان کے
خ اشاروں میں بھی بکھرے اور کھرے ہیں جو آنے والی نسلوں
رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ترقی پسندی کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہے۔
سید احمد خاں کی تحریک برصغیر میں فکری تحریک تھی لیکن اس
سراغ غالب کے نظام تفکر میں ملتا ہے کیونکہ تاریخی
بدلیوں نے معاشرے میں نئے شعور اور نئے ذہن کو پیدا
یا تھا جو تاریخ کی مادی جدلیت سے عبارت ہے۔ کلکتہ
ں انقلابی معاشرے کے قیام نے مغلوں کے فرسودہ جاگیردارانہ
ام کے مقابلے میں صنعتی نظام کی افادیت کو اجاگر کر کے نیا
ہنی افق فراہم کیا۔ اس کے بعد دہلی کالج (۴۲ - ۱۸۴۱ء)
قیام اور پروفیسر رام چندر کی ادارت میں شائع ہونے
الے تمینوں رسالوں (محب ہند - خیر اندیش الناظرین اور قران
سعدین) نے اس وقت کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت
اور مادی جدلیاتی فکر کی افادیت کو اجاگر کیا اور سر سید
مد خاں کی تحریک میں اسی کالج کے فارغ التحصیل (محمد حسین
زاد، نذیر احمد اور ذکاء اللہ) پیارے لال آشوب اور
الی تک ادب کی نشاۃ الثانیہ میں ہراول دستے کے طور پر شامل
تھے۔ چنانچہ سر سید تحریک کے بعد برصغیر میں سب سے زیادہ
انا، مستحکم اور زور دار تحریک کانگریس اور مسلم لیگ
استعمار اور سامراج کے خلاف تحریک تھی جو سیاسی اور تاریخی
اذ پر بھی اہم تھی، علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی محاذ پر
پر بھی نہایت اہم، وسیع اور ممتاز تھی جس نے اقبال، حسرت
ور جوش جیسے شعراء کو جنم دیا۔ اسی کے پہلو بہ پہلو ترقی
پسند تحریک تھی۔ یہ تمام تحریکیں آگے پیچھے [illegible]
[illegible]

موضوع الذکر دونوں تحریکوں سے جگن ناتھ آزاد بطور خاص
متاثر ہوئے۔ دونوں تحریکوں کے اثرات ان کے دل و دماغ
پر پڑتے رہے اور ان کی شخصیت کی فکری اور عقلی تہذیب
اور تشکیل کرتے رہے۔ چنانچہ اگر ان کی شعری متاع
کا پس منظر معلوم کیا جائے اور اس کے بتدریج ارتقا
کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو جگن ناتھ آزاد کی ترقی پسندی
کا پورا گراف سامنے آجاتا ہے لیکن یہ بھی ملحوظ خاطر رہے
کہ کسی تخلیق کار اور شاعر کی متخیلہ میں احساس جمال اور
حسن کا تصور وہ نہیں ہوتا جو عموماً عام انسان کا ہوتا ہے
اس کی متخیلہ میں شعر و نغمگی کا نظام جمالیات کے حوالے
سے استوار ہوتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد چونکہ علمی، ادبی
اور اکیڈمک آدمی ہیں لہذا انہوں نے افلاطون، ارسطو
ڈیکارٹ، برکلے، ہیوم، کانٹ، نطشے، شیلنگ، ہیگل،
گوئٹے، شوپنہاور اور کروچے وغیرہ تک کے جمالیاتی
نظریات کو کھنگالا ہوگا اور غالباً بلینسکی، ٹالسٹائی کی ان تفاسیر
سے متاثر ہوئے ہوں گے جو اس نے مارکس اور اینگلز کے
جمالیاتی نظریات کے سلسلے میں پیش کی ہیں کیونکہ اس
کے تین شواہد بدیہی طور پر آزاد کی متخیلہ سے مترشح ہیں۔
اولاً یہ کہ آزاد اقبال کی متخیلہ کے فکری تجربے سے متاثر
ہیں لیکن اقبال کی متخیلہ کے اس فکری حصے پر زور نہیں
دیتے جو تجسیمی کے علی الرغم تنزیہی اور مابعد الطبیعاتی تھے۔
دوسرے یہ کہ آزاد جوش ملیح آبادی کی متخیلہ کے تجسیمی (جمالیاتی)
جز کے مزاجاً زیادہ قائل ہیں تیسرے یہ کہ اطہرا اور اجنتا
کے جمالیاتی حسن میں اسی تجسیمی حصے نے ان کی متخیلہ میں رنگ بھرا
ہے اور یہی وہ رنگ ہے جو آزاد کی شاعری کے پورے پیکر میں
اور پیکر کے ہر حصے میں سمایا ہوا ہے۔ ان کا شاعری
کے [illegible] تشبیہات اور استعارے [illegible]

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
حیدر آباد

سعید بن محمد نقش کی شاعری

سعید بن محمد نقش کیا کیا کچھ تھا۔ بہترین دوست تھا، مصور تھا تو مصور دوراں تھا، حسن اور نغمہ پر جان دیتا تھا۔ شاعر تھا۔ شاید مہنہ تراش بھی تھا۔ لیکن کینوس پر پیکر تراشی کا ماہر تھا۔ دوستی سے شاعری تک وہ ہر صورت میں فن کار تھا۔

اس کا پورا کلام ایک ساتھ پڑھ ڈالئے، مجموعی تاثر یہ ہوتا ہے کہ وہ رنگوں اور خطوط کا شاعر ہے۔ رنگوں اور لکیروں سے پیکر تراشتا ہے اور رنگوں اور لکیروں ہی سے علامات تخلیق کرتا ہے۔ وہ شاعری میں مصوری کرتا ہے۔

خود اپنے سلف پورٹریٹ میں کہتا ہے۔

میں ایک ثقیل سیہ سوز و داغ کی تصویر
مری شبیہ میں صدیوں کا اضطراب اسیر
یہ گرنیکا حقیقت میں ہے مری تصویر
کہ میرا کرب ہے دنیا کے درد کی تفسیر

"گرنیکا" پکاسو کی شہرۂ آفاق پینٹنگ ہے۔ فاشسٹوں نے گرنیکا نام کے ایک گاؤں پر جو تباہی لائی تھی، اس کا نقش ہے۔ "کرب و درد" کی تصویر ہے لیکن اس کے درمیان "امید و بیم" کی ایک شمع بھی ہے۔

سعید بن محمد بھی صدیوں کے انسانی "اضطراب" اور اسی "درد و کرب" کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا اور "رنگ" اس کی امید ہے۔

ایک نظم "اپنے رنگ کی بات" میں انسان کے ارتقا اور ارتقا کے ساتھ اضطراب کا نقشہ کھینچتا ہے۔ ایک منزل وہ آتی ہے۔

خدا بھی مختلف زبانوں میں باتیں کرنے لگا
مقدس صحیفے بھی آنے لگے
پھر صنعتی انقلاب آیا اور
مشینوں میں سب حرف ڈھلنے لگے
پھر جنگ و جدال، جوع الارض، نوآبادیات کے لئے
لڑائیاں اور سعید کہتا ہے۔

ہو گئے زخمی مہ و انجم تمام

اور بارود کی بو بھی آنے لگی

دھماکے، زلزلے، چیخیں، نہ پوچھو

دقت ہر سانس سے انگارے اگلتا ہوا ہلا

اب سعید کو اپنے رنگ میں دیکھئے۔ رنگ اس کی کائنات ہے۔ رنگ اس کی آشا، اس کی امید ہے۔ کہتا ہے:

ایسی ہنگامہ آرائی میں

اک دھنک

مسکرائی

اور اس نے زمیں سے کہا

ہماری زبان تو

فقط

رنگ ہیں

سعید بن محمد نقش پکاسو سے کس قدر متاثر تھا۔ یہ تو آپ کو اس کی تصویروں میں ملے گا۔ لیکن پکاسو کی موت پر جو نظم کہی ہے اس کا صرف یہ شعر دیکھئے۔ شعر کے ترنم سے شہنائی کی مصنوعی گونج پیدا کی ہے!

تھی اس کے فن میں علامت کی ایسی گہرائی

نقوش یار ہیں، بجتی ہو جیسے شہنائی

علامت، علامت میں بات پیدا کرنے کا جو سلیقہ پکاسو کے پاس تھا اسے سعید نے جان لیا تھا۔

سعید اپنے دوستوں کا عاشق تھا۔ مخدوم، میر حسن، سلیمان، اریب، راگ و رنگ کی محفلوں میں اس کے ہم نشیں رہے ہیں۔ ان کی موت اس کے لئے صدمۂ جاں کاہ ثابت ہوتی ہے۔

مخدوم پر جو نظم کہی ہے۔ اس کا صرف یہ شعر ہی دیکھئے:

دیارِ شعر میں تقسیمِ زندگانی تھا، جہانِ سعد میں کل، مخدوم اک نشانی تھا۔

مخدوم کی ساری شخصیت کو سمیٹ لیا ہے۔

میر حسن کے بارے میں جب یہ کہتا ہے

وہ بساطِ رقص کی محفل سے اٹھ گئے افسوس

ہماری بزم کی خوشبو تھے زندگانی تھے

بساطِ رقص میں میر حسن اور مخدوم کی بے پناہ دوستی اور محفل رنگ و رقص کی ساری یادیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔

سلیمان اریب کے سانحۂ ارتحال پر اچھی نظم کہی ہے لیکن آخری شعر میں اپنے آپ کو سلیمان اریب سے جس طرح وابستہ کر دیا۔ جواب نہیں۔

مرے جنم کا دن تھا، اور اس کا یوم وفات

غم اریب مرے ساتھ جیسے میری حیات

اس کے بعد آپ کو وہ نظمیں ملیں گی جو نقطہ، عمودی خط، ترچھی لکیریں، خط منحنی، مربع، بیضوی، دائرہ، مثلث (مذکر) اور مثلث (مونث) کے عنوان سے ہیں۔ یہ سب رنگ کے ساتھ مل کر پینٹنگ کو جسد عطا کرتے ہیں، علامت بن جاتے ہیں۔ مصور کے تخیل کی اڑان اور دیکھنے والے کے جذبات کے درمیان جب ایک طرح کا تال میل ہوتا ہے تو تصویر بولنے لگتی ہے۔

ایک سہانی شام تھی۔ میرے عزیز دوست، بدری دگل پتی نے جو آرٹ، خاص طور پر مصوری کے بڑے شیدائی ہیں اور اچھی پرکھ رکھتے ہیں۔ سعید بن محمد کی تصویروں کی ایک گھریلو نمائش سجا رکھی تھی۔ میں وہیں تھا۔ ایک تصویر کے سامنے رک گیا اور بہت دیر اسے تکتا رہا۔ سعید نے ایک نئے طریقے سے یہ تصویر بنائی۔ ایک ——— پہ تیل ڈال کر ہاتھ سے پیٹرن بناتا اور پھر اس کا چہرہ اتارتا تھا۔ (میں اس فن کے ٹیکنیکل نام سے ناواقف ہوں) اس تصویر کا عنوان تھا: "بھولا ہوا خواب"

دائرہ [illegible] ہے [illegible] حیات
دائرہ [illegible] ہے سمیٹیں کیسے

"مثلث" (مذکر)

راس جو بھی ہے نوجوانی ہے
ارتقا کی یہی نشانی ہے
اس کے تینوں ضلع ستاری ہیں
عدل و انصاف کی گواہی ہیں
جلوہ گر اس میں ہر سپاہ و شمشیر
ناک پہنے ہوئے ہینی بھی ہے

"مثلث" (مونث)

شکل زن کی یہی علامت ہے
جس کی تصویر بھی قیامت ہے
پیار کرنا مزاج ہے اس کا
جنس آدم پہ راج ہے اس کا
دل کی صورت ملی ہے ظالم کو
کیسی دولت ملی ہے ظالم کو

نقش کی کچھ غزلیں بھی ہیں۔ یہاں بھی آپ کو رنگ اور نغمے کا کھیل ملے گا اور شعر اپنے رنگین اور نغمہ ریز ماحول کے ساتھ ایسے ہوں گے جن کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

ان کی آہٹ ہے کہ اک لے سی چلی آتی ہے
دل تو دل ساز کا سینہ بھی دھڑک اٹھتا ہے
سنہرے گال تھے جو ہو گئے گلابی سے
[illegible] نیا رنگ دے دیا کس نے

اور یہ شعر دیکھئے:

[illegible] تازہ [illegible] میں
[illegible] سیاہ رنگ [illegible]
[illegible]

سرخ جبیں پہ نظروں کا آتشیں نشانہ ہو
یہاں اپنے کالے رنگ کو سرخ جبیں پر کالی تو کر نظروں کا آتشیانہ بنا دیا ہے۔

ملے وہ جام ہمیں ان نشیلی آنکھوں
گئے تھے ہوش میں، آئے تو بے خبر آئے
وہ چھیڑتے ہیں جلانے کو راگ دیپک
میں ان کے واسطے نیلی سی شام لایا

"جلانے" کے لفظ پر غور کیجئے۔ پھر دیپک راگ شام میں راگ و رنگ کی آمیزش کا لطف اٹھا

چہرہ میرے محبوب کا کیوں سرخ ہوا
شاید میری نظروں نے اسے چوم لیا

شاعر کے دیکھ ہی لینے سے محبوب کا شرما جانا، یہ نظروں نے چوم لیا ہے۔ شاعر کا تصور ہے اور محبوب تخیل بھی۔

نقش کا یہ شعر دیکھئے۔ کہیں اس میں آپ اپنا تجربہ نچوڑ کر نہ آ گیا ہو۔

دلوں میں زہر ہے اور مسکراتے پھرتے ہو
ہمارے پاس تو ایسا کوئی نقاب نہیں

"یادوں کا کینسر" ایک نظم ہے۔ اس کا یہ حصہ دیکھئے

ساز حیات پر
مضراب آنا ہے
اتنی شدید ضربیں کیوں لگا رہی ہو
سرخ چنگاریاں
آواز کا پیرہن

"فن کار" کی بیوی ہو کر سماعت داں کی ریاکاری کھلی [illegible] کی، کبھی بے چادروں کا بدلا لی
وہ آپ [illegible]

درمیان

سعید نے ہلکے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور
پوچھا۔ "تصویر پسند آئی اس میں تجھے کیا نظر آتا ہے؟" میں
نے کہا۔ "بھولا ہوا خواب ہے۔ داہنے جانب نیچے
ایک عورت کا ہلکے رنگوں اور خطوط میں دھندلا سا خاکہ ہے
ہے اور باقی ساری تصویر پر خزاں کی ویرانی طاری ہے،
درختوں کی بے برگ شاخیں ہیں لیکن ہیں دو شاخوں کے درمیان
ایک "آنکھ" نظر آتی ہے۔ میں نے اشارہ کیا۔
سعید بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا۔ "یہ تصویر کی
روح ہے۔
رنگوں اور لکیروں کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوتا۔ مصور
اپنی تصویر میں کئی پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی
ممکن نہیں مگر دیکھنے والا بھی تخلیقی انداز سے دیکھ کر کچھ
اور ایجاد پیدا کر لے۔"
غرض نقطہ، لکیر، دائرہ، مثلث سبھی علامتیں بن
گئی ہیں۔ اور مصور ان سے کھیل کر نئی نئی باتیں پیدا کرتا
ہے۔ "نقطہ" کے بارے میں کہتا ہے:

میں کہ نقطہ ہوں، جب بھی میں چاہوں
قدرِ اعداد سب بدل ڈالوں

عمودی خط:-

یہ ہے وحدت کی گواہی
ارتقا کی ہے نشانی

افقی خط:

سکوتِ مجسم
جمود آشنا
بے حس و بے ادب
فنا کی علامت

"ترچھی لکیر":

اک دھماکہ ہے زلزلہ ہے یہ
جوش میں غرق ولولہ ہے یہ
ارتعاش و غضب کی ہے تنویر
اور شجاعت ہی اس کا ورثہ ہے
اصل میں نقش کا یہ غصہ ہے

"خطِ منحنی":

بنسری کی مدھر الاپ ہے یہ
نغمہ و شعر کا ملاپ ہے یہ
لَے ہے، نغمہ ہے، یہ بلاغت ہے
خطِ چغتائی کی نزاکت ہے

"مربع":

اس کے چاروں ضلع مساوی ہیں
حسنِ کعبہ کے یہ راوی ہیں

اور کیپسر

ہے یہی نیرم برہمن کا
اور یہی جو کھٹا ہے آسن کا

بیضوی:

ہم صورتِ آدم ہے
تخلیق کا ہمدم ہے
تصویر ہے یوسف کی
ارمانِ زلیخا کا
مریم کی لطافت ہے
عیسیٰ کی علامت ہے
چہرہ یہی کرشن کا
رادھا کی شباہت ہے

دائرہ:-

بھی کہیں اور لگا ہوا ہے "بیوی کا شکوہ" نظم کے یہ شعر دیکھیے۔

وہ آئی اس طرح جیسے کہ برق کوند گئی
تمہارے کمرے میں یہ کون آتی رہتی ہے
نگار خانے میں تصویر جس کی بنتی ہے
طریقے تم کو جلانے کے خوب آتے ہیں
تمہارے آرٹ میں سوکن ہماری رہتی ہے

اور پھر بیگم سعید کی تو مصوری ہی نہیں اور بھی سوکنیں ہیں۔ شعر و شراب و نغمہ۔ "دودھ کی خوشبو" (ماں کے نام) ایک بڑی خوبصورت نظم ہے۔ کہتا ہے۔

یاد ماضی کے نیلے سایوں میں
دائمی نیند سو رہی ہے ماں
سوندھی مٹی میں
دودھ کی خوشبو
آج بھی نقش یاد آتی ہے

"یرقانی نظم کے یہ شعر دیکھیے،

بھوک ہے فاقہ ہے افلاس ہے ناداری ہے
حرص ہے مکر ہے، کینہ ہے، ریاکاری ہے
دعوتِ مرگ ہے یرقان کی بیماری ہے
بسترِ مرگ پہ زندہ کی اداکاری ہے

اس کے بعد وہ نظمیں آتی ہیں جو مختلف رنگوں پر لکھی گئی ہیں۔ پیلا، ارغوانی، نارنجی، سرخ، بنفشی، نیلگوں، سفید، سبز، فیروزہ، سرمئی، گلابی، کاہی، عنابی، گیروا، سفید و سیاہ، یہاں رنگوں کی تفسیر ملے گی۔ ان کا بیان ملے گا۔

پیلا ______

کرشن کا پیتمبر ہے
اوشا کا بدن جیسے
مکھراج انگوٹھی کا
زعفران ______
جیسے محبوب کا بدن
سورج مکھی کا تن

نارنجی ______

اک حربۂ جوانی
شعلے کی اک نشانی
تصویر بغیر گل کی
تعبیر خواب گل کی
گوگان اس کا شیدا
پنہاں بھی اس سے پیدا

سرخ ______

آزادی کا اک جام ہے
اور خون شہیدوں کا
یہ لاوا ہے
غصہ ہے
دہکتا لال انگارا
انقلاب کا نعرہ
مہندی ہے یہ دلہن کے لئے
سیندور سہاگن کے لئے
یاقوت انگشتر کے لئے

بنفشی ______

رنگوں کی یہ گہرائی
احساس کی نخوت ہے
دربار کا نغمہ ہے
شہزادی کی بلعت ہے
پیشانی ہے دھنک کی

کاشی کی عظمت ہے

نیلگوں

وادیاں بھی اسی کا رنگ لئے
وقت مغرب اسی کا ڈھنگ ہے
یہ تقدس بھی ہے اور مکرو سماں
جس پہ ہوتا ہے کسی کلی کا گماں
صحرائے چرخ ہے اور احساس کی بلندی
خوشبو کا دھواں ہے اور اک حد نظر
بھگوان کا رنگ شادیوں کا آنچل

فیروزہ

دامن سبز پہ نیلے آنسو جذب ہوئے فیروزہ بنے
کھل اٹھا نیلا تبسم، یہ ندائے صبح ہے
راہ الفت بھی یہی روح کی منزل بھی یہی
شیو شنکر کا نیل کنٹھ ہے یہ

سبز

حصہ یہ دھنک کا ہے
احساس مہک کا ہے
یہ زاسیب کی دھڑکن ہے
گلنار کا درپن ہے
یہ روح کا مسکن ہے
صالح کا نشیمن ہے

سرمئی

اک طور کے جلوے کا یہ راکھ ہے سرمہ ہے
رنگوں کا تبسم ہے، آنکھوں کی سجاوٹ ہے

گلابی

سفید و سرخ کا سنگم گلابی
یہ بوئے گل ہے، کومل سی مہک ہے
یہی ہے سرخ ماتھے کا پسینہ
گلابی آنکھ گویا ڈبڈبائی
شفق جیسے فلک پہ مسکرائی

گندمی

عارض سبزہ اک بوسۂ سرخ
سوندھی مٹی بھی یہی

گیروا

یہ ہے بدھا کا مقدس پیرہن
نفس امارہ کے حق میں بن گیا جذبہ شکن
سرخ جذبوں کا عمل ہے یہی ترک تمنا

سفید

نور اعلیٰ کی قسم یہ نور ہے
نیک، صالح، مہاتما، سچا
مغربی دلہن کا اجلا پیرہن
مشرقی بیوہ کی پاکی من و تن
اور یہی دودھ ہے پیاری ماں کا
ممکن ہے کرشن کا
چادر ہمالیہ کی، گواہی وجود کی

سیاہ

سنگ اسود کی قسم
یہی اسرار کائنات ہے
بحر اسود کا تدبر
اندھیرا رحم مادر کا
یہی تاریک خلا
اور یہی عالمہ کی عبا
اک خال حسین رخ کا
یہ عشق ہے دیوانوں کا

کاجل ہے یہ آنکھوں کا
فکر عمیق ہے یہ

ان ہی رنگوں بھری نظموں میں ایک نظم "کائی" ہے :

یہ ساگر کا ہے کنارہ بھی
اور سکون کے لئے اشارہ بھی

بوسۂ موج سے ہوئی جو نڈھال
تو لب سنگ پہ بچھی کنجال
کائی لہروں کی ہے تھکن گویا

فکر کی پرواز کے ساتھ الفاظ کے برتنے کو دیکھئے "گویا" کا لفظ کتنا بر محل لفظ ہے۔ یہاں "گویا" اپنے دونوں معنوں میں جلوہ گر ہے۔ کائی یا کنجال کی زبان سے لہروں کی تھکن بول رہی ہے۔

غرض سعید بن محمد نقش ایک ہمہ جہتی فن کار تھا، مصور تھا، شاعر تھا، پیکر تراش بھی تھا اور پیکر شناس بھی۔ اس نے خود اپنے متعلق کہا ہے :-

دکن کا نقش ہوں، آزر بھی ہوں مصور بھی
سخنوروں کے لئے ہوں ایک شاعر بھی

شاعری میں اس کا اپنا قطعی منفرد رنگ ہے، وہ مصور کے برش سے شاعری کرتا ہے۔

دشتی

▲ بقیہ :- موج عارض کے . . . . .

بڑی اچھی غزل ہے۔ ایسی غزل جس کا ہر شعر اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ دو اشعار پیش ہیں :-

وقت کے حیرت کدے میں کیا ہے لمحوں کی بساط
میں نے جس کو چھو لیا وہ جاودان بنتا گیا
غور سے گر دیکھیے تاریخ عالم ہے گواہ

خون ناحق سرخیٔ ہر داستاں بنتا گیا

زندگی کو عنوان بنا کر کہا ہے

زندگی تو نے کہانی دے دی
بانوں باتوں میں نشانی دے دی
رخ رنگین سے اٹھا کر آنچل
سارے موسم کو جوانی دے دی

آخر میں ایک قطعہ دیکھئے :-

لمحہ لمحہ ہے حال کا چیلنج
وقت کو راہ سے ہٹاتا ہوں
مجھ کو شاید پلٹ کے تم دیکھو
لو! میں ماضی میں لوٹ جاتا ہوں

کیا صابر ماضی کی جانب مراجعت کر سکا ہے یا کر بھی سکتا ہے کیونکہ حالات حاضرہ پر اس کی نظر گہری بھی ہے۔ بھرپور بھی ہے :-

آپ ہیں اہل سیاست آپ درباروں میں ہیں
ہم نے سچ بولا ہمیشہ ہم گنہ گاروں میں ہیں
صرف تاریخ میں دو نام یزید اور حسین
جنگ کوئی نہیں جنگ حق و باطل کے سوا

غرض کہ صابر کی شاعری کے اپنے اخرام و احزاب، اپنے اختصاص و اختلاج، اپنے احوال و احقاق، اپنے اختراع و اختفاظ ہیں، ایسے مختصات و ممیزات جو احیاناً ہی نظر آتے ہیں۔ شاعر کا ذاتی کرب آگہی کے اجزائے ترکیبی میں فلسفیانہ ارتکاز، سماجیاتی تناظر، نفسیاتی تصور و تخیل در آغوش نظر آتے ہیں۔ صابر فی الواقع ایک منفرد آواز ہے، ایک حرف معتبر ہے، صابر کو زبان ادبیات اردو ہمہ اوست ہے اور شعر صابر بہر اعتبار ہمہ از اوست ہے۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
گیا

موجِ عارض کے آئینہ میں صابر دت..

★ "فن و شخصیت" جیسے اطراف و اکنافِ ادبیات پر استوار و مشتمل جریدے کے مدیر، خالق تصور، مرتب مجتبیٰ و مجذوب صابر دت کا نام اردو حلقوں میں کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے مضمون (تخلیق لاہور، اگست ۹۲) میں اسی لئے میں نے صابر دت کو فن و شخصیت کی تجسیم بتایا ہے۔ فن و شخصیت کا وہ شمارہ جس کا نام "چند تصویر بتاں" ہے ابتکارانہ کارنامہ بھی ہے اور مصورانہ ادبیاتی حسن نظر بھی ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو فن و شخصیت ایک جریدہ ہی نہیں ہے بلکہ تابندہ اصطلاح ہے ایسے شخص کی جو عرفِ عام میں صابر دت ہے — اور صاحبِ فن و شخصیت ہے۔ یعنی صابر دت کہئے یا فن و شخصیت ایک ہی بات ہے۔ اپنے دوستوں کے اصرار اور [illegible] جیسے ملی خواہوں کے مشوروں پر صابر دت نے اپنی مجموعہ کلام بہ عنوان "موجِ عارض" بہ تزئین شائع کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی تصویر بھی شامل کی ہے۔ ملحوظ رہے۔ کہیں صابر کی تصویر شامل اشاعت نہیں تھی۔ تصویر کے پس منظر [illegible] فن و شخصیت کے چند شماروں کی تصویریں ہیں اور پایان تصویر یہ شعر ہے

ہے کھوج کا کرب، فکر آب و گندم کی عزا
ہم بھی اپنے دیس میں اردو کے فنکاروں جیسے

یعنی کرب ذات اور کرب حالات دونوں کا فنکارانہ احاطہ کرتا ہوا شعر ہے۔ جو "آپ بیتی" بھی ہے اور اردو "جگت بیتی" بھی ہے۔ یہی نہیں اطراف [illegible] اردو کے واقف کاروں کے خیال ان معدودے چند اشخاص کی جانب بھی منعطف ہو جاتے ہیں جو اردو صحافت کی [illegible] مگر وہ فنکار نہیں کہے جا سکتے۔

کسی کتاب کا نام مصنف تخلیق کی فکر سے عبارت ہوتا ہے۔ انگریزی کے معروف مضمون نگار جی

گارڈنر نے اپنی تصنیف ALPHA OF THE
GINI MAMING ON (یعنی پر تو اشاریہ میں) میں
(نام تجویز کیے جانے کے بارے میں) کے تحت اپنے
مخصوص و شگفتہ انداز و اسلوب میں لکھا ہے کہ
نام رکھنا، عنوان قائم کرنا، سرخی دینا وغیرہ آسان
کام نہیں ہیں۔ دیکھئے نا شیکسپئر کے ایک ڈرامے کا
نام ہے AS YOU LIKE IT یعنی جو آپ پسند
فرمائیں۔ کیا یہ نام شیکسپئر کی حیرانی کا غماز نہیں ہے۔
کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب کا نام اپنے تخلیق
کار کے خیالات و تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے
صابر نے "موجِ عارض" قرار دیا ہے۔ موجِ عارض
بڑی خوبصورت، ندرت آگیں، رومانی ترکیب
ہے اور اس ترکیب کے ذریعہ قاری کو بہت کچھ فراہم
کر دیا گیا ہے۔ رُخِ محبوب سے ابھرتے ہوئے شعلہ و
شبنم جیسے رعنائی و زیبائی کی صوتی تصویر اسی
حسین ترکیب سے پیش کش شعر صابر کا استعارہ
بن جاتی ہے۔ استعارہ یعنی مفاہیم مابعد الفاظ
ابلاغ کی منزلیں طے کرتا ہوا سمبل بن جانے کی
توانائی و تابناکی رکھتا ہے۔ اگر صابر کی شاعری کی
خصوصیات و کیفیات صرف دو لفظوں میں بیان کرنا
مقصود ہو تو "موجِ عارض" ہی کافی ہیں جیسے کہ شریمد
بھگوت گیتا کی پوری تلخیص "دل نہ ہارو" سب یہ
کارنامہ ہے سے پیش ہو جاتی ہے۔

وہ صابر جو "سینہ تصویر بتاں" جیسی مصور و
مزین تاریخ ادب اردو پیش کر چکا ہے۔ جو ساحر لدھیانوی
جاں نثار اختر، سردار جعفری نیز دیگر شعراء کی محفلوں
میں شامل رہا ہو۔ جو بمبئی کی بزموں میں شریک رہا

ہو اس کی اپنی زندگی المیہ، ایسا المیہ جو اشک
سے زیادہ بیش بہا (TOO DEEP FOR TEARS)
کہا جا سکتا ہے، رہی ہے۔ حادثات کے سلسلہ
سے سراسیمہ دل و دماغ ریزہ ریزہ ہوتے ہوتے
رہ گئے ایک تعجب سے کم بات نہیں ہے۔ قیام پاکستان
پر جب صابر کی عمر آٹھ نو برس تھی جموں کو ہجرت
کرنے کے دوران رات کو تین بجے مذہبی پاگلوں
ان کے والد کا خون کر دیا۔ ان کی ماں نے جیسے تیسے
دونوں بچوں کی جان بچائی اور ان کے منہ کو اپنے
ہاتھوں سے بند رکھا تا کہ بچے چیخ نہ پڑیں۔ بعد
کا سارا خاندان جموں کے مہاجرین کیمپ سے گو
گاؤں آ گیا جہاں صابر کی پھوپی کے صاحبزاد
کشمیری لال ذاکر محکمہ تعلیمات سے وابستہ بر
اسکول میں داخل کرا دیا گیا اور وہیں انہ
میٹرک پاس ہونے تک قیام پذیر ہونا پڑا۔ وہ
ماں کے پاس جموں میں رہنا چاہتے تھے۔ مگر جموں
پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ان کی ماں صرف ایک د
ہی سور گباشی کر چکی تھیں۔ طوعاً کرہاً واپس
آ کر انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے پاس کر ہی لئے
حالانکہ وہاں ان کا ذریعہ تعلیم ہندی ہی رہا۔
ذاکر صاحب کے نام آنے والے اردو جرائد و رسا
کا مطالعہ صابر کو موجب دلکشی رہا۔

دہلی سے صابر نے ہندی رسم الخط میں ار
ادب کا ایک رسالہ "روپ" کے نام سے شائع کر
شروع کیا اور بعد کو اردو میں ایک ہندہ روز
رسالہ "دلی والا" نکالنا شروع کیا۔ مگر یہ دو
صابر کی اصل جستجو، ان کے نصب العین کی

کوناکافی ہے اور وہ بمبئی چلے آئے اور وہاں ان کے مقتدر ہستیوں سے دوستانہ مراسم ہوگئے۔ اب وہ بمبئی کی ادبیاتی محفلوں کے "جان جانہ" ہو چکے ہیں مگر زیر دستی ان کا مقدر بہ دستور بنی رہی ہے۔ صابر کی صلاحیتوں کو نام و مقام ملے ہیں۔ مگر چوں کہ صابر نے اردو سے محبت کی ہے۔ انہوں نے اس محبت کا صلہ کبھی طلب نہیں کیا ہے ؎

اہل اردو مجھے چاہیں تو بھلا سکتے ہیں
میری بات اور ہے میں نے تو محبت کی ہے

شعر میرا ہے جس میں ساحر کے ایک شعر کا دوسرا مصرع شامل کر دیا ہے۔ اس کا اطلاق صابر پر بھی ہوتا ہے باوجود نامساعد حالات وہ اردو ہی کو اپنی زندگی کا جہاد و مجاہدہ بنائے ہوئے ہیں۔ اردو ہی ان کی محبوبہ ہے، ان کے خوابوں کا تاج محل ہے اور جس دوشیزہ نے صابر ہے۔ بیوفائی کی اس کی یاد کو بھی صابر نے اردو کے جام بلوریں میں منعکس کر لیا ہے ؎

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست
گوئی گویا فشردہ اند بہ جام آفتاب را

(غالب)

شاعری سے مختصات سے مخاطب ہونے کے پیشتر میں درج ذیل اشعار کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا پسند کرتا ہوں۔

ہم سے دیوانوں پہ وہ وقت نہ آئے صابر
جب حکومت کا وفادار بنے اپنا کلام

آپڑے کام زندگی میں بہت
ورنہ ہم تیری آرزو کرتے

چھلکتے پھول کے آنچل میں اوس کے موتی
مری کہانی اشاروں میں رکھ گیا ہے کوئی

ہم نے دیکھی تو نہیں رسم وفا
آپ کہتے ہیں تو اچھی ہوگی

شب مہتاب میں دیکھا ہے ستاروں کا سفر
تیری پازیب کی چاندی سی بکھر جاتی ہے

قصہ گو محو تھا قصے میں پتہ بھی نہ چلا
اس کے کردار نے کس موڑ پہ دم توڑ دیا

چلمن نہ لیوں انگڑائیاں لو
ہمیں مارو نہ اتنی سادگی سے

(پس چلمن مستعمل ہے)

ہو جو ممکن تو اسی وقت کی رفتار بدل
راہ منزل نہ بدل قافلہ سالار بدل

آپ کو کیوں نہ تراشا گیا میرے دل سے
سنگ مرمر سے ہمیشہ یہ صدا آتی ہے

مدتوں بعد اٹھائے تھے پرانے کاغذ
ساتھ تیرے مری تصویر نکل آئی ہے

وقت نے چھین لیں جب سے تری آنکھیں مجھ سے
مجھ کو تاروں کا چمکنا بھی برا لگتا ہے

ہم ثریا سے کبھی پرے ہوتے
تیری خاطر کہاں سے لوٹ آئے

مجھے شعور نے برباد کر دیا صابر
کسی کا جرم ہو اپنی خطا لگے ہے مجھے

یہ حقیقتاً وہ شعر ہیں جو سب کو پسند آئیں گے اس پر بعد کو کچھ کہا جائے گا۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سرورق الٹتے ہی ان اشعار کو آمنے سامنے کے دو رنگین صفحات پر بہ تزئین سفید الفاظ میں پیش کیا

گیا ہے، یہ نیا انداز پیش کش ہے جس کا سہرہ شاعر ہی کے سر بندھتا ہے نیز اس سے یہ نکتہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ شاعر کو قابل رشک خود اعتمادی ہے کہ یہ اشعار پسند خاص و عام میں شمول ہو کر رہیں گے۔ شاعر، شعر اور سامع یا قاری سے بننے والی تثلیث ایک ہی وجود کی حامل وحدت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر صابر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سخن فہم بھی ہے اور قاری و سامع بھی سرورق کے ایک دم بعد دو صفحات پر ثبت متذکرہ ہی پر اچھے اشعار کی تعداد ختم نہیں ہوتی، مجموعے کے اندر اور بھی بہترین اشعار ہیں جو مقولہ (QUOTE) ہونے کی توانائی سے بھرپور ہیں جیسے

اسی کا روپ، اسی کی جھلک، اسی کا جمال
بدل کے بھیس نظارو مجھے فریب نہ دو

حسن کیا جانے محبت کا سلیقہ یارو
عشق نے درد کے ماروں سے محبت کی ہے

ہر اک پڑاؤ پہ ہم رہنما کو ڈھونڈتے ہیں
بدل گیا ہے کوئی رخ ہماری منزل کا

بات نکلی جو ماہ پاروں کی ٭ روشنی گھٹ گئی ستاروں کی

ہم سے محنت کا تقاضہ تو بجا ہے لیکن
کام کرنا بھی اگر چاہیں تو ملتا ہی نہیں

وقت کے جرعے گھٹے میں کیا ہے لمحوں کی بساط
میں نے جس کو چھو لیا وہ جاوداں بنتا گیا

بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ایسے اشعار جو دوران گفتگو موضوع و بحث کو مزید تقویت پہنچاتے معلوم ہوتے ہیں۔

اگر صابر کی سوانح حیات حادثات سے عبارت ہے اور تجزیہ شاہد ہے کہ ہر حادثہ غم کا موجب ہوتا ہے جس کے ارتسامات دل آگاہ پر واضح طور پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے صابر کی شاعری میں بھی وہی غم آلودہ مرتسمات کرن کرن نظر آتے ہیں۔ ان کا غم غم انگیز ہو کر بھی راحت آفریں ہو کر ابھرتا ہے۔ یعنی صابر کا غم جدلیاتی غم ہے، جو اپنی نوعیت میں المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی ہے۔ ملحوظ رہے، وہ المیہ جو فنکارانہ حساسیت کو بیدار کرے اور فن پارہ بن جائے ابتہاج و مسرت کا موجب ہو جاتا ہے۔ صابر نے اپنے باپ کو مسلم جنونیوں سے قتل ہوتے دیکھا اپنی ماں سے تعلیم کی وجہ سے دور رہے اور جب ماں کے پاس جانے کی کوشش میں پاش پاش ہو کر رہ گئے کیونکہ صابر کے جموں پہنچنے سے ایک دن پیشتر ہی پر لوک تاترا پر چلی جا چکی تھیں۔ کالج کے دوران زیر تعلیم جس لڑکی سے محبت کی اس نے بے وفائی کی، غرض کے ہر موڑ پر وہ تباہ ہو کر رہ گئے

موڑ آئے نہ کبھی ایسا فسانے میں کوئی
میرے مانند نہ تنہا ہو زمانے میں کوئی

اپنے جگری دوست ساحر لدھیانوی کی طرح ؎

وہ فسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا اچھا

اپنے افسانۂ حیات کو صرف فن کاری میں کشید کرنے میں ضرور کامیاب رہے ہیں۔ اگر صابر کی محبوبہ اپنے کہے ہوئے ساجن سے طوعاً پر عمل کرتی ہوئی ان سے صاف ہم آغوش ہو گئی ہوتی تو شہرت کے رنگین آنچل سے صابر محروم ہو کر رہ گئے ہوتے ؎

ہر شام اسی شام کی یاد آتی ہے اب بھی

سہیل کیا

گذرے ہوئے لمحات کو دہراتی ہے اب بھی
وہ شام، تمہارے جس میں جنم دن یہ گیا تھا
ساجن سے ملو، سکھیوں سے تم نے کہا تھا

بس، لوید کو بنایا نہیں، مجبوریاں، معذوریاں ہوگئی ہوں گی مگر صابر اس حادثہ کو بھی شعر نہ کر کے جھیل گئے۔

تیری چھاؤں میں محبت کے ترانے گائے تھے
آرزو پھولوں کی تھی، ہاتھوں میں کانٹے آئے تھے

یہ کو صابر نے اس شعر میں زندہ و جاوید بنا دیا ہے

موسم نے بھی طوفان بنایا تھا غزل کو
میں تکتا رہا اپنے نئے تاج محل کو

بوب کو غزل اور تاج محل صابر ہی نے کہا ہے۔

یا ہے۔

نے کالج کی یادیں بھی تازہ رکھی ہیں ؎

تیرے کالج ترا گلشن یوں ہی گل افشاں رہے
عشق کی رسوائیوں میں حسن کا ساماں رہے
اے مرے کالج اے مری الفت کے تاج
(میرا کالج میرا تاج)

لج کی الوداعی پارٹی جس میں محبوب صابر شرکت کی تھی الوداع نظم سے ایک اقتباس بر محل نہ ہوگا ؎

یہ حسیں دن یہ جواں رات ملے یا نہ ملے
وقت کی دھوپ میں ہر رنگ بدل جاتا ہے
تیرے ہاتھوں کو تھاما ہاتھ ملے یا نہ ملے
ڈال دے ایک نظر ہنس کے مری جھولی میں
پھر یہ ہنستی ہوئی سوغات ملے یا نہ ملے

ہم اجنبی ، میں کہتے ہیں ؎

میں تجھے کوئی حسیں تاج نہیں دے سکتا
کل تو کل ہے میں تجھے آج نہیں دے سکتا

اسی یاد کے تحت یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

آپ ہی جب نہ ہوسکے میرے
کیا زمانے کا اعتبار کروں

جس نے ٹانکا تھا کبھی پھول ترے جوڑے میں
اب اسی ہاتھ کو ہم دیکھ کے رو دیتے ہیں

شراب بادہ گساروں میں رکھ گیا ہے کون
تمہارا حسن بہاروں میں رکھ گیا ہے کون

موضوع کا رخ بدلتے ہوئے صابر کی انسان دوستی عصر حاضر کے جذبات کی دھوپ چھاؤں، کردار کی اہمیت وغیرہ کو زیر بحث لایا جائے۔ ساحر کی نظم "تاج محل" شعر اردو میں ممتاز و منفرد مقام و مرتبہ کی حامل ہے اپنے دوست کی نظم کا یہی تجزیہ صابر کے دل و دماغ پر مرتسم و مصور ہے، لہذا اپنے جذبات کو شعری ملبوس میں پیش کیا ہے ؎

تاج اک معبد الفت تھا کبھی میرے لئے
میں نے سمجھا تھا محبت کو خدا کا انعام
اک ہوس کار نے اس تاج کے دامن میں کبھی
اس کی عظمت کی قسم کھا کے مجھے لوٹا تھا

تجھ میں جتنا مرے خوابوں کا لہو بہتا ہے
تاج ہے مقتل جذبات بتاؤں کس کو
سب اسے روضۂ ممتاز محل کہتے ہیں
میں بھی یاں دفن ہوں یہ بات بتاؤں کس کو

ملاحظہ ہو کتنے کندن بنے جذبات پیش کئے گئے ہیں۔ ساحر کے نزدیک تاج محل شاہانہ جبر و استبداد کا مظہر ہے، عوام، صناعوں اور کاریگروں

کے استحصال کا سمبل ہے اور صابر نے اسے
اپنے محبت آگنیں جذبات کا مقتل سمجھا ہے
تاج محل کی موگند کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مرس
کار عظمت جذبات کو بھی روند ڈالتا ہے بالفاظ
دیگر، صابر کے خیال میں تاج محل ذریعہ استحصال
بنا ہوا ہے۔ ساحر و صابر خیالات کے اعتبار
سے ہم وزن الفاظ بھی ہیں اور ہم قافیہ الفاظ
بھی۔ اردو میں تاج محل پر یوں تو بے شمار نظمیں
کہی گئیں مگر کل میر سید۔ ساحر بھی ہے اور صابر بھی۔

صابر ایک خود دار فنکار ہے۔ اس کو
اپنے محبوب سے بے پناہ محبت ہے جس کو وہ
صارفیت (CONSUMERISM) سے
محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ نظم "فنکار" کا آخری
حصہ دیکھئے

میرے اشعار وہ دولت ہے جواب تیری ہے
اپنے شعروں کا چمن نذر کیا ہے تجھ کو
اپنا انداز سخن نذر کیا ہے تجھ کو
دھڑکنیں میرے جواں دل کی بسی ہیں جس میں
میں نے وہ فکر و فن نذر کیا ہے تجھ کو
کسی فن کار کا کردار نہیں بک سکتا
میرے محبوب ترا پیار نہیں بک سکتا

لاوارث (اپنے والد کے قتل پر کہی نظم) شاعر
رومانی جذبات کا صابر زندگی سے خوب واقف
ہے۔ آج کی دنیا میں کیا صورت حال ہے

زندگی جوا ٹھہری
ہر گھڑی تجارت ہے
ہر بس میں ہے مجبوریہ

حبیب میں محبت ہے
حائل محبتوں میں سیاست ملی مجھے
حیراں ہوں اپنے ملک میں ہجرت ملی مجھے
اپنے ہی دوستوں کے حسد کا شکار ہوں
ہر اک قدم پہ تازہ نصیحت ملی مجھے

آڑ بھاشا کی لے کے کچھ ناداں
میری جنت تباہ کرتے ہیں
کاش ان کی سمجھ میں آجائے
کہ وہ کیسا گناہ کرتے ہیں

ہر ایک روز ہی چھپتے ہیں سینکڑوں اخبار
ہزاروں درد مگر کوئی دل نہیں روتا
یہ کیسا شہر ہے، یہ کون نگر کہ ہمیں
سڑک پہ لاش پڑی ہو تو غم نہیں ہوتا
(بمبئی)

اپنے دوستوں جیسے ساحر لدھیانوی، مخدوم،
سردار جعفری، جاں نثار اختر، گیش بہاری طرز وغیرہ
پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ جو "تصویر بتاں" کی خصوصیت
سے مزین ہیں یعنی ہر ایک نظم میں صابر کے تاثرات
میں منعکس اطراف و کوائف مثلاً مجروح
سلطانپوری کی معروف غزل جس کا ایک شعر
ضرب المثال ہو گیا ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطانپوری)

پر غزل بطور نذرانہ پیش کی ہے جو ہر اعتبار سے

کرشن موہن
دہلی

آخرِ عمر میں

یہ جہاں دیدگی
آئی بالیدگی
مرے احساس میں
آگہی ہے کمی
میرے وشواش میں
بیکسی، بیدلی
زندگی درد ہے
دود اور گرد ہے
چہرہ زرد ہے
موسم سرد ہے
کوئی ہمدم نہیں
کوئی محرم نہیں
میری ہستی ہے اب
فرطِ رنج و تعب
آخرِ عمر میں
سوچ ہی سوچ ہے
سوچ سنکوچ ہے
پاؤں کی موچ ہے

اُردو میری زبان

مرے وطن میں عجب حالِ زار اُردو ہے
وفا و مہر کی تہذیب آنسو آنسو ہے
یہ کیا زباں ہے بڑھاوا نہیں ملا جس کو
فروغِ نشو کا دعوےٰ نہیں ملا جس کو
مری زباں، مرے بچے جانتے ہی نہیں
مجھے مصورِ احساس مانتے ہی نہیں
نہیں تھا عنصرِ تعبیر میرے خوابوں میں
مرا لکھا کبھی تلف ہو گیا کتابوں میں

جو میرے بچے ہی دل میں جگہ نہیں دیں گے
تو غیر کیسے مری شاعری کو سمجھیں گے

غزل

فضا ابن فیضی

مئو ناتھ بھنجن

یونہیں! اندھیرے اجالے سے واسطہ رکھنا!
ہزار سخت ہوں حالات، حوصلہ رکھنا!

خیال رکھنا، جو ہم سے تعلقات بڑھیں
کوئی، ہمارے لئے اور ضابطہ رکھنا!

نہ کھینچ اتنی بلند، اپنے گھر کی دیواریں
کہ لازمی ہے، ہوا کا بھی راستہ رکھنا

معانی، بن گئے پیرے کی گرد، آخر کار
نفس نفس، وہی لفظوں سے رابطہ رکھنا

بلا کی بھیڑ ہے باہر، کہیں نہ کھو جاؤ
چلے ہو گھر سے، تو اپنا بھی کچھ پتہ رکھنا!

تمہارے پاؤں کے نیچے، کوئی زمیں تو رہے
روائتوں ہی پہ، بنیادِ تجربہ رکھنا!

نئے ہیں ذہن، نئی آگہی، نیا اسلوب
ابھی فضول ہے، ترسیل کا گلہ رکھنا

نقوش عصری رویوں کے غیر واضح ہیں
یہ عکس چمکیں گے، شفاف آئینہ رکھنا!

نہ پوچھو ہم سے، کہ ہم نے کہاں سے سیکھا ہے
چھپا کے، سادہ سی باتوں میں فلسفہ رکھنا

یہ آگہی کا سفر ہے، یہاں مناسب ہے
خود اپنے آپ کو بے زاد و مرحلہ رکھنا

فضا! قلم نے خراشیں جو رُخ پہ چھوڑی ہیں
تم اپنے پاس انہیں، منجملہ صلہ رکھنا!

غزلیں

ماجد الباقری
گجرانوالہ، پاکستان

گھر سے نکلا ہے تو صدا بھی دے
گر پڑا ہوں مجھے اٹھا بھی دے

تو کہے گا تو لوٹ آؤں گا
چل پڑا ہوں تو راستہ بھی دے

آنے والوں کا انتظار نہ کر
جانے والوں کا کچھ پتہ بھی دے

بادبانوں کی رہنمائی کر
آگ لگ جائے تو ہوا بھی دے

اتنا ٹھہرا ہوا سفر نہ کرا
کشتیاں ہیں تو ناخدا بھی دے

روح پر خول اس طرح نہ چڑھا
جسم دیتا ہے تو حیا بھی دے

لفظ دے برہنہ خیالوں کو
ایک پردہ سا یہ اٹھا بھی دے

میری اولاد پر نہ چھوڑ اسے
زندگی دی ہے مدعا بھی دے

شہر سب پتھروں کے ہیں ماجد
شکل دی ہے تو آئینہ بھی دے

رؤف خیر
حیدر آباد

ہے پریشاں وہ پرندہ دانے دانے کے لئے
آسماں کو چن لیا جس نے ٹھکانے کے لئے

رو پڑے یاروں کے دروازے مقفل دیکھ کر
ہم مسافر آئے تھے ملنے ملانے کے لئے

جال میں دنیا کے پھنستے ہیں کہیں اہل نظر
یہ طوائف گرچہ کوشاں ہے رجھانے کے لئے

کب تلک اترے گا یوں خنجر ہماری پیٹھ میں
سامنے بھی کاش آتے آزمانے کے لئے

تختۂ مشقِ ستم اپنے سوائے کون ہے
ایک ہم ہی رہ گئے ہیں ہر نشانے کے لئے

ہم متاعِ غیر پر تکیہ نہیں کرتے کبھی
ہاتھ کافی ہیں کمانے اور سرہانے کے لئے

گم شدہ پونجی ہے اپنے واسطے ہر حرفِ خیر
ہم اٹھا لیتے ہیں یہ سکے لٹانے کے لئے

فرحت قادری

(گیا)

کوئی لذت نہ ملی دردِ مسلسل کی طرح
غم بھی چھپا یا رہا مجھ پر کسی آنچل کی طرح

تشنگی، اپنا مقدر نہ کہیں بن جائے
تم برس جاؤ کسی دن گھنے بادل کی طرح

تم نے بھی چھوڑ کے سب ظلم و ستم ڈھائے ہیں
ہم سے بھی ٹوٹ کے [illegible]

تیری تسلیم نظر سے نہیں شکوہ مجھ کو
[illegible] ہے کوئی ہولی چھاگل کی طرح

بات کیا ہے مری دہلیز پہ آ کر شب بھر
سر پٹکتی ہیں ہوائیں کسی پاگل کی طرح

کوئی [illegible] کی [illegible]
وادیٔ وقت سے فرحت کسی [illegible] کی طرح

رکھتا ہوں پاؤں تابشِ آزار دیکھ کر
ہنستے ہیں آبلے رہِ دشوار دیکھ کر

اہلِ جنوں سمیٹ کے پتھر، چلے گئے
اب خوش ہیں لوگ راہ کو ہموار دیکھ کر

ہوتا ہے دور اندھیروں کے چراغ سے
حیران کیوں ہو، ہم کو سرِ دار دیکھ کر

[illegible] گھٹ [illegible] قید میں زندانِ کرب کے
جی خوش ہوا ہے روزنِ دیوار دیکھ کر

ماحول جل رہا ہے، فضا میں دھواں دھواں
حیراں ہوں، زندگی کو شرربار دیکھ کر

خنجر چلے، سہاگ لٹے، گاؤں جل گئے
فرحت کا جی اٹھتا ہے اخبار دیکھ کر

غزلیں

نشتر اکبرآبادی

پونا

بہت دن ہو گئے تقدیر چمکے
اب اپنے خواب کی تعبیر چمکے

نہاؤں نور کی بارش میں شب بھر
چراغوں میں تری تصویر چمکے

بلا سے شہر میں رسوائیاں ہوں
گلے میں عشق کی زنجیر چمکے

یہی اک شخص کی بھی آرزو ہے
رسالوں میں مری تحریر چمکے

نہیں پاس لفظوں کا ذخیرہ
بھلا کیسے تری تقریر چمکے

یونہی شہرت نہیں ملتی ہے نشتر
دنیا معمار ہے تعمیر چمکے

ظفر صہبائی

بھوپال

آگ بھی دیکھی، دھواں بھی دیکھا
دل کے بجھنے کا سماں بھی دیکھا

آسماں تیرے نگر میں بھی ملا
جو یہاں دیکھا! وہاں بھی دیکھا

بے وفا دونوں، حسیں بھی دونوں
تجھ کو بھی دیکھا، جہاں بھی دیکھا

آسمانوں کی بلندی بھی ملی
خود کو بے نام و نشاں بھی دیکھا

دیکھا جاتا نہ تھا ہم سے لیکن
قتل تہذیب و زباں بھی دیکھا

دیکھ کر سارے بھرم ٹوٹ گئے
کچھ فرشتوں کو عیاں بھی دیکھا

غزلیں

حنیف ترین سنبھلی

سنبھل

بدن کی روشنی جب بے ضمیر لگتی ہے
تو ڈور سانسوں کی کتنی حقیر لگتی ہے
جہاں بھی ٹوٹے ہے رشتوں کا ریشمی دھاگا
وہاں تو نوک بھی سوئی کی تیر لگتی ہے
گہن میں آئے ہوئے چاند کے دو رلبے پر
سیہ لباس میں شب بھی فقیر لگتی ہے
سماعتوں کو وہ فکروں کی آگہی دے گی
جو نوک خامہ پہ گونجی صریر لگتی ہے
برس رہی تھی جو تیری صداؤں کی بارش
پھوار بن کے مری ہم صفیر لگتی ہے
ہو حوصلوں کی اگر فوج ساتھ میداں میں
اکیلی ذات بھی جم غفیر لگتی ہے
حنیفؔ ساتھ ہو اس کے تصورات کا چاند
تو ریگ صحرا بھی اس دم حریر لگتی ہے

غزلیں

نسیم شاہجہانپوری

شاہجہاں پور

مجھے یوں فوقیت حاصل ہے عصر نو کے انساں پر
کسی کے خون کے دھبے نہیں ہیں میرے داماں پر
کروں کیا تبصرہ میں خندۂ گلہائے خنداں پر
کہ شبنم مستقل تنقید ہے نظم گلستاں پر
کبھی یہ طنز کرتے ہیں، کبھی یہ مسکراتے ہیں
بڑے احسان ہیں اپنوں کے مرے حال پریشاں پر
ملے گا ہر ورق رنگین ہماری داستانوں سے
جہاں تک تم نظر ڈالو گے تاریخ گلستاں پر
فریب اعتبار اپنا مقدر بن گیا شاید
یقیں آنے لگا ہے پھر کسی کے عہد و پیماں پر
میں نکلا بھی تو نکلا قید ہستی سے رہا ہو کر
اسیری میری اک احسان ہے تاریخ زنداں پر
ہوئی پامال جب بھی کوئی حسرت دل تڑپ اٹھا
نشیمن جب جلا کوئی تو آنچ آئی گلستاں پر
فنا ہو کر اہمیت فنا کی ہوتی ہے ظاہر
کھلا کرتی ہے یہ زندہ حقیقت مر کے انساں پر
کسی کا اے نسیمؔ انعام و بخشش تو بڑی شے ہے
مرے اشکوں کا بھی احسان نہیں ہے میرے داماں پر

ضیاء الانجم

جبلپور

سر پہ سورج اور تپتی ریت کا منظر عجب
جل رہا تھا خانہ بربادوں کا لشکر عجب
دن کا گل چھڑنے لگا واپس پرندے ہو چلے
شاخ پر آسیبِ شب کی پھیلی ہے چادر عجب
موسمِ گل تو ہی رکھ دے دستِ شفقت شاخ پر
ہے برہنہ شاخِ گل گلشن کا ہر منظر عجب
میرے محسوسات کے جنگل میں کتنی بھیڑ ہے
ایک میں اور حادثوں کا لامتناہی دفتر عجب
فیصلہ کیسے ہو کیا ہو اپنے محسوسات کا
چل رہا ہے رات دن احساس کا نشتر عجب
تک رہی ہے جانے کس کی راہ اک مدت سے آنکھ
سینچ رہا ہے روح و دل میں درد کا لشکر عجب
کچھ نہ کچھ تو ہے لگاؤ اس کو مجھ سے اے ضیا
لے کے آیا ہے جو ہمسایہ ہاتھ میں خنجر عجب

میرا سویا ہوا احساس جگا دے کوئی
اس حویلی میں نیا دیپ جلا دے کوئی
میرا منصف کہیں سویا نہ ہو دیکھو شاید
پھر سے انصاف کی زنجیر ہلا دے کوئی
رات اک غمزدہ بیمار سی لگتی ہے مجھے
روشنی شامِ شبستاں کی بڑھا دے کوئی
درد کے ساز پہ چھیڑا ہوا نغمہ جیسے
دور سے مجھ کو سسکتی سی صدا دے کوئی
دوریاں قرب میں تبدیل ہوا کرتی ہیں
پیار کی ڈور کو آپس میں ملا دے کوئی
مجمعِ شہر میں اک شور اٹھا ہے شاید
کاش یہ بڑھتی ہوئی آگ بجھا دے کوئی
اے ضیا شہرِ خیالات میں گرمی ہے کہ دھوپ
ایسے تپتے ہوئے عالم کا پتہ دے کوئی

غزلیں

شبیر احمد قرار ۔ بمبئی

اب بھی اجالوں کی پاسبانی میں
اک لگی رہے گی پانی میں
ہم نہ ہوتے تو خاک اڑتی پھر
دور تک آپ کی کہانی میں
پتھروں کا غرور ٹوٹ گیا
اپنا دریا رہا روانی میں
زندگانی وہی دکھی سیتا!
رام تصویر میں کہانی میں
اور خانہ بدوش کیا کرتے
کھو گئے فخر لا مکانی میں
وقت سر سے گزر گیا اختر
کٹ گئی عمر خوش گمانی میں
نقطہ نقطہ یونہی نہیں مہکا
گھل گئی جان گل فشانی میں
شاعری ہے میاں مذاق نہیں
جان جاتی ہے تر زبانی میں

کرشن پرویز ۔ کھرڑ، پنجاب

کیوں خوف سا آتا ہمیں دیوار سے در سے
وہ ٹوٹا مکاں اچھا تھا اس کانچ کے گھر سے
کچھ لوگ اندھیرے میں چلے جانب منزل
ہم گھر سے نکلتے ہی نہیں دھوپ کے ڈر سے
دیتا ہی نہیں ساتھ برے وقت میں کوئی
جھڑ جاتے ہیں پتے بھی خزاں میں تو شجر سے
مسیحائی کا دعوا جو کیا کرتے تھے ہر دم
وہ لوگ بھی خاموش رہے موت کے ڈر سے
خود مٹ کے زمانے کو اجالا ہی دیا تھا
سیکھا ہے سبق ہم نے یہی شمع سحر سے
جن کو نہ ملا رنج و الم کوئی جہاں میں
گزرا ہی نہیں ایسا بشر میری نظر سے
ہے وقت ابھی بڑھتے ہوئے جبر کو روکو
پانی نہ نکل جائے کہیں دیکھنا سر سے
بچوں نے بڑے پیار سے احوال تھا پوچھا
پرویز جو لوٹے تھے کبھی لمبے سفر سے

جوآؤ ماریس روزا

مترجم :- شرجیل احمد خان
- گیا -

ندی کا تیسرا کنارہ

میرے والد ایک فرض شناس، متوازن اور دیانتدار انسان تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بچپن ہی سے ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی تھیں۔ مجھے بھی یاد ہے کہ وہ نہ تو بہت، زندہ دل تھے اور نہ بہت حسزین مزاج۔ میری ماں ہی گھر کی حکمراں تھیں۔ سارا کاروبار ان کی مرضی سے چلتا تھا۔ میری ماں روزانہ مجھے اور میرے بھائی بہن کو ڈانٹ، ڈپٹ کرتی رہتی تھیں۔

ایک دن ایسا ہوا، میرے والد نے ایک ناؤ بنانے کا حکم دے دیا۔ انہوں نے تاکید کی کہ ناؤ عمدہ اور مضبوط لکڑی کی بنی ہو جو کم از کم تیس، چالیس سالوں تک صحیح و سالم رہے۔ ناؤ میں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش ہو۔ ماں نے بہت واویلا مچایا۔ ماں نے والد سے غصہ کے عالم میں پوچھا "یک بیک تمہیں یہ کیا سوجھی ہے۔ کیا تم ایک مچھیرا بننا چاہتے ہو، یا پھر شکاری؟" والد خاموش رہے۔ ہم لوگوں کا مکان ندی سے ایک میل سے بھی کم فاصلہ پر واقع تھا۔ ندی، خاموش، گہری اور حد نظر تک چوڑی تھی۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا جس دن ناؤ بن کر تیار ہو گئی۔ والد نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ان کے چہرے پر کسی طرح کے جذبات نمایاں ہوئے انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی اور ہم لوگوں کو خیرباد کہا۔ وہ اپنے ساتھ کسی طرح کی کھانے کی چیزیں نہیں لے گئے تھے۔ مجھے امید تھی کہ ماں بہت شور و غل مچائے گی۔ لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ صدمے سے پیلی نظر آ رہی تھیں۔ ماں نے بہت خفیف آواز میں فقط اتنا کہا: "اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن پھر کبھی لوٹ کر نہیں آنا۔"

والد نے بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے بڑی ملائمیت سے میری طرف دیکھا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ماں کے خوف کے باوجود میں نے والد کے حکم کی تعمیل کی۔ ہم ایک ساتھ ندی کی طرف بڑھے۔ میرا احساس جاگ اٹھا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک عجیب

طاقت محسوس کی۔ میں نے والد سے فرطِ جوش سے پوچھا کیا آپ مجھے اپنے ساتھ ناؤ میں لے جائیں گے۔ انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ مجھے دعائیں دیں اور مجھے واپس چلے جانے کا اشارہ کیا۔ میں مڑا اور پاس ہی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا تا کہ انہیں دیکھ سکوں۔

والد ناؤ میں داخل ہوئے اور ناؤ کھیتے ہوئے نظروں سے دور چلے گئے۔ ناؤ کا لمبا اور خاموش سایہ مگرمچھ کے مانند پانی کی سطح پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔

والد واپس نہیں لوٹے۔ دراصل وہ کہیں دور گئے بھی نہیں تھے۔ وہ ندی میں ہی ناؤ کھیتے رہے۔ ہمارے لوگ خوف زدہ تھے۔ یہ کیا ہو گیا۔ ایسا واقعہ تو پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا اور نہ جس کا امکان تھا۔ ہمارے رشتہ دار، پڑوسی اور دوست احباب آئے اور اس عجیب و غریب واقعہ پر عرصے تک اظہار خیال کرتے رہے۔ سبھوں کا خیال تھا کہ میرے والد پاگل ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا گمان تھا کہ والد کسی فقیر سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کر رہے ہیں یا انہیں کوڑھ یا اسی قسم کی کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ خاندان کے لوگوں کی سلامتی کی خاطر علاحدہ ہو گئے۔ پھر بھی میری ماں اس واقعہ سے بہت شرمندہ تھیں۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی تھیں۔ انہوں نے بڑی خوبی سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا۔

ندی کے دونوں کنارے پر آباد لوگوں نے اطلاع دی کہ میرے والد نے کبھی خشکی پر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ دن رات ندی میں تن تنہا، لاوارث کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ میری ماں اور رشتہ دار اس بات پر متفق تھے کہ ناؤ میں چھپی ہوئی کھانے کی چیزیں (جو ان کی رائے میں والد نے دانستہ چھپا رکھی تھیں) کے ختم ہوتے ہی، میرے والد یا تو دور کسی انجانی جگہ چلے جائیں گے یا اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔

وہ لوگ حقیقت سے کتنے دور تھے!

یہ ہے کہ میں ہر روز کھانے کی چیزیں چرا کر اپنے و[...] کو فراہم کرتا تھا۔ واقعہ کی پہلی رات ہم سب نے کنارے آگ روشن کیا اور والد کی سلامتی کی [دعائیں] مانگیں۔ اسی رات میں بہت کبیدہ خاطر تھا۔ [...] بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ دو[...] دن صبح میں تھوڑا گیہوں اور مکئے کی روٹی اور شا[...] ڈلی لے کر ندی کنارے پہنچا۔ میں وہاں بڑی بے صبری سے گھنٹوں انتظار کرتا رہا بالآخر دور بہت دور سطحِ آب پر پھیلتی ہوئی نظر آئی۔ والد ناؤ کے ا[ندر] بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن نہ تو وہ ناؤ کھے کر میرے قریب آئے اور نہ کو[ئی] اشارہ کیا۔ میں نے ان کو کھانے کی چیزیں دکھا[ئیں] اور تب میں نے ان چیزوں کو ندی کنارے ایک کھ[...] پتھر میں چھپا کر رکھ دیا۔ یہ کام میرا روزانہ کا [معمول] بن گیا۔

بعد میں مجھے بہت تعجب ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ میری ماں میرے معمول کو جان گئی تھیں، وہ دانستہ کھانے کی چیزیں ادھر ادھر چھپا د[یتی] تھیں تا کہ میں انہیں آسانی سے چرا سکوں۔ ان[کے] دل میں جذبات کا ایک طوفان بپا تھا لیکن وہ [اس] کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔

ماں نے کھیتی اور تجارتی کاروبار میں [...] کے لیے اپنے بھائی کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے ہم

ن مناسب تعلیم کے لئے اسکول کے معلم کو مقرر کر دیا۔
ان کی ایما پر ایک تانترک والد پر سوار آسیب اتارنے
ے لئے معمور ہوا۔ وہ دیر تک جھاڑ پھونک کرتا رہا۔
الد صاحب کو خائف کرنے کے لئے دو سپاہی بھی
ھیجے گئے لیکن یہ تمام تدابیر بے سود ثابت ہوئیں۔ جیسے
یرے والد دور دور سب کی نظروں سے اوجھل اپنی ناؤ
ھیتے رہے۔ انہوں نے کبھی کسی کی بات کا جواب نہیں
یا اور نہ کسی کے قریب آئے۔ جب کچھ اخبار والے
الد کی تصویر اتارنے بجری کشتی پہ آئے میرے والد اپنی
ؤ کو ندی کے دوسرے کنارے دلدل میں لے گئے اور
ہاں اپنے کو گھنی جھاڑیوں میں چھپا دیا۔ دلدل میں
میلوں پھیلا ہوا تھا اور جن کی چاروں طرف گھنی
ھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، والد نے خود کو وہاں محفوظ
یا۔

بالآخر ہم لوگوں کو اس واقعہ کا عادی ہونا
ا۔ گو کہ ہم اس واقعہ کو بھولنا نہیں چاہتے تھے اور
بھول سکے تھے۔ میرے خیال میں میں ہی واحد شخص
ماھیں کو اس بات کا علم تھا کہ میرے والد کیا چاہتے
ے اور کیا نہیں چاہتے تھے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں
ی کہ انہوں نے کسی طرح اتنے شدید مشکلات کا سامنا
ا۔ میرے والد دن رات کڑی دھوپ ہو یا موسلادھار
رش، شدید گرمی یا یخ بستہ ہوا کا جھونکا، سر پہ
سیدہ ٹوپی اور بدن پر برائے نام کپڑا ڈالے اپنی بیکار
الخ ہوتی ہوئی زندگی سے بے خبر ہفتوں، مہینوں،
سوں، ان مصائب کا مقابلہ کرتے رہے۔ انہوں نے
خشکی یا کسی ٹاپو پر قدم نہیں رکھا۔ بلا شبہ وہ کبھی
ا اپنی ناؤ کو کوئی خفیہ جگہ شاید کسی ٹاپو سے باندھ

دیتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے تھے۔ انہوں
نے نہ تو کبھی آگ روشن کی اور نہ ماچس کی ایک تیلی
جلائی۔ ان کے پاس ٹارچ تک نہیں تھا۔ کھوکھلے پتھروں
کھانے کی چیزیں چھپا دی تھیں۔ ان میں سے بہت مختصر
سامان وہ لے جاتے تھے جو میرے خیال میں ان کی بقا
کے لئے ناکافی تھا۔ ان کی صحت کی حالت کیا رہی ہوگی؟
پتوار آگے پیچھے چلانے اور ناؤ کو قابو میں رکھنے میں کتنی
توانائی ضائع ہوئی ہوگی۔ اور وہ ہر سال سیلاب کی
زد سے کس طرح سلامت رہے جب ندی الٹتی تھی
اور اپنے ساتھ خوفناک مادوں کو مثلاً درخت کی شاخیں،
جانوروں کی لاشیں بہا لے جاتی تھیں جو اس چھوٹی سی ناؤ
سے اچانک ٹکراتے ہوں گے۔ انہوں نے کسی نفس سے
کبھی بات نہیں کی۔ اور نہ ہم نے کسی سے ان کا ذکر کیا۔
نہیں، ہم ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکے تھے۔ اگر کبھی وہ
ہمارے ذہن سے مختصر وقفہ کے لئے دور ہوئے بھی تو اچانک
ہم ان کی خوفناک صورت حال کے تصور سے چونک پڑتے
تھے

میری بہن کی شادی ہو گئی۔ ماں نے بارات نہیں
بلوائی۔ بارات کے آتے ہی غم و الم کا سماں بندھ جاتا۔ دکھ
اور درد بھری یادیں تازہ ہو جاتیں۔ جب کبھی ہم مرغن
کھانا کھاتے یا طوفانی و تند و سرد رات میں اپنے نرم نرم
بستر پہ لیٹتے، والد کی یاد آجاتی۔ ان کی شبیہ ذہن کے
پردے پہ ابھرتی کہ وہ تن تنہا، غیر محفوظ، نحیف ہاتھوں
سے اپنی ناؤ خطرات سے باہر نکال لانے کی جدوجہد کر
رہے ہیں۔ کچھ لوگ اکثر یہ کہتے میری صورت والد کی
شکل اختیار کر رہی ہے۔ لیکن میں خوب جانتا تھا کہ
اس وقت تک تو والد کے بال اور داڑھی دراز ہو گئے

[illegible]

[illegible] لاغر اور بیمار دکھتا۔ سورج کی تپش سے جسم کالا ہو گیا تھا۔ تصویر میں وہ تقریباً عریاں دکھائی پڑتے گرچہ میں نے کئی بار انہیں کپڑے [illegible] اہم کئے تھے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا والد ہم لوگوں کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ میرا دل ان کی عزت اور محبت سے اب بھی معمور تھا۔ یہ بات کہ میرے والد کو اب ہم لوگوں کا خیال نہ رہا۔ متعلق سچ تو نہیں تھا۔ لیکن اس میں سچ کا شائبہ ضرور تھا۔ یہ سچ نما [illegible] تھا کیونکہ ہمارے والد ندی میں ہمارے قریب [illegible] کیوں گھومتے رہتے تھے وہ ندی کے دوسرے کنارے [illegible] کیوں نہیں چلے جاتے تھے تاکہ نہ وہ ہمیں دیکھ سکیں اور نہ ہم انہیں دیکھ پائیں۔ والد ہی اس سوال کا جواب جانتے [illegible]۔

میری بہن کو بیٹا تولد ہوا۔ اس کا اصرار تھا کہ والد اپنے ناتی کو ایک نظر دیکھ لیں۔ ایک خوشگوار صبح ہم سب ندی کنارے گئے۔ میری بہن اپنی شادی کے سفید جوڑے میں ملبوس تھی۔ وہ اپنے بچے کو اپنی بانہوں میں اوپر اٹھائے ہوئے تھی۔ اس کا شوہر چھتری کھولے سایہ کر رکھا تھا۔ ہم لوگوں نے والد کو بلند آواز میں پکارا اور دیر تک انتظار کرتے رہے۔ لیکن وہ نظر نہیں آئے۔ میری بہن رو پڑی۔ ہم سب فرط غم سے ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب روئے۔

میری بہن اپنے شوہر کے ہمراہ دور کہیں چلی گئی۔ میرا بھائی بھی شہر کو روانہ ہو گیا۔ میری بوڑھی ماں اپنی بیٹی کے پاس چلی گئیں۔ میں اپنی قسمت پہ نالاں اکیلا رہ گیا۔ والد لاچار و بے کس، آوارہ صفت ندی میں بھٹکتے رہے۔ انہیں میری ضرورت تھی۔ گو والد نے ہم والوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ والد کو میری ضرورت تھی۔ لیکن وہ تو کب کا مر کھپ گیا تھا۔ دوسرے کسی شخص کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ جب کبھی بہت تیز بارش ہوتی کچھ لوگ اٹکل لگاتے کہ والد کو حضرت نوح کی طرح آگاہی ہو گئی تھی کہ دوسرا عظیم سیلاب آنے والا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ناؤ بنوائی۔ حقیقت جو بھی ہو میں اس غیر معمولی واقعہ کے لئے والد کو قصوروار نہیں ٹھہراؤں گا

میرے بال سفید ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یا خدا میرا کیا قصور تھا جس کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی۔ میں ضعیف و ناتواں ہو گیا تھا۔ والد کی جدائی کا درد مجھے کھائے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں بیمار ہو گیا۔ مجھے گٹھیا کا مرض لاحق ہو گیا۔ اور میرے والد؟ وہ تو بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ وہ کتنی تکلیف میں ہوں گے۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا مجبوری تھی۔ خدانخواستہ ایک دن ان کے نحیف ہاتھوں سے کہیں پتوار چھوٹ نہ جائے اور پانی کا تیز بہاؤ ان کی ناؤ کو گہری ندی میں غرقاب نہ کر دے۔ میں اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا۔ میرا امن و سکون لٹ گیا۔ مجھے رہ رہ کر یہ احساس ہوتا تھا جیسے میں نے کوئی جرم کیا تھا؟ میرا پورا وجود ایک ناسور بن گیا تھا جو ہر لمحہ رستا رہتا تھا۔ میں اس المناک واقعہ کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت تک رسائی نہیں ہوئی۔ شاید اگر حالات مختلف ہوتے تو اصلیت سامنے آجاتی۔ میں نے قیاس آرائی شروع کی کہ بات کیا تھی۔ کہاں کون سی غلطی سرزد ہو گئی۔ کیا میں پاگل ہو

تھا؟ نہیں، میرے گھر میں آج تک کوئی پاگل نہیں ہوا ہم تو اس لفظ سے نا آشنا ہیں۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو پاگل نہیں کہا۔ کیونکہ کوئی پاگل نہیں تھا۔

میں نے صرف اتنا کیا کہ ندی کنارے آیا اور ہوا میں رومال لہرایا تاکہ وہ مجھے دیکھ سکیں۔ میں اپنے پورے ہوش میں تھا۔ میں نے انتظار کیا۔ آخر وہ کچھ دور پر نظر آئے۔ وہاں دور ناؤ کے اندر ان کی بہت دھندلی شبیہ تھی۔ میں نے ان کو کئی بار پکارا۔ میں نے اپنی باتیں ان کو بلند آواز میں سنائی۔ میں نے کہا والد صاحب! آپ کو وہاں بہت دن گذر گئے۔ اب گھر واپس آجائیے۔ اب آپ کو پھر ایسی اذیت اٹھانی نہیں پڑے گی۔ آپ آجائیے میں آپ کے عوض وہاں چلا جاؤں گا۔ آپ جو بھی وقت مقرر کریں۔ آپ چاہیں تو اسی وقت میں آپ کی جگہ ناؤ میں بیٹھ جاؤں۔

انہوں نے میری بات سن لی۔ ان کو میری پیش کش منظور تھی اور اچانک میں پورے بدن سے کانپ گیا۔ انہوں نے برسوں میں پہلی بار اپنا بازو ہوا میں لہرایا تھا۔ میں پست ہو گیا۔ خوف سے میرا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ میں پاگل کی طرح بھاگا۔ مجھے لگا کہ وہ کسی دوسری دنیا سے آئے تھے اور میں معافی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بھیک ۔۔۔ بھیک!

میرے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی اور میں بیمار ہو گیا۔ پھر کسی کو ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کیا ایسی ناکامی کے بعد بھی میں ایک انسان ہوں؟ میں وہ شئے ہوں جو مجھے کبھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میری زندگی اب ایک ایسی صحرا ہے جہاں ویرانی ہی ویرانی ہے۔ زندگی ہے شاید میں خود مختصر کر لی ہے۔

میری آخری آرزو ہے کہ جب موت آئے تو میری لاش ایک چھوٹی سی ناؤ میں ڈال دی جائے کہ میں ساحلوں کے درمیان ندی میں کہیں گم ہو جاؤں ۔۔ ندی کے اندر بہت اندر سما جاؤں ۔۔۔

(بقیہ:- فرض کی صلیب)

" نہیں رمیش۔"

" اس شرط کے ساتھ یہ سودا مجھے منظور ہے کہ اگر میں جیل میں بند بھی کر دی گئی تو میری غیر حاضری میں تم میری بہنوں کی دیکھ ریکھ کروگے اور رہائی کے بعد میری مانگ میں سیندور بھر دوگے۔ کیونکہ اب تک میں نے اپنی عزت کے دامن پر کوئی داغ لگنے نہیں دیا ہے۔"

جواب میں رمیش انجلی کو پکارتے ہوئے کہا۔

" انجلی سیندور لیتی آنا۔"

انجلی جب سیندور لے آئی تو رمیش نے اس کی موجودگی میں ڈبیا سے سیندور اپنی چٹکیوں میں لے کر نیہا کی مانگ کو بھر دیا۔

اور اس طرح ایک کروڑ پتی سیٹھ جو کیکوں کے اندر لولو کینڈیوں کی چھوٹی چھوٹی پیکٹوں میں چھپا کر براؤن شوگر کا دھندا کرتا تھا۔ قانون کی گرفت میں آکر آہنی سلاخوں کے اندر بند کر دیا گیا۔

اردو لکھئے، پڑھئے اور بولئے

شہاب دائروی

قرض کی صلیب

گھومی نیلی رنگ کی ماروتی کار مانگ پر لگی بندیا کی طرح چمکتی ہوئی بے شمار کاروں، ٹرکوں، جیپوں کے درمیان روشنی کی طرح اجلی چادر اوڑھے سڑک پر دھیرے دھیرے رینگتی، رکتی آگے بڑھ رہی تھی — سڑک کے دونوں طرف فٹ پاتھوں پر انسانوں کا بے پناہ ہجوم — ہر انسان اپنے چہرے پر دکھ سکھ کی پرچھائیاں سمیٹے۔ کوئی زمانے کی ساری خوشیاں، اپنے دل میں مخمور سے خوش رنگ پھولوں کی طرح کھلا۔ کوئی اپنے غموں کے بوجھ سے کمہلا زرد پتے کی طرح مرجھایا — کوئی کچھ نہ پاکر پانے کی آرزو میں سوچ کر سمندر میں ڈوبا اور کوئی اپنے حال میں مست قلندر — یکایک آگے رستہ جام ہو جانے کی وجہ سے گاڑیاں جہاں تہاں رک گئیں۔ نیلی رنگ کی ماروتی بھی ٹرکوں اور جیپوں کے درمیان کھڑی ہو گئی اور اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی منتہا کی نگاہیں فٹ پاتھوں پر چلنے والے رہ گیروں کو ایک ٹک دیکھنے لگی۔ کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف — یکایک اس کی نگاہ [illegible] کے دائرے [illegible] ایک [illegible] مرد [illegible] کے بعد وہ چہرہ کچھ، آشنا

جس نے کبھی اس کے دل کے آنگن میں دھیرے دھیرے اتر کر اس کے دماغ میں سپنوں کا خوبصورت شہر آباد کر دیا تھا — جس شہر میں خود کو پاکر اس نے سب کچھ پا لیا تھا۔ دنیا کی ساری خوشیاں اس کی مٹھی میں بند ہو گئی تھیں — پھر وقت کا ہلکا سا دھکا کھا کر جب وہ گری تھی تو اس کے سپنوں کا شہر اس کے خیال سے اجڑ چکا تھا اور اس کی بند مٹھی کھلی تو وہ پوری طرح اندھیرے کی قید میں تھی — اپنے باپ کی اچانک موت کے بعد دو بہنوں کی پرورش کی ذمہ داریوں کا بوجھ اور افلاس کے احساس نے اس کو اس طرح توڑا مروڑا کہ وہ نڈھال بے جان سی ہو کر اپنی خودداری کے لٹ جانے کے ڈر سے رمیش کو کچھ بتائے بغیر چپکے سے اس شہر سے اس کی زندگی سے نکل کر اپنے گاؤں چلی آئی تھی۔

سچائی کا یہ مجرمانہ احساس جوں ہی اس کے دل کے گوشوں میں ابھرا — اس نے اپنی نگاہوں کو اس کے چہرے سے ہٹا لیا — لیکن چاہت کے دباؤ سے مجبور ہو کر دوسرے ہی پل اس کی نگاہیں اس چہرے پر جم گئیں، رمیش

ے کنارے کھڑا ہو کر جیسے خوابوں کے دریا میں تیر رہا تھا
گاؤں غلب جب بھی رمیش کا خیال ہواؤں کے جھونکوں
طرح اس کے دل میں سرسرآیا تھا اس کے دل کا خون پانی
کر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ زمین پہ گرا تھا اور
پکے ہوئے آنسو کی ہر بوند میں نہ جانے اس کی کتنی آرزوئیں
تی امنگیں — کتنی خواہش مٹی میں دفن ہوئی تھیں۔

گاؤں کے ماحول میں ایسا کچھ نہ تھا جو اس کے کچلے
ے احساسات اور بیقراری کا مداوا بن پاتا اور نہ وہاں
ں کی بہنوں کی تعلیم جاری رکھنے کا کوئی معقول انتظام
تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے گاؤں میں اپنی
ی بچائی زمین کو فروخت کر کے ایک نئے شہر میں داخل
ر اپنی زندگی کا پھر سے آغاز کیا تھا۔ بہنوں کی تعلیم جاری
دینے کے بعد ایک دن ایک بس اسٹاپ پر ایک لڑکی سے
ں کی ملاقات ہوئی تھی جس نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا
ا — باٹلی والا بہت بڑا سیٹھ تھا۔ وہ اپنی نگاہوں
میزان پر ہر شخص کو صحیح تول لینے میں انتہائی ماہر تھا —
پہلے پہل وہ اس سے چھوٹا موٹا کام لیتا رہا تھا — ماہانہ
خواہ بھی اس کی خاطر خواہ نہ تھی — لیکن رفتہ رفتہ
سے جیسے باٹلی والا کا اس پر اعتبار مستحکم ہوتا گیا
ں کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا تھا اور اب وہ اس
ے جسم کے ایک مضبوط بازو کی طرح اس کی سکریٹری کا
منصب پا کر اس کے وسیع کاروبار کو پوری طرح سنبھالے
ئی تھی۔ اب اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس
ے تصور کی اڑان میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنا
بنگلہ تھا۔ اپنی کار تھی — پھر بھی اس کے من کا سونا پن
سی طرح برقرار تھا۔ وہ ایسے درخت کی طرح تھی جو
پتوں سے پوری طرح خالی تھا۔ نہ اس میں کوئی پھول

تھا، نہ کوئی کلی تھی اور وہ درخت زمین پر ساکت
کھڑا رہ کر اس وقت کا منتظر تھا جب پانی کے چھینٹوں
سے وہ پھر ہرا بھرا ہو کر کلیوں اور پھولوں سے لد جائے
گا — شاید یہی ایک آرزو اس کی زندگی کی سب سے
بڑی جستجو بن گئی تھی۔

آگے کا راستہ کھلتے ہی اس کی کار چل پڑی اور
وہ چہرہ جو اس کے ذہن کو اس کے دماغ سے اڑا کر دور
دور تک لے گیا تھا جوں ہی اس کی نگاہوں کے دائرے
سے باہر ہوا — اس کا دل بے قابو ہو کر بری طرح تڑپ
اٹھا — جیسے فضاؤں میں اڑتا ہوا کوئی پرندہ شکاری کی
گولی سے زخمی ہو کر سیدھا زمین پر تڑپنے لگا ہو۔

" گاڑی کو ایک کنارے کر کے اس طرح روک لو کہ
راستہ بھی کھلا رہے۔" اس نے شوفر سے کہا۔

شوفر بڑا ماہر تھا اس نے کار کو مختلف گاڑیوں
کے آگے پیچھے کر کے ایک کنارے لے جا کر روک دیا اور نہا کار
سے تیزی سے اتر کر اس طرف چل پڑی جہاں رمیش کو اس
نے کھڑا دیکھا تھا۔ رمیش کی نگاہیں بھی اس کا تعاقب کر رہی
تھیں۔ نہا اس کے سامنے کھڑی ہوتے ہوئے کہا — " پتھر
کاٹ کر ہیرا نکالا جاتا ہے اور ہیرے کی کنی سے شیشہ
تراشا جاتا ہے — تم تعجب میں کیوں ڈوبے ہو۔ میں تمہاری
نہا ہوں —"

" مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسہ نہ تھا۔" رمیش نے کہا

" میرا ایک ایک پل کم قیمتی ہے۔ یہ کارڈ رکھ لو —
آٹھ بجے رات کے بعد میں تمہاری راہ دیکھوں گی۔"

پھر نہا اپنی کار میں بیٹھ کر کئی راہوں سے گزرتی ہوئی
بڑے بڑے ہوٹلوں میں گئی۔ کلبوں میں گئی اور سیٹھ سے مل
کر جب وہ اپنے بنگلے پر آئی تو دن کا سورج شام کے آنچل

میں اپنا منہ چھپا رہا تھا۔ اور اس کی دونوں بہنیں برآمدے میں بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں۔ نہا نے قریب پہنچ کر ان سے کہا —" جلد سے جلد کچھ لذیذ چیزیں بنا ڈالو۔"

" کوئی مہمان آنے والا ہے دیدی — ؟"

" ہاں —"

کچھ دیر بعد نہا، نہا دھو کر اس طرح نکھر گئی تھی جیسے۔ چمیلی کی پھیلی ہوئی بیلوں میں لگی لمبی لمبی نازک سفید کلیاں شبنم کے قطروں سے دھل کر اس طرح چمک اٹھی ہوں — صوفے پر بیٹھ کر وہ بار بار اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے لگی — وقت ہر پل اس کے لئے ایک جگ بنتا جا رہا تھا۔ اس کی بے قراری کا عجیب عالم تھا جیسے کہ وہ بیچ دریا میں پھنسی ساحل پانے کے لئے بے چین ہو — اور ساحل دکھائی نہیں دے رہا ہو۔ یکایک دروازے پر لگی گھنٹی بج اٹھی۔ نہا نے لپک کر دروازہ کھولا۔ سامنے رمیش کھڑا تھا۔

اپنے باپ کی حیات کے دوران نہا نے رمیش کو اپنے دل میں بٹھا لیا۔ اس کو پانے کی آرزو دیکھ کر اپنے جیون کا سب سے حسین مقصد بنا لیا تھا — لیکن یکایک حالات کا رخ بدل جانے کے بعد وہ خود اس کی زندگی سے نکل بھاگی تھی اور آج پھر اس مقصد کے حصول کی آرزو اس کے دل میں شدت سے ابھر آئی تھی —

نہا کی دونوں بہنیں بھی رمیش کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھیں — ان دونوں نے کبھی رمیش سے بھائی کا امٹ پیار پایا تھا۔ دونوں کے بیٹھتے ہی یکسوئی پا کر رمیش نے نہا سے کہا۔

" مجھے بتائے بغیر تم کیوں چلی گئی تھیں — ؟"

" تمہیں بتاتی تو کیا تم مجھے جانے دیتے — ؟"

" یہ سچ ہے کہ میں تمہیں جانے نہیں دیتا۔ لیکن میں تمہارے حال پر چھوڑتا بھی نہیں۔ اتنا بھروسہ تو مجھ پر کرنا ہی چاہئے تھا۔"

" اسی بھروسہ نے مجھے چپ چاپ نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا — میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنی زندگی کے اندھیروں میں تمہارا مستقبل تاریک کر دوں۔"

" تم اب بہت گہری باتیں کرنے لگی ہو۔"

" میری تعریف کے پل مت باندھو۔ یہ بتاؤ کہ اس شہر میں کیسے آنا ہوا — ؟"

" میں یہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان لوگوں کی تلاش میں آیا ہوں جو چاندی کی سڑک پر چل کر ان گنت نوجوانوں — نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کو گمراہ کر کے سرے راہ ان کا قتل عام کر رہے ہیں — تم چاہو تو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہو —"

" میں تمہارے کوئی کام آ سکوں اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

" میں تمہارے سیٹھ کے خلاف تمہیں سرکاری گواہ بنانا چاہتا ہوں۔"

" دفعتاً نہا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سیٹھ اس کو زمین کی گہرائیوں کے اندھیرے سے نکال کر بلندیوں کے اجالے میں لایا تھا — رمیش اس کے دل کی کشمکش کو تاڑتے ہوئے فوراً کہا۔

" تمہارا دل اگر اس بات کے لئے آمادہ نہ ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ میں کوئی بھی کلب یا ہوٹل کے منیجر پر سختی کر کے سارا راز اگلوا دوں گا۔ لیکن تمہیں اس آگ کے دریا سے نکال نہیں پاؤں گا اور میری ساری زندگی اس دکھ کے درد سے کراہتی رہے گی — "

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

ب : جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)
جلد اوّل
ر : خلیق انجم
ت : ۱۰۱۲ صفحات ▲ قیمت : ۲۵۰ روپے
ر : انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، ۲۱۲ راؤز ایونیو
نئی دہلی

اس مجلے کے ذریعہ جگن ناتھ آزاد کو خراج
ت پیش کیا گیا ہے وہ اس کے محتاج تو نہیں لیکن
ضرور ہیں۔ مستحق تو اتنے ہیں کہ ان کے شعری، تنقیدی
ی، تدریسی اور اقبالیات کی نسبت سے ان کے
ناموں کی روشنی میں یہ مجلہ بھی کم ہے۔ یہ بات اس کے
نے بھی محسوس کیا ہے اسی لئے اس پیش کش کو جلد
رار دیا گیا ہے۔

پیش نظر مجلے کی علمی و تنقیدی اہمیت تو کم ہے
اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا
ئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی علمی مشغولیات، ان کی
، تدریسی مشاغل، تخلیقی انہماک، بیرون قیام
اور اعزازات، تقریر و تحریر، مذاکرات و مباحث
کی حرکت، عوام و خواص کے تاثرات اور اس طرح
کی دوسری متعدد جزئیات کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے
اور یوں ہمیں جناب آزاد کے فکر و نظر، مزاج و کردار، عمل
اور رد عمل نیز ان کے طرز زندگی کے بارے میں ایسی باتیں
معلوم ہو جاتی ہیں جن کے علم کے بغیر آزاد کی شخصیت اور ان
کے فن کی تفہیم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے جگن ناتھ
آزاد کی شخصیت کے اتنے سارے گوشے روشن کر دیئے
ہیں کہ وہ لوگ جو اب تک جناب آزاد کو دور سے دیکھتے تھے
اب نہ صرف انہیں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان کے
جمال سے کسب نور بھی کر سکتے ہیں۔ اس پیش کش کی ترتیب و
تدوین میں نفاست، سلیقہ اور محنت کا ہی مظاہرہ نہیں ہوتا بلکہ
اس محبت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو مرتب جناب آزاد کے
سلسلے میں محسوس کرتے ہیں۔

یہ نذرانہ خلوص پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے لئے بھی
بہجت و مسرت کا باعث ہوگا اور مجھ جیسے بندگان ادب و شعر
کے لئے بھی ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ متعدد تصاویر، کتابت و
طباعت کے اعلیٰ معیار، بہترین کاغذ، نہایت نفیس گٹ اپ
اور مجلے کی باوقار تقطیع نے اس پیش کش میں چار چاند لگا دیئے ہیں

—— علیم اللہ حالی، گیا

نام کتاب: حرفِ کم دیدہ
شاعر:- ڈاکٹر محمد علی اثر
قیمت:- چالیس روپے
پتہ:- کاشانۂ اثر، محبوب چوک، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۲

ڈاکٹر محمد علی اثر مردِ میدانِ تحقیق ہیں اور کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں انہیں۔ شعر گوئی کا سلیقہ ان کے لئے اک حسنِ اضافی کا درجہ رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اثر ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور درد کو لمحہ لمحہ جیتے بھی ہیں اسی لئے ان کے اشعار آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج ہیں ؎

ریزہ ریزہ بکھر رہی ہے حیات
لمحہ لمحہ پگھل رہا ہوں میں

مجموعہ روایتی طور پر حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے۔ غزلوں کے بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی موثر نظمیں مزہ دے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اثر نے بیشتر غزلیں چھوٹی بحروں میں کہی ہیں اور بعض مشہور شاعروں کی مقبول غزلوں پر غزلیں بھی کہی ہیں اس طرح انہوں نے ان بڑی لکیروں کے متوازی ایک لکیر کھینچنے کی کوشش ضرور کی ہے جیسے ناصر کاظمی کی مشہور غزل جسے غلام علی نے گا کر حیاتِ دوام اور مقبولیت عام بخشا یعنی۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

اس زمین میں ڈاکٹر اثر نے جو غزل کہی ہے اس کا مقطع ان کے احساسات کا ترجمان ہے۔

موت شہروں میں پھر رہی ہے اثر
خیریت پوچھیے کوئی ہے ابھی

اسی طرح شاذ تمکنت کی ایک معروف غزل بھی کا ایک شعر تھا

ترے شاداب پیکر کی کھنک سن کر یقیں آیا
بدن کے زاویوں میں یوں ہنسی تقسیم ہوتی ہے

اس زمین میں ڈاکٹر اثر نے شعر کہتے ہوئے سرزمینِ دکن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

دکن کی سرزمیں سے اب بھی روشن نورِ دانش سے
دیارِ علم و فن میں آگہی تقسیم ہوتی ہے

اقبال، ناصر کاظمی، شاذ تمکنت جیسے مقبول و ممتاز شاعروں کی زمینوں میں قدم رکھنا دراصل اپنے حوصلوں کو آزمانا ہے۔ اور کہلا کہ محمد علی اثر بڑے صاحب حوصلہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی اثر نفاست، نظافت اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں اسی لئے ان کا شعر بھی اسی رکھ رکھاؤ کا مظہر ہے۔ وہ اپنے آپ کو راتوں اور راستوں کے حوالے نہیں کرتے بلکہ اپنے نام و در کا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے شاہین بلند پروازی کے باوجود نظر سوئے آشیانہ رکھتا ہے

یاد خوشبو ہے چھپانے سے کہیں چھپتی ہے
موج خود ہی بنا لیتی ہے رستہ اپنا
رات کے ساتھ اثر لوٹ کے گھر جانا ہے
راستہ دیکھ رہا ہوگا دریچہ اپنا

آبروئے دکن ڈاکٹر اثر کے مزاج میں اہلِ دکن سے اک خاص شغف پایا جاتا ہے۔ وہ دکنیات کے مسلم ماہر ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر گیان چند جیسے محققین بھی ان کے جذبۂ تحقیق کی داد دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎ علم و تحقیق کا سرمایہ دکن سے نکلا
ہر نیا باب قطب شاہ کے فن سے نکلا

(ہر صنف سخن میں اولیت کا سہرا کسی بہاری ادیب و شاعر کے سر باندھنے والے مظہر امام صاحب کو ڈاکٹر اعز کا یہ شعر پڑھ کر یہ خیال گزر سکتا ہے کہ کاش قطب شاہ بھی دھن باد میں پیدا ہوتا) اپنے اپنے مولد و مسکن سے عشق تو ہر دل میں عموماً ہوتا ہی ہے۔

ڈاکٹر اثر نے غزل کے ساتھ ساتھ مختصر نظمیں بھی کہی ہیں جن میں طویل داستانیں بند ہیں۔ جیسے

اترتی شام سے پوچھیں گے / جگنوؤں کا مزاج /
جنوں کے شہر میں / راتوں کا کیا ہوا آخر

افق پہ یوں تو سمٹ آئے تھے / نئے منظر / سلگتی
آنکھوں میں حسرت / ہراس / تنہائی

تمام شہر تماشہ بنا تھا / حیران تھا / مگر جب
آنکھ کھلی

وہی پرانے تماشے تھے اور مداری نئے۔

(پرانے تماشے)

کہیں پرانے شکاری نئے جال لے کر وارد ہوتے ہیں تو کہیں نئے مداری وہی پرانے تماشے دکھایا کرتے ہیں۔ ایک نظم کا مصرعہ "فضا یرقان جیسی چار سو ہے" اپنی جگہ ایک دنیا ہے۔ بعض مصرعے اپنی جگہ اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ پوری نظم کی کیفیت سمیٹ لیتے ہیں۔ انعام، راہ نجات، ذوق مطالعہ، کتبہ، تم اتنا جانتے ہو وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔

"حرف نم دیدہ" ہر اعتبار سے سچے تجربات، مشاہدات، اور احساسات کا دل آویز مرقع ہے۔ ڈاکٹر اثر کا یہ گمان کا خوش فہمی پر منحصر نہیں کہ ؎

نقد و تحقیق کی راہوں میں اجالے ہوں گے
کل کتابوں میں ہمارے بھی حوالے ہوں گے

نام کتاب :- عنبر لامحدود (افسانوی مجموعہ)
تخلیق کار :- ایس شمس الحسن گیاوی
پتہ :- معرفت کرن سنیما، گیا - ۸۲۳۰۰۱ (بہار)
قیمت :- ۸۰ روپے

"عنبر لامحدود" اردو کے معروف نوجوان افسانہ نگار و کہانی کار ایس شمس الحسن گیاوی کی تیسری تخلیق ہے جو آٹھ افسانوں پر محیط ہے۔ جہاں تک شمس الحسن کا تعلق ہے ان کے تعارف کے سلسلے میں مجھے صرف دو باتیں کہنی ہیں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار ..." اور خالق کا سب سے بہتر تعارف اس کی تخلیق ہے"۔

جہاں تک فن افسانہ اور فنکار شمس الحسن کا تعلق ہے۔ افسانہ کی اپنی تکنیک اور اس کے اپنے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ بڑی سبک روی سے آگے بڑھتا ہے۔ شمس الحسن گیاوی کے افسانے اپنے فنی اور تکنیکی اصول و ضوابط کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے افسانے بڑے ہی گٹھے ہوئے ماحول اور سلجھے انداز میں بچے تلے اور مناسب فضا بندی کے ماحول سے نکل کر آہستہ خرامی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ حصہ اتنا غضبناک ہوتا ہے کہ قاری پلاٹ کی دنیائے مافیہا میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور افسانہ کے اختتام پر ہی ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی نیند ٹوٹتی ہے۔ گٹھا ہوا پلاٹ، چست و درست چھوٹے مگر پر اثر جملوں کے ڈائیلاگ ماحول و کردار کی مناسبت سے ان کی ادائیگی۔ عام فہم اور روزمرہ کے استعمال کے الفاظ۔ نقطۂ عروج پر ایک عجیب سی سنسنی خیزی کا احساس اور بروقت اختتام کے ساتھ ساتھ موقعہ اور ماحول کی مناسبت سے سیاسی و سماجی اور معاشرتی و معاشی پہلوؤں کی نشاندہی نیز درسِ زندگی دیتے ہوئے وہ اپنے افسانوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہی وہ ساری خوبیاں

ہیں جو شمس الحسن کو فن افسانہ نگاری میں اپنے ہم عصروں سے بالاقد کرتے ہوئے اس بھیڑ میں ان کی شناخت خصوصی قائم کرتی ہے اور انہیں اپنے فن میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی ناولٹ "لوکی لپیٹ سے"، "سپنے بکھر گئے" یا دیگر مطبوعہ افسانے ہوں ہر جگہ آپ کو یہ خصوصیت بدرجہ اتم ملے گی۔ شمس الحسن گیاوی نے اپنی تمام تر کہانیوں میں سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی مسائل اور ان کے ناسور اور متوسط و نچلے طبقے کے مسائل زندگی کو پیش کیا ہے جس کے آئینے میں قاری اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اسے یہ مسائل اپنے مسائل محسوس ہوتے ہیں وہ ان میں ایک عجیب سا اپناپن محسوس کرتا ہے اور پھر اپنی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی عمل اور ردعمل کا سلسلہ ہے جس نے عام قاری کے دلوں میں شمس الحسن کے لئے جگہ بنا دی ہے۔

ناولٹ "غم لامحدود" جو کہ محض ۳۲ صفحات پر محیط ہے اس کی ہر کہانی چاہے وہ غم لامحدود ہو یا "ایکار"، "انتقام" آخری ملاقات" "فرض" "جیت"، یا "خودکشی" ہو ہر جگہ انسانی مسائل اس کی نفسیات کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ موجودہ اخلاقی پستی پر افسانہ نگار کے تیر و نشتر بھرے جملوں سے حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کے سارے افسانے جو اس کتاب میں ہیں اپنے فنی معیار پر پورے اترتے ہیں۔

کتاب کی زبان صاف ستھری اور عام فہم ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی الفاظ کا بے دھڑک استعمال کیا گیا ہے جس سے افسانہ نگار کو احتراز کرنا چاہیے۔ طباعت قابل قبول اور سرورق ... ہے۔ نئے افسانہ نگاروں اور فن افسانہ کو پرانی تکنیک کے شائقین کے لئے اس کا مطالعہ بہر صورت سودمند ہے۔ اس مختصر کتاب کی گرانی کے لحاظ سے قیمت زیادہ نہیں ہے۔

— سید ابوالفیض سید آبادی

بھرپور حوصلے، امنگ اور غیر معمولی
تیاریوں کے ساتھ
ماہنامہ سہیل گیا —

کلام حیدری کے فکر و فن اور ان کی
متنوع شخصیت سے متعلق

ایک ضخیم اور وقیع خصوصی شمارہ
کا اعلان کرتا ہے

تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔
اہل قلم حضرات سے تعاون کی اپیل ہے

کلام حیدری نمبر
ایڈیٹر ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ گیا

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے سہیل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا۔

بانی: حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی

بیادگار: زین العابدین آتمر و ادریس سنسہاروی

سُہیل گیا

ماہنامہ

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر

ایڈیٹر: جمیل منظر

اعزازی ایڈیٹر: خورشید ہاشمی

معاونین: شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، لقمان عزیزی

کتابت: سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ۹ جلد ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ .... ۵ روپے

زر سالانہ .... ۵۰ روپے

لائف ممبری .... ۱۰۰۰ روپے

فہرست

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل گیا

ویلیز سائڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۲۱۵۷۳

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام
ـــــ حصولیابی کے نئے نتائج

۲۰ نکاتی پروگرام کا خاص مقصد ہے غریبی کے خلاف مسلسل جدوجہد۔ ریاست میں اس پروگرام کے ذریعہ مخصوص نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اور لوگوں کی زندگی کے معیار کو بہتر سطح پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس پروگرام کے تحت سال ۹۴-۹۳ء میں حاصل شدہ کامیابیاں درج ذیل ہیں ـــــ

ــــ سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت 3،35،906 خاندانوں کو مستفیض کیا گیا۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت ۱۳۲،۰۴ لاکھ مانو دیوس کا سرجن کیا گیا۔
۱۴،۹۹ لگھو گرامین اور شلپی کرت اکائیاں قائم کی گئیں۔ ● بھومی سدھار یوجنا کے 7452.68 ایکڑ زمین کی تقسیم کی گئی۔ ● ریاست کے 3530 گاؤں میں صاف پینے کے پانی کا انتظام کیا گیا۔ ● دو بچوں کے خاندان کے اصول کے تحت 308266 لوگوں کا بندھیا کرن کرایا گیا ● بچوں کا ٹیکہ کرن پروگرام کے تحت ڈی۔ پی۔ ٹی، پولیو، بی۔ سی۔ جی کے 2،83،385 ٹیکے لگائے گئے ● 2،2،4 آنگن باڑی سنٹرز قائم کیا گیا ● مختلف یوجناؤں اور پروگراموں کے تحت 1،79،385 انوسوچت جاتی اور 1،51،309 انوسوچت جن جاتی کے خاندانوں کو مستفیض کیا گیا۔ ● بے گھر لوگوں کے درمیان 88960 رہائشی مکان تقسیم کئے گئے ● اندرا آواس یوجنا کے تحت انوسوچت جاتی اور جن جاتی کے لوگوں کے لئے 88960 مکانات تقسیم کئے گئے ● اقتصادی طور سے کمزور اور کم آمدنی والے طبقہ کے لوگوں کے لئے 58، نیز 206 مکانوں کی تعمیر اور تقسیم کی گئی ● تنگ بستیوں اور اصلاحی پروگرام کے تحت گندی بستیوں میں رہنے والے 2810 لوگوں کے لئے پانی پینے کا، سواہ انتظام، نالی سدھار، غسل خانے و پیخانے، گلی کی تعمیر، بجلی وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرائی گئیں۔

ـــ ● 54956.94 ہکٹر میں 830.55 لاکھ پودے لگائے گئے۔ ● جن وترن پرنالی کی 1737 دکانیں کھولی گئیں ● 205 گاؤں کی بجلی کاری۔ 903 پمپ سیٹوں کا بجلی سے رابطہ، 64782 چولہے قسم کے چولہوں کی تعمیر، اور 2640 بایو گیس سپلائی کی تشکیل کی گئی۔

IPRD-4175 (4-28) 94-95

نمود

ہم کیوں لکھیں

یہ اگر مان بھی لیا جائے کہ تخلیقی ادب شعوری سے زیادہ وجدانی ہوتا ہے یہ اختیاری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک اضطراری عمل کا نتیجہ ہے تو بھی جب ہماری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپتی ہیں یا ہم ان کا مجموعہ شائع کرتے ہیں اور ہمارے قارئین کا چھوٹا یا بڑا ایک حلقہ ہے جہاں سے برابر صدائے تحسین یا نوائے نفرین سنائی دیتی ہے ——— تو یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ ہمارے لکھنے کا مقصد کیا ہونا چاہئے۔ فن کار کی ذمہ داری صرف اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور جذبۂ بے نام و ارادہ کو کاغذی پیرہن دے دینے سے پوری نہیں ہو جاتی بلکہ اسے اپنی تخلیقات سے ایک ایسا نظام مرتب کرنا پڑتا ہے جہاں شعر و ادب کا سماجی مفہوم مرتب ہو سکے۔ قاری سماج کا حصہ ہے۔ وہ ہم سے کیا پاتا ہے۔ ہماری تخلیقات سے اس کی ذہنی کیفیات کی کتنی اور کون کون سی موجیں پیدا ہو سکتی ہیں پھر یہ کہ ان تموجات کا معاشرے کے افراد کے ردعمل پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ مسائل ایسے ہیں جن سے ہم پورے طور پر گریز نہیں کر سکتے۔ آواز کی ہلکی سی لہر جانے کب تک فضا میں خاموش سا ارتعاش پیدا کرتی رہتی ہیں اور اس ارتعاش کے اثرات کہاں کہاں مرتب ہوتے ہیں یہ نہایت باریک اور لطیف نکتہ ہے۔ مگر اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح ایک نظم، ایک غزل، ایک افسانے یا ناول سے ہمارا حال اور استقبال کن کن تبدیلیوں سے روشناس ہو سکتا ہے ——— یہ بات ہمارے فن کاروں کے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور رہنی چاہئے۔ اور جب ایسا ہوگا تو شعر و ادب کو ایک مثبت سمت مل سکے گی۔ اس صورت حال میں نہ صرف ہمارا معاشرہ ترقی کر سکے گا بلکہ ہمارا ادب بھی بالیدہ ہوتا رہے گا۔

مسعود منظر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
حیدر آباد

فریدہ زین کی کہانیاں

فن اور مواد میں ارتقا کی داستان

فریدہ زین کی کل ۳۳ کہانیوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ہر مجموعہ میں گیارہ کہانیاں ہیں۔ پہلا مجموعہ "سسکتی چاندنی" ۱۹۷۹ء میں چھپا تھا — دوسرا مجموعہ "دل سے دار تک" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ "اے گردش دوراں" ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا۔

ان ساری کہانیوں کو پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ فریدہ زین کی زبان، فن اور کہانی کے مواد میں مسلسل ارتقا کی کیفیت واضح ہے۔ اور اپنی بساط کے مطابق اس مضمون میں اس پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

کسی بھی فن پارے کی تہ تک پہنچنے کے لئے ان عوامل کا جائزہ ضروری ہے جو تخلیق فن کا جواز ہے۔ ان میں بہت باتیں آجاتی ہیں۔ خود فنکار کی رہتی زندگی، اس کے اتار چڑھاؤ۔ اس کا طرب و کرب۔ اس سے فنکار کے ذہن کی ساخت ہوتی ہے۔ اور ذہن کا خراج بنتا ہے۔ بکا غم ذات کے ساتھ غم دوراں کا مشاہدہ بھی ہے اور فنکا نے اسے بھگتا بھی ہے۔ کبھی تو غم ذات، غم دوراں کا حص ہی ہوتا ہے۔ اور کبھی کچھ الگ بھی۔ غم دوراں اپنے سار کرب کے ساتھ فنکار کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔

یہاں سے تخلیق کی کشمکش شروع ہوتی ہے۔ فنکا نے اگر صرف غم ذات کے اظہار ہی کو اپنی فنی تخلیق کا جز بنایا تو یہ اظہار ایک معنی میں محدود ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ یہی غم ذات اوروں کا بھی تجربہ ہے اس لئے سماج کے اس مخزوں حصے کا اپنا غم بھی ان تخلیقات میں منعکس ہوگا۔ اور یہی فنی تخلیق محدود ہی سماجی اپیل کی بنا بنے گا۔

لیکن ذاتی کرب نے چونکہ فنکار کے ذہن کو نہ صرف غم شناس بنا دیا ہے بلکہ دوسروں کے غم سے ا قدر شدید تاثر حاصل کرنے کے قابل بنا دیا ہے کہ د

دوسروں کے غم کو بھی اپنا ہی غم سمجھتا اور اس کے کرب سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طرح "غم ذات" کا ارتقا ہے۔ اس ارتقا کی اگلی منزل یہ ہے کہ فنکار ان غم انگیز عوامل کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کرے اور زندگی کو سنوارنے کے لئے جدوجہد کرے۔ زندگی جینے کے لئے ناساعد حالات سے مقابلہ ضروری ہے۔ جہد حیات ہی حیات کا حیات افروز نام ہے۔

اب فنکار کے غم کا جواز جہد حیات ہے۔ پھر یہ جدوجہد بھی فنکار کی اپنی جدوجہد پر اور انفرادی زندگی پر اب سماجی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اس لئے زندگی کے آلام کے خلاف جدوجہد کے سماجی ابعاد زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ سفر کا حصہ ہے جہاں فنکار اور ادیب مشعل جہاد ہاتھوں میں لئے سماج کے آگے آگے چلنے والی صفوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کی فنی تخلیقات اب قطرہ میں دجلہ دیکھتا ہی نہیں۔ دوسروں کو دکھانے اور پھر خود کے بہاؤ کا تعین کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

فریدہ زین کی زندگی نے بہت کرب دیکھا ہے۔ ابتدائی عمر ہی میں باپ کی رحلت دیکھی۔ ماں کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹتی دیکھیں۔ زندگی میں خلا پیدا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اس تاریکی میں جو امید کی کرن پھوٹی اور جس نے فریدہ کو حوصلہ دیا وہ زین العابدین سعید ایڈوکیٹ (مونگیر) سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہونا تھا۔ زین فریدہ کے لئے نہ صرف ایک اچھے شوہر تھے بلکہ ان کے توسن فن کو مہمیز بھی کی۔ ان کے اندر کا فنکار جو اس وقت انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا جب وہ ساتویں جماعت کی طالب علم تھیں۔ جسے والدین کی جدائی کرب لئے کچھ سلا دیا تھا۔ اب زین کی مدد سے پھر جاگ اٹھا۔ اور فریدہ نہ صرف لکھنے لگیں بلکہ خاندانی روایات بندشوں کو توڑ کر چھپنے لگیں۔

واضح رہے کہ روایتوں کی بندشوں کو توڑنے کا عنصر بھی اب ان کا مزاج میں داخل ہو گیا۔ اور اس کے نمایاں اثرات ان کی کہانیوں میں ملتے بھی ہیں۔

اور ابھی ڈیڑھ برس ہوا کہ زین نے بھی داغ مفارقت دیدیا۔ پھر فریدہ کے کوئی اولاد نہیں۔ یہاں تنہائی ہی ان کی رفیق رہ گئی ہے۔

وہ اب لال شبری میں ایک کلاوڈرن اسکول کی پرنسپل ہے اور تصنیف و تعلیم ہی ان کی دو بیساکھیاں ان کی زندگی کا سہارا ہیں۔

ان کی کہانیوں کا ایک اجمالی تذکرہ ضروری ہے تاکہ اس میدان میں ان کے توسن قلم کی جولانیوں کا جائزہ لیا جا سکے۔

"سسکتی چاندنی" کی پہلی ہی کہانی "ایک چراغ رہ گزر" میں قاری کا دیپا۔ شہاب اور اسلم کی مثلث میں محصور ہو جاتا ہے۔

دیپا اسلم کی بیوی ہے۔ شہاب اسلم کا دوست ہے۔ جنگ سے ابھی لوٹا ہے اور بہت زمانے کے بعد اسلم سے مل رہا ہے۔ اسلم کی شادی میں بھی وہ شریک نہ ہو سکا تھا۔

محسوس ہوتا ہے کہ شہاب کو دیپا سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ شہاب اپنی بھابی سے بہت باتیں کرتا، پھر دیپا کے کہنے پر وہ جانے لگا۔ لیکن فوراً واپس آ گیا اب اس کے ہاتھ میں اسلم کے ہوائی جہاز کے حادثے

میں موت کا مارتھا۔ دیبا کی مانگ اجڑ گئی۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ شاک کا نتیجہ ہے اور وہ اس سے بھی بڑے شاک ہی سے ہوش میں آسکتی ہے۔ چنانچہ شباب اپنے بازو پر پستول چلا دیتا ہے اور اس دھماکے کی آواز سے دیبا آنکھیں کھول دیتی ہے۔

اب شباب دواخانے میں ہے۔ خون کی ضرورت ہے۔ دیبا اپنا خون دے کر شباب کو بچا لیتی ہے اور خود مر جاتی ہے۔

"شام جو ڈوب گئی" میں آصف کا پیر حادثے میں کٹ گیا۔ وہ دواخانے میں ہے۔ نکہت اس کی بیوی ہے ماجد اس کا دوست۔ ماجد کو تائی سے محبت تھی۔ لیکن وہ مر چکی ہے۔ ماجد کو شبو سے پیار ہو گیا۔ لیکن شبو کی شادی کسی اور سے کرا دی گئی۔ اب وہ لاچار اور بے سہارا تھا۔ توصیف نے پناہ دی۔ ایک دن نکہت نے چائے دی۔ گرم گرم چائے گر پڑی۔ نکہت نے اُف کہا اور ماجد نے نکہت کی ہتھیلی کے نیچے سیاہ تل دیکھی۔ اسے دفعتاً شبو کا خیال آگیا اور اس نے تل کا پیار لے لیا۔ آصف کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے ماجد کو گھر سے نکال دیا۔

شبانہ (شبی) کی شادی حسن سے ہو گئی تھی اور حسن آنکھیں کھو بیٹھا تھا۔

اور ماجد المیہ کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ایک روز حسن کے گھر آتا ہے تو شبانہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ ماجد کے اندر خود غرضی ابھرتی ہے۔ حسن کے اندھے پن سے فائدہ اٹھا کر شبانہ کو لے اڑنا چاہتا ہے شبانہ

انکار کرتی ہے۔

ماجد گھر آجاتا ہے۔ پھر ایک حادثے کا شکار ہوتا ہے اور شبانہ اور حسن دواخانے آتے ہیں۔ اور ماجد وصیت کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں حسن کو دے دی جائیں۔ ماجد جو خود عشق کا مارا تھا اور اس کی زندگی تاریک تھی اب انہیں دیکھیں حسن کو دے کر اس کی زندگی کو سنوار اور شبانہ کی زندگی کو بہتر بنا دینے کے لیے قربانی دے رہا تھا۔ ماجد اور شبو کے اپنے اپنے کرب ہیں۔ "خوشی اور غم دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ یہ تو غم ہی ہے جو کبھی کبھی کبھی کے لیے خوشی کا روپ دھار لیتا ہے"۔ "جب خواب منور ہو گئیں" اعجاز شبنم نسرین اور وسیم کے درمیان گھومتی ہے۔ اس کہانی میں شبنم کا کردار قابل توجہ ہے۔ وسیم کو شبنم سے محبت ہے لیکن شبنم اعجاز سے عشق کرتی ہے اور وہ حادثہ میں مر جاتا ہے۔ اس کی بہن نسرین بے سہارا ہے۔ اور شبنم وسیم کا بیاہ نسرین سے کر دیتی ہے۔ وسیم شبنم کا نہیں ہو سکتا تھا۔ شبنم اعجاز کی یادوں سے روگردانی نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی نسرین کی بے چارگی دیکھ سکتی تھی۔

"صبح ہر رنگ میں جلتی ہے" ساری کہانی ترنم کے نام خطوں کی شکل میں ہے۔ ترنم کی شادی الیاس سے کر دی جاتی ہے لیکن ترنم کے کوئی اولاد نہیں ہو پاتی۔ الیاس کا رویہ بدلتا ہے۔ ترنم کے کہنے پر الیاس اسد جبینہ سے دوسری شادی کر لیتا ہے۔ ایسے میں ترنم کا باپ مر جاتا ہے۔ کہانی بڑے اضطراب سے گزرتی ہے۔ ندیم کو ترنم سے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن ترنم کو کینسر ہو جاتا

ہے۔ ندیم دیکھتا ہی رہتا ہے۔ فریدہ کہتی ہے "شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں آیا ہے یا مرد کے؟"

"دست حنا" بھی ایک بڑی خوبصورت کہانی ہے جس میں پھر عورت کی قربانی کو مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔

شمع کی شادی ہونے والی ہے لیکن جہیز پر تکرار کے بعد بارات واپس ہو جاتی ہے۔ شمع "دلہن تو بن سکی مگر سہاگن نہ بن سکی" اس کی بہن نگار ہے۔ نگار کی شادی کیسے ہو؟ جہیز کہاں سے لایا جائے۔ اسی دوران نوید شمع سے محبت کرنے لگتا ہے۔ لیکن شمع نے کیا کیا؟ شمیم احمد کا چھوٹا لڑکا نگار کے لئے منتخب ہوتا ہے لیکن مطلوبہ جہیز کہاں؟

شمع نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ شمیم احمد سے کہتی ہے کہ وہ خود ان کے بڑے لڑکے اعجاز سے شادی کے لئے تیار ہے جو کینسر کا مریض ہے اور زندگی کے دن گذار رہا ہے اور شمیم احمد بغیر جہیز کے اپنے چھوٹے بیٹے سے نگار کی شادی قبول کر لیتے ہیں۔

شمع نے شادی تو کر لی۔ مگر اعجاز پر آپریشن کامیاب نہ ہوا اور وہ چل بسا۔ شمع پاگل ہو جاتی ہے۔ اور نوید آنسو بہاتا نظر آتا ہے۔

"ویران ہے میکدہ" میں سحر اندھی ہے لیکن نہایت حسین۔ آفتاب ان کے گھر میں کرایہ پر رہتا ہے۔ اسے سحر سے عشق ہو جاتا ہے۔ سحر جواب ٹالتی رہی اور آخر میں اپنی سالگرہ کے دن جواب دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ کہانی میں سسپنس قابل توجہ ہے۔ سالگرہ کے دن پتہ چلتا ہے کہ سحر اندھی ہے۔

اب آفتاب کا امتحان ہے۔ سحر اس سے کہتی ہے کہ وہ صبح ہوتے ہوتے گھر خالی کر دے۔ کہیں سحر کے والدین کی امید نہ جاگ جائے کہ سحر کی زندگی بھی آفتاب سے منسلک ہو سکتی ہے اور آفتاب چلا جاتا ہے۔ آفتاب بزدل ہے —

"بے نیازی حد سے گزری" میں زیبا کی شادی جس سے ہوتی ہے وہ رخسانہ سے عشق کرتا ہے جو اس کی نہ ہو پاتی۔ زیبا ایک فرماں بردار بیوی کی طرح رہتی ہے۔ اس کی ساری کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور اس کا شوہر رخسانہ ہی کی یادوں میں مسرور رہتا ہے پھر کہانی ایک موڑ لیتی ہے۔ زیبا نے ایک چٹھی لکھی اور میکے جا کر زہر کھا کر مر جاتی ہے۔ زیبا لکھتی ہے کہ اسے بھی ظفر سے پیار تھا لیکن ظفر کے ماں باپ نے اس کی شادی کہیں اور کر دی۔ وہ بھی مجروح تھی لیکن اس نے زندگی سے صلح کر لی اور اپنے شوہر پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ اس کے شوہر کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ دوڑا جاتا ہے لیکن زیبا مر چکی تھی اور ظفر اسے کاندھا دے رہا تھا۔

"بہار دے کر خرید لے گئے ویرانے" میں مونا کا کردار ابھارا ہے۔ مونا کا باپ چار بچوں کو چھوڑ کر مر جاتا ہے۔ مونا ملازم ہو جاتی ہے اور بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ ضیا کو مونا سے عشق ہے۔ ایسے میں اکرام در آتا ہے۔ مونا اسے نکال دیتی ہے لیکن سلیما کو اکرام سے لگاؤ ہے اسے غلط فہمی ہوتی ہے مونا اکرام کو چاہتی ہے اور سلیما سے اس کا نکاح کروا دیتی ہے۔

مونا — مونا ضیاء کے گھر پہنچتی ہے۔ ضیاء بزنس سے واپسی میں ہما (ضیاء کی بیوی) کی مونا کی موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ [illegible] کی بھی حنا سے بات ہوتی ہے۔ یہاں مونا کو معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء نے شادی کر لی۔ ہما اس کی بیوی ہے اور حنا بیٹی۔ وہ ضیاء کو مونا کے نام سے پکارتا ہے کیوں کہ مونا نام اسے بہت عزیز ہے۔ حنا کی سالگرہ پر مونا جاتی ہے لیکن ضیا اسے ملے بنا حنا کو تحفہ دے کر لوٹ جاتی ہے۔ اور ساری عمر انسانیت کی خدمت میں گزار دینے کا عہد کر لیتی ہے۔

• "ایک شیشہ اور ٹوٹا" میں شانو کا المیہ ہے۔ اس کی ماں نینی تال میں پہاڑی سے گر کر مر جاتی ہے۔ باپ قلب کا مریض ہے۔ شانو اپنے محبوب ایاز سے کہتی ہے کہ شادی کر لے تاکہ اس کے باپ کی زندگی بہل جائے۔ لیکن ایاز اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا۔ ایسے میں شانو اسکول میں نوکر ہو جاتی ہے۔ جنید کو اس سے لگاؤ ہوتا ہے وہ کسی کارخانے میں نوکر ہوتا ہے۔ بالآخر شانو جنید سے شادی کر لیتی ہے۔ شہزاد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جنید مر جاتا ہے۔ اب شانو کے لئے زندگی کا سہارا محض شہزاد ہے۔ اس کی شادی سمیرہ سے کر دیتی ہے۔ لیکن شہزاد اور سمیرا بڑی بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور شانو کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں شانو کی آنکھوں میں صرف آنسو رہ جاتے ہیں۔

• "کانٹوں سے دل تو چاک سیئے": شفا کی کہانی ہے۔ اسے مضراب سے عشق ہے۔ لیکن بمبئی میں اس کی شادی ثاقب سے ہو جاتی ہے۔ ہما ان کا بیٹا ہے۔ ثاقب کا کسی حادثے میں انتقال ہو جاتا ہے اور شفا بھی آگ میں جھلس کر بدشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں نواب سے ملاقات ہوتی ہے۔ شفا مضراب سے التجا کرتی ہے کہ ہما کو اپنا لے اسے باپ کی محبت کی ضرورت ہے۔ اور دوسرے ہی دن شفا کو لاش ملتی ہے وہ ڈوب کر جان دے چکی تھی۔ اس کی بند مٹھی میں کانٹے تھے جو مضراب نے دیئے تھے۔ آخر کانٹوں سے بھی دل کا چاک سیئے جا سکتے ہیں۔

• "سسکتی چاندنی" چاند کے کرب اور اس کی قربانی کی کہانی ہے۔ چاند کو صامت سے محبت تھی۔ مگر صامت چاند کی نہیں۔ عفت پر جان دیتا تھا۔ ان کی شادی ہو جاتی ہے اور چاند اسے برداشت کر لیتی ہے۔ عفت کے بچہ ہوا۔ گڈو۔ مگر عفت جان دے گئی۔

اب گھر صامت، گڈو، امی اور چاند کے چوکھٹے میں محصور تھا۔ چاند تینوں کی خدمت کرتی ہے۔ صباحت کو چاند سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور بڑھتی ہی جاتی ہے۔ صباحت کو چاند سے محبت تھی لیکن صباحت کو چاند سے "ہمدردی" تھی اور اس کے لئے اور اس کے لئے ضرورت۔ چاند کو یہ سودا منظور نہ تھا۔ اچانک باورچی خانے میں چاند جھلس جاتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ مرتے مرتے بھی صباحت کو "بھیا" کہتی ہے اور گڈو اور امی کی امانت اس کے سپرد کرتی ہے۔

—

ـسنگی چاندنی" کی کہانیوں میں زبان کی
ے علاوہ رومانی فضا دھندلائی ہوئی سی
ہوئی تھی۔ عورت کی قربانی مرکزی خیال ہے۔
، بچے اور روایات کی پاسداری کے نام
سے کنارہ کشی اختیار کرسکتا ہے۔ ان کہانیوں
ت کا درد و کرب اور اضطراب مرکزی خیال
ہوتا ہے۔
دل سے دور تک" "دلبر" کی قربانی کی کہانی
[illegible] نائلہ اور دلبر اس کہانی کے کردار ہیں۔
ن چاہتی ہیں کہ امان کی شادی نائلہ سے کردی
. دلبر سے قربانی کی درخواست کرتی ہے۔ اب
دلبر دیکھئے۔ خالہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو
بیوہ ظاہر کرے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتی
سے کہ اس کی شادی ہوچکی ہے۔ اور ایک
روپ دھارے امان کے سامنے آتی ہے۔
برس پڑتا ہے۔ اس نے امان کی محبت
لیا ہے۔ امان نائلہ سے شادی کرلیتا ہے۔
ہوئے بھی دلبر کو کھری کھری سناتا ہے۔
خالہ کے کرداروں پر غور کیجئے۔
خوابوں کے کھنڈر" میں حمید اکرام کی بیوی مر
وہ اپنے بیٹے وحید کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہے —
یادوں کو تازہ رکھنا چاہتا ہے۔ رکشہ چلاتا
حمید کو پڑھاتا ہے۔ اب وحید کو ڈاکٹری کی تعلیم
کالج میں شریک ہوتا ہے، دو ہزار روپیہ چاہیئے
سکتے! تنے میں رکشہ والوں کے ایک مقابلے
[illegible] ہوتا ہے جیتنے والے کو ۲ ہزار ملیں گے۔

حمید اسے سنہرا موقع جان کر مقابلہ میں شریک
ہوتا ہے اور ایک بے خودی کے عالم میں رکشا دوڑاتا
ہے۔ بیوی کی یاد آتی ہے۔ ذرا جھکتا ہے۔ اچانک
حادثہ کا شکار ہوتا ہے۔ اب وہ دواخانے میں ہے۔
دونوں پیر کٹ چکے ہیں۔ انعام کسی اور کو ملا اور حمید
کو بیساکھیاں۔ اب وحید رکشا چلا رہا ہے اور حمید
بیساکھیوں کے ساتھ اس میں بیٹھا ہے۔ یہ اس کے
خوابوں کی تعبیر ہے — کھنڈر —
"چندا کی چاندنی" لاجو کے جڑواں بچے پیدا
ہوتے ہیں۔ ونے اور وجئے۔ پھر لاجو کا شوہر پریم
کارخانے میں حادثہ میں مرجاتا ہے۔ اس پر بیوگی طاری
ہے۔ نہ چوڑی کی کھنک، نہ چوڑیوں کی جھنک اور
نہ ہی پازیب کی سنگیت۔ اس کے بچے اسے ماں
ماننے سے انکار کردیتے ہیں اور کھانا بھی نہیں کھاتے
لاجو بچوں کی خاطر پھر سہاگن کا ڈھونگ رچاتی ہے
لیکن بستی والوں کو گوارا نہیں۔ چہ مگوئیاں، لعن طعن
سبھی سہتی ہے۔ پھر وہ بچوں کو لے کر نکل جاتی
ہے۔ بچوں کو رام دیال کے پاس چھوڑ کر وہ اسلم
میاں کے پاس نوکری کرلیتی ہے۔
پھر بستی میں فساد ہوتے ہیں۔ انھیں لوگوں
سے، جنھوں نے اسے گھر سے نکالا تھا، مخاطب
ہوتی ہے: "میں بدمعاش، آوارہ اور ذلیل سہی
مگر یہ وقت ایسا ہے کہ تمہیں میرے یہاں پناہ
لینی پڑے گی" تمہارا ٹھکانا تمہیں تازیانہ ہے۔
اس کے دونوں بچے فسادیوں کے ہاتھ
سے مرجاتا ہے۔ اب لاجو [illegible]

گھومتی پھرتی ہے اور کہتی ہے "دیکھو تو رے نے
وجیہ نے مجھے چندا کی چاندنی بنا دیا۔ میں چندا
چاندنی ہوں"

"دل ایک سجدہ گاہ" میں ڈاکٹر الیاس اور
نگار میں محبت ہے۔ لیکن ڈاکٹر الیاس دھوکا دیتے
اور شادی کر لیتے ہیں۔ ان کے ایک لڑکی پیدا
ہوتی ہے۔ نگار نے شادی نہیں کی اور ایک لڑکے
کو گود لے لی۔ شیبا اور ثمر میں محبت ہے۔ نگار
اس شادی کے خلاف ہے۔ الیاس شیبا کی خاطر
نگار کے گھر جاتے ہیں اور نگار کو دیکھ کر حیرت زدہ
ہو جاتے ہیں۔ نگار انہیں خوب پھٹکارتی ہے اور
اپنے لڑکے سے شیبا کی شادی سے انکار کر دیتی ہے۔
الیاس مایوس لوٹ آتے ہیں۔ نگار اپنی تذلیل کا
بدلہ لے رہی ہے۔

دوسری صبح نگار ثمر کو ساتھ لئے الیاس
کے گھر آتی ہے اور الیاس کو حیران کر دیتی ہے جب
شیبا کو بہو کہتی ہے۔ نگار نے شادی کیوں نہ
کی؟ فریدہ کو سنئے۔

"جس کی زندگی محبت ہو اور جو محبت کو عبادت
بنالے اسے شریک زندگی کی کیا ضرورت
ہوتی ہے۔"

"پلکوں کی چھاؤں میں"۔ وہ دل کے
جان لیوا مرض میں مبتلا تھا۔ باپ نے کافی دولت
چھوڑی تھی۔ دور نزدیک کے رشتہ داروں پر جی
کھول کر خرچ کیا اور خود المیہ ناولیں لکھنے لگا۔
ناولوں سے خوب آمدنی ہوتی وہ بھی خیراتی کاموں پر خرچ
کر دیتا۔ اس کا تہنیتی جلسہ ہے اور وہ قلب پر حملے
سے وہیں ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کے سارے "رشتے دار"
اس کے اثاثے پر قابض ہیں۔ ایسے میں ایک دوشیزہ
آتی ہے اور اپنا حصہ طلب کرتی ہے۔ رشتہ داروں
سے تکرار ہوتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں اس کا کیا رشتہ ہے
فنکار کے ساتھ۔ وہ کہتی ہے کہ بے غرض اور بے لوث
رشتہ ہے۔ تیزی سے الماری کھولتی ہے اور ساری
کتابیں صندوق میں بھر لیتی ہے اور اسے ٹیکسی میں رکھوا
کر چلی جاتی ہے۔ یہاں فریدہ زبان حال سے پوچھتی
ہیں ــ ادیب کس کا تھا؟ کیا وہ اپنے رشتہ داروں
کا تھا؟ اور وہ کہتی ہیں۔

"ادیب مر کر بھی زندہ تھا کسی کی پلکوں کی
چھاؤں میں۔

"منزل" کی ہیروئن آخر میں ایک کالج کے
فاؤنڈر عمران بیگ کی بیٹی ہے۔ زبردست انا کی
مالک ہے۔ اپنے حسن پر ناز بھی ہے اور شادی کر کے
ماں بن کر اس پر آنچ بھی نہیں آنے دینا چاہتی۔ رونق
سے عشق ہے لیکن شادی نہیں کرتی۔
وہ کالج آتی ہے۔ لوگ تعریفوں کے پل باندھتے
ہیں اور وہ ہوئی نکل جاتی ہے۔ حسن پہ ناز جو
ہے۔

کالج میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہے۔ آفریں
نے انعام شنید کو دیا۔ اور شنید نے انعام لیا، اور
بے التفاتی سے لوٹ آیا۔ آفریں کو حیرت ہوئی۔ اس
حسینہ کو کبھی ایسی بے التفاتی کا تجربہ نہ ہوا تھا۔
اب وہ شنید کو ساتھ لئے گھر آتی ہے

نہیں جانا چاہتی۔ شنید اسے "انتہا" کہتا ہے۔ وہ اور بھی بلا حسین ہو جاتی ہے۔ اور پھر شنید سے کہتی ہے کہ وہ جائے اور دوسرے دن وہ کالج میں اس سے ملنے آئے گی۔

دوسرے دن وہ جاتی ہے تو روشن اس کی بیوی شہلا موجود ہیں۔ اور شنید ان کا لڑکا ہے۔ گو ایک بچے کی ماں شہلا بہت حسین معلوم ہوتی ہے۔ اس سے لپٹ جاتی ہے اور پھر شنید سے حسن کو زوال ہے لیکن گھر دار اور بال بچوں سے وہ لازوال ہو جاتا ہے

"بسیرا" میں ایک کامپلکس کی تعمیر کی کہانی ہے۔ رحمت گاؤں میں مسلسل قحط کی تباہ کاریوں سے گھبرا کر کام کے لئے شہر آتا ہے۔ سے واپس آکر شادی کا وعدہ کرتا ہے۔

شہر میں "بسیرا" کی تعمیر کا کام میں لگ جاتا ہے۔ اس میں گیاریج میں رہتا ہے۔ سمنٹ کی قلت کی بنیاد پر بلڈنگ کی تعمیر کچھ دنوں کے لئے رک جاتی ہے۔ وہ گاؤں کو جاتا ہے اور نازو کو لے آتا ہے۔ دونوں شادی کے بعد اس گیاریج میں رہتے ہیں۔ ان کے ایک بچہ بھی ہوتا ہے۔

اب "بسیرا" کا افتتاح ہے۔ منسٹر صاحب آئے ہیں۔ تقریب ختم ہوتی ہے۔ لیکن گیریج کے سامنے ہو کھیدا رہے۔ گیریج ملہوترا صاحب کا برادر رحمت، نازو اور ان کا بچہ [illegible] بھنستا ہوا بچہ سردی [illegible] ہاتھ کے حوالے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دن بسنے بچے کی لاش ہوتی ہے۔ نازو چلا چلا کر رو رہی ہے

"بسیرا" لے معماروں کے لئے ہی کوئی بسیرا نہ تھا۔

گھونگھٹ کی آنچ۔ لوگ ایک طرف نواب حشمت خاں کی عیاشی کی داستاں ہے تو دوسری طرف صبا کے "گھونگھٹ کی آنچ" میں جلنے کی کہانی ہے۔ یا کہئے گھونگھٹ کی آنچ میں جلا دینے کا زمانہ ہے۔

گھر سے دلہن رخصت ہو گئی۔ صبا بت بنی کھڑی تھی۔ احمر پھولوں کا گچھا دیتا ہے "رونمائی" کا تحفہ فوزیہ صبا کو ستانے پر تلی ہوئی تھی۔ رونمائی چھیڑ چھاڑ ـــــ

ادھر حشمت نواب "نئی امی" پر "نئی امی" لاتے ہیں۔ شراب و کباب میں مست ہے۔

فوزیہ، صبا کے لئے احمر کا پیام لاتی ہے لیکن حشمت نواب دھوم دھڑکے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوں میں نہیں۔ کہتے ہیں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ احمر پڑھائی سے لوٹ آئے دیکھا جائے گا۔ فوزیہ چلی جاتی ہے

احمر واپس آتا ہے۔ اب حشمت نواب اور بھی خستہ ہیں مگر ٹھاٹ باٹ باقی، صبا کی شادی تو نہیں کر سکتے اور احمر انتظار ہی کرے؟ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ حشمت نواب احمر سے "بدلہ" لینے کے لئے ایک اور بیوی لاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے سیج تیار رہے۔

اب کہانی کا سب سے دردناک حصہ آتا ہے

... سفوری اس بیچ پر سو جاتی ہے۔ زہر کھا لیا
... میں ایک خط ہے۔ نواب حشمت خاں نے
... "انتقام" میں اپنی شادی رچائی تھی۔ اب وہ
... میں بدل جاتا ہے۔

"لہو کے رنگ" کہانی ہے اگر ایک عورت
... کی تو ایک دوسری عورت کی قربانی کی۔ انجم کو
... سال ہوئے آفاق سے شادی ہوئے۔ مگر اولاد
... رہے۔ آفاق فیکٹری میں ملازم ہے۔ مسز خان
... میں گویا یہ دار ... ہے تاکہ انجم کو بہلانے کے لئے
... ہو۔ مسز خان کی جوہی انجم سے گھل مل جاتی ہے۔
... خان دہلی جاتی ہے۔ انجم ہی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔
ایک دن جوہی گر پڑتی ہے۔ زخمی ہوتی ہے،
... بہتا ہے۔ انجم نے اپنا خون دیا اور جوہی بچ گئی۔
مسز خان دہلی سے واپس آگئیں۔ سحر کو زخمی
... انجم پر برس پڑیں اور گھر سے نکال دیا۔
فریدہ نے تحقیق میں انجم کا خون جو جوہی کی رگوں
... گیا وہ صرف پانی تھا؟

"... شبنم" میں غروب ہوتا ہوا سورج
... شفق کی لالی سورج کے قتل کا گمان پیدا کرتا ہے
... کہانی کی روح ہے۔ اور روحا کے عشق کے
... کی علامت۔

روحا کو عدنان سے عشق ہے۔ لیکن عدنان
... میں شریک ہو جاتا ہے۔ لڑائی پر جاتا ہے۔ گرفتار
... ہے لیکن فرار ہو کر ایک بوڑھے کے گھر پناہ لیتا
... بوڑھے کے ... اور اس کی مہربانیوں سے متاثر
... کر ... خاتمہ کر لیتا ہے۔

ادھر روحا کی شادی ... سے کر دی
جاتی ہے۔ مگر وہ تو عدنان کے عشق میں دیوانی ہے۔
وہ اس پہاڑی پر جاتی ہے جہاں سے "سورج کے قتل"
کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ پیچھے سے عدنان آتا ہے اور
سحر ساتھ تھی۔ عدنان سے روحا کہتی ہے "تم نے
سحر کو اپنا کر محبت کو عبادت کا درجہ دیدیا" اور مر
جاتی ہے۔

اس مجموعہ کی آخری کہانی "... اور ہم اکیلے
ہیں" ایک پھول بیچنے والے کی المیہ داستان ہے۔
میم صاحب روزانہ اس کی دکان کے سامنے موٹر
روکتیں۔ وہ سفید گلاب دیتا اور وہ چلی جاتی تھیں۔
یہ روز کا معمول تھا۔ اور اس لڑکے، سفید گلاب
اور میم صاحب کا ایک مثلث بن گیا تھا۔
پھر میم صاحب کئی روز تک نہیں آئیں۔ لڑکا
خود سفید گلاب لے کر ان کے گھر جاتا ہے۔ میم صاحب
کی شادی ہو رہی ہے وہ بلاتی ہیں اور اس سے سفید
گلاب لے لیتی ہے۔ اب لڑکے کا روزانہ کا معمول
بن گیا تھا کہ وہ میم صاحب کے پاس سفید گلاب پہنچائے۔
ایک دن میم صاحب نے لڑکے کو جھڑک دیا۔
اور نکال دیا۔ انہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ ان کا
کوئی اولاد نہیں اور گود پھول سے خالی ہے
اب اس پھول بیچنے والے نے دل سے دعا کی کہ
میم صاحب کی گود بھر جائے۔
دعا قبول ہوئی۔ میم صاحب کو بچہ ہونے کو
ہے۔ پھول بیچنے والے کی تلاش ... اور
ادھر پھول ... کے ...

پہنچ گیا۔
مگر...... بچہ مزید بیدا ہوا۔ سفید گلاب۔
اور میم صاحب اللہ کو پیاری ہو گئیں۔
اب پھول والے کا روز کا معمول ہو گیا کہ میم صاحب کی قبر پر سفید گلاب چڑھاتے اور گھر جا کر ان کے سفید گلاب کو سینے سے لگائے۔
بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے اور "سسکتی چاندنی" کی کہانیوں کا "دل سے دراز تک کہانی سے مقابلہ کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ فریدہ نے کردار سازی کے فن میں ترقی کی ہے اور جب کہ عنوان عشتی نے کہا ہے کہ "سسکتی چاندنی" میں فریدہ رومانہ کے دھندلکوں میں ہے۔ اور دل سے دراز تک" والی کہانیوں میں وہ ان دھندلکوں سے نکلتی محسوس ہوتی ہیں۔
رومانہ کی قدرے دونوں ہی مجموعوں میں مشترک ہونے کے باوجود اب سفر دل سے شروع ہو کر شاید دراز تک جاتا ہے۔ "سسکتی چاندنی" میں اگر صرف عورت کی قربانی اپنی جگہ ہے لیکن اب فریدہ مرد کو بھی چھپاتے بتاتی ہیں۔ اور عورت قربانی صرف جان دے کر نہیں رہتی بلکہ اپنے آپ کو ستم رسیدہ انسانوں کی خدمت کے لئے وقف کر کے بھی دیتی ہے۔ یہی تو نگار نے کیا الیاس کو چھپانے کے لئے چھوڑ کر خود سماج کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتی ہے
" اے گردش دوراں" فریدہ کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۱ء میں مرتب ہوا۔ اس کا انتساب خود فریدہ کے ادبی سفر کے نئی منزلوں سے آشنا ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔
انتساب،
کاروان حیات کے نام
جو
سفر سے منزل تک، جذب سے کرب تک نقطے سے حرف تک، احساس سے تپش تک، روشن صبح سے مایوس شام تک کی تمام راہوں پر گامزن ہے"
ارتقا ہے، لیکن ابھی فریدہ حالت سفر میں ہو منزل کا نشانہ ابھی امید کی خوشی میں تبدیل نہیں ہوا ہے جذب سے کرب تک پہنچی ہیں اور یہاں ذاتی کرب سے کرب دوراں تک پہنچی ہیں، نقطہ سے شروع کیا تھا حرف تک آگئی ہیں۔ احساس جو ہوا وہ تپش بن چکا ہے۔ اور احساس کی یہ کیفیاتی تبدیلی فریدہ کی اپنی کشمکش حیات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ابھی فریدہ نے روشن صبح سے اپنا سفر شروع کیا ہے اور شام غم تک ہی پہنچی ہیں یعنی ان کا سارا دن کشمکش حیات میں گزر گیا اور ابھی آسودگی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اب اگلی منزل شام غم سے آگے بڑھتے، رات کی تاریکی میں دیا جلانے اور اگلی صبح کو پچھلی صبح سے کیفیاتی طور پر بدلی ہوئی دیکھنے کی ہے۔ یہ صبح امید ہے۔ تمنا کا اگلا قدم رکھنا ہے۔
تیسرے مجموعہ کی کہانی " اے گردش دوراں" پہلی کہانیاں ہیں اور اس سفر کی اگلی منزل کی

بشارت دیتی ہے۔ گلابو کی ماں سخت بیمار ہے۔ گلابی ابھی بچی ہے ماں کی جگہ کام کرتی ہے۔ ماں کا علاج ممکن نہیں ہے، پیسہ نہیں ہے۔ کبھی کبھار کسی مہمان نے کام سے خوش ہو کر دو روپے بخشش دیے تو وہ کچھ اچھا کھانے کے شوق میں گھر جاتی ہے لیکن ماں کی ضرورت زیادہ ہے اور وہ دلیاں لانے چلی جاتی ہے۔

دیکھئے بڑے گھر والوں کے تیور۔ ناشتہ کی ٹیبل سے صاحب خانہ کی بچی لکی کے ہاتھ سے جاپان کا خوبصورت گلدستہ چھوٹ گیا اور ٹوٹ گیا۔ مگر بڑی صفائی کے ساتھ الزام گلابی کے سر تھوپا گیا۔ اور اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا گیا۔

اب گلابی بھی بدل رہی ہے۔ لکی فیس کے پیسے چھوڑ کر ہی اسکول چلی گئی۔ یہ پورے ساٹھ روپے تھے۔ گلابی نے انھیں اٹھا لیا اور رحیم چاچا کے رکشا میں ماں کو لے کر دوا خانے چلی گئی۔ وہاں لائن لگی تھی۔ اور پھر ماں کو ایمرجنسی وارڈ لے جایا گیا۔

ایسے میں صاحب خانہ دندناتے آتے ہیں۔ گلابی پر چوری کا الزام لگا کر مارتے پیٹتے ہیں۔ وہ گڑگڑاتی ہے۔ چوری نہیں کی۔ ماں کے علاج کا سوال تھا۔ پھر اطلاع ملی کہ ماں گزر گئی۔

اب گلابی بدل چکی تھی۔ اس نے غصے میں بچے ہوئے اٹھائیس روپے بڑے سرکار کے منہ پر دے مارے اور رحیم چاچا سے لپٹ گئی۔ وہی اس کا آسرا تھے۔

گلابی انگور ہے۔ یہ پودا بڑھنے کے بعد سورج کی تمازت کا مقابلہ بھی کرے گا اور رستی چھاؤں میں دوسروں کی حفاظت بھی کرے گا۔ گلابی ہی کل کی مجاہد عورت ہے۔

"کوہکن" بھی بڑی دل کو چھو لینے والی کہانی ہے اور سماج کے کسی کوستانے کا کتنے ڈھنگ ہوتے ہیں قاری کو نظر آنے لگتے ہیں۔

عامر ہے۔ اس کی ماں ہے اور شیلو بہن ہے گھر بھی چلے اور شیلو کی شادی ہو۔ سخت پریشانی ہے۔ عامر کو کام نہیں ملتا۔

پھر عامر کو کام ملتا ہے۔ راتوں کا کام ہے۔ کالا دھندا ہے۔ سیٹھ سلیمان کے اسمگلنگ کے دھندے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پیسہ کما رہا ہے۔ لیکن عین اس وقت جب نیلو کی شادی ہو رہی ہوتی ہے اور بارات آتی ہے۔ پولس عامر کو گرفتار کر لیتی ہے۔ بارات واپس ہو جاتی ہے اور عامر کو چھ مہینے کی سزا ہو جاتی ہے

جیل سے وہ واپس آتا ہے ماں مر چکی ہوتی ہے لیکن سیٹھ سلیمان نے اس کے لئے خوشنما مقبرہ بنوا دیا ہے۔ جسے زندگی میں بوریا نصیب نہ تھا اسے مرنے کے بعد سنگ مرمر ملا۔

عامر کا دوست اور شریک کار شرما اسے شراب خانے لے جاتا ہے اور وہاں نیلو ایک رقاصہ کے روپ میں شراب کا جام لئے آتی ہے۔ عامر پاگل ہو جاتا ہے۔ نیلو اور شرما دونوں کو قتل کر دیتا ہے۔

— باقی آئندہ —

شیریں اختر
گیا

سید احمد قادری کی افسانہ نگاری

(ریزہ ریزہ خواب کے تناظر میں)

دورِ حاضر کے افسانوی ادب میں سید احمد قادری صاحب کے بیس افسانوں کا مجموعہ "ریزہ ریزہ خواب" ایک قابلِ قدر اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ غیاث احمد گدی کے الفاظ میں

"جدید تر اردو فکشن کی دنیا میں سید احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظام کے نام پر ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔

اظہار بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا ذروبست، تہہ در تہہ زندگی کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سید احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔"

انسانی زندگی کے آئے دن نئے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ عام انسان انہیں نظر انداز کر جاتا ہے [illegible] حساس ہوتا ہے، وہ ہر معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر مضمر راز کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کو الفاظ کے تانے بانے سے بن کر اس ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی تحریر میں دلآویزی اور دلکشی قائم رہے۔ سید احمد قادری کے افسانے اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی سچی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ تصویرِ زندگی پیش کرنے کے ساتھ تعمیرِ زندگی کا مقصد بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

سید احمد قادری کے یہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ انہوں نے پریم چند کی طرح انسانی زندگی کو اپنے فن کی بنیاد بنایا ہے۔ مظلوم، پچھڑے، متوسط طبقے کے اجتماعی کرب کو انہوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور طبقاتی استحصال کے نتیجے میں انسانی محرومیوں اور مجبوریوں کی داستان سنائی ہے۔ مجموعے کا پہلا افسانہ "خشت خشت" ہمارے آج کے مادیت پرست

دور میں [illegible] جینا سب بے ہم زندگی کو بڑی خوبصورتی سے ابھارا گیا ہے۔ وہ شہر جہاں سکون و قرار مقصود ہے اس کرب کی شدت کو افسانہ نگار نے چند جملے میں اس طرح پیش کیا ہے۔

شاید شہر کا مطلب ہی یہی ہے۔ جھوٹ، فریب، دھوکہ، جبر و ظلم اور استحصال، اذیت و درد، کرب — کہاں نجات ہے ان سے۔ خوشیاں شہر سے رخصت ہو چکی ہیں۔

اس طرح سرخ جوڑے، بند آنکھوں کا سپنا، آنگن کی بات وغیرہ افسانوں میں موجودہ سماج کے افراد کی بے حسی، بھوک، افلاس اور انسان کی ناکام حسرتوں کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ بے وطنی اور اپنی سرزمین سے دوری کا کرب کیسا ہوتا ہے اس کی دردانگیز تصویر افسانہ "لمحوں کی بازگشت" میں نظر آتی ہے۔ فاصلہ قریب کا، تقسیم وطن سے ابھرنے والے مسئلے پر لکھا ایک پراثر افسانہ ہے۔

'ریزہ ریزہ خواب' کے بیشتر افسانوں میں قارئین کی ذہنی اصلاح کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام دینے کی خواہش بھی ترشی نظر آتی ہے۔

مثلاً "میں کامیں" میں ایک مخصوص معاشی ماحول میں انسان کے ضمیر کے خارجی اور داخلی کوائف کو بیان کیا گیا ہے۔ 'فریب' میں افسانہ نگار نے انسان کی ایک خاص نفسیاتی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے۔ اس افسانے پر فرائڈ کا اثر نمایاں ہے۔ اس طرح 'احساس' میں اس خیال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اخلاقی اور نفسیاتی کمزوریوں کی خاطر کبھی کبھی انسان ایسے اعمال بھی کر گزرتا ہے جس کے لئے بعد میں اسے پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ 'قیدی' میں سرمایہ دارانہ کے غیر اخلاقی رویوں، دن بہ دن ان کے بڑھتے مظالم اور مزدور بچوں کو روندتے ہوئے ان کے ا کی تصویر کشی حد درجہ نمایاں ہے۔

سید احمد قادری کے افسانوں میں موضوعا طرح کرداروں میں بھی تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے سم مختلف طبقے کے اعلیٰ و ادنیٰ کرداروں کو ان کی مخت منفرد صفات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے افس میں عورت کا کردار کئی روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے کی فطرت میں چھپا درد، جذبۂ ایثار، اس کی ما بے بسی، اس کی محبت اور بے وفائی سبھی افسانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی عورت بعد میں ح شکار ہو کر داشتہ، طوائف اور کال گرل کے بھیس نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں 'سرخ جوڑے' 'سپنے' خواب' 'اجنبی راہیں، انتظار، لمحے درد کے قابل ذ افسانے ہیں۔

سید احمد قادری بیانیہ کے اسلوب سے واقف ہیں۔ بقول شفق :-

"سید احمد قادری بیانیہ کے اس پل صراط کامیابی سے گزر جاتے ہیں جس پر اکثر جد نگار قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور ر کوشش انھیں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر

اداسیاں، اس مجموعے کا بے حد کامیا ہے جس میں غیاث احمد گدی کے اسلوب کی جھلک 'یادوں کا المیہ' میں زندگی کے بیتے ہوئے قیمتی، ا خوشگوار اور ناخوشگوار لمحات کو شعور کی رو کی تکنی ذریعہ اظہار کی زبان دی گئی ہے۔ بقول کلام حیدری

نعمان شوق
آرہ

یہاں سب خیریت ہے

دور دیس میں رہنے والے دوست کی چٹھی
اکثر آتی رہتی ہے
گاؤں کی حالت پوچھی ہے
اس بار بھی اس نے
کیا بتلاؤں کس مشکل میں جان پھنسی ہے
سوچ رہا ہوں کیا لکھوں

یہ لکھ دوں کہ
نیم کے پیڑ پہ بیٹھی
میٹھے میٹھے گیت سنانے والی مینا کو
اجگر نے نگل لیا ہے
جس املی کے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے
ہم اور تم
پہروں کھٹی میٹھی باتیں کرتے رہتے تھے
اس پیڑ کے نیچے دھونی رمائے
اب اک سادھو
دن بھر گانجا پیتا رہتا ہے

چھوٹی سی وہ لالہ جی کی چنچل لڑکی
مکتب میں جو اپنے ساتھ پڑھا کرتی تھی
کل مٹی کا تیل چھڑک کر
آگ لگا دی اس کو
اس کے شوہر نے

اور اپنا وہ ہمدم
جو اسکول میں ہر سال اوّل آیا کرتا تھا
بیکاری سے اکتا کر
پرسوں اس نے جان گنوادی
ریل کے نیچے آکر

یا پھر لکھ دوں
آنکھ جو پہلے کھلتی تھی
آواز اذاں کی سُن کر
اب بم کے دھماکوں سے کھلتی ہے

باد صبا اب
چھیڑ نہیں کرتی ہے
دھان کی بالی سے

ہاں!
گرم ہوا کے جھکڑ چلتے رہتے ہیں

آسمان پر
ابر تو چھاتے ہیں لیکن
کھیتوں میں زہریلی بارش ہوتی ہے
دودھ نہیں آنسو گرتے ہیں
ماؤں کے پستانوں سے
کہاں بچا ہے خون کا کوئی قطرہ بھی شریانوں میں
دہقانوں کے بچے بن گئے خود سرسوں کے پھول

چھوٹے سے اک خط میں
آخر کیا کیا لکھتوں
سوچ سوچ کے میں تھک گیا اب یار
"گاؤں میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"
ایک ہی جملہ لکھ دیتا ہوں
چٹھی میں ہر بار —

پانچ نظمیں

محمد خطیب القادری حمیدی
مظفرپور

(۱) آج اک تصویر میں
عیسیٰ کو آویزاں
صلیب و دار پر
دیکھ کر ایسا لگا
جیسے میں ہی عیسیٰ ہوں
خود صلیب و دار بھی!

(۲) خموشیوں کے
آسماں میں
کھو گئی جب
ہر صدا
خموشی میری
بن گئی خود
ایک آفاقی نوا

(۳) یہ مقام عشق ہے
ذات کے عرفان کا ہے مرحلہ
یا ہے اک سوز جنوں کا سلسلہ
جو بھی ہو
ہے بہت ہی جانگسل
اپنے ہی وجود کو
قطرہ قطرہ
پگھلتے ہوئے دیکھنا

(۴) تاریکیوں کے دار پر
لٹکی ہوئی یہ روشنی
مر نہیں سکتی کبھی
لڑ رہی ہے
وہ اندھیروں سے ابھی
اور لڑتی جائے گی
روشنی ہی روشنی
روشنی ہی روشنی

(۵) اب ہمارا یہ شعور
ہر تخیل
ہر تصور
اور ہر اک لفظ سے
اس کے معنی سے پرے
ہو گیا ہے! شاعری اب کیا کروں
اس لئے رہتا ہوں چپ
پھر بھی میری خامشی
ہے لطیف اک شاعری!

فضا ابن فیضی
مئو ناتھ بھنجن

غزل

آگے پیچھے، موت کا لشکر، زندہ رہنا
اوڑھ کے، خاک و خوں کی چادر، زندہ رہنا

غنچوں کے تابوت، نگاہوں کے یہ جنازے
سخت سہی، موسم کے تیور، زندہ رہنا

سلگائے ہیں، وقت نے اپنے آذر خانے
ہر شعلہ ہے قد کے برابر، زندہ رہنا

خود کو سمجھو، آتش خوار پرندہ، لوگو!
کیا مشکل ہے آگ کے اندر زندہ رہنا

چاروں جانب، سایوں کی لاشوں کے ٹکڑے
پھینک چکے، وہ دھوپ کے خنجر، زندہ رہنا

یہ گل پوشی، یہ اعزاز، فضیلت ایسی
زخموں کی دستار ہے سر پہ، زندہ رہنا

فکر نہ کرنا، چھن جائیں جو خال و خط بھی
بے چہرہ، بے صورت پیکر، زندہ رہنا

بیداری کے لمحوں میں تو، زہر گھلا ہے
خیر ہے خوابوں کا بالش بستر، زندہ رہنا

رستے کو دیوار کیے، چپ چاپ کھڑا ہے
ہمسائے کا بھاری پتھر، زندہ رہنا

تہذیبوں کا قتل، معیشت کی بربادی
یہ منظر، یا وہ پس منظر، زندہ رہنا

پروازوں کو اونچی رکھنا، شرط جنوں ہے
تیز ہوائیں، کھول کے شہپر، زندہ رہنا

تم ہو خود اک گہری جھیل، پریشانی کیا
پیاس بہت، دریا مٹھی بھر، زندہ رہنا

مشکل ہے تفہیم، تمہاری شخصیت کی
آنکھیں صحرا، ذہن سمندر، زندہ رہنا

جو آوازیں گونگی ہیں، وہ کب مرتی ہیں
میرے حرفو! دانش دفتر، زندہ رہنا

فردوسِ آئندہ کی تشکیل کی خاطر
پالو اسی دوزخ میں جاکر، زندہ رہنا

غزلیں

انجم بھاگلپوری۔ برہان پور

بلندیاں ہیں بہت فکر کی اڑانوں میں
زمیں کرتی ہے پرواز آسمانوں میں

لکھے گا جب کوئی تاریخ سرفروشوں کی
ہمارا ذکر بھی آئے گا داستانوں میں

نہ فکر حال کی ان کو نہ خوف مستقبل
غضب کا جوش ہے ساقی ترے دیوانوں میں

ہر ایک چہرہ ہے اک درد و کرب کی تصویر
یہ آگ کس نے لگا دی ہے آشیانوں میں

اناج کی جگہ کھیتوں میں بھوک اگتی ہے
غریبی اب تو رہا کرتی ہے کسانوں میں

یہ کون وقت کے ہاتھوں میں لٹ گیا انجمؔ
شکستہ دل کی صدا گونجتی ہے کانوں میں

سید احمد سحر۔ شاہجہانپور

کب تک آخر یہ ظلم دیکھوں میں
بزدلی ہے جو کچھ نہ بولوں میں

پھول اگتے ہیں کانٹے بو کر بھی
اپنی منطق ہے کیسے مانوں میں

تھا یہیں پر کہیں تو گھر میرا
نئی بستی میں کس سے پوچھوں میں

یاد یاراں چراغ درد جلا
توڑ دوں شام غم کا افسوں میں

رکھ لوں آنکھوں میں عکس اُن کے حسیں
اور پھر آنکھیں بند کر لوں میں

زندگی اور کیا ہے اس کے سوا
وہ مجھے چاہے، اس کو چاہوں میں

تھی یہ قسمت کہ خون دل سے سحرؔ
داستانیں بہار لکھوں میں

غزلیں

اسعد رضوی ۔ مظفر پور

بچھڑ کے رونے لگی تیرگی فضاؤں سے
چراغ لڑتا رہا سر پھری ہواؤں سے
جنوں کی حد سے گزر کر خرد کی منزل پر
وہ درد دل تھا جو نکھرا گیا دواؤں سے
یہ تشنگی بھی بدل جائے گی تجسس میں
ہمارے شہر کا گر رابطہ ہو گاؤں سے
میں ایک ذرہ خاکی مری حقیقت کیا
بلندیاں تو ملیں آپ کی دعاؤں سے
بہت دنوں سے کسی بد نظر کی زد میں تھا
حصار توڑ کے نکلا ہوں میں بلاؤں سے
یہ اس کے عشق کی معراج ہے اسعد رضوی
وفا کی آرزو کی جس نے بے وفاؤں سے

شبیر احمد قرار ۔ بمبئی

اپنا عدم وجود برابر نہ ہو کہیں
سانسوں کا کھیل خواب کا منظر نہ ہو کہیں
رہ رہ کے ریگ زار [illegible] میں دیکھنا
مٹھی ہوا کے ہاتھ میں پتھر نہ ہو کہیں
رگ رگ میں بس گئی ہیں کئی بد گمانیاں
جو ساتھ ہے یہ غم کا لشکر نہ ہو کہیں
ویسے بھی اعتبار کی حالت خراب ہے
اپنے لہو کی زد پہ مرا سر نہ ہو کہیں
کاغذ کے گھر میں چین کی بنسی بجائیے
لیکن ہوا کا نام بھی چھت پر نہ ہو کہیں
کیسا قلق ہے پاؤں بھی ٹکتے نہیں یہاں
ہر حال میں زمیں ہی بستر نہ ہو کہیں
شک اندھا ہوں خوف بچھاتا ہوا گیا
ہر لمحہ اضطراب مقدر نہ ہو کہیں

● ابوالخیر نشتر بتیا

یہ شہر سیاست ہے، بتا کیوں نہیں دیتے؟
منصف ہو تو قاتل کو سزا کیوں نہیں دیتے؟
گر عزم بھی رکھتے ہو دکھا کیوں نہیں دیتے؟
پتھر پہ کوئی پھول کھلا کیوں نہیں دیتے؟
یہ وقت کے طوفان پہ گرجتے ہوئے بادل!
ہستی سے مرا نام مٹا کیوں نہیں دیتے؟
مانگے کے اجالوں سے کہاں روشنی ہوگی!
یہ بات پڑوسی کو، بتا کیوں نہیں دیتے؟
چہرے پہ کئی داغ لئے گھوم رہا ہے!
اس شخص کو آئینہ دکھا کیوں نہیں دیتے؟
موسم کی طرح رنگ بدلتے ہوئے انساں!
بے نور اجالوں کو ضیا کیوں نہیں دیتے؟
خود ساختہ چہروں پہ جنہیں ناز بہت ہے
اس عہد پریشاں کو سجا کیوں نہیں دیتے؟
اے فتنہ و فسادوں کے شہر بانٹنے والو!
تم اپنے مقدر کو جگا کیوں نہیں دیتے؟
ساحل کے تماشائی بھی خاموش ہیں نشتر!
ہم ڈوبنے والوں کو صدا کیوں نہیں دیتے؟

کیا لطف محبت کا جو الزام نہ آئے
تو قیر سحر کیا ہے اگر شام نہ آئے
خوشبوئے محبت سے مرے شعر نہ مہکیں
گر میرے تصور میں وہ گلفام نہ آئے
چمکیں نہ کبھی جس میں تری یاد کے جگنو
ایسی مری قسمت میں کوئی شام نہ آئے
وہ پیکر سیماب محبت کے سفر میں
آئے تو مگر لرزہ براندام نہ آئے
میں فکر کے اس دشت حقیقت میں کھڑا ہوں
بھولے سے جہاں گردش ایام نہ آئے
اک عالم احساس میں چھوڑ آئے ہیں تجھ کو
محفل سے تری آئے تو ناکام نہ آئے
تاریخ ہے شاہد کہ ہر اک دور میں ہم لوگ
سولی پہ تو لٹکے ہیں تہ دام نہ آئے
افسوس کہ ہم جنت گم گشتہ کی جانب
صدیوں کی مسافت میں بھی دو گام نہ آئے
میں ذات کے صحرا میں بھٹکتا رہا ساجد
موسم کے اشارات مرے کام نہ آئے

● ساجد خیرآبادی — خیرآباد

غزلیں

کفیل انور، آرہ

خوف ہر لمحہ اک پل مجھے اس بات کا تھا
میرے پیچھے میں تھا زہر بھری ذات کا تھا

عکس اس کا تو سمندر کی تہوں پر تھا جما
چاند زندانِ شب اپنے طلسمات کا تھا

پھر پلٹ آؤں گا اک روز خود اپنے ہی قریب
وہم کچھ ایسا بھی اس دل کے خیالات کا تھا

لوحِ تنہائی کے غاروں میں بسی تھی تسکین
حوصلہ مجھ کو ہی وہ میرے جذبات کا تھا

جانے کیا اس نے مقدر میں لکھا تھا انور
فیصلہ اپنوں کو جو وقت کے حالات کا تھا

مقبل گیاوی، دھنباد

چہرہ چہرہ کہہ رہا تھا وہ تقاضا پیاس کا
خواہشوں کے دشت میں اتنا شدیدہ پیاس کا

عکس کی بارش میں چھپی رہی سطحیں تھا دھو
قربتوں کے بیچ بھی فاصلہ تھا پیاس کا

دو دلوں کے بیچ جیسے سمر کی تشنگی
بھیگ کر تو اس بار بھی تشنہ پیاس کا

جاتے جاتے دے گیا اک لمس اور قطرہ شبنم کا
آشنا خود سے ہوا تو راز سر بستہ کا

آئینے کے سامنے رکھا تھا چہرہ جلتے لئے
یہ زمیں مخصوص تھی خوش رنگ منظر کے لئے

کہہ دیا دل کے ورق پہ سبز نے صحرا پیاس کا
اف وہ کیسی شعلگی منظر بہ منظر تھی مقبل
ورسے ورسے کی زبان پر ذائقہ تھا پیاس کا

کمال الدین کمال، برنپور

سکونِ دل کی خاطر چل کے دیوانے تو جاتے ہیں
تمہارے سنگِ در سے سر کو ٹکرانے تو جاتے ہیں

چلو اچھا ہوا اپنی جہالت کام تو آئی
کہ کچھ نافہم کو ہم فیض پہنچانے تو جاتے ہیں

یہی کیا کم ہے کہ ہم خود سمجھ پاتے نہیں کچھ بھی
پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کو سمجھانے تو جاتے ہیں

جناب شیخ ہم مستوں سے آخر یہ الجھنا کیا
نہیں جاتے ہیں ہم مسجد کو میخانے تو جاتے ہیں

کمالِ خستہ جاں اس بھیڑ میں یہ بھی غنیمت ہے
ہم اپنے نام سے بستی میں پہچانے تو جاتے ہیں

غزلیں

قربان آتش
بھوجپور

شہر در شہر فضا یار عجیب دیکھی ہے
خوف سے کانپتی دیوار عجیب دیکھی ہے
زلزلہ آیا مگر اسے سکوں ابھی نہ سکا
ہم نے اک ریت کی دیوار عجیب دیکھی ہے
ہر کہ آنکھیں ہیں چراغوں کی طرح جلتی ہیں
شاید اب کے اس بار عجیب دیکھی ہے
روشنی کا جھلکے خوشبو کا تبسم لیکن
ہم نے دیکھا ہے بہت عجیب دیکھی ہے
سر پہ لٹکی ہوئی تلوار عجیب دیکھی ہے
سانپ جانے کا اداسی کا کہیں تک منظر
وحشت کی رات بھی اس بار عجیب دیکھی ہے

تارا انجم
سنبل

بدگلی سے تو گزر اس راہ جب ہے
زریچے در مجھ روز و شب ہے
گرتے ہیں یا برسات آئی ہے
لوگ سمجھے ہوئے میں کیا کب ہے
بدیاں
پیٹھ پہ تو ہم رہی ہیں
سکون مجھ سے ہوا میں کیا عجب ہے
نیکیاں قید ہوئیں کیسے جیسے
بات جل جل کے ہی سمجھا کب ہے
صبح دم پوچھ سا ہوں سونا سونا
مہکی فانوس سا گیا سب عجب ہے
دل بیٹھا کے وہ ... میں
... عجب ہے

کوثر داؤد نگری
داؤد نگر

زندگی دے کے تو مجھ کو پیار بھی دے
سب سے پہلے تو کا اعتبار بھی دے
سکون میں بھی تجھ سا اپنا پیار
کبھی تو اتنا اختیار بھی دے
تو مجھے جنوں میں جا بجا لکڑی
زرد رت ہے مجھے بہار بھی دے
یا خدا اس کو پیار میں ہیں کر
گرد جاؤں گا آنگن میں بیمار بھی دے
خزاں ہے مجھے اس کو خبر کے
موج ہوا اس کو انتظار بھی دے
ہم بھی ...

سجاد احمد قادری
مٹھو کریم گنج، گیا

فقیر انکل

(کلام حیدری مرحوم کے نام)

صبح نو بجے میں تیار ہو کر کام کرنے کی غرض سے کرسی پر بیٹھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور اٹھا کر میں نے جیسے ہی "ہیلو" کہا دوسری جانب سے ایک باوقار اور جانی پہچانی آواز ابھری۔

"قادری ہو جی"

"جی، انکل، سلام علیکم" آواز پہچانتے ہی میں نے کہا۔

"کہاں میاں، کہاں غائب رہتے ہو؟"

"ایک کام سے پٹنہ چلا گیا تھا۔"

"تم ہمیشہ پٹنہ ہی میں رہتے ہو، تو وہیں کوئی مکان دکان کیوں نہیں جوا لیتے ہو"

"انکل، خواہش تو میری بھی ہے کہ راجدھانی میں رہ کر راجدھانی کے فائدے اٹھاؤں۔ بس آپ دعا کریں۔"

"ارے میاں، صرف دعا سے کام نہیں چلے گا۔ دوا کی بھی ضرورت ہے۔ اچھا خیر، تم ابھی کیا کر رہے؟"

"کوئی خاص نہیں انکل، بس ایک چیز لکھ کر کاتب کے حوالے کرنا ہے۔ پھر میں فری ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے، تم ۱۱ بجے تک آجاؤ، تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اور وہ فائل تمہارے حوالے کروں گا، اب تم اس کا جو کرو، ویسے مجھے تم پر بھروسہ ہے، اب تک تو مجھے جو ملے، سبھوں نے دھوکا کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ خیر، چھوڑو، ان باتوں کو، تم آؤ تو باتیں ہوں گی۔"

"بہت بہتر انکل، میں گیارہ بجے تک ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔" اور یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اور جلدی جلدی سارے کام نپٹانے لگا تاکہ ۱۱ بجے تک میں انکل سے مل سکوں۔ لیکن کام سے کام نکلتا گیا

کسی کی آمد، کسی کا فون، کسی کا کام — ان ہی الجھنوں
میں صبح سے شام ہو گئی، رات میں سوچا کہ فون کر کے
معذرت کر لوں، لیکن پھر سوچا کہ کل صبح سویرے
جا کر معذرت کر لوں گا اور ساری باتیں بھی ہو جائیں
گی۔

لیکن صبح، وہ صبح ایسی منحوس بھی ہو گی اس کا
میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا — فون کی گھنٹی ہی سے
میری نیند ٹوٹی، ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا، تو دوسری
طرف سے مسعود بھائی کی آواز ابھری — "کچھ خبر
ہے؟ آپ کے انکل ... کا انتقال ہو گیا"

"نہیں" بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل
گئی اور ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، ایسا کیسے ہو سکتا
ہے۔ شاید مسعود بھائی نے غلط اطلاع دی ہے، آج
... آج تو مجھے ان سے ملنا ہے۔ ان سے کل
نہیں آنے کے لئے معذرت کرنا ہے۔

میں ان کی رہائش گاہ کی جانب دوڑ پڑا اور
کوٹھی کے قریب ٹھٹھک پڑا۔ ضرور کوئی انہونی ہو گئی
ہے، تبھی تو آج یہ کوٹھی اداس اور سوگوار ہے۔ میں
کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ اور تیز قدموں سے چلتا
ہوا بالائی کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ ابھی میرے
قدم اندر کی جانب داخل ہی ہوئے تھے کہ میں ٹھٹھک
پڑا۔ میری نظروں کے سامنے ایک انسانی جسم سفید
چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ [illegible] آدمی نے
مجھے دیکھ کر [illegible] چہرے [illegible] ہٹا دیا —
اُف [illegible] اس طرح سے
[illegible] کو

جاتا یا آپ سے ملنے آ جاتا۔ [illegible] جانے کتنے ایسے لوگ ہیں
جنہیں جگانے کی ذمہ داری آپ پر تھی لیکن آپ
تو سو گئے، ابدی نیند۔ پھر کون انہیں جگائے گا۔
کون ان میں بے باک اور [illegible] کے اندر کی
انسانیت کو جھنجھوڑے گا، کون حکام کے [illegible] کو
مثال کا آئینہ کے ٹکڑے دکھا کر شرم دلائے گا۔

میں سسک پڑا اور جیسے ہی دروازے کے
قریب سے ہی لوٹ آیا تھا، میری نگاہیں اوپر سیڑھی
کی طرف سیڑھیوں پر پڑ گئیں۔ مجھے ایسا لگا، جیسے ابھی
ابھی انکل اوپر کے کمرے سے نکلتے ہوئے تابناک چہرہ
خوبصورت فریم کا چشمہ کے پیچھے سے جھانکتی ذہین
آنکھیں، دیدہ زیب لباس میں ملبوس انکل ایک
باوقار انداز میں آئیں گے اور کہیں گے "آ گئے تم"
لیکن سیڑھیاں بھی خاموش اور اداس تھیں۔
میں [illegible] کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
میری آنکھوں سے ضبط کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔

میری نظروں کے سامنے انکل کی دھندلی ابھرتی
تصویریں ابھرنے لگیں — وہ ہال جہاں میں ابھی
ابھی انہیں دیکھ کر آ رہا ہوں، وہ ہال کبھی مختلف
تحریکوں کی آماجگاہ تھا۔ وہاں فکر و فن کا سمندر ٹھاٹھیں
مارتا تھا۔ اس ہال کے ایک ایک اینٹ، ایک ایک
شئے اس بات کی گواہ ہے کہ کیسی کیسی بڑی بڑی [illegible]
شخصیتوں نے [illegible] باتیں [illegible] کی ہیں۔
کیسے کیسے نادر خیالات و افکار نے اسی ہال میں
جنم لیا [illegible] کیسے کیسے [illegible] کے اندر [illegible] دفن کر دیا
[illegible] ہے۔ اور [illegible]
[illegible]

پورا مشورہ کیا گیا۔ لیکن "اشک" نے خود اپنے لئے کیا
کہا۔ شاید کچھ نہیں۔ وہ خود کہتے تھے۔ میں فقیر
آدمی ہوں۔

لیکن وہ ایسے فقیر تھے، جو دونوں ہاتھوں
سے علم و ادب کی دولت زندگی بھر لٹاتے رہے۔ اور
خود کبھی کچھ پانے کی تمنا نہیں کی۔ لوگ کرسی پانے
کی دوڑ میں بھاگتے پھرتے تھے اور وہ کرسی سے دور
بھاگتے تھے کہ کرسی پا کر کہیں ان کا اپنا قیمتی سرمایہ
جس کو وہ اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی حفاظت
کرتے رہے، کھونا نہ پڑے۔ "انا" ہی ان کا قیمتی
سرمایہ تھا۔ اور اسے وہ کسی قیمت پر بھی مجروح
نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کے ہاں میں ایسے
لوگوں کو بھی ہاتھ باندھے کھڑے دیکھا گیا جو ان کے
ہاتھوں شیکور سے بڑا فنکار اور مصور ان کا ہی اوتار
کا خطاب پا کر بڑا سے بڑا عہدہ دینے کو تیار رہتے تھے۔

— لیکن اشک — ایسی سخت مٹی کے بنے ہوئے
تھے کہ ان کے اوپر ان عہدوں کے لئے کبھی کوئی جھک نظر
ہی نہیں آئی۔ وہ برملا اور بے لاگ باتیں کرتے، لوگوں
کو آئینہ دکھانے میں انہیں خاص لطف آتا کہ یہ نے
یہ جرأت کی۔ "اشک" کے بعض دوستوں نے سمجھایا
آپ اتنا "سچ" کیوں بولتے ہیں، کیوں لوگوں کی
خفگی اور دشمنی مول لیتے ہیں۔ جواب میں ان کا چہرا
تمتما جاتا اور وہ گرج پڑتے۔ تو کیا میں بھی بکاؤ
بن جاؤں۔

لوگ خاموش ہو جاتے کہ ان کی باتوں میں
منطق ہوتا — اور یہ وزن، اسی دور کے بگڑتے
ہوئے ماحول میں [illegible] ان کا قد بلند
سے بلند تر ہوتا گیا۔ اتنا بلند کہ وہ جلتے ہوئے
گوشوں سے بھرے ماحول کو، بدنام ہوتے ہوئے
رشتوں کو، ذات پات اور فرقہ پرستی
ہوئے حالات کو، کھوکھلی ذہنیت اور حرص
کو بڑے صاف طور پر دیکھتے تھے۔ لیکن ان
نے ....

اچانک میرے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ
کمرے میں کئی لوگ داخل ہو کر میرے ارد گرد
پر بیٹھ گئے تھے۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا
اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ تعزیت میں آنے
کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ باہر لان میں کا
میں کرسیاں ڈال دی گئی تھیں — لیکن زیادہ
کرسیاں خالی ہی تھیں — میں آنے والے چہ
میں وہ چہرے تلاش کر رہا تھا۔ جو "اشک"
حضوری میں لگے رہتے تھے اور ان کی قد آور شخ
کے سایہ میں اپنی شخصیت کو بنا کر نئے چہرے
نت نئے مکھوٹے لگائے گھوم رہے تھے، بلکہ
لوگ تو ایسے بھی تھے جو اپنی جیبوں میں طرح
مکھوٹے لئے گھومتے رہتے اور جب جیسا موقع
کوئی مکھوٹا لگا لیتے۔

صبح سے دوپہر ہو گئی اور دوپہر سے ش
میری نگاہوں کے سامنے جو چہرے صبح میں
دیکھا چہرے شام میں بھی رہے — وہ مکھوٹے
لوگ کہاں گئے — شاید وہ اب کسی اور
سایہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔

ڈوبتی شام کے آخری لمحوں میں جب ان
سپرد خاک کر کے قبرستان سے باہر نکلا تو ایک

ـنائی دی۔

"کچھ دیتے جاؤ بابا لوگ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بوسیدہ اور تار تار
ـڑوں میں لپٹا [illegible] فقیر ہاتھ میں کشکول لئے کھڑا
ـ۔ میں نے اپنی جیب سے چند سکے نکال کر
ـں کے کشکول میں ڈال دیئے اور کہا۔ "لو بابا۔
ـڑوں ہاتھوں سے لٹانے والا فقیر تو چل بسا اور
ـبرسوں سے کشکول لئے کھڑا ہے۔

گھر لوٹتے لوٹتے رات ہو گئی۔ اپنے کمرے
ـآکر اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ نیوز کا وقت
ـچکا تھا۔ ایک تجسس کہ دیکھوں لوگ ایسے
ـکے بارے میں کیا بولتے ہیں۔ کس طرح سے تعزیت
ـکرتے ہیں، میں نے ٹی وی سیٹ آن کر دیا۔
ـپوری نیوز ختم ہو گئی۔ اور اس شخص کی
ـت کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ جس نے نہ جانے کتنے
ـکے بگولوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کر لیا تھا۔
ـرا پنے فکر و فن سے کتنے ستارے منور کر دیئے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹی وی آف کر دیا اور
ـچنے لگا۔ کاش انکل۔ اپنی انا کے خول سے
ـنکل آتے، تو آج ہر طرف ان کی موت پر
ـنو بہائے جاتے، تعزیت نامے کے ڈھیر لگ
ـتے۔ لیکن پھر سوچا ـــ جس دن وہ اپنی انا کے
ـمے باہر نکل آتے۔ ان کی موت تو اسی دن ہو
ـا اور اتنے برسوں تک وہ اپنے مردہ جسم کو
ـکاندھوں پر ڈھوتے رہتے، جس طرح لوگ آج
ـکو ڈھو رہے ہیں۔

<u>بقیہ: سید احمد قادری کی افسانہ نگاری</u>

"یادوں کا المیہ" ـــ یادیں بیک وقت
مسرت اور تلخیاں دیتی ہیں اور فرد کے لئے دونوں
کے ذائقوں کو الگ الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

سید احمد قادری کے افسانوں میں کہیں
کہیں گہری علامیت اور اشاریت بھی پائی جاتی ہے لیکن
انھوں نے محض فیشن کے طور پر علامت کو استعمال نہیں کیا
بلکہ وہ کسی موضوع کردار یا ماجرا سازی کے تحت علامتوں
کا استعمال کرتے ہیں ان افسانوں کے ضمن میں "گمشدہ جزیرے"
اور "کنارہ دور" قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ماجرا سازی
کی بہترین عکاسی کی مثال "افسانہ" منظر یوں تھا" میں ملتی
ہے۔

"ریزہ ریزہ خواب" کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد
یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری صاحب نے اپنے
مشاہدات و موضوعات کو جس فنی مہارت سے افسانے کے سانچے
میں ڈھالا ہے وہ انہیں دیگر افسانہ نگاروں میں ممتاز
کرتا ہے۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ
پریس پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر
سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا سے
شائع کیا۔

اپنی تخلیقات صاف اور خوش خط

ارشاد الایمان

میرا پیشہ

میں جلدی میں تو نہیں تھا۔ لیکن میرے پاؤں خدا جانے خود بخود تیز ہونے لگے۔ میں اپنے اڈے پر جا رہا تھا جہاں اپنے آدمیوں کو کچھ ضروری ہدایتیں دینی تھیں۔ سوموار کا دن تھا اور شام کے گھیر پکڑنے والے تھے اور رنگا رنگ خوابوں کی دنیا آباد ہونے والی تھی۔ فٹ پاتھ ہو یا سڑک، آمدورفت کے دونوں ذرائع لوگوں اور گاڑیوں سے بھرے ہوئے تھے ایسے عالم میں ... سے ٹکرا گیا۔ طبیعت بھنا گئی اور میں اسے کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اس کی شکل دیکھ کر سنبھل گیا۔

میری خود غرضی اور خباثت نے کہا کہ اس سے پہلے کہ وہ بھی مجھے پہچان لے تو بھیڑ میں گم ہو جا لیکن ... میرا سویا ہوا اخلاق کیسے جاگ پڑا اور وہ میری کمینگی اور خود غرضی پر حاوی ہو گیا۔

ایک ... اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کہیں سے ... آ رہا تھا۔ اس کے وہی دیدہ زیب خدوخال تھے۔ اس کا وہی نکھرا ہوا رنگ روپ تھا اور اس کے لباس سے اب بھی حسن اور پاکیزگی ہویدا تھی۔

"دیکھ کر نہیں چلتے بھائی؟" وہ آگے جاتے جاتے گیروے رنگ میں ملبوس ... بولا۔

"معافی چاہتا ہوں۔"

"ارے تم، خدا کی قسم خوب ملے۔" اور اس نے نشاط اور محبت میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہاں ـــــ؟" میں مسکرایا اور پھر میں اسے لے کر ایک ریستوران میں چلا گیا۔

"تمہارے بارے میں عجیب عجیب خبریں ملتی ہیں کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں! یہ سچ نہیں ہوئی کہ میں جھوٹ کا سہارا لوں۔"

"لیکن تمہیں اور کوئی دھندا نہیں ملا؟" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

جینے کے لئے مولوی گیری ہو یا ... تجارت یا میدانِ صنعت، آج کے اس لاقانونیت اور خود غرضی ... میں سب ایک ہیں۔"

"سیاست اور تجارت کے معاملے میں تو میں تمہاری ... سے اتفاق کر لوں گا۔ کیونکہ جو لوگ اس سے منسلک ... ان میں سے بیشتر آدمیوں کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ ... مفقود ہے۔ ایسے لوگ سماجی خدمت کی آڑ میں ... انسانوں کا خون چوستے ہیں۔ لیکن تم نے مولوی طبقہ ... کیوں ان یہودیوں کے زمرے میں شمار کر لیا؟"

"پیارے! بہت دنوں کی بات نہیں ہے۔ تم ایک تاریخی [illegible] دارالعلوم کے سانحے کے بارے میں ... ضرور سنا ہوگا۔ بتاؤ اس عظیم الشان اور مشہور ... درسگاہ اور تعلیم گاہ میں کس نے طوفان برپا کیا اور اس ... کس کو فائدہ اور کس کا نقصان ہوا۔ اور پھر کس ... کی رسوائی ہوئی ۔۔۔ اس لئے اگر میں نے مولوی کو بھی ... اسی طرح سمجھا ہے تو کیا برا کیا ہے؟"

"بعض باتیں اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو ... نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ معاملہ اور پیچیدہ ... ہو جاتا ہے اور قوم و ملک کی بدنامی کا سامان فراہم ہونے ... میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔"

"اس طرح کی باتیں تم جیسے مصلحت پسند سوچا ... کرتے ہیں۔ میرے جیسا صاف اور کھرا آدمی انہیں ... برا کو برا اور اچھا کو اچھا ہی کہوں گا۔"

"ضرور کہو۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لیکن ... جینے کے لئے برا راستہ اختیار کرنا بھلا اچھا ہے؟" اور ... مسکرایا۔

"پھر تم بھول گئے یار! آج سوسائٹی کا کون سا شعبہ باقی رہ گیا ہے جس میں کوئی خرابی کا پہلو نظر نہیں آتا ہے۔ جب سند یافتہ مذہبی آدمی بھی اپنے چہرے پر تقدس کا سائن بورڈ لگا کر گھوم رہے ہیں تاکہ دنیا غفلت کے جوہر میں ڈوبا رہے تو میرا کیا ذکر، میری تو تعلیم ہی خدا بیزار درسگاہ میں ہوئی ہے۔ میں یہ کام نہیں کروں گا تو مجھ جیسا زمانے کا ستایا ہوا اور ضرورت کا مارا کرنے لگا کیا۔ اور آج ایسے بہتیرے لوگ اس لائن میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ میں ایک طویل عرصہ تک بی اے آنرز کی ڈگری لے کر دفتروں اور اداروں کی خاک چھانتا رہا ۔۔۔ تھک کر ایک سیاسی لیڈر کا چمچہ بنا۔ اور پھر اس کا دیا ہوا یہ نسخہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور اب ٹھاٹ ہی ٹھاٹ ہے۔"

"مگر تم کو معلوم ہے کہ مجرم کی منزل کہاں ہوتی ہے؟"

"مجھے منزل و نزول کی کیا فکر۔ میں جینا چاہتا ہوں اور جینے کا جو بھی راستہ ملے گا میں اس پر چلوں گا۔ بھوک میں گوبر سے جینا ہوا نا ہضم والا بھی اچھا لگتا ہے۔"

"تم اس قدر کور مغز ہو گئے کہ حرام و حلال اور خیر و شر کی تمیز بھی تمہارے اندر نہیں رہی۔"

"یار، تم کوئی دوسری بات نہیں کر سکتے؟" میں نے تلخ موضوع کو موڑنے کے خیال سے کہا۔

"جب میں اس شہر میں آیا تو تم سے ملنے کا پروگرام بھی تھا اور اسی پروگرام میں تمہاری کارگزاریوں پر تبصرہ بھی کرنا تھا اور تمہیں اس راستے سے ہٹانے کا بھی منشا تھا۔"

"بڑے مصلح بن گئے ہو۔"

"آج کل یہ کام دائیں بائیں محاذ والے اور وہ آمد خندہ نظر ہے کہ مریدوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہم

"تم کس مسلک سے تعلق رکھتے ہو؟"

"دنیا میں مصطفیٰ کے سب سے عظیم انقلابی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"لیکن ان دنوں تو نوے فیصد مسلمان کسی مجاور یا گدی نشین یا کسی پیر کے غلام اور کسی مسلک کے پیروکار بن گئے۔ ان کا حال بھی ایسے غیر مسلموں کی طرح ہو گیا ہے جو اپنے مذہبی پیشواؤں کے حصار میں قید ہیں۔"

"میں تمہارے اس نکتہ سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اسی وجہ سے تو ہم جیسے خادم پیری مریدی اور نام نہاد مسلک کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں جو کچھ لینا دینا ہو ڈائرکٹ خالق کائنات سے اور رب کون و مکاں سے معاملہ کرو۔ سفارش کے لئے درمیان میں کسی کو نہ لاؤ۔ اس کے دربار میں کسی کی ریکومنڈیشن کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔"

میں نے اپنی کلائی گھڑی دیکھی۔ میرے پاس آدھ گھنٹہ اور وقت رہ گیا تھا۔

"تمہیں کہیں جانا ہے؟" اس نے حقیقت کو تاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یار۔ نصف معاوضہ بطور پیشگی لے چکا ہوں۔ ڈیوٹی کے لئے اپنے آدمیوں کو ہدایت دینی ہے۔"

"یہ ڈیوٹی کیسی ہے؟"

"جلسہ درہم برہم کر دینا، ہڑبونگ مچانا، مزاحمت ہو تو بھیڑیا کا رول ادا کرنا ....."

"کتنا ملتا ہے ایک ڈیوٹی کا؟"

"تین ہزار تک۔"

"اس کے علاوہ اور کیا ڈیوٹیاں ہیں؟"

"تم لوگ کہیں پکڑے نہیں جاتے؟"

"یہ ہماری ڈیوٹیوں میں شامل نہیں ہے۔"

وہ یہ سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"تمہیں آخرت کا کوئی ڈر نہیں۔ اور مجرم حرام ہو تم۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جس قادر مطلق نے تمہیں اتنا خوبصورت انسانی ڈھانچہ دے رکھا ہے اور اس میں چلنے کی طاقت اور سوچنے سمجھنے کی قوت دی ہے اس کی نافرمانی اور عدول حکمی نمک حرامی نہیں تو اور کیا ہے؟"

"اچھا پیارے! رات آٹھ بجے اس پتہ پر ملو۔" میں نے اس سے چھٹکارا پانے کی غرض سے اسے اپنا کارڈ پیش کیا۔

"فرار اختیار مت کرو۔" وہ میرا مدعا سمجھ گیا۔

"تم اتنے عقلمند کب سے ہو گئے؟" میں نے کہا۔

"جب سے تم جیسے [illegible] نے گمراہی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا ہے۔" اس نے برجستہ کہا۔

میں جھینپ کر رہ گیا۔ حقیقت بھی کہ اسی کالج میں، میں اپنی جماعت کا ذہین ترین اور قابل ترین اسٹوڈنٹ رہا ہوں۔ لیکن جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو کسی نے میری ذہانت اور صلاحیت کی قدر نہیں کی۔ برادری، مذہب، سرمایہ اور تعلق کی اہمیت نے میرے راستے بدل دیئے۔

اسی وقت کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ میری جان میں جان آئی۔

"ٹھیک ہے امجد، میں تمہارے پاس آرہا

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی)

چکبست: کچھ باز دید، کچھ پیش رفت

مصنف :- کالی داس گپتا رضا
صفحات :- ۱۰۸ ٭ قیمت : ۵۰ روپے
ناشر :- ساکار پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ
جولی بھون نمبر ۱، ۱۰ نیو مرین لائنز
بمبئی، ۴۰۰۰۲۰

اردو تحقیق میں جو چند نام احترام سے لئے جاتے ہیں، ان میں ایک اہم نام کالی داس گپتا رضا ہے۔ انہوں نے غالب اور چکبست پر جس ایماندارانہ انداز سے تحقیق کیا ہے، وہ یقینی طور پر ان دونوں بڑے اور عظیم شاعر کے کئی گمنام گوشوں کو نہ صرف ادبی دنیا کے سامنے لاتا ہے بلکہ تحقیقی ادب میں اضافہ بھی کرتا ہے۔

زیر نظر کتاب چکبست — کچھ باز دید، کچھ پیش رفت" کالی داس گپتا رضا کی چکبست کے سلسلے میں چار کتابوں بہ عنوان — (۱) چکبست اور باقیات چکبست (۱۹۷۹) (۲) انتخاب آتش و غالب و چکبست (۱۹۸۰ء) (۳) کلیات چکبست (نظم، ۱۹۸۰ء) اور (۴) مقالات چکبست (نثر۔ ۱۹۸۲ء) پر وقتاً فوقتاً جو ترمیم و تنسیخ ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کتابوں پر جو اعتراضات کئے گئے۔ ان کا بڑے مبسوط انداز میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) چکبست اور باقیات چکبست

مندرجہ بالا کتابوں کی اشاعت کے بعد بعض حضرات کی نشاندہی اور جو سوالات یا اعتراضات کئے گئے، ان کا مدلل جواب اپنے ابتدائی چار مضامین میں رضا نے بڑے اعتماد کے ساتھ دیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ تبصرہ کرتے وقت یا تنقیدی مضامین تحریر کرتے ہوئے بعض مبصرین اور ناقدین صاحب کتاب پر اپنی علمی لیاقت اور دانشورانہ صلاحیت کی دھونس جمانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور بغیر کسی تحقیقی و تنقیدی فکر کے صرف اپنی صلاحیتیں کا لوہا منوانے کے لئے اعتراضات کرتے۔ زیر نظر کتاب میں بھی اسی نوع کی تحریر کا جواب کالی داس گپتا رضا نے بڑے خوبصورت انداز میں دلائل کے ساتھ دیا ہے۔ کتاب کی فہرست کے پہلے چار عنوانات کے بعد جو عنوانات ہیں، وہ ایسی ہی تحریروں پر محیط ہیں۔ "صبح وطن" کے پہلے ایڈیشن کے سلسلے میں یا پھر

"دھن کے راگ" یا "دھن کا راگ" پر ڈاکٹر سید محمد عقیل (سابق صدر شعبۂ اردو، الہ آباد، یونیورسٹی) کا اعتراض، ڈاکٹر سیفی پریمی کا یہ لکھنا کہ "کالی داس گپتا رضا نے تحقیقی کام پیش کرنے میں محنت کی ہے۔ مگر تنقیدی حصہ سطحی ہے" (مطبوعہ کتاب نما، نومبر ۱۹۸۱ء) کا جواب جن عنوانوں کو بنیاد بنا کر رضا نے دیا ہے وہ یقینی طور پر اس بات کا غماز ہے کہ رضا کی نظر تحقیق اور تنقید دونوں پر بڑی گہری ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقیدی رائے (مطبوعہ آجکل، فروری ۱۹۸۳ء)

کا جواب رضا نے بھی خلوص سے دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے رضا کی اردو دوستی اور اردو نوازی کا ایک خاص پہلو سامنے آتا ہے۔ رضا عبدالمغنی کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"میں اردو اور ہندی کو بنیادی طور پر ایک ہی زبان مانتا ہوں اور میرے نزدیک صفحۂ اردو زبان کے ناگری لپی میں لکھے جانے کا نام ہندی ہے۔ ایسی زبان کو فارسی، عربی اور اب سنسکرت ترکیبوں سے بوجھل بنا کر آپ جو نام دینا چاہیں دے لیں، مگر اصل زبان اردو ہی رہے گی (صفحہ ۷۹)

رضا کی کتاب "مضامین چکبست" کا جائزہ لیتے وقت شمیم حنفی نے چکبست پر جو سطحی اور عامیانہ الزام (مطبوعہ "آجکل" فروری ۱۹۸۲ء) لگایا ہے، وہ یقینی طور پر محب وطن اور اتحاد و اتفاق کا ذہن رکھنے والوں کو زخم دینے کے لئے کافی ہے۔ ادب میں ہندو اور مسلمان کی تفریق بلاشبہ قابل مذمت ہے اور ایسی تحریروں کو condemn کرنا چاہئے۔ رضا نے بھی شمیم حنفی کی ایسی رائے کو دلائل کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے condemn کیا ہے۔ اور ان کا یہ کہ اچھا لگا کہ جہاں تک چکبست کا تعلق ہے ہمیں ہندو مسلم چھوڑ کر صرف چکبست اور ان کے کلام یاد رکھنے چاہئیں" (صفحہ ۸۱)

"کلیات چکبست" کے سلسلے میں ڈاکٹر سید حسن نے رضا کی تحقیق پر تنقید کی ہے۔ اس کا جواب رضا نے جس انداز سے دیا ہے، وہ رضا کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔ ڈاکٹر سید حسین احمد نے گیا (بہار) جگیشور پرساد خلش کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ "بزم سخن" کو بنیاد بنا کر جو (مطبوعہ "معیار تحقیق" پٹنہ) تنقیدی رائے دی اور رضا کی تحقیقی صلاحیت پر انگشت نمائی کی ہے۔ اس کا جواب قابل مطالعہ بلا وجہ کسی فکر و آگہی کے اعتراض کرنے والوں کے لئے تازیانہ ہے۔ لیکن رضا کے مدلل جواب کے آخری چند جملے ۔۔ "ح (حسین احمد) کے ہاتھ رسالہ "بزم سخن" کی فائل کیا لگ گئی کہ وہ محقق ہی بن بیٹھے۔ ہلدی کی ایک گرہ ہاتھ آجانے سے کوئی پنساری تو نہیں بن جاتا۔ ح (حسین) جیسے دانشوروں کے "بنیادی کلچر" کیا ہیں، میں خوب جانتا ہوں ۔۔

بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

جھنجھلاہٹ اور غیر سنجیدہ ذہن کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک سنجیدہ اور باوقار محقق کو ایسے سطحی اور جذباتی جملوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

کالی داس گپتا رضا نے اپنی اس زیر نظر کتاب کے دوسرے مضامین میں اپنی فکر اور نظریات کا اظہار بڑے وسیع معنوں میں تحقیقی وسعتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ پوری کتاب بے حد دلچسپ

اور حکمت کے اشعار اور افکار سے متعلق ایک معیاری دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتابت، طباعت اور سرورق عمدہ ہے۔ قیمت زیادہ ہے۔

▲ سید احمد قادری، گیا

● چاندنی کا درد

شاعر :۔ منصور اعجاز
قیمت :۔ ۵۰ روپے ▲ صفحات :۔ ۱۰۵
ناشر :۔ منصور اعجاز
راشد۔ اسٹوڈیو، الیوت محل۔ ۴۴۵۰۰۱
(مہاراشٹر)

ان دنوں اردو ادب میں دوسرے اصناف کے مقابلے شعری مجموعوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو اردو شاعری کے معیار، مزاج اور وقار میں اضافہ کے بجائے اردو شاعری کے فکر وفن دونوں کو مجروح کر رہے ہیں۔

ایسے حالات میں منصور اعجاز کا یہ شعری مجموعہ "چاندنی کا درد" موضوع، معنویت اور جدت وندرت کے لحاظ سے ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح سامنے آیا ہے۔

منصور اعجاز ایک نوجوان شاعر ہیں، ان کے ارد گرد جو گھٹن بھرا ماحول اور فضا ہے اس سے وہ بڑی شدت سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے ان ہی تاثرات کو فکری وفنی لوازمات کے ساتھ بڑے خوبصورت لب ولہجہ میں پیش کرتے ہیں۔ منصور اعجاز کے گہرے مطالعے ومشاہدے کا یہ اعجاز ہے کہ ان کی شاعری میں سماجی، تہذیبی اور تمدنی انقلابات کا اظہار بڑی شدت سے در آیا ہے۔ جس کی چند مثالیں پیش ہیں :۔

میں نے سچ بولنے کی ٹھانی ہے
کوئی آئے نہ مجھ کو سمجھانے

خود سے مل کر مجھے شدت سے لگا منصور
اب تلک مردہ ضمیروں میں رہا ہوں جیسے

اس راہ میں کچھ دن پڑے، اس راہ میں مقتل سجے
ہر دور میں اس راہ پر لٹتی رہی بے چارگی

شہر کا جنگلی تمدن اور یہ چہروں کی بھیڑ
اپنا سایہ اپنے تن کو کھوجتا رہ جائے گا

میرے دکھ میں میرے یار
جن کے سنگ میں ہنستا ہوں

آج کے غم والم کو بھی شاعر نے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ خارجی غموں کو جذب کرکے غم والم کو بھی ایک معنویت اور حسن بخشتا ہے۔

غزلوں میں اپنے خوبصورت احساسات وجذبات کو فکری وفنی سطح پر معیار اور وقار دینے کے ساتھ ساتھ منصور اعجاز نے اپنی چھوٹی چھوٹی معیاری نظموں میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ منصور اعجاز کی بعض نظمیں فکر ومعنی کی اس بلندی پر نظر آتی ہیں، جہاں سے فکر واحساس کی رنگ برنگی کرنیں پھوٹتی ہیں، جو بلاشبہ شاعر کا کمال ہے۔ "انسانی فطرت" "فرار" "معاشرہ، شناخت، کربلا، اقلیت، گونگا عالم" وغیرہ نظمیں ایسی ہیں جو شعریت کے لحاظ سے شگفتگی، معنویت اور فکری اعتبار سے شعلگی اور حرارت سے بھرپور ہے۔ ایسا لگتا ہے شاعر اپنے فکر واحساس کے شعلوں میں جل رہا ہے اور اس کے اندر سے آگ ہی آگ نکل رہی ہیں، لیکن اس

آگ میں برجستگی کے ساتھ ساتھ ایک ٹھہراؤ اور سنجیدگی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

منصور اعجاز کی شاعری کا تعارف ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، شاہد لطیف اور ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے پیش کیا ہے۔ کسی بھی فنکار کا تعارف خود اس کا فن ہوتا ہے اور منصور اعجاز کا فن خود اپنا بھرپور تعارف کرانے کی قوت رکھتا ہے۔

منصور اعجاز کی معیاری شاعری، اردو شاعری کے لئے ایک باوقار دستک ہے۔ کتاب کی کتابت، طباعت، سرورق عمدہ اور نفیس ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

▲ سید احمد قادری، گیا

● بہار کی پسماندہ مسلم آبادی

مصنف:۔ پروفیسر جابر حسین، چیئرمین اقلیتی کمیشن
بہار، پٹنہ

مرکز دستیابی:۔ بہار فاؤنڈیشن لوہیا نگر، پٹنہ
بلاک ۷/ک نیو پونائی چک، پٹنہ
بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ

قیمت:۔ دس روپیہ ▲ صفحات:۔ ۱۰۴

جابر حسین اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں، قومی و ملی خدمات اور سیاسی و فکری بصیرت کے سبب اب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک احساس اور درد مند دل و دماغ پایا ہے۔ بے باکی، سادگی اور کام کی لگن ان کا خاصہ ہے۔ یہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں ساتھ ہی عصبیت اور تنگ نظری سے پاک بھی۔ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف کمیشن کو ایک زندہ و فعال ادارہ بنایا بلکہ وہ مقام بھی عطا کیا کہ آج حکومت اسے اقلیتوں کی ایک ایسی با اقتدار آواز سمجھنے پر مجبور ہے جس کی ان دیکھی کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ آج صوبہ بہار میں مسلم اقلیت کی پہلے کے مقابلے میں جو خوش آئند پوزیشن ہے وہ محض جابر حسین کی بدولت ہے۔

بہار کی پسماندہ مسلم آبادیاں جابر حسین کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف روزناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین میں سے کچھ کو ایک موضوع کے تحت منتخب کر کے جابر حسین نے ایک اہم قومی اور ملی خدمت انجام دی ہے۔ ان مضامین میں موصوف نے کلہیا، شیر شاہ آبادی، شیشہ گر، سلائی کامگار، منجرا، راعین، گدی، منصوری وغیرہ مسلم پسماندہ برادری کی تعلیمی، معاشی، سماجی حالات کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اہل ملت کے لئے انتہائی درجہ قابل غور ہیں اور امت مسلمہ کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر تامل نہیں کہ بحیثیت مسلمان تمام کلمہ گو خدائے بزرگ و برتر کے سامنے ایک ہیں۔ تقریباً ۸ سو سال تک حکمرانی کرنے والے اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں نے بھی اپنی خود غرضی، تنگ نظری اور عصبیت کے سبب ان برادریوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ان برادریوں میں خود ہی بیداری کی لہر دوڑ چکی ہے اور ماضی کے مقابلے میں وہ سنبھل چکے ہیں۔ بھلا کیوں نہ سنبھلیں انہیں جابر حسین

...سی ایک برادری نہیں بلکہ ساری پسماندہ برادری
...نا ہیں۔ میری یادداشت اور مطالعہ کے مطابق
...ب تک کے پسماندہ مسلم برادری کے اکابرین
...منفرد مقام کے حامل ہیں۔

جہاں تک کتاب کی ادبی افادیت کا تعلق ہے
...ی زبان صاف شستہ اور نکھری ہوئی نثر عام فہم
۔ انداز بیان سیدھا سادہ اور موثر گنجلک
...سے پاک رواں دواں اور موثر ہے۔ ایک ایک
...سچائیوں کے صدہا پرت کھولتا ہے اور دعوت
...مل دیتا ہے۔ انداز بیان میں بے باکی ہے مگر مجروح
دماغ ہوتے ہوئے بھی کہیں پر بھی اظہار خیال
...تو کڑواپن ہے نہ ہی کسی کو ہدف ملامت بنایا گیا
...مصنف کے عظیم تر پن شرافت نفسی کا ثبوت ہے
...اکابرین وقائدین اور پسماندہ طبقے کے افراد کے
...س کا مطالعہ کافی سودمند ہوگا۔

کتابت و طباعت صاف ستھری ہے سرورق جاذ...
...ہے۔ قیمت اس ہوشربا گرانی کے لحاظ سے بہت
...ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جابر صاحب نے اس کتابچہ
...شاعت اپنے ذاتی غرض پر محض اس لئے کی ہے کہ
...پسماندہ مسلم آبادی کثیر سے کثیر تعداد میں اس کا
...ہ کر کے اپنے آپ کو سنبھالے اور اپنے مستقبل
...وارے۔ اس حقیقت کی روشنی میں تمام اردو
...بالخصوص پسماندہ مسلم آبادی کے پڑھے لکھے افراد
...کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لینی چاہئے۔ نیز ایسی
...ب کو حکومت اور اکادمیوں سے بھی انعامات
...ازا جانا چاہئے۔

▲ سید ابوالفیض سیدآبادی

● میں زندہ ہوں (نثری تصنیف)
تخلیق کار :۔ محمد ایوب واقف
قیمت :۔ ۶۰ روپے
مراکز دستیابی :۔ انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر
راؤز ایونیو، نئی دہلی
نیو میونسپل کالونی، ۴۲/بی گونڈی ممبئی نمبر ۴۳

اپنی متعدد تخلیقات کے ذریعہ واقف دنیائے اردو ادب کے قارئین و ناقدین کے لئے اب ناواقف نہیں رہے۔ ان کی ہر تخلیق اپنے اندر ایک اچھوتا پن اور نیا پن رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی زور بیان، سلاست، روانی، سادگی، شگفتگی، سحر کاری و سحر انگیزی، گنجلک پن سے گریزگی، سلجھا ہوا انداز بیان، عام بول چال کی زبان اور بے باکی کے ساتھ مدلل طور پر اپنی بات کو قاری کے سامنے اس انداز سے پیش کرنے کا فن کہ قاری ان کی باتوں سے پوری طرح متفق ہو جائے اور مخالف بھی ان کی منطقی اور استدلالی دلائل کے سامنے لاجواب ہو کر سر تسلیم خم کر دیئے۔ ان کی انفرادیت ہے جو ان کی تحریر میں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ تحریر میں جامعیت اور طوالت بیجا سے پرہیز ان کا خاصہ ہے۔ تذکیر میں ان کا "میں" امتیازی شان رکھتا ہے اور نفس مضمون کا ایک اہم جزو بن کر قاری کا "میں" ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ عمیق، مشاہدہ وسیع اور یادداشت قوی ہے جو ان کی تحریر کو پختگی اور قبولیت بخشتا اور ان کے "میں زندہ ہوں" کے دعوے کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ واقف مہاراشٹر کے چھوٹے گاؤں...

سے بخوبی واقف ہیں اور اس آرٹ کو اس فنی مہارت سے پیش کرتے ہیں حریف کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا اور ان کا منشا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اگر احساس ہوا بھی تو وہ ان کے ذریعہ اٹھائے گئے نکات و سوالات یہاں کے منطق اور استدلالی دلائل کے سامنے خاموش خاموشی بے بس ہو جاتا ہے۔ ان کے اعتراضات بے جان و بے پر اور خلا میں اڑنے والے نہیں ہوتے بلکہ وہ حقائق و دلائل پر مبنی اور سچے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں زمین کی تہہ میں اور مضبوط ہوتی ہیں۔ ان میں کسی عصبیت، تنگ نظری اور طرفداری کی جھلک نہیں ملتی۔ ویسے تو ادب کے متعلق ہر ادیب و فنکار کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی نظر سے دیکھتا ہے اس لئے اختلافات کی گنجائش سے انکار بھی ممکن نہیں

ان کی تازہ ترین تخلیق مندرجہ بالا تمام اوصاف سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ اور مزین و مرصع ہے واقف کی یہ تخلیق اپنے اندر بہت سارے افادی پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہے اور ادب میں یہ ایک گرانقدر اضافہ ہے اس کا مطالعہ قاری کے لئے سود مند ہوگا۔

کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ کاغذ اچھا ہے سرورق اور قیمت بھی مناسب ہے۔ بائنڈنگ کی عجلت کے سبب صفحات ۹۳ تا ۹۸ اور ۱۰۱ تا ۱۰۸ دوبارہ بائنڈ کر دیئے گئے ہیں انہیں نکال دینا مناسب ہے۔

▲ سید ابوالفیض سیدابادی

براہ کرم تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں

بقیہ:- میرا پیشہ

اور وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ!" میں نے کہا

"لیکن کھانے وغیرہ کا انتظام نہ کرنا۔" وہ بولا۔

میں چونکا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے اس کی وجہ پوچھتا وہ ریستوران کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں چند ثانیہ تک اس کے اور اپنے "کاروبار" کے بارے میں سوچتا رہا۔ ——— اور پھر میں بھی وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب پاؤں کو آگے بڑھانا چاہا تو ناکام رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دونوں پاؤں کو کسی نے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

ختم

"سرمایۂ حیات" اور "گنجینۂ عرفان" کے بعد
صابر آروی کی
ایک اور شعری پیش کش
سرمایہ احساس سے منتخب کلام کو ہندی میں پڑھئے

روپ اور دھوپ

شائع ہو کر بازار میں دستیاب ہے
ملنے کا پتہ:- صابر آروی 15/2-7 ایس کے پوری ایساؤتھ بورنگ روڈ۔ پٹنہ ۱

شہرِ خیال

اب اداریئے بہت خوب لکھتے ہو، خالص ادبیاتی اور فکر انگیز۔

میں بھی چراغِ سحری ہوں۔ جسمانی و نفسیاتی مصیبتوں کا شکار، جن کو اقتصادی پریشانیاں تلخ تر کر رہی ہیں۔

تاراچرن رستوگی، گوہاٹی

سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ

گذشتہ کئی شماروں سے رسالے کے مشمولات کا معیار کافی بہتر ہوگیا ہے۔ تازہ شمارہ میں بھی کئی تحریریں دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں۔ میرا حقیر سا مشورہ ہے کہ شعری حصے سے انتخاب میں کچھ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان دنوں غزلوں کے نام پر زیادہ تر شعراء الم غلم چیزیں لکھ کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کر رہے ہیں نہ فکر میں کوئی ندرت ہے نہ لب و لہجہ میں تازگی ایسی صورت میں اچھی تخلیقات بھی بھیڑ میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ہاں! ایک صفحہ پر دو سے زیادہ غزلیں ہرگز نہیں شائع کریں اس سے رسالے کا حسن بری طرح متاثر ہوتا ہے

اس شمارے میں منصور اعجاز کا مراسلہ پڑھ کر میری مشکل بہت حد تک آسان ہوگئی۔ میں نے عبدالسلام کوثر صاحب کا خط پڑھا تھا لگتا ہے وہ سہیل کا مطالعہ سنجیدہ سے نہیں کرتے کیونکہ "سہیل کا ادبی کردار" کے عنوان سے بزرگ شاعر اور ناقد اویس احمد دوراں نے میری غزل کے سلسلے میں جو کچھ لکھا تھا اسے پڑھ کر کوئی بھی ذی شعور آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ میں نے غزل کس پس منظر میں کہی ہے۔ سچ پوچھیئے تو عبدالسلام کوثر کا خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ شاعر ہونے کے باوجود وہ ایک سادہ سے طنزیہ شعر کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ میں منصور اعجاز کا ممنون ہوں کہ انھوں نے عبدالسلام کوثر کے خط سے قارئین کے ذہن میں پیدا ہونے والے کنفیوزن کو دور کر دیا۔

● لقمان شوق، آرہ

"سہیل" کی پابندی سے ترسیل کے لئے بے حد مشکور ہوں۔ تازہ شمارہ جناب فرحت قادری نمبر ہے۔ فرحت قادری صاحب پر آپ نے اچھا مواد فراہم کیا ہے۔ موصوف بلاشبہ اس کے طویل عرصے سے مستحق تھے اور ان کی ادبی خدمات پائندہ اور تابندہ ہیں۔ کاش اس شمارے کی تزئین ممکن ہو سکتی۔

● مصور سبزواری، جہاں آباد

جناب فرحت قادری کے نام سہیل کا ایک شمارہ
پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ کی کوشش اچھی ہے۔
آپ کے "نمود" میں سہیل کی ہمیشہ کی کوشش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحرا کے شعر و ادب کے ان ذروں کی طرف متوجہ ہوا جائے جن میں آفتاب کی توانائی پوشیدہ ہے۔ خود آپ کے گیا کے ادبی سماج میں ایسی کئی نورانی ہستیاں ہیں جو ادب کے لئے پرانے کئی چراغوں کے لئے قیمتی متاع ہیں۔ کسی خاص نظریہ ادب کی حد بندی نہ کریں تو سہیل کے کئی شمارے گیا کی موجودہ ادبی شخصیات پر نکل سکتے ہیں۔

عطا عابدی، دہلی

سہیل کا تازہ ترین شمارہ فرید آباد میں ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح "نمود" کے تحت آپ کے قیمتی خیالات پسند آئے۔ جناب مظہر امام اور جناب عبدالقوی دسنوی کے معلوماتی مضامین کے ساتھ ساتھ جناب شرون کمار ورما کا افسانہ بھی پسند آیا۔ چوبیس کتابوں کے مصنف (بقول جناب پریم آنند سوز) کہنہ مشق اور بزرگ شاعر جناب کرشن موہن کے "ہائیکو نما" پسند آئے۔ ضیاء الانجم کے نمبر ۱۲ اور ۲۴ کے دوہے محل نظر ہیں۔ ہو سکتا ہے کتابت کی غلطی ہو۔ مگر تسلیم انجم کی رباعیات خارج الوزن ہیں کسی میں دو مصرعے بے وزن ہیں تو کسی میں تین مگر چاروں میں خامیاں ہیں۔ امید ہے موصوف وضاحت کریں گے۔

• ناشاد اورنگ آبادی، فرید آباد

غزل کی اشاعت کا شدت سے انتظار ہے

سہیل کا تازہ شمارہ ملا جو فرحت قادری نمبر ہے میں سمجھتا ہوں کہ بہار میں اپنے ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کرنے کی جو روش عام ہے سہیل نے اس سے ہٹ کر قدم اٹھایا ہے۔ فرحت قادری ہمارے بزرگ شعراء میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی واضح پہچان بنانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن بہر حال ان کی پہچان ہے ضرور

• خالد عبادی۔ پٹنہ

عصری ادب کا بہترین رسالہ

جدید اسلوب سہسرام

• پہلا شمارہ زیر ترتیب

• ناقدین، شعراء و افسانہ نگار حضرات سے گزارش ہے کہ اپنی منتخب و غیر مطبوعہ نگارشات سے نوازیں

پتہ:
مظفر حسن عالی
جدید اسلوب میگزین
محلہ بارہ دری سہسرام ۸۲۱۱۱۵
(بہار)

مرتبین:-
شاہد جمیل، ڈاکٹر مظفر حسن عالی

اعلان

"علاقہ مگدھ میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" کے عنوان کے تحت ایک تحقیقی مقالہ ترتیب دے رہا ہوں۔ اس کے دائرہ کار میں نوادہ، جہان آباد، گیا اور اورنگ آباد کے ضلع آتے ہیں۔ براہ کرم متعلقہ اضلاع کے فنکار اپنا ایک تفصیلی تعارف درج ذیل پتہ پر جلد از جلد ارسال کریں۔

پتہ: شکیل علائی "کہکشاں" کریم گنج، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

بانی: حافظ محمد عبدالرحمن علی شہسرامی — بیادگار: زین العابدین احمد داور شہسرامی

ماہنامہ سُہیل گیا

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر
- ایڈیٹر: جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر: خورشید ہاشمی

معاونین: شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

▲ کتابت: سید عبدالاحد گیاوی ▲

- شمارہ نمبر ۱ — جلد ۵۲
- بدل اشتراک
- فی شمارہ ——— ۴ روپے
- سالانہ ——— ۴۰ روپے
- لائف ممبری ——— ۱۰۰۰ روپے

فہرست

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سُہیل

... سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

(بہار)

آپسی میل یکجہتا۔ اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا۔ یہ سبھی فرقوں کا زبانوں، مذہبوں اور تہذیب وتمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے بنا ہے۔ گوندر، رنیدر، قاضی نذرالاسلام یادکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور کبیر کے گیت ہر گاؤں گھروں میں گائے جاتے ہیں۔

کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ آج کی نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے

آیئے — ہم سب مل کر قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ، بہار

P.R.NO 21/26 (21-45) 94-95

سوچ

ہم کیسے لکھیں

ہم تخلیق کی بات کرتے ہیں، اچھی اور سچی تخلیق کی کھوج میں ہم رہتے ہیں۔ ہماری تنقید بہترین تخلیق کا عرفان حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور ایسے اصول و ضوابط وضع کرنا چاہتی ہے۔ جن سے جنوئین فن پارے سامنے آسکیں۔ ہمارے قارئین ایسی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں جو ادب کا نچوڑ ہوں۔ غرض ادبی معاشرے کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو خوب سے خوب تر ادب کا متلاشی نہ ہو۔

لیکن یہ سوال بہرحال سامنے آتا ہے کہ اچھا ادب کس طرح سامنے آسکتا ہے۔ ہمارے اہلِ فکر و نظر اس امر پر تشویش کرتے ہیں کہ ادھر چند دہائیوں میں مجموعی طور پر تخلیقی ادب میں زوال آیا ہے۔ اس انحطاط کے اسباب پر بھی غور و خوض کیا جاتا ہے۔ بعض علمائے ادب اس امر پر مصر ہیں کہ آج کی ادبی نسل اپنی روایات سے دور ہو گئی ہے۔ زبان و بیان پر ہماری گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے۔ ہم اپنے پرانے ادبی اثاثے سے غافل ہو گئے ہیں۔ گویا ایک سلسلہ اور تواتر جس سے شعر و ادب میں ارتقا پیدا ہوتا ہے اب کمزور ہو چکا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج ہمارے تخلیقی سوتے خشک ہوتے جا رہے ہیں۔

کچھ لوگوں کا تصور یہ ہے کہ آج کا انحطاط اس لئے ہے کہ ہم نظریاتی طور پر بے سمتی کے شکار ہو گئے ہیں۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے ہمارے پاس کوئی لائحہ کار

باقی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا ہمارا ادب افراتفری کا شکار ہو چکا ہے۔

اور اسی طرح کے متعدد کلیات سے صریحاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان میں سے کسی ایک خیال کو کلیتہً قبول بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ سچا فن کار اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں میں آتے جاتے سارے مناظر منعکس کرتا رہتا ہے۔ سماجی، سیاسی حالات، بدلتے ہوئے اقدارِ حیات، نئی ایجادات و انکشافات، عارضی انقلابات، عقائد و مسلک یہ سب کے سب ہمارے لئے تخلیق کا محرک بنتے ہیں۔ اچھا اور سچا فن کار کبھی حالات سے غافل نہیں رہتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریہ حیات کا وکیل نہ ہو — اور شاید اسے ہونا بھی نہیں چاہئے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ صالح روایات کا ایک مجموعی تاثر رکھتا ہو۔ انسانی اور اخلاقی اقدار پر ایقان رکھتا ہو۔ فن کار معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ حد درجہ باشعور ہوتا ہے۔ — اور ظاہر ہے کہ ان خصوصیات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کہیں نہ کہیں سے وابستہ ہو۔ ایسا ہی حساس، باشعور، وسیع المطالعہ اور بینا و دانا فرد اچھا فن کار ہو سکتا ہے اور اس طرح ہم بہتر سے بہتر ادب کے خالق بن سکتے ہیں۔

مسعود منظر

اُردو کے ایک اہم دانشور افسانہ نگار

— اور صاحب طرز صحافی —

— کلام حیدری —

کی شخصیت اور فن پر ایک عظیم اور باوقار پیش کش

ماہنامہ سہیل کا کلام حیدری نمبر —— ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک وقیع مجلہ

ہندو پاک کے نامور قلم کاروں سے تعاون کی اپیل ہے —— منیجر ماہنامہ سہیل گیا

قسط ۔ ۲

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
حیدر آباد

فریدہ زین کی کہانیاں

فن اور مواد میں ارتقاء کی داستان

: دوسرے دن اخبار میں چھپا کہ :-

" ایک بھائی کے ہاتھوں بہن کا قتل قاتل نے دوست کا بھی قتل کر دیا ۔ پتہ چلا کہ ملزم پاگل پن کا شکار ہو گیا ۔

فریدہ پوچھتی ہے ـــــ

" پاگل کون تھا ؟ عامر، شرما، سلیمان سیٹھ، یا پھر سماج "

یہ جملہ ہی فریدہ کے مشاہدے سے مجاہدے کی ے سفر کی نشاندہی کر رہا ہے ۔ " پاگل " کا پتہ چل جائے پر مقابلہ کے داؤ پیچ متعین ہو سکتے ہیں ۔

" کنارے بے وفا نکلے " بھی ایک دل کو چھو لینے والی کہانی ہے ۔ ممتاز احمد کے گھر بیٹی ہوتی ہے ماں ۔ وہ بیٹا چاہتے ہیں ۔ اور گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔ [illegible] ہو جاتے ہیں

شادماں ۱۰ سال کی ہو جاتی ہے

ممتاز احمد کاروبار سے بڑے عرصے کے بعد آتے ہیں ۔ میز پر کئی خطوط ہیں ۔ اس میں سے گلابی خط اٹھاتے ہیں ۔ یہ شادماں کا ہے ۔ بڑے دل ہلا دینے والے انداز میں باپ کو لکھا ہے ۔ اور دونوں ماں بیٹی جواب کا انتظار کرتے ہیں ۔ ممتاز احمد خط پڑھ کر پچھتاوے میں پڑ جاتے ہیں ۔ اور فوراً شادماں کے گھر جاتے ہیں ۔ لیکن پڑوسیوں سے پتہ چلا کہ وہ دونوں انتظار کرتی رہیں پھر بستی والوں کی لعن طعن کو سہ نہ سکیں اور خودکشی کر لیں ۔

اب ممتاز احمد کی سنئے ۔ گھر آتے ہیں اور قلب کی حرکت بند ہونے سے رحلت کر جاتے ہیں ۔ دوسرے دن اخبار میں چھپا تھا کہ شہر کا ایک رئیس قلب حرکت بند ہونے سے مر گیا ۔ وہ لاولد تھا اور ساری جائداد خیراتی اداروں میں تقسیم کر دیا ۔

[illegible] کے پیچھے جو ایک جذباتی اور [illegible]

کی دنیا حسین ہے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

"یہ بتا جادوگر" میں اصل میں حسین ساگر میں گوتم بدھ کے مجسمے کے نصب کرتے وقت کشتی کے الٹ جانے کا جو حادثہ ہوا تھا اسے موضوع بنایا گیا ہے۔ دینو گاؤں سے شہر آتا ہے کہ کچھ کمائے اور بوڑھے ماں باپ کی خدمت ہو اور رما سے شادی ہو جائے۔ لیکن شہر میں وہ کشتی اتارنے کے کام آ گیا۔ کشتی الٹ گئی اور وہ جان کھو بیٹھا۔

اس کے دوست بدری ناتھ نے اس کی لاش کی شناخت کی اور پھر گاؤں گیا کہ ماں باپ کو لے آئے کہ دس ہزار کا ایکس گریشیا حاصل کرے۔

بدری ناتھ کی گاؤں میں رما سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ دینو کے متعلق پوچھتی ہے تو اس کی چوڑیاں توڑ دیتا ہے یہی خاموش لیکن دل خراش جواب تھا۔

بدری ناتھ دونوں بوڑھے ماں باپ کو شہر لاتا ہے۔ مردہ خانے لے جاتا ہے۔

کہانی ختم ہوتی ہے جب لوگوں نے دیکھا کہ حسین ساگر سے دو دن دو لاشیں نکلتی ہیں اور ان کی بے نور آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔

"یہ بتا جادوگر — ہمارا قصور کیا تھا!!"

"تلاش میں ہے سحر" میں ندا کو شکیب سے محبت ہے۔ لیکن ندا کی شادی کہیں اور ہو جاتی ہے اور شوہر اسے طلاق دیدیتا ہے۔ اب وہ شکیب سے دور ہی رہنا چاہتی ہے۔ لیکن شکیب اس سے شادی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ندا بچنے کے لئے گھر سے نکل جانا چاہتی ہے۔ ایسے میں شکیب آتا ہے۔ اور جب ندا چلے جانے پر اصرار کرتی ہے تو پیچھے سے شکیب کے والد آتے ہیں اور ندا کو اپنی بہو بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اب ندا بھی اپنے آپ کو سپرد کر دیتی ہے۔

یہاں ندا کی روایتی نسوانیت کہ وہ ایک مطلقہ عورت ہے اور شکیب کو اپنانے کا اسے حق نہیں۔ شکیب کی محبت اور اس کے باپ کی فراخدلی اور روایت سے بغاوت کے جذبے کی کہانی قلمبند ہوتی ہے۔

"خون پھر خون ہے" فسادات کی کہانی ہے لیکن بربریت پر انسانیت کی فتح کا نقشہ پیش کرتی ہے پرانی نسل کے مولویوں اور پنڈتوں کی تنگ نظری پر نئی نسل کے نوجوانوں کی فراخدلی کی کہانی ہے۔

نجمہ زخمی ہے۔ اور دیپک اسے دواخانے لاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر سے التجا کرتا ہے لیکن اس لڑکی کو خون دینا ہے اور اسٹاک میں اس گروپ کا خون نہیں۔ دیپک اپنا خون پیش کرتا ہے اور وہ مل جاتا ہے۔ پنڈت جی آتے ہیں اور دیپک سے کہتے ہیں کہ اس کی بہن آشا کے قاتلوں کے قافلے کی لڑکی کو وہ اپنا خون نہ دے۔ ایک مولوی صاحب آتے ہیں کہ وہ ایک مسلمان لڑکی کی رگوں میں اشرف کے قاتلوں کے گروہ کے ایک نوجوان کا خون برداشت نہیں کر سکتے۔ لیڈی ڈاکٹر ان دونوں کے خون کی بوتلوں کو الماری تک لاتی ہے اور پوچھتی ہے وہ بتائیں کہ اس میں کون سا خون ہندو کا ہے اور کون سا مسلمان کا — وہ دونوں بے بس ہو جاتے ہیں۔ دیپک کا خون نجمہ کو چڑھایا گیا۔ نجمہ صحت

کے لئے آشنا ہے اور دیپک بجھ کے لئے اخرف۔

"پتھر کا درد" کہانی میں صبیح کینسر کا مریض ہے اور رانی سے پیار و محبت کی باتیں کرتا ہے۔ رانی کو یہ پسند نہیں۔ پھر صبیح کا آنا بند ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ دواخانے میں بستر مرگ پر پڑا ہے۔ رانی جاتی ہے۔ ساری کہانی آشکارا ہوتی ہے۔ دوسری صبح رانی دلہن کی طرح بن سنور کر صبیح کے پاس جاتی ہے وہ آنکھیں کھول کر "دلہن" کو دیکھتا ہے اور مر جاتا ہے۔ رانی نے وہیں چوڑیاں توڑ ڈالیں اور باہر ایک دھماکہ ہوا۔ کسی نے پتھر کو بارود لگا کر توڑا تھا۔ یہ دھماکہ، ایک علامت بن جاتا ہے اس دھماکے کی جو رانی کی زندگی میں ہوا تھا۔

"قاتل مسیحا" بھی ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔

ارجن کو بہن کی شادی کے لئے جہیز کی رقم کی ضرورت تھی۔ وہ ٹرک میں گانجا لے جا رہا تھا کہ ۵ ہزار مل جائیں اور اس کی بہن کی شادی ہو جائے۔ ارجن گرفتار کر لیا جاتا ہے اور برات واپس ہو جاتی ہے — ورشا اس کو برداشت نہیں کر پاتی اور خودکشی کر لیتی ہے۔

ارجن رہا ہو کر آتا ہے اور انسپکٹر خرما کو پکڑ لیتا ہے۔ انسپکٹر کہتا ہے اس نے اپنی ڈیوٹی انجام دی۔ لیکن ارجن انتقام پر تلا ہوا ہے۔ ارجن انسپکٹر کے ساتھ اس کے گھر آتا ہے۔ غصہ میں بھرا ہے۔ شالو نے دروازہ کھولا اور انسپکٹر خرما نے شالو کو ارجن سے [illegible]

اس وقت ارجن واپس ہو جاتا ہے

اب خرما کی بیٹی کی شادی کا سوال ہے۔ دینا ناتھ کا خط آتا ہے کہ بغیر جہیز کے وہ بارات نہیں لائیں گے خرما پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ شالو نے خرما کو تکئے کے سہارے بٹھایا اور دروازہ کھولا۔ ارجن ہے اور اس کے ساتھ انیل۔

خرما پریشان ہے۔ ارجن کہتا ہے اسے دینا ناتھ کی غرض کا پتہ ہے۔ اب شالو کی شادی انیل کے ساتھ ہوگی۔ انیل وہی تھا جو ورشا سے شادی نہ کر کے بارات لوٹا گیا تھا۔ باپ کے کئے پر پشیمان تھا۔ گھر چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اور اب شالو سے بغیر جہیز کے شادی کر کے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا تھا۔

فریدہ پوچھتی ہے۔ "ارجن آخر کون ہے؟ قاتل یا مسیحا؟"

"وقت سفر یاد آیا" میں فرح کو اسلم سے لگاؤ ہے۔ لیکن اسلم بے التفاتی برتتا ہے۔ فرح کو یکسر نظر انداز کرتا رہا۔ وہ اس کے پیروں پر گر پڑی۔ لیکن اسے وہ ڈھونگ جانا۔

اب فرح کی منگنی ہو رہی تھی۔ یکایک فرح بے ہوش ہو گئی۔ اسلم نے اسے بھی فریب اور ڈھونگ سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر نے کہا وہ کہ فرح قلب کی مریضہ ہے۔ اب اسلم سمجھ چکا تھا۔ لیکن کئے پر اسے پچھتاوا تھا۔ فرح مر جاتی ہے۔

اب اسلم روزانہ فرح کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے اور آنسو بہاتا [illegible] محبت کی توہین کے گناہ کا [illegible]

"دل ڈھونڈتا ہے" میں عنبرینہ کی موٹر سے ایک [illegible] ٹکراتا ہے اور وہ دواخانے میں شریک کیا جاتا ہے۔ عنبرینہ نے اسے اپنے باپ کی فیکٹری میں کام دلا دیا۔ وہ روزانہ عنبرینہ کے پاس آتا وہ شاعری کرتا تھا۔ عنبرینہ اور شاعر کی ملاقاتیں رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہونے لگیں۔

ایسے میں عنبرینہ کا دیرینہ دوست صوفی کوئی چار سال کے بعد آجاتا ہے۔

اب عنبرینہ شاعر کے گھر نہیں جاتی۔ ایک روز جاتی ہے تو صرف یہ کہنے کے لئے کہ "مجھے بھول جاؤ" اور واپس ہو جاتی ہے۔

یوں ہوتا ہے کہ شاعر صوفی کی موٹر سے ٹکرا کر مر جاتا ہے۔

اب عنبرینہ سات سال کے بعد وطن واپس ہوتی ہے اور سیدھے شاعر کی قبر پر پہنچتی ہے۔

"پھول انتظار کے" شاہی آنٹی کی دلدوز کہانی ہے۔ اس کا شوہر "لاپتہ" ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ مر گیا۔ مگر شاہی آنٹی نہیں مانتی۔ وہ سہاگن ہی کی طرح بنی سنوری رہتی ہے۔ پڑوس کی بچیوں کی ہر طرح خدمت کرتی ہے۔

عید قریب ہے۔ شاہی آنٹی کے قلب پر حملہ ہوتا ہے۔ وہ لڑکیوں کو بلوا بھیجتی ہے کہ عید کی مہندی تو لگوالیں۔ اور عید کی صبح وہ مر جاتی ہے۔

فاتحہ سوم تھی۔ قبر پر جہاں سب بیٹھے تھے۔ وہیں آفاق بھی موجود تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی۔ شاہی آنٹی صحیح ہی تو کہتی تھیں کہ وہ سہاگن تھی۔

آفاق پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ شادی بھی کر لی تھی۔ اب وہ واپس آئے تھے؟ شاہی آنٹی گزر چکی تھیں۔

"اے گردشِ دوراں" کی کہانیاں پچھلی کہانیوں سے کچھ اور ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک تو فریدہ نے کرداروں کی تشکیل میں محنت اور جدت دونوں ہی کا اضافہ کیا ہے۔ زبان اور بھی رواں دواں ہو گئی ہے اور موضوع کے اعتبار سے بھی کہانیوں کی سماجی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

"سسکتی چاندنی" میں دیبا، شبنم، ترنم، شمع سحر، زیبا، مونا، شالو، ثنا اور چاند جیسے کردار ملتے ہیں۔ جو محبت پر قربان ہو جاتے ہیں۔ عورت کی قربانی اور مرد کی بے اعتنائی زیادہ تر ان کہانیوں کا موضوع ہے عورت کی محبت پختہ اور مرد کی محبت سیمابی محسوس ہوتی ہے۔ وہ سماجی رکاوٹوں کے خلاف بغاوت نہیں کرتا محبت سے منکر ہو جاتا ہے

"دل سے دار تک" آتے آتے کہانیوں اور کرداروں میں اور بھی جان پڑ جاتی ہے۔ دلبر کی قربانی ہے تو خالد نکما نہیں ہے۔ اور اماں حقیقت کو جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ شاید ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔

حمید تو خوابوں کی تعبیر کے لئے قربان ہو جاتا ہے لیکن مفلس کی دنیا نہیں بدلتی۔

لاجو صرف اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر سہاگن کا لبادہ اوڑھے ہے۔ لیکن بستی والے اسے برداشت نہیں کر سکتے بالآخر وہ اور اس کے بچے ہی رات کے وقت بستی والوں کو بچاتے ہیں اور قربان ہو جاتے ہیں۔ لاجو

بہار سہی گیا

ستی والوں پر کسی کر چوٹ بھی کرتی ہے کہ وہ بدمعاش
ہی لیکن انہیں اس کے پاس پناہ لینی پڑے گی ۔

نگار کا کردار بھی غیر معمولی ہے ۔ الیاس
نے اسے دھوکہ دیا ۔ شادی کرلی ۔ لیکن وہ غیر شادی
شدہ ہی رہی ۔ ثمر کو گود لیا ۔ آخر میں الیاس کو اپنی بیٹی
شیبا کی نگار کے گود لئے بیٹے ثمر سے شادی کے لئے
نگار کے پاس جانا پڑا ۔ نگار کو پہچانا اور پشیمان ہوا ۔
لیکن نگار نے محبت کی لاج رکھ لی اور شیبا کو بہو
الیا ۔

نگار نے محبت کی عزت رکھ لی جبکہ الیاس نے
سے ٹھکرایا تھا ۔ اور پھر شادی کرکے تو خود اپنی محبت
ا توہین نہیں چاہتی تھی ۔ سماج کی خدمت کے لئے ایثار
رتی ہے ۔ اب ایثار کا مقصد ہی بدل گیا تھا ۔ جان دینا
ہیں بلکہ دکھی جانوں کی خدمت کرنا ہے

" پلکوں کی چھاؤں میں ایک لڑکی ہی ادب کی حفاظت
ر ادیب کی یادوں کو اپنا فرض سمجھتی ہے جبکہ رشتے
ار مال و دولت پر نظر رکھتے ہیں ۔

آفرین اپنی انا کی شکار ہے ۔ وہ بھولتی ہے کہ
سن کو بھی زوال آتا ہے لیکن گرہست اور بال بچوں
ے پرسکون ماحول میں حسن لازوال ہو جاتا ہے ۔ آفرین
آفرین نے روشن کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا کہ اسے حسن
ی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتی ہے ۔ لیکن خود روشن
اور شہلا کے بیٹے شنید سے اس وقت ملتی ہے جب
اس کے بالوں میں چاندی چمک رہی ہے اور چہرہ میک
اپ کا محتاج ہو گیا ہے ۔

رحمت [illegible]

تعمیر کرتا ہے لیکن رہی بے گھر ہے اور اس کا بچہ بخار
میں مبتلا جاڑوں میں فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتا ہے ۔
دولت اور محنت کی کشمکش ظاہر کی ہے ۔ فرہاد کی
محنت نے شیریں کو تو حاصل نہیں کیا لیکن ایک بادشاہ
کے فریب نے شیریں کو لوٹ لیا ۔

نواب حشمت خاں کا بھی ایک کردار ہے ۔ "انی
مان" لاتے اور شراب و کباب کے مزے اڑانے میں
ماہر ہیں ۔ مگر صبا کی شادی احمر سے نہیں کر سکتے کیوں
کہ نہیں میں آن بان دکھانے کی سکت نہ رہی اور صبا
قربان کر دی جاتی ہے ۔

انجم کا کردار دیکھئے ۔ جو ہیرے جان چھڑکتی ہے
اور جوہی کو اپنا خون دے کر بچا لیتی ہے مگر مسٹر
خان جوہی کے زخم کو اس کے گرنے پر نہیں انجم کی لاپرواہی
سے منسوب کرکے اسے کوٹھے سے گھر سے نکال دیتے
ہیں ۔ ایک امیر اور دوسرا غریب عورت کا کردار ہے
کرن بھی واضح ہے ۔

روما کا بھی ایک کردار ہے ۔ وہ عدنان سے
عشق کرتی ہے ۔ دوسرے سے شادی ہوتی ہے لیکن
وہ برداشت نہیں کرتی ۔ عدنان واپس آتا ہے لیکن
اس نے سحر سے شادی کر لی ہے کیونکہ سحر اس لڑکے
کی اکلوتی بیٹی ہے جس نے عدنان کو پناہ دی تھی ۔

روما اور عدنان دونوں ہی محبت کی قربانی
دیتے ہیں ۔ ہر روز شام میں پہاڑی کے پیچھے سورج کا
قتل ہوتا ہے ۔ شفق بکھرا ہے ۔

نسیم صاحب کا بھی ایک کردار ہے ۔ [illegible] سعید
گلابو سے عشق ہے ۔ لیکن [illegible]

غلاف سے صرف جوڑے کو بچا کر کھا لیں گی۔
گل فروش لڑکے کو میم صاحب سے سفید گلاب
کے گچھے سے لگاؤ ہے۔ اس کی دعا سے میم صاحبہ
کی گود بھرتی ہے لیکن وہ خود مر جاتی ہیں۔ یہاں
گل فروش لڑکے کا کردار ابھارا ہے۔

اے گردشِ دوراں "کی پہلی کہانی کی گلابو
ہی ایک غیر معمولی کردار کی شکل میں ابھرتی ہے۔ بڑے
سرکار کی امیری اور گلابی کی غریبی کا تصادم ہے۔ کہانی
میں تو گلابی کی ماں مر جاتی ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ
بڑے سرکار کی موت واقع ہوئی اور گلابی
مجاہد انسانیت کی علامت کے طور پر سماج پر چھا
گئی۔

عامر کا بھی ایک کردار ہے۔ بہن کی خاطر
کالا دھندا کرتا ہے لیکن گرفتار ہو جاتا ہے۔ بہن
کی بارات لوٹ جاتی ہے۔

وہ جب جیل میں ہوتا ہے تو سلیمان سیٹھ
نے اس کی ماں کا تو شاندار مقبرہ بنایا لیکن اس
کی بہن نیلو کو عطا فرمائی۔ یہاں عامر کا کردار
دیکھئے۔ اور انتقام کے انداز پر غور کیجئے۔ وہ اپنی
نیلو کو اور اپنے دوست شرما دونوں کو قتل کر دیتا
ہے۔ اور پاگل ہو جاتا ہے۔ پاگل کون ہے؟

ممتاز احمد کا بھی ایک کردار ہے۔ بیٹی ہوتی
ہے۔ چونکہ بیٹا نہیں ہوا اس لئے بیوی بیٹی کو
چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ فرے کا روباری بن جاتے
ہیں۔ آخر میں بیٹی کا دل خراش خط ملا تو پشیمان
ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک بیوی اور بیٹی دونوں

ہی نے خودکشی کر لی۔

ممتاز احمد کے کردار میں فریب اور مکاری ہے تو
پشیمانی بھی "سسکتی چاندنی" کے بعد کی کہانیوں
میں "پشیمانی" کا عنصر آگیا ہے۔ جو اطراف کا مشاہدہ
کا ایک موضوعی پہلو ہے۔ اب مشاہدہ گہرا بھی ہو گیا
ہے اور وسیع بھی۔

دینو کا انجام تو وہی ہے جو ایک دیہاتی
نوجوان کا شہر میں پیسہ کمانے کے لئے آنے والے
کا مقدر ہے۔ لیکن اسے گوتم کے تقدس سے
جوڑا ہے۔ رما کی چوڑیاں توڑی ہیں اور بوڑھے ماں
باپ کو قربان کیا ہے۔

ندا کا کردار تو وہی روایتی مطلقہ عورت کا
ہے جو دوسری شادی کو اپنے لئے گناہ سمجھتی ہے۔
لیکن یہاں شکیب کا کردار اور اس سے بڑھ کر
اس کے باپ کا کردار بہت بلند محسوس ہوتا ہے۔
ندا روایت میں جکڑا ہے تو شکیب اور اس کا
باپ ویسی روایتوں کو جو انسانیت کو روند ڈالتی
ہیں توڑ دینا چاہتے ہیں۔

دیپک کا کردار تو ہندوستان کے نوجوانوں
کے اس حوصلے کا اظہار ہے جو ہندوستان کا
روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

صبیح اور رانی کی کہانی بھی دو کردار پیش کرتی
ہے۔ صبیح کو رانی سے محبت ہے۔ اور رانی اسے بڑھنے
نہیں دیتی۔ لیکن جب صبیح بسترِ مرگ پر ہوتا ہے تو رانی
جیسے خواب سے چونک جاتی ہے۔ صبیح کی وقعت
اس کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ شادی

کے بغیر ہی ، بیوہ ہو جاتی ہے۔

فریدہ کے کرداروں میں کوئی دلہن تو بنتی ہے لیکن سہاگن نہیں ۔ اور کوئی دلہن نہیں بنتی ہے بیوہ ہو جاتی ہے۔

ارمن کا کیرکٹر بھی خوب ہے ۔ اور انیل کا بھی ۔ وہ انتقام کے جذبے سے انسپکٹر کا پیچھا کرتا ہے لیکن مسیحا بن کر انسپکٹر کو ہیمبرز کے دکھ سے بچا لیتا اور انیل اور شانو کی شادی ہوتی ہے۔ انیل اپنے باپ کی ہیمبرز کی ضد کا کفارہ ادا کرتا ہے۔

اسلم اور فرح کے کردار بھی خوب ہیں ۔ فرح کو اسلم سے محبت ہے لیکن وہ دل کی مریضہ ہے بار بار بے ہوش ہوتی ہے تو اسلم اسے ڈھونگ سمجھتا ہے۔ لیکن جب فرح منگنی کے وقت بے ہوش ہوتی ہے اور ، اس کے قلب کی مریضہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہے تو اسلم شرمندہ ہوتا ہے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی ۔

عنبرینہ کا کردار بھی خوب ہے ۔ اسے صوفی سے محبت ہے ۔ لیکن اس کار سے ٹکر کھانے والے شاعر کی طرف وہ راغب ہوتی جاتی ہے ۔ پھر جب صوفی لوٹ آتا ہے تو عنبرینہ شاعر سے کنارہ کشی ہو جاتی ہے ۔ شاعر صوفی کی کار سے ٹکرا کر مر جاتا ہے ۔ عنبرینہ سات سال بعد وطن واپس آتی ہے تو سب سے پہلے شاعر کی قبر پر جاتی ہے۔

شاہی انی کا کردار بھی جاذب توجہ ہے۔ اسے [illegible] ہے۔ سہاگن ہی رہتی ہے ۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کا شوہر آفاق قبر پر موجود ہوتا ہے ۔ شاہی انتی سہاگن ہی رہی ۔ اسی میں مگن بھی ۔ اڑوس پڑوس کی بات نہ مانی ۔ اور آفاق آتا بھی ہے تو محض پچھتانے کیلئے ۔

اس مجموعے کی کہانیوں میں کچھ تابوت بھی ہے اور وہ کبھی قبر یہ ظاہر ہوتا ہے ۔

لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ فریدہ کی کہانیوں میں ایک مسلسل ارتقا ملتا ہے ۔ کہانی کے مواد میں ۔ زبان و بیان میں اور کرداروں کی تعمیر میں لگتا ہے فریدہ نے عورت کو اچھی طرح سمجھا ہے ۔ اور اس کی مصیبتوں کو سماجی اور روائتی بنیادوں پر بھی محسوس کیا ہے ۔ اس کا مشاہدہ تیز ہے اور وہ عورت کے ذاتی غم کو سماج کا آفریدہ جانتی ہے ۔ اس نے دیکھا ہے ۔ سمجھا ہے ۔ اب اسے حالات کو بدلنے کی طرف بڑھتا ہے ۔

آزادی کے بعد الوت محل سے
اردو میں شائع ہونے والا
نئی نسل کے نمائندہ شاعر
منصور اعجاز
کا اولین شعری مجموعہ
چاندی کا زہر
قیمت ۵/-
پتہ : منصور اعجاز ، راشد اسٹور ... الوت محل ...

آنجہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ
کلکتہ

جوہر غازیپوری
ایک افسانہ نگار، شاعر اور صحافی

جوہر غازی پوری — صحت مند بھاری بھرکم جسم، رنگ عام ہندوستانیوں کی طرح، یعنی نہ بالکل گورے اور نہ ہی کالے، بلکہ ایسی رنگت کو ہم کھلتا ہوا کہہ سکتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ آسانی سے کہا جاسکتا کہ جب وہ جوان تھے — خوش مزاج، خوش اخلاق اور ہنس مکھ — یاد نہیں کہ مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف کب حاصل ہوا تھا اندازاً ۵۶-۱۹۵۵ء ہوگا۔ پیدائش ۱۹۰۰ء بمقام دہلی۔ یعنی جب میری ان کی ملاقات ہوئی تب وہ پچاس کے کوٹے میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ ایک اچھے ہومیو پیتھی ڈاکٹر تھے اور انہوں نے سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈھاکہ کے میڈیکل ہومیو کالج سے ایم۔ بی کی سند حاصل کی تھی "دار الیتامی اسلامیہ ہوڑہ" اور "دی ہوڑہ جنرل ڈسپنسری" میں وہ بطور ایک ہومیوپیتھی ڈاکٹر کے پراکٹس کرتے تھے ساتھ ہی وہ دار الیتامی اسلامیہ ہوڑہ، جسے عام طور پر مسلم خانہ ہوڑہ کہا جاتا تھا کے سکریٹری اور کرتا دھرتا بھی تھے۔ لیکن میری ان سے ملاقات کی وجہ نہ ان کا ڈاکٹر ہونا تھا اور نہ ہی دار الیتامی اسلامیہ ہوڑہ کا سکریٹری ہونا — بلکہ میں ان سے ملا محض اس لئے کہ وہ ایک شاعر تھے اور کم از کم بنگال کی حد تک ایک نامور شاعر تھے اور ساتھ ہی ہفتہ روزہ "عدت ہوڑہ" کے مدیر۔ صرف یہی نہیں کہ ان کو ہوڑہ کی علمی اد ماحول میں ایک باعزت اور نہایت اہم مقام حاصل تھا بلکہ پورے مغربی بنگال میں وہ ایک جانے پہچانے نز شاعر کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ ادبی نشستوں ا مشاعروں میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا تھا۔

دار الیتامی اسلامیہ ہوڑہ کوئی ۱۲ ۱۵۰ کٹھے زمین پر ایک دو منزلہ عمارت رہی ہے۔ داخل ہونے پر

جو بہت بڑا کمرہ تھا اس کے درمیان حصے میں ایک بہت بڑا ٹیبل — ٹیبل پر ایک طرف دفتری کاغذات و فائلیں — دوسری طرف پاندان — پھر ایک طرف ہفتہ وار "عبرت" کے لئے آئے ہوئے مضامین، نظم و نثر اور خطوط، پھر کہیں کچھ اور کہیں کچھ — ٹیبل کے نیچے ایک بڑا اگالدان۔ بیچ کی کرسی پر براجمان ہیں حضرت جوہر غازیپوری۔ ان کے پیچھے اوپر دیوار پر ٹنگی ہوئی دارالیتامیٰ اسلامیہ ہوڑہ کے بانی ڈاکٹر محمد شفیع عسکری کی تصویر — یہی بڑا کمرہ یتیم خانے کا دفتر ہے۔ ہفتہ وار "عبرت" کا دفتر ہے اور یہی یتیم خانے کا ہومیو پیتھی شفاخانہ بھی — اسی کمرے کے دائیں جانب دیوار سے لگی ہوئی ایک الماری میں ہومیو پیتھی دوا کی مختلف چھوٹی چھوٹی شیشیاں — اب کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مسکرا کر آپ کا سواگت کریں گے۔ کھلے دل سے — بھاری بھرکم آواز میں — لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان کا ایک گال کچھ پھولا ہوا ہے۔ وجہ منہ میں پان جو ہے — وہ فوراً ہی نیچے جھک کر اگالدان میں پیک پھینکنے کے بعد گفتگو کا آغاز کردیں گے — پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔ "عبرت" کے لئے کس کس کا مضمون آیا ہے، کس نے کیا لکھا۔

کہاں کون سی ادبی نشست ہوئی یا ہونے جارہی ہے، کب اور کہاں کوئی مشاعرہ ہے، شعراء میں کون کون تھے یا کس کس شعراء کو مدعو کیا گیا ہے یا کون سا مشاعرہ کیسا رہا، وغیرہ وغیرہ — اور ہر آدھ گھنٹے میں ایک بار چپراسی کو چائے لے آنے کا حکم دیں گے۔ چپراسی کیتلی لے کر چلا جائے گا اور واپس لوٹ کر چھوٹی چھوٹی [illegible] جتنے لوگ اس وقت موجود ہوں) آدھی آدھی پیالی چائے ڈھال کر سب کو پیش کرے گا۔ چائے کے دو گھونٹ لیجئے۔ اگر پان کا شوق ہو تو سامنے ہی پاندان ہے۔ پان لگائیے۔ کھائیے اور حاضرین کو کھلائیے — اور پھر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھئے — یہی ہیں ڈاکٹر زاہد حسین جوہر غازی [illegible]

پہلی ملاقات ہی میں انہوں نے اپنے حسن اخلاق سے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ لہٰذا ان کے یہاں [illegible] جانا شروع ہوگیا۔ حالانکہ میرے غریب خانے سے [illegible] یتیم خانے کا سفر کم از کم دو گھنٹے کا ہے لیکن روز بروز ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ کئی دن تو ایسے بھی گذرے ہیں کہ میں صبح دس گیارہ بجے ان کے [illegible] پہنچا اور دن بھر ان کا مہمان رہا۔ دو چار بار ایسا بھی [illegible] کہ رات میں کہیں کوئی مشاعرہ ہونے کی وجہ سے مجھ کو [illegible] نے روک لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ اور شاعر [illegible] ہوتے بھی مجھے دیگر شعرائے کرام کے ساتھ ڈائس [illegible] بیٹھ کر رات بھر مشاعرے کا لطف اٹھاتے ہوئے اور رہ رہ کر واہ واہ کی صدا بلند کرتے ہوئے گزارنا [illegible] ہے۔ پھر میں "عبرت" میں ایک کالم نگار کے طور پر بھی لکھنے لگا۔ ساتھ ہی دیگر مضامین اور افسانے بھی [illegible] میں شائع ہوتے رہے۔ افسوس کہ آج میرے پاس [illegible] "عبرت" کا کوئی مکمل فائل نہیں ہے۔ صرف [illegible] کے ہاتھوں سے بچ کر تین چار شمارے رہ گئے ہیں [illegible] اس دور کے کئی مشاعروں کی روداد، کلکتہ اور ہوڑہ کے کئی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک ریکارڈ ہوتا اور میں آج حضرت جوہر غازی پوری کے سلسلے [illegible]

شاعری تو وہ عمر بھر کرتے رہے لیکن جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ ۱۹۶۵ء کے بعد انہوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ "باغیانہ افسانے" کے نام سے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا تھا۔ جناب مالک رام نے "تذکرۂ معاصرین جلد دوم" میں صالحہ بیگم مخفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ـــــ "انہوں نے کسی زمانے میں ہفتہ وار "عبرت" بھی کلکتے سے جاری کیا تھا جو بہت دنوں تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا"۔ معلوم نہیں کس بنا پر مالک رام نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ محترمہ مخفی نے "عبرت" نہ کلکتے سے جاری کیا تھا اور نہ ہوڑہ سے بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ صالحہ بیگم مخفی شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں اور وہ جوہر غازی پوری کی شریک حیات یعنی بیگم جوہر غازی پوری تھیں۔ کچھ عرصہ وہ "عبرت" میں خواتین کے صفحات کی نگراں رہی ہیں اور بس ـــــ

دراصل جوہر صاحب نے صالحہ بیگم مخفی کو "ادیبہ بنگالہ" بنا دیا تھا۔ جوہر صاحب کو ان کی بیگم صالحہ مخفی سے بے حد محبت تھی جس کا اظہار انہوں نے بارہا کیا ہے۔ انہوں نے "باغیانہ افسانے" کا انتساب مخفی کے نام کرتے ہوئے لکھا ہے ـــ "ادیبہ بنگالہ صالحہ بیگم مخفی نے میری ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کچھ ایسے حالات و اسباب پیدا کر دیئے کہ روز و شب مختلف موضوعات پر سالہا سال میرا قلم چلتا رہا۔"

صالحہ بیگم مخفی کے افسانوں کا ایک مجموعہ "نیا شاہکار" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا لیکن بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ "نیا شاہکار" سے برسوں پہلے ۱۹۱۸ء میں مخفی کی ایک اور مختصر تصنیف ا[…] حسین" کے نام سے چھپی تھی جس میں چند مرثیے اور سلا[…]

ان دنوں محترمہ مخفی جناب عبدالحئی صاحب ہیڈ ما[…] مسلم ہائی اسکول کلکتہ کی شریک حیات تھیں۔ [جوہر] صاحب کی یہ بھی ایک خوبی رہی ہے کہ وہ حد سے [زیادہ] صاف گو تھے اور اپنے دوستوں جن کو وہ اپنے سے قریب پاتے تھے سے کسی بات کو پوشیدہ نہیں [رکھتے] تھے، چاہے وہ ان کی نجی زندگی اور عشق و محبت کی ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے مجھے صالحہ بیگم سے ا[پنی] ابتدائی ملاقاتوں اور پھر صالحہ بیگم کی زندگی [کے] سلسلے میں بھی بتایا ہے۔ جوہر صاحب کے ایک [بیان] کے مطابق وہ خود صالحہ بیگم مخفی کے تیسرے شوہر [تھے]۔ صالحہ بیگم کی پہلی شادی سورت کے رہنے والے [اور] کلکتے میں تجارت کرنے والے عباس علی بھائی [سے] پولک اسٹریٹ کلکتہ میں ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑ[کی] (طاہرہ کلثوم) ہے۔ عباس علی بھائی سے علاحد[گی] کے بعد ان کا نکاح ثانی پنجاب کے باشندے عبد[الحئی] ایم اے سے ہوا جو مسلم ہائی اسکول (موجودہ: محمد جان ہائی اسکول) کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بدقسمتی [سے] عبدالحئی صاحب ۱۹۴۷ء میں جالندھر کے ایک فرقہ وارانہ فساد کے شکار ہوئے۔ ان سے بھی د[و] بیٹیاں رضیہ بانو اور فاطمہ فرخ ہیں۔ پھر آخر کا[ر] صالحہ بیگم مخفی جوہر غازی پوری کی زوجیت میں آ[ئیں] اور دسمبر ۱۹۷۰ء میں وہ انتقال کر گئیں۔

اس کا تو مجھے علم نہیں کہ جوہر غازی پوری نے افسانہ نگاری اور شاعری کب سے شروع کی تھی لیکن[…]

عرض کر چکا ہوں [illegible] کے بعد
انہوں نے کوئی نیا افسانہ نہیں لکھا۔ لیکن برخلاف
جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی ان کی شاعری جوان
ہوتی گئی اور وہ آخری دنوں میں بھی جب وہ نہایت
کمزور ہو گئے تھے اور قوت بینائی میں غیر معمولی کمزوری
آ گئی تھی، تب بھی شاعری سے ان کی دلچسپی میں کوئی
فرق نہیں آیا۔ انہوں نے خود ہی کہا ہے ؎

بڑھاپے کی حدوں میں ایک شاعر جب پہنچتا ہے
تخیل میں تب اس کے شعر ڈھلتے ہیں جواں ہو کر

جہاں تک ہوڑہ میں اردو شعر و شاعری کا تعلق
ہے وہاں ان کی شخصیت ہی کو ایک انجمن کا مقام حاصل
رہا ہے۔ اس کے باوجود علمی ادبی سرگرمیوں کو جاری
رکھنے اور نوجوانوں میں ادبی ذوق کو پروان چڑھانے
کے لئے انہوں نے ہوڑہ اور پھر آسنسول میں ادبی ادارے
قائم کئے تھے۔ وہ طرحی مشاعروں کے طرفدار تھے اور جن
ادبی نشستوں یا مشاعروں کا وہ خود اہتمام کرتے تھے۔
وہ عموماً طرحی ہوتے۔ مشاعروں سے وہ آخری دنوں تک
دلچسپی لیتے رہے۔ ان کی آواز بھاری بھرکم تھی اور
مشاعروں میں ایسی ہی آواز میں وہ اشعار سنایا کرتے
تھے۔ وہ ترنم پسند نہیں تھے اور نہ ہی اپنا کلام ترنم سے
سناتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ان کی عادت تھی کسی
مشاعرے میں وہ کسی شاعر کو ٹوکتے نہیں تھے۔ اچھے
اشعار پر وہ ضرور داد دیتے تھے اور شعر خوب پسند
آنے پر تو دل کھول کر داد دیا کرتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں انہوں نے میدان صحافت
میں قدم رکھا [illegible] ہوڑہ
سے ۲۴ [illegible] کو نکلا۔ اس کے ادارۂ تحریر
میں جوہر فاکری اور [illegible] شامل [illegible]
یہ ہفت روزہ طویل عرصہ تک نہیں نکلا۔ اس کے
بعد ہی وہ ہفت روزہ "عبرت" ہوڑہ نکالنے لگے جس
کا اولین شمارہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کو نکلا۔ شمارہ ۱
تا شمارہ ۶ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء اس کے
مدیر اسد اللہ دہلوی رہے اور اس کے بعد ۲۲ اکتوبر
۱۹۳۲ء سے جوہر فاز مہدوی مدیر ہو گئے۔ ہفت
روزہ "عبرت" ۱۹۶۲ء تک نکلتا رہا، یعنی طویل
تیس سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور جہاں تک مجھے
علم ہے بنگال میں کسی ہفتہ وار کو یہ مقام ۱۹۶۲ء تک
نہیں ملا تھا لیکن اب ہفتہ وار "اجالا" اس ریکارڈ
کو توڑ رہا ہے۔ کیونکہ "اجالا" ۱۹۴۷ء میں جاری
ہوا، اور آج تک نکل رہا ہے۔ ۱۹۶۱-۶۲ء میں راقم
الحروف کو بھی "عبرت" سے منسلک رہنے کا شرف
حاصل رہا ہے۔ ان دنوں میں بطور کالم نگار ایک
مستقل کالم "قلم [illegible]" لکھا کرتا تھا۔
وجوہات کا مجھے علم نہیں لیکن ۱۹۷۰ء کے
لگ بھگ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ [illegible]
اسلامیہ ہوڑہ سے جوہر صاحب کو نکل جانا پڑا لیکن
ان کے الگ ہو جانے کے بعد اس مشہور [illegible] کے دن
بھی دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہو گئے۔ دوسری طرف
جوہر فاز مہدوی بھی مالی پریشانیوں سے تنگ آ گئے
آخری عمر میں وہ اولاد اور گھر کے دیگر افراد سے بھی خوش
نہیں تھے۔ ان کے کئی خطوط میں انہوں نے اولاد کی طرف
سے ان کو جو روحانی صدمہ بار بار پہنچتا رہا ہے کا ذکر کیا ہے

[illegible]

[illegible] بہت ... [illegible]

... دوست ... شاعر ... زندگی
کے آخری ... دشواریوں ... [illegible]
اور صحت کی خرابی میں بیتے ہیں۔ ... [illegible] ... وہ
... کا آسنسول ... جہاں قریشی صاحب بھی
انہوں نے ... قائم کی تھی۔ وہاں بھی ایک ادبی
ادارہ "حلقۂ ادب" کے نام سے قائم کیا تھا جس
کے تحت ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے آسنسول
میں ہوتے ہوئے مجھے بھی دو تین بار کسی نہ کسی کام سے
آسنسول جانا پڑا۔ وہاں محمد قریشی ... جو جوہر صاحب
... آسنسول میڈیکل ... [illegible]
... میں نے دیکھا کہ باوجود مالی دشواریوں کے ان
کی ... میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہی خلوص، وہی
محبت ... وہ خود مجھے لینے ریلوے
اسٹیشن پر حاضر ہوتے اور جس دن میں کلکتہ لوٹتا اس
دن ... تک پلیٹ فارم پر کھڑے مجھ سے
گفتگو کرتے رہتے تھے۔ آج کے دور میں ایسے لوگ
کہاں ہیں؟

سن تو یاد نہیں لیکن علالت کی وجہ سے ہی وہ
آسنسول چھوڑ کر ... لوٹ آئے تھے اور اپنی
... آخرکار وہ دن آ ہی گیا جب غالباً
... لگے تھے اور ابھی
... ۱۹۸۳ء
[illegible]
[illegible]

[illegible]

افسوس تو یہ ہے کہ جوہر صاحب اپنی زندگی میں
اپنا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں کر سکے اور ان کی
وفات کے بعد بھی کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔
ان کا سارا کلام محض اخبارات اور رسائل میں
بکھرا ہوا ہے۔ اور اب تو اس دور کے بہت سے
اخبارات و رسائل بھی محفوظ نہیں رہے ہیں۔ بہرحال
ذیل میں ایک نظم اور پھر چند اشعار پیش کر رہا ہوں۔

اے میری جوانی

وہ دورِ شادمانی، وہ عہد کامرانی
وہ زیست کی کہانی، اب ہو گئی پرانی
اے میری نوجوانی، اے میری ...

وہ ولولہ کہاں ہے، ہر عضو ناتواں ہے
وہ جسم ہے نہ جاں ہے، خوں ہو گیا ہے پانی
اے میری نوجوانی، اے میری ...

تو ہو گئی ہے رخصت، سب لے کے تاب و طاقت
کرتا ہوں میں بہ رقت، اب تیری نوحہ خوانی
اے میری نوجوانی، اے میری ...

اک آنکھ میں نہیں دم، ... روشنی کم ...
ہر وقت دل ہے ابرِ غم، کرتا ہے حکمرانی
اے میری نوجوانی، اے میری ...

دل میں ... وہ ... [illegible]
اب ہو گئی ہے ... زندگانی
[illegible]
[illegible]

پیری کا یہ زمانہ، ہے موت کی نشانی
اے میری نوجوانی اے میری نوجوانی

اب میں ہوں اور بستر، ہیں روگ حملہ آور
اس زندگی سے بہتر ہے مرگ ناگہانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

کی صرف تیری طاقت بسیار از ضرورت
کچھ تیری قدر و قیمت، پہلے نہ میں نے جانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

ٹھکرا کے عیش و راحت کی خدمت صحافت
برسوں برائے "عبرت" در در کی خاک چھانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

تنگ آ گیا تھا جی سے، لیکن ادب کے ناطے
"اردو اکیڈمی" نے کچھ کر دی مہربانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

بیخود رہے نہ شاکر پرویز ہیں نہ طاہر
طرزی نہ جوہر و عام ہیں جیتے جی ہوں فانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

تو کر سکے تو یہ کر ملتفت ہو اس پہ
یہ کہہ رہا ہے جوہر آ جا حیات ثانی
اے میری نوجوانی، اے میری نوجوانی

آرام جاں

وہ جو ہمارے ماضی میں محروم تاج حکمراں ہو کر
چمکتے تھے کبھی جو رونق بزم جہاں ہو کر
یہ محرومی، یہ ناکامی، ہوئے ناکامیاں سہہ کر
میرے حصے میں آئی ہے نصیب دشمناں ہو کر

کسی کو یاد ہو جو وجہ سکون قلب مضطر تھی
وہی آرام دل بھی لے گئی، آرام جاں ہو کر
یہیں پہ کھل کے مرجھائے گلستاں کی گل رنگیں
حیات و موت کا کہتے ہیں قصہ بے زباں ہو کر

بڑھاپے کی حدوں میں ایک شاعر جب بھی ہوتا ہے
تخیل میں تب اس کے شعر ڈھلتے ہیں جواں ہو کر
بہا کر خون کل تک ہم نے جس گلشن کو سینچا تھا
اسی پہ آج اپنا حق نہیں کچھ باغباں ہو کر
گرانی، قحط سالی، خودکشی، ہنگامہ آرائی
یہ اب اپنے وطن کا حال ہے جنت نشاں ہو کر

ابھی یہ بات کل کی ہے کہ ہم نے ساری دنیا کو
دکھایا ہے کمال منصفی شاہ جہاں ہو کر
برائے ملک و ملت تو زمیں اب قفل خاموشی
تو جوہر چپ ہے کیوں اک شاعر ہندوستاں ہو کر

۱ جوہر نظام پوری دراصل غزل گو تھے لیکن انہوں نے نظمیں بھی کیا خوب کہی ہیں۔ "اے میری نوجوانی" ان کی نظم ہے جو بڑھاپے میں انہوں نے پرویز شاہدی کی نظم "اے میری خیروانی" سے متاثر ہو کر کہی ہے۔

۲ ان کی بائیں آنکھ آپریشن کے بعد بے نور ہو گئی تھی

۳ داہنی آنکھ میں موتیا بند

۴ تیس برس سے زیادہ عرصہ

۵ "عبرت" ہفتہ وار، ہوڑہ، جس کے وہ مدیر تھے۔

۶ مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۷ پروفیسر عباس علی خاں بیخود، شاگرد علامہ وحشت کلکتوی۔

چوری

اقبال انصاری، دہلی

پیٹ بھرنے کو روٹی چرائی تھی کل،
آج تن ڈھانکنے کو چرائی قبا،
آج تو تو فقط جرم کی زد میں ہے
کل سزا کے شکنجے میں آجائے گا
تجھ کو بدبخت، چوری ہی کرنی ہے تو
جا کہیں سے کتاب آج کوئی چرا

خورشید طلب

بیکارو

مشعلیں
قندیلیں، جگنو
قمقمے، سورج
لاؤ......
تم نے باہر کے اندھیروں سے
نمٹنے کے لئے
جمع کر رکھے ہیں
کافی اسلحے
عین ممکن ہے
کہ تم اس جنگ میں
جیت بھی جاؤ مگر
وہ اندھیرا......؟
جو تمہاری روح کے اندر
بہت اندر
کہیں گہرا رہا ہے!!

کرفیو

سیدہ ثمینہ ناز، جبل پور

ہر طرف ہے مہیب سناٹا
قید ہیں اپنے اپنے گھر میں سب
کوئی دستک بھی اب نہیں دیتا
صرف کانوں میں بھاری بوٹوں کی
اک دھمک سی سنائی دیتی ہے
مجھ کو لگتا ہے غالباً یارو
شہر پر حکم امتناعی ہے

غزلیں

ڈیپک قمر

میرٹھ کینٹ

کچھ بھی نہیں ہے بات مگر سوچتا ہوں میں
اس دل کی کائنات میں ہی کھو چکا ہوں میں

تاریک سرد رات میں بجھتا دیا ہوں میں
کس روشنی کے واسطے اندھا ہوا ہوں میں

خود اپنے آپ ہی سے رہے جنگ رات دن
دانو کبھی ہوں میں تو کبھی دیوتا ہوں میں

باہر کا منظر ان دنوں اتنا خراب ہے
اب ڈر سے گھر کی کھڑکیاں کم کھولتا ہوں میں

میں اجنبی تھا اور ابھی بھی ہوں اجنبی
جانے کہاں سے کون طرف آ گیا ہوں میں

کس کو کہوں کہ کون ہوں میرا پتہ ہے کیا
اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں میں

اوروں کی بات چھوڑیئے اپنا یہ حال ہے
اپنے کہے کو دوسرے پل کاٹتا ہوں میں

کیسا نشہ ہے بن پیئے مسرور ہوں بڑا
تلچھٹ نہیں ہے پھر بھی لبوں تک بھرا ہوں میں

موسموں کے ساتھ چلنے کے لئے ایسا کریں
جو ضروری ہو وہی پوشاک ہم پہنا کریں

برکھا کی بوچھاروں میں دونوں مل کے یوں بھیگا کریں
سب تجلے گونگوں کی زد سے بچا بھی لیں تو کیا

کفر کے باتیں ایسے بچوں سے کریں تو کیا کریں
شب جو ڈسکو میں گزاریں، دن میں جو سویا کریں

اب محبت کی نظر میں جسم و جاں کی حد نہ ہو
پیڑ، پنچھی، چاند، تارے، آسماں دیکھا کریں

اس طرح بن جائیں گے احساس کے کچھ دائرے
غم کے پتھر دل کی گہری جھیل میں پھینکا کریں

منہ نہ موڑیں درد و غم سے چند خوشیوں کے لئے
زندگی کی بات کو اتنا نہ ہم ہلکا کریں

چھوڑ دیں ہم راستوں پر کچھ خیالوں کے نشاں
دیکھ کر راہی انہیں شاید کبھی سوچا کریں

جلتی بجھتی اور سلگتی یاد کی چنگاریاں
زندگی کے سرد لمحوں میں انہیں تاپا کریں

کچھ بھی کرنا اور نہ کرنا ایک جیسا ہو گیا
عمر کے اس موڑ پر بیٹھے ہوئے اب کیا کریں

ظفر حمیدی
مظفر پور

غزلیں

ہر ادا بے چہرہ ہے اب چہرگی کے خوف سے
سادگی بھی سہما سہما ہے نغمگی کے خوف سے

جم گئیں شبنم کی بوندیں اور اولے بن گئیں
کاغذی پھولوں کی رسمی تشنگی کے خوف سے

تیرے گلدانوں میں کچھ پانی ملا تیزاب ہے
کانپتی ہے ہر کلی پژمردگی کے خوف سے

کم سے کم کانٹے کا تحفہ تو اسے ملنا ہی تھا
وہ تو در وا ہی نہیں تھا خستگی کے خوف سے

آپ کی خلوت میں ہر جانب چھپا تھا آئینہ
آپ نے دیکھا نہیں شرمندگی کے خوف سے

مجھ سے سچائی ملی تھی زندگی کے موڑ پر
بن گئی اک چیستاں وابستگی کے خوف سے

میں کھلونوں سے تھا لدا اک تازہ نادر سا شجر
خود کو بوسیدہ کہا تھا کہنگی کے خوف سے

اک تصور کا کرشمہ تھا تشخص بھی مرا
معتبر کہنا پڑا تھا زندگی کے خوف سے

دوست دشمن جن کو بن جانا تھا بنتے ہی گئے
اے ظفر تنہا رہا وابستگی کے خوف سے

تم نہیں ہو گے تو یہ طرز ستم بانٹے گا کون
ہم نہیں ہوں گے تو یہ زہر قلم بانٹے گا کون

ہے صنم تو ایک ہی اور ہیں پجاری بے شمار
مسئلہ یہ ہے کہ آخر میں صنم بانٹے گا کون

ہر طرف شیشے کی آنکھیں ہو گئی ہیں دور دور
میں پریشاں ہوں مری یہ چشم نم بانٹے گا کون

میں بھی بکتا ہوں مرا غم بھی تو نادر ہے بہت
مجھ سا ہے کوئی نہیں پھر میرا غم بانٹے گا کون

ہم بہت حساس آئینہ ہیں رہنے دیجئے
آپ کے گیسو کے سارے پیچ و خم بانٹے گا کون

پینے والے تو سمجھتے ہیں اسے آب حیات
تو نہ ہو تو مئے کے ساغر میں یہ سم بانٹے گا کون

یہ طلسم ساحری تیرا غنیمت ہے ہنوز
ورنہ تیرے بعد یہ خواب ارم بانٹے گا کون

تشنگی کا دلربا اک رقص جاری ہے ابھی
خوبصورت سے سرابوں کا کرم بانٹے گا کون

اس ظفر کو آپ پیہم زندہ کرتے جائیے
آپ کا ہر لمحہ انعام عدم بانٹے گا کون

عبدالمتین نیاز

(بھوپال)

سب موڑ راستوں کے ہماری نظر میں ہیں
ہم زندگی کے ساتھ مسلسل سفر میں ہیں

جلتے ہوئے ہی ملتے ہیں کوئی مقام ہو
احساس آگ جیسے چراغوں کے سر میں ہیں

بستی جلی تو اوروں پہ الزام کس لئے
چنگاریاں ستم تمہارے ہی گھر میں ہیں!

تم جن کو حسن فکر بتاتے ہو دوستو!
یہ حسرتوں کے داغ روا ہے ہنر میں ہیں!

آنسو یہ بے حسی کے نہیں اپنے حال پر
طوفان خواہشوں کے مری چشم تر میں ہیں!

ان سے ہمارا رشتۂ جاں ہے بصد عطا ہوا
روشن ذرا ذرا ہے [illegible]

"صحبت بھی اہل علم کی کرتی ہے سر بلند"
ہم یوں مہک رہے ہیں کہ خوشبو کے گھر میں ہیں!

"حرف نوا ہے اس نے نوازا ہے اس لئے"
ہم بے ہنر بھی حلقۂ اہل ہنر میں ہیں!

پرواز کا جنون ابھی جاگا نہیں نیاز
ورنہ بلندیاں تو مرے بال و پر میں ہیں

یہ سارے اگلی منزل کے نشاں محفوظ کر لے
مجاہد! اپنے سب تیر و کماں محفوظ کر لے

یہی زادِ سفر ٹھہرے گا تری زندگی کا !
کہ سینے گزرے یاروں کے بیاں محفوظ کر لے

تباہی کو مری اخبار میں واجب بتا کر
سلگتے شہر میں اپنا مکاں محفوظ کر لے

خلاف اب ظلم کے میں بھی شہادت دینے والا ہوں
مجھے کچھ دیر کو اے آسماں محفوظ کر لے

لگائے گا کہاں تک تو کمندیں دوسروں کے
تری پہچان ہے تیری زباں ، محفوظ کر لے

یہ کام آئے گی تجھ کو بے ضمیری کے دنوں میں
زمانے! اہلِ حق کی یہ اذاں محفوظ کر لے

نیاز الفاظ میں تحلیل کر کے اپنا مکتب
یہ بستی کی متاعِ رائیگاں محفوظ کر لے

غزلیں

غزلیں

پی۔ پی۔ سریواستو رند ساغری
[illegible]

گم شدہ لمحات کی زنجیر لے کر آئی ہے
عمر کی پروائی عجب تاثیر لے کر آئی ہے
دھوپ لفظوں کی سنہرے تیر لے کر آئی ہے
زنگ آلودہ سہی شمشیر لے کر آئی ہے
مدتوں کے بعد اب ٹوٹی ہوئی دہلیز تک
پھر وہی خوشبو وہی تحریر لے کر آئی ہے
موسموں کی زد میں کچھ الفاظ گیلے تھے مگر
اب کے بارش اک نئی تدبیر لے کر آئی ہے
پھر نئی تخمین، ریتیلے شبستانوں کے بیچ
اک شکستہ خواب کی تعبیر لے کر آئی ہے
خواہش فکر تمنا، پتھروں کے شہر میں
ایک بے آواز سی زنجیر لے کر آئی ہے
رند میری ذات تو بے ربط منظر تھی مگر
زندگی اپنی الگ تصویر لے کر آئی ہے

سید بشارت علی
سوریہ پیٹ

کچھ کم ستم نہ آہ ہم نے کرلی
اُڑتی سی نگاہ ہم نے کرلی
حائل یوں ہزار مرحلے تھے
پیاس سے تو راہ ہم نے کرلی
کوئی بھی سپر نہ کام آئی
خود اپنی پناہ ہم نے کرلی
سر اپنا نگوں نہ ہو سکے گا
"کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی"
ہر سانس میں نیزے کی چبھن تھی
ہر سانس گواہ ہم نے کرلی
جس نے نہ کسی سے کبھی نبھائی
ہاں اس سے نباہ ہم نے کرلی
کوئی نہ تھی جس سے آشنائی
بس خواہ مخواہ ہم نے کرلی

گوہر شیخپوری

تلیا باغ، بنارس

غزلیں

آسائش جہاں پہ وہ کیسے نظر کرے
رو رو کے زندگی کی جو شام و سحر کرے

وہ زہرِ غمِ حیات بھی پی لے خوشی کے ساتھ
انساں شکایتیں نہ خدا سے مگر کرے

پتھر کو لکھے پھول تو شعلے کو برگِ گل
جو چاہے آپ کا قلم فتنہ گر کرے

تہذیب اور خلوص کے پیکر نہ کیوں بنیں
بچوں پہ شفقتوں کی نظر ماں اگر کرے

مزدور میرے شہر کا ہوگا نہ مطمئن
اپنے لہو کو پانی اگر عمر بھر کرے

وہ سوچتا ہی رہ گیا ان کی جناب میں
کس طور اپنا قصۂ غم مختصر کرے

آرائشِ چمن پہ ہے حیران دیدہ ور
گل پر نظر کرے کہ کلی پر نظر کرے

گوہر مری طرف اٹھے سب کی نگاہِ شوق
شہرِ ادب میں اتنا خدا معتبر کرے

جو اپنے حوصلوں سے شعلۂ نفرت بجھا دے ہے
اسی کو آج میرے شہر کا حاکم سزا دے ہے

نہ کوئی واسطہ اس سے نہ کوئی رابطہ پھر بھی
دعائیں دے کے میری زندگی وہ کیوں بڑھا دے ہے

خدا جانے وہ کیسا شخص ہے جو شہرِ نفرت میں
مری کٹیا کو بھی آباد رہنے کی دعا دے ہے

وہی اک پل اذیت ناک ہے میرے لئے اب بھی
چراغِ اشک سورج ڈوبتے ہی جو جلا دے ہے

مہذب ہو گئے اہلِ جہاں لیکن مجھے دیکھو
مری عریانیت تہذیب کا میری پتا دے ہے

بظاہر جو مرا غم خوار بھی ہے اور محسن بھی
اسی انساں کو میری داستانِ غم مزا دے ہے

خدا شاہد میں اس کی قدر کرتا ہوں بہت گوہر
جو سچے دل سے میری خامیاں مجھ کو بتا دے ہے

سید احمد سحر

شاہجہاں پور

ہو چکیں ہونا تھیں جو رسوائیاں
ہم سفر ہیں پھر مری تنہائیاں
بدگمانی کو ہوا دینے لگیں
دوستوں کی حاشیہ آرائیاں
سلسلہ در سلسلہ ہیں گامزن
تجربے کی تشنہ لب گہرائیاں
تتلیاں جیسے ہوا کے دوش پر
میرے خوابوں کی حسیں پرچھائیاں
پھر در دل پر کوئی دستک ہوئی
درد پھر لینے لگا انگڑائیاں
غنچہ پھر چٹکا شگوفہ پھر کھلا
خندہ زن ہیں پھر چمن آرائیاں
تشنۂ تکمیل ہے جہد حیات
کیا ہوئیں احساس کی رعنائیاں

جاوید احمد

رات خاموش رہی زلف کی حیرانی پر
ہجر تحریر ہوا چاند کی پیشانی پر
کون رہتا ہے مری نیند کے گلزار و ریاں
کون مامور ہے خوابوں کی نگہبانی پر
سانس کھینچے ہوئے کچھ لوگ یہاں ملتے ہیں
کون بولے در و دیوار کی ویرانی پر
مجھ کو منزل کی خبر کیا یہ ہوائیں دیں گی
یہ تو رکھتی ہیں نظر بے سر و سامانی پر
موج صرصر میں کہاں حلقۂ خوشبو رہتا
مسکراتی ہے صبا پھول کی نادانی پر
عشق ہر ایک کو اک ملک سبا دیتا ہے
ہر کوئی خاک پہ یا تخت سلیمانی پر
عالم خواب میں بھی نغمہ سرا رہتا ہوں
میری ہر سانس ہے مامور غزل خوانی پر

غزلیں

غزلیں

ڈاکٹر سعید عارفی
بہرائچ

پتا نہیں مجھے خود بھی کہاں کہیں ہوں میں
جہاں یہ چھوڑ گئی ہے خودی وہیں ہوں میں
کہیں گمان کی صورت، کہیں یقیں ہوں میں
مجھے پکار کے دیکھو کہاں نہیں ہوں میں
بھٹکنے والے کہاں جا رہا ہے ظلمت میں
ادھر تو دیکھ تری منزلِ یقیں ہوں میں
مرے وجود میں شعلے ہیں عصرِ حاضر کے
سنبھل کے چھو مجھے سر تا پا آتشیں ہوں میں
نہاں ہے ذات میں میری جمالِ موسمِ گل
نگار و نقشِ کفِ دستِ نازنیں ہوں میں
یہ تیرا کلام فصیح و بلیغ کر دے مجھے
سخن سخن میں ترا حرفِ اولیں ہوں میں
خیال مثلِ پرندوں کے آتے جاتے ہیں
سرِ منور، سخن کی نئی زمیں ہوں میں
مجھے نہ ڈھونڈنا چاہو تو میں کہیں بھی نہیں
اگر تلاش کرو تو یہیں کہیں ہوں میں
ملی نہ جس کو کبھی راحتوں کی فصل سعید
یہ ناز کس سے بتاؤں کہ وہ زمیں ہوں میں

سیف الدین الغاف
بمبئی

(۵ دسمبر ۹۲ء کو یادِ آوارہ کے نشست
میں ممبرا بمبئی میں پڑھی گئی تھی)

نئی صبحیں جگاتا ہے، مری ہر شام کا منظر
غروبِ مہر و مہ میں دورانِ طلوعِ جام کا منظر
تھکن سے چور فرشِ خاک پہ آرام کا منظر
خدا کے گھر میں ہے ٹوٹے ہوئے اصنام کا منظر
نہ ماتھوں پر شکن کوئی، نہ باتوں میں جھجک کوئی
دلوں میں جھانکئے تو ہے عجب کہرام کا منظر
خداوندا! مرا ایمان سلامت، دیکھتا ہوں میں
وہ لطفِ خاص کا وعدہ، یہ قتلِ عام کا منظر
انہیں صرف کیمرے کی آنکھ سے دیکھا تو کیا دیکھا
یہ خوں آلود دیواریں، یہ زخمی بام کا منظر
سیاست نے یہ نفرت کی عجب بنیاد رکھی ہے
دعا ہے، رب نہ دکھلائے کبھی انجام کا منظر

حسین الحق
نیو کریم گنج، گیا

اصل سوال

★ یہ بات بہت زور و شور کے ساتھ اٹھی کہ وہ آ گئے مگر میں نے اپنے پر ضبط کیا کہ بے تابی کے دن تو اب ہوا ہوئے مگر جب میرا بچہ بھی مجھ سے پوچھ بیٹھا کہ "وہ کون ہیں" اور کیا واقعی وہ ہیں بھی یا نہیں اور اگر واقعی وہ ہیں تو کیا سچ مچ وہ آ گئے ہیں تب مجھے لگا کہ سفر اختیار کرنے کا وقت آ ہی گیا۔

پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ ریلوے لائن کے پاس پیرجی کے مقبرے میں جو کنواں ہے اسی میں وہ ظاہر ہوئے مگر اس سلسلے میں خیالات الگ الگ تھے، بعض کا کہنا تھا کہ وہیں ظہور ہوا۔ بعض کی رائے تھی کہ وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ اسی علاقے پر وہ ظاہر کئے گئے ہیں مگر آج کل آتش زدگی کا خطرہ زیادہ بڑھ گیا ہے اس لئے وہ جا پذیر ہو گئے ہیں۔

ویسے مجھے اس بحث سے کیا لینا دینا؟ مجھے تو ان تک پہنچنا تھا مگر یہ سوال اہم ضرور تھا کہ آخر ان تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ان تک پہنچنے کے چار راستے تھے۔ پہلا اور آسان ترین راستہ تو مین روڈ سے ہوتا ہوا پیرجی کے مقبرے تک پہنچتا تھا اور اس راستے میں اسکول، پوسٹ آفس اور ٹاؤن ہال وغیرہ ملتا ہے۔ یہ پختہ سڑک ہے جس سے رکشہ، ٹم ٹم، سائیکل موٹر ہر سواری جا سکتی ہے۔ دوسرا راستہ شیر شاہ کے مقبرے سے ہو کر گذرتا ہے، یہ کچھ دور تک تو پختہ ہے مگر اس کے بعد کچا ہو جاتا ہے اور اس طرف صرف ٹم ٹم یکہ جا سکتا ہے۔ دراصل یہ راستہ نہیں بلکہ ایک چوڑی پٹڑی ہے جو کھیتوں کے درمیان ہوتی ہے اس کے دونوں طرف لہلہاتے کھیت ہیں اور تھوڑے فاصلے پر گڈھوں میں پانی جمع ہے جس میں بھینس اور گائے نہاتے

یا اور دھو بنیں سارے شہر کی غلاظت دھوتی ہیں۔
سرا راستہ کھیت کے بالکل بیچ سے گذرتا ہے جو
ہر حال راستہ تو نہیں ہے مگر جسے بوقت ضرورت راستہ
نایا جاسکتا ہے۔ چوتھا راستہ پیچ در پیچ ہے۔ بازار
الی سے معین پورہ، مہابیر ٹولی ہوتے ہوئے لکھنؤ سرائے
جائیے اور پھر وہاں سے گرو دوارہ اور مشن اسکول
رکرتے ہوئے پیر جی کے مقبرے تک پہنچئے۔ اس راستے
بلند بالا عمارتیں پر رونق شاہراہیں گندہ راستے
ہوتے چھوٹے جوہڑ، سربلند و شاداب کھیت، پگڈنڈیاں
بھی کچھ ملتی ہیں۔

لیکن حیرتناک بات یہ ہے کہ جب میں چلنے کے
لئے تیار ہوا تو سب راستے بند ہوگئے۔

مگر اب کرنا کیا تھا، اب تو معاملہ دروازے
سے اندر آچکا تھا۔ اس لئے ایک شب جب ساری
دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور پورے شہر پر موت
طاری تھی، میں نے چپکے سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اور آگے
کی روداد یہ ہے کہ میں اپنے گھر سے بمشکل محلے کے موڑ
تک پہنچا ہوں گا کہ ایک بھیانک طوفان نے مجھے چاروں
طرف سے گھیر لیا۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ میں اس طوفان
میں ایک تنکے کی طرح ادھر سے ادھر [illegible] رہا تھا۔ یا
شاید طوفان مجھے گیند کی طرح اچھال رہا تھا اور میں اس
اندھیری اور طوفانی رات میں ایک بے سروسامان شخص یا بے
بس و مجبور بچے کی طرح ہواؤں کی مار پر تھا۔ ہوائیں مجھے
اڑائے لئے چلی جا رہی تھیں اور میں اڑتا چلا جا رہا تھا۔

اس طوفانی جد و جہد میں ایک لمحے کے لئے [illegible] گیا

پری عاشق ہوگئی ہے۔ اور وہ مجھے اڑن کھٹولے پر
اڑائے لئے چلی جا رہی ہے مگر پھر خوف کی لہروں نے
اس خیال کو بھی طوفانوں کی نذر کیا اور جب کچھ ٹھہراؤ
نصیب ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک شہر کے ملبے پر کھڑا
ہوا ہوں۔

مگر عبرت کی بات شاید یہ نہیں تھی، حیرت کی
بات تو یہ تھی کہ یہ شہر بالکل سرزمین ختن کے شہر مینو سواد و
بہشت نژاد کی طرح تھا۔ جہاں نیر اعظم چرخ چہارم پر عجب
جمال سے نظر آتا تھا۔ اور ماہ، باوجود داغ علامتی تاب
مشاہدہ نہ لاتا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا شہر
ہے جہاں اپنے شہر کا نقشہ ملنا مشکل تھا یا نقشے میں اپنا
شہر ملنا مشکل تھا۔

میں یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اچانک سوچ کی
دھارا رک گئی۔ کچھ عجب سا احساس ہونے لگا۔ مجھے نہیں
پتہ کہ میں نے کیا محسوس کیا مگر یاد کا وہ پل میرے
حافظے میں اب تک موجود ہے۔ جس میں میں نے سوچا
کہ میں تو دراصل ان کی زیارت کے لئے نکلا ہوں۔

تو میں اس اندھیری رات میں اور اس بے نام شہر
میں پھر ان کی تلاش پر روانہ ہوا، یہ سفر تو شروع سے ہی
بے راہ سا تھا۔ اس لئے میں نے زمین سے ایک مٹھی دھول
اٹھائی کہ دھول جس سمت اڑے گی اسی سمت چلوں گا
مگر ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرگئی دھول اندھیرے کا
مقدر بن گئی۔

اور تب میرا سفر سمتوں کے تعین کے بغیر شروع
ہوا۔ میں ایک قدم چلتا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ

اندھیروں سے مانوس ہو گئیں۔ نتیجتاً راہ بھی کچھ واضح ہونے لگی۔ زمین اور نیچے پھیلے، اور کچھ ابر سیاہ نما پتھریلی زمین اور صاف و شفاف پہاڑی خطے بار بار میری راہ میں رکاوٹ کا ذریعہ بنتے۔ لیکن میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا پہاڑ سر کرتا آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کہ اچانک ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔

بہت نیچے سے پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی چشمہ کسی بہت اونچی جگہ سے گر رہا ہو یا کوئی تیز رفتار پہاڑی ندی، پتھروں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہو!

یہ عجیب مقام تھا اور عجیب فضا اور میں اس فضا کا اسیر۔ ہر سمت اندھیرا... سیاہی... گہرا... دھند... کہیں کہیں سے ذرا ذرا سی پھوٹتی ہوئی روشنی جیسے روشنی کا نام و نشان بہت دیر سے نہیں اور یہ صاف و شفاف پہاڑ، گہری گہری کھائیاں، پرخطر راستے اور آگے اندھیرے کے بطن سے پھوٹتی پانی کے بہنے کی آواز۔

مجھے احساس ہوا کہ میں جہاں کھڑا ہوں اس سے تھوڑی ہی دور پر ایک بہت تیز رفتار اور پر شور ندی اپنی پوری تابانی اور روانی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ میں چند لمحوں تک مبہوت کھڑا رہا۔ دراصل میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، ایک خواہش سی بھی دل میں پیدا ہوئی کہ واپس لوٹ چلوں لیکن فوراً ہی یاد آیا کہ اس سے تو اسی راستے پر ملاقات ممکن ہے۔ پھر سوچا راستہ بدل دوں مگر تقریباً دونوں طرف احساس ہوا کہ دور دور تک بس پانی.....

"تو گویا مجھے اسی راستے پر جانا ہے"۔ اس احساس کے بغل میں ایک دوسرا احساس کھڑا تھا۔ ندی پر پل ہو گا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں جہاں کھڑا ہوں اسی کے سامنے سے ایک لکڑی کا پل ندی کے اس کنارے کو اس کنارے سے ملاتا ہے۔

میں خوش ہوا اور مطمئن انداز میں پل کی طرف بڑھا مگر جیسے ہی اس پل پر پیر رکھا لگا کہ زلزلہ آ گیا جیسے کسی بلندوبالا لمبے چوڑے بے ترتیب درخت پر کوئی بہت وزنی چیز رکھ دی گئی ہو۔ ایسا لگا جیسے پل بالکل چرمرا کر بیٹھ رہا ہو۔

میں تو جامد لہو کی طرح ایک جگہ کھڑا کسی بھی حادثے کا منتظر تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بس اب چند لمحوں میں یہ پل لڑکھڑا کے غرقاب ہو جائے گا لیکن یہ حسنِ اتفاق تھا کہ پل بہت دیر تک ہچکولے کھا کر اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ میں مزید احتیاط کی خاطر آہستہ سے اس پل پر سینے کے بل سانپ کی طرح رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

نیچے تیز رفتار پُر شور ندی.... آگے پانی.... پیچھے پانی.... داہنی پانی بائیں پانی.... اور پانیوں کے اس اژدحام میں، ندی کے بیچوں بیچ ایک کمزور و ناتواں پل جو ذرا سی حرکت پر بید کی طرح لرزنے لگتا.... اور اس کمزور و ناتواں پل پر سینے کے بل سانپ کی طرح رینگتا ہوا میں.... ہولے ہولے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں.... میں بیچ میں اس پل کی طرح لگا ہوا تھا

...کی کوشش کی — ہر طرف وہی ندی، وہی پانی
...وہی ندی وہی پانی ......

میرے رینگنے کی صورت حال کچھ یوں تھی کہ میں
پیٹ کے بل لیٹ کر دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلا
دیتا تھا تاکہ میرا اگلے قدم کا، دھندلے طور پر ہی سہی،
اندازہ تو ہو سکے .... تو میں سینے کے بل لیٹ
...یوں رینگ رہا تھا کہ جو جو میرے رینگنے کے لیے برسہا
برس کی مدت صرف ہو رہی تھی ... میں اسی طرح
آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجھے [illegible] سا لگ

—

میرے سر سے آگے پھیلے ہوئے دونوں ہاتھ خلا
میں جھول رہے تھے۔

اب کیا ہوگا؟ میرے اندر زلزلہ آ چکا تھا
... آگے پانی پیچھے پانی .... دائیں پانی بائیں پانی۔
... میں پل کے ایک جرجر ڈھانچے پر .... بعد
...پر جرجر ڈھانچہ ..... اندازہ ہوا کہ پل کی سرحدیں یہاں
ختم ہوتی، آگے شکستہ دیواروں اور منڈیروں کا وہ
سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کی جڑیں تو مضبوط ہیں مگر
سر بالا عمارات کے اوپری کنگرے ایک ایک کر کے
تباہ ہو چکے ہیں اور آگے جو کچھ ہے وہ ندی میں بھی ہے
اور ندی سے الگ بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا نچلا حصہ لرزتے ہوئے جرجر
کرتے جرجر پل سے ان منڈیروں تک کیسے پہنچا جائے
...کہ کس طرح ناتواں پل اور شکستہ دیواروں کے بیچ
کا خلا۔
سوال یہ ہے کہ خلا کو کیسے پر کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا اب تک مجھے جواب نہیں مل سکا
ہے اور میری صورت حال یہ ہے کہ میں کہ ٹرنک پل سے
الگ خلا میں لٹکا ہوا ہوں اور عمر کے بعد سے پل پر چلا
اور ندی کے تیز رفتار اور پرشور بہاؤ میں پل ابھی
ہے یا ندی کے تھپیڑے بہاؤ کے سبب بہتا محسوس ہو
رہا ہے۔

ان کے ظاہر ہونے کی خبر سینے میں اٹکی ہوئی ہے
بیٹے کا سوال سینے میں پھنسا ہوا ہے۔
ہر طرف وہی ندی وہی پانی .... وہی ندی وہی
پانی ..... صدیاں بیت گئیں اور سارا کچھ اسی
طرح!

پتہ نہیں وہ جو ظاہر ہوئے تھے وہ ابھی تک
ظاہر ہی ہیں یا باطن ہو چکے
یہاں تو دوسرا خرخشہ کھڑا ہو گیا ہے کہ پل
ناقابل اعتبار اور عمارت کے اوپری کنگرے تباہ!
اب ایسے میں جڑیں اگر مضبوط بھی ہیں تو اس
سے کیا ہونے جانے کا؟
کہ اصل سوال تو خلا کا ہے جس کے پر کرنے کا
طریقہ ہی شاید ذہن سے نکل چکا ——!!

[signature]

● پرنٹر پبلشر شہزاد منظر نے [illegible] پریس
شاہ گنج [illegible] سے چھپوا کر دفتر [illegible]
[illegible] سے شائع کیا۔

مصنف :- گیووانی ورگا
مترجم :- شرجیل احمد خان زکیا

بھیڑنی

★ وہ دراز قد اور دبلی پتلی تھی۔ گرچہ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی، اس کے سینے کا ابھار اب بھی جاذبِ نظر تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ جیسے وہ ملیریا کی دائمی مریضہ ہو۔ زرد چہرے کے حلقے میں اس کے سرد، سرخ ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھیں ایسی دکھائی پڑتی تھیں جیسے وہ آپ کو نگل لیں گی۔ گاؤں والے اس کو بھیڑنی کہہ کر پکارتے تھے وہ اس لئے کہ وہ کبھی سیر نہ ہوتی اس کی بھوک ہمیشہ تازہ دم رہتی۔ جب کبھی وہ تنہا ایک بھوکی بھیڑنی کی طرح خراماں خراماں سامنے سے گذرتی تو عورتیں خوف سے اپنا راستہ بدل لیتیں۔ اس کے سرخ ہونٹوں کی حضرت چند ثانیوں میں ان عورتوں کو اپنے بیٹوں اور شوہروں سے محروم کر سکتے تھے۔

غریب مرجیا چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی تھی صرف اس لئے کہ وہ بھیڑنی کی بیٹی تھی۔ کوئی شخص اس سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ گرچہ اس کی کوٹھڑی میں قیمتی زیورات تھے۔ گاؤں کی کسی بھی لڑکی کے مقابلے میں اس کے پاس زرخیز زمین کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔

ایک دن بھیڑنی ایک خوبرو لونڈے پر عاشق ہو گئی۔ وہ جوان حال ہی میں فوج سے واپس آیا تھا۔ اس دن وہ دونوں کھیت میں گھاس کاٹ رہے تھے۔ کہ دفعتاً بھیڑنی کی نظر اس جوان پر پڑی۔ کیوپڈ کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ عشق کا شعلہ بھڑکا۔ بھیڑنی کو محسوس ہوا جیسے اس کا تن بدن آگ میں جل گیا۔ فرطِ جوش سے اس کے حلق خشک ہو گئے۔ وہ نوجوان خاموشی سے سر جھکائے گھاس کاٹتا رہا۔ اس نے صرف اتنا پوچھا "کیا بات ہے اماں پیناٹ" اس وسیع کھیت میں جہاں صرف اڑتے ہوئے جھینگر کی آواز سنائی دیتی تھی، بھیڑنی بھوکی پیاسی مسلسل

سں کاتتی رہی۔ گٹھری پر گٹھری باندھتی رہی
نی کی قربت کا لطف قائم رہے جو بدستور اپنے
میں مصروف تھا اور بار بار پوچھتا تھا۔ "تم کیا
تی ہو۔ اماں پینا۔"

ایک رات جب کسان دن بھر کی محنت سے
ماندے کھیتوں میں اونگھ رہے تھے اور کتے دور
کی مہیب تاریکی میں بھونک رہے تھے۔ وہ بولی
تھی۔ "میں تمہیں بہت چاہتی ہوں نیّی؟ تم تو سورج
ح پیارے ہو اور شہد کی طرح شیریں۔ تم تو میری
ہو پیارے۔" لیکن مجھے تو تمہاری بیٹی کی چاہت
نیّی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ بھیڑنی
پنے بالوں کو ناز سے پھیرا اور خاموشی سے سر
تے ہوئے دور چلی گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی کھیت
یا آئی۔ نیّی سے پھر اس کی ملاقات اکتوبر ماہ
ئی جب زیتون پیڑے جا رہے تھے اور نیّی اس
ر کے قریب ہی کام میں مصروف تھا۔ زیتون
کی چکی کی چیں چیں کی آواز نے اس کی نیند حرام
تھی۔ نیّی بھر بھر بیلچہ زیتون چکی میں ڈال رہا
ر ادہی، ادہی کے شور کے ساتھ خچر کو چکی
د ہانک رہا تھا۔ "کیا تم واقعی میری بیٹی مرجیا
شادی کرنا چاہتے ہو؟" اماں پینا نے پوچھا۔
ی بیٹی مرجیا کو جہیز میں کیا دوگی؟" نیّی نے جواب
"تمہیں وہ تمام سامان ملے گا جو مرجیا نے
باپ سے ترکہ میں حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ
تم کو اپنا مکان بھی دے دوں گی۔ مجھے خوشی ہو گی
ہا دو [illegible] کا صرف ایک گز [illegible] دو گے

جہاں میں اپنا بستر لگا سکوں۔" اگر یہ بات ہے
تو کرسمس میں شادی طے سمجھو" نیّی نے کہا
لیکن مرجیا کسی بھی قیمت پر [illegible]
سے لت پت نیّی سے شادی کے لئے تیار نہ تھی
تب اس کی ماں نے اس کو جھونٹوں سے پکڑا اور
دانت پیستے ہوئے بولی تھی۔ "اگر تو نیّی سے شادی
نہیں کرے گی تو میں تجھے مار ڈالوں گی۔" بھیڑنی بڑی
متفکر تھی۔ وہ بیمار نظر آنے لگی۔ لوگ کہنے لگے بڑھاپا
میں شیطان کے سادھو کا بھیس بدل لیا ہے۔ اب کبھی
وہ باہر گلیوں اور کھیتوں میں آوارہ گھومتے نہیں دیکھی
جاتی تھی۔ اور نہ اب وہ کبھی دروازے سے لگ کر اپنی
وحشی آنکھوں سے باہر تکتی تھی۔ مرجیا سارا دن گھر
پر رہتی۔ بچوں کو کھانا کھلاتی جب کہ اس کی ماں باہر
کھیتوں میں مردوں کے ساتھ گھاس پھوس چنتی، مٹی
کھودتی، جانوروں کو چارہ دیتی اور انگور کے لتوں کو
چھانٹتی۔ جنوری میں اتر پوربی سرد ہوائیں چلیں یا اگست
میں جھلسا دینے والی تند ہوا کا جھونکا جب خچر اپنی
گردن جھکائے اور کسان دیوار کے سائے میں سو رہے
ہوتے۔ نیّی اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ دوپہر کی تیز
دھوپ اور سہ پہر کی شدید گرمی میں جب کوئی شریف عورت
باہر قدم نہیں رکھتی، اماں پینا گاؤں کی تپتی ہوئی گلیوں
اور کھیتوں میں بھٹکتی رہتی۔ نیّی گرد آلود باڑے سے لگے
کھاٹ میں سو رہا تھا کہ بھیڑنی اس کے پاس آئی اور پیار
سے بولی۔ "جاگو نیّی، دیکھو میں تمہارے لئے تھوڑی شراب
لائی ہوں، اپنا حلق تر کر لو۔" نیّی نے حیرت سے اپنی
آنکھیں کھولیں اور غنودگی کے عالم میں اس کی طرف

گھورا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ زرد رنگت، کوئلے کی طرح سیاہ آنکھیں۔ اور غیر ارادی طور سے اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ نہیں، کوئی شریف عورت دوپہر کی سخت دھوپ اور سہ پہر کی شدید گرمی کے درمیان گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی۔ نتی نے سسکی بھر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اور سوکھے گھاس کو اپنے چہرے پر ملتے ہوئے نتی نے بھیرلی سے کہا ــــ "چلی جاؤ ــــ دفان ہوجاؤ یہاں سے۔ پھر یہاں کھلیان میں کبھی نہیں آنا۔ اور بھیرلی اپنا کپڑا درست کرتے ہوئے، نظر جھکائے، تپتے ہوئے کھیتوں سے گذرتے ہوئے دور چلی گئی۔

لیکن وہ بار بار کھلیان واپس چلی آتی اور نتی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اور اگر اسے آنے میں دیر ہو جاتی تو نتی بڑی بے صبری سے گاؤں کی شاہراہ پر اس کا انتظار کرتا رہتا۔ لیکن بھیرلی جیسے ہی اس کے قریب آتی وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہی جملے دہراتا ــــ "چلی جاؤ ــــ دفان ہوجاؤ یہاں سے پھر یہاں کھلیان میں کبھی نہیں آنا۔

مرچیا دن رات روتی رہتی۔ جب کبھی وہ اپنی ماں کو کھیت سے واپس آتے دیکھتی دور سے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور حقارت بھری نظروں سے اپنی ماں کو گھورتی۔ وہ خود بھی تو بھیرلی کی اولاد تھی ــــ "بدذات عورت" اس نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔

"تم ماں کے بھیس میں ایک شیطان ہو"

"اپنی زبان بند رکھو"

"چھوڑ ذلیل"

"اپنی زبان کو لگام دو"

"میں ابھی پولیس کو بلواتی ہوں۔ میں جا رہی ہوں"

"ہاں ٹھیک ہے، جاؤ۔ جاؤ"

اور واقعی مرچیا پولس سرجنٹ کو بلا کر لے آئی۔

وہ جذبۂ حسد سے پاگل ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں اپنے ہونے والے شوہر کی محبت جاگ گئی تھی۔ وہ مجبور کی گئی تھی کہ تیل اور چکناہٹ میں لت پت نتی سے شادی رچائے۔ لیکن اب تو اس پر نتی کے عشق کا بھوت سوار تھا یہ پولیس سرجنٹ نے نتی کو بلوایا۔ اس کو بہت ڈرایا دھمکایا گیا۔ نتی سسکی بھرتا رہا۔ سر کے بال نوچتا رہا۔ لیکن اس نے انکار نہیں کیا اور نہ کوئی بہانہ تراشا "یہ صحیح تھا سرجنٹ۔ یہ ترغیب گناہ تھی جس کا میں مجرم ہوں" وہ سرجنٹ کے قدموں پر گر گیا اور گڑگڑایا "مجھ پر رحم کرو سرجنٹ۔ مجھے اس دوزخ سے دور لے جاؤ۔ میں مجرم ہوں، مجھے پھانسی پر لٹکا دو یا جیل بھیج دو۔ مجھے اس عفریت سے نجات دلا دو سرجنٹ تاکہ میں کبھی اس کا چہرہ نہ دیکھوں۔ کبھی نہیں ..."

بھیرلی نے احتجاج کیا "سرجنٹ، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ یہ مکان میرا ہے۔ جب میں نے مکان جہیز میں دیا تھا تو باورچی خانہ کا ایک گوشہ اپنے قبضہ میں رکھ لیا تھا۔"

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ایک دن خچر نے نتی کے سینے پر دو لتیاں جھاڑ دیں۔ نتی کو سخت چوٹ آئی تھی۔ وہ قریب مرگ ہو گیا۔ لیکن پادری نے بھیرلی کی موجودگی میں مذہبی رسومات کے لئے گھر آنے سے انکار کر دیا۔ بھیرلی کو کہا گیا کہ وہ گھر چھوڑ دے۔

[illegible] عذاب [illegible]
طرح جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ عشائے ربانی کے دن
[illegible] کے گناہ کا اقبال کر لیا۔
اس نے پوری صفائی سے اپنی پشیمانی کا اظہار کیا
مگر رسم میں شریک تمام شیدائی فرطِ جذبات سے رو
رہے۔ کاش جس دن نتی نے اقبالِ گناہ کیا تھا اسی دن
اس کی روح پرواز کر گئی ہوتی! تو پھر شیطان کو اس کے
جسم و روح میں دوبارہ سرایت کرنے کا موقع نہیں
تھا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو" نتی نے بھیڑن سے التجا کی۔
"خدارا مجھے امن و سکون کی زندگی گزارنے دو، میں نے
موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قریب قریب میری جان
[illegible] ہو گئی ہے۔ لوگ ساری باتیں جان گئے ہیں۔
بہتری اسی میں ہے اب میں تم سے پھر کبھی نہ ملوں۔ اسی
میں [illegible] کی بھلائی ہے۔"

کاش ایسا ہوتا کہ وہ اپنی آنکھیں نکال
پھینکتا تاکہ اس کی نظر میں بھیڑن کی آنکھوں سے
نہ ٹکراتیں جو اس کے جسم و روح کی ساری توانائی
غصب کر لیتی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس [illegible]
نجات کیا ہے۔ یہ السیٹر (Alastor) کے [illegible] اس
نے عشائے ربانی کی رسومات کا [illegible] اپنے گناہوں
کا اقبال کیا [illegible] کی طرف [illegible]
[illegible]

[illegible]

"مجھے [illegible] لوٹ" بھیڑن نے جواب دیا۔ "کوئی
فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی زندہ
نہیں رہ سکتی۔"

ایک دن جب نتی انگور کے باغ میں مٹی
کھود رہا تھا، اس نے دیکھا کہ بھیڑن ہرے بھرے
کھیتوں سے گزرتی ہوئی اس کی طرف آ رہی ہے۔
اس نے کھرپا زمین پر رکھ دیا اور تیزی سے درخت کی
اوٹ سے اپنی کلہاڑی نکالی اور بھیڑن کی طرف
بڑھا۔ بھیڑن نے دیکھا کہ نتی ہاتھ میں سورج کی
روشنی میں چمکتی ہوئی کلہاڑی اور آنکھوں میں وحشت
لئے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ایک دم پر
پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہاتھ میں لالہ کا پھول لئے نظریں
اٹھائے نتی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کی [illegible]
آنکھیں نتی کو تکتی گئیں۔

"خدا تمہیں غارت کرے!" نتی کی آواز حلق
میں پھنس گئی تھی۔

ماخذ: [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نئی مطبوعات کا تعارف

تبصرہ کے لیے دو جلد کتابوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب: برنداون
مصنف: محمد عبدالقادر ادیب
ضخامت: ۱۴۲ صفحات ۔ قیمت: پچاس روپے
پتہ مصنف: NO 29 CMH ROAD
Near Bata Show Room
INDIRANAGAR, BANGALORE-560[illegible]

"برنداون" کے مصنف محمد عبدالقادر ادیب اب شعر و ادب کے میدان میں ایک کہنہ مشق شاعر اور اہل قلم کی حیثیت سے اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں میں نے اس شاعر کا اظہار بڑی بے باکی سے کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے پندرہ بیس برس قبل جب میں جناب ادیب کی تحریریں پڑھتا تھا تو مایوسی ہوتی تھی اور مجھے خود بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک وہ وقت بھی آئے گا جب مجھے اپنے اس قصور پر شرمندہ ہونا پڑے گا۔ آج مجھے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

آواز کا سایہ کے بعد برنداون جناب ادیب کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں موضوعاتی اور ہنگامی امور کو پارے کا روپ دیا گیا ہے۔ آج جب متعدد ہیئتی تجربات کی مدد سے ہمارے شعرائے کرام لطیف ترین، ژولیدہ و پیچیدہ اور مبہم و مخفی ذہنی کیفیات احساسات کی پیشکش پر زور دے رہے ہیں موضوعاتی اور ہنگامی شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانا ایک زبردست چیلنج ہے۔ جناب ادیب نے یہ چیلنج قبول کیا ہے تو اس پر قائم بھی رہنا ہوگا اور اس کے CONSEQUENCES کے لئے بھی انہیں تیار رہنا چاہئے۔

اندرون کے شعری ادب و لہجے کا حسن [illegible] بیرونی یا خارجی شاعری کا کیا [illegible] ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔ کیا داخلی [illegible] [illegible]

[illegible] جلوہ گل [illegible]

جشم کرتا ہے ہر رنگ میں دا ہے جانا

فنکار کی بنیادی یافت ہوتی تماشا ہے۔ خارج

شاعری کرنے والے لوگ بھی انہیں گہرائیوں میں اتر کے

فرق اتنا ہے کہ وہ کثافت سے لطافت پیدا کرنے

حملہ رکھتے ہیں۔ جمود و سکوت میں حرکت لانے

جد و جہد کرتے ہیں۔ پتھر پہ پھول کھلانے کا مجاہدہ کرتے

۔ وہ آسان راستہ اپنانے کی بجائے سنگلاخ

زمینوں سے گزرتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے

والوں کی ہمت بہرحال قابل احترام ہے۔ جناب ادیب

بھی یہی روش اپنائی ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

نیم شاعری کی جو تابناک شعاعیں جناب عبد القادر

ب کی منظومات سے جگہ جگہ پھوٹتی ہیں ان کی بنیاد

نا چاہتا ہے کہ ان سے گزارش کروں کہ وہ مثنوی

طویل تر بیانیہ نظموں کی طرف متوجہ ہوں۔ مجھے یقین

ہے کہ وہ اس طرح ہمارے شعری سرمائے میں گراں قدر

اضافہ کر پائیں گے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی، گیا

آبشارِ فکر (نظموں کا مجموعہ)

کتاب :- آبشارِ فکر

فنکار :- گوہر شیخپوروی

ناشر :- [illegible]، صفحات :- ۱۰۴ - قیمت :- [illegible] روپے

[illegible] گوہر شیخپوروی - [illegible] بہار [illegible]

[illegible]

[illegible] الامام [illegible]

[illegible]

یافتہ شاعر ہیں۔ [illegible] شاعری [illegible]

اور سحر کاری نے ہزاروں دلوں کو مسحور کر لیا ہے۔

فی الحال میرے سامنے گوہر صاحب کی [illegible]

"آبشارِ فکر" (نظموں کا مجموعہ) ہے جو پہلی بار منظرِ عام

پر آیا ہے۔ اس کے پہلے وہ اپنی فکروں کو (قصیدہ [illegible]

"غبارِ فکر") غزلوں کے سانچوں میں ڈھال کر قارئین و

ناقدین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور خوب خوب داد و تحسین

حاصل کر چکے ہیں۔ یہ دونوں کتاب ان کی غزلوں کا نہ

صرف مجموعہ ہے بلکہ بیش بہا خزانہ ہے۔

اب "آبشارِ فکر" لے کر حاضر ہوئے ہیں جس کو

انہوں نے اپنی نظموں سے سجایا ہے۔ قطعات اور [illegible]

بھی موجود ہیں۔

گوہر صاحب کی غزلوں میں جو نیاپن، تڑپ، کسک،

کرب اور حسن جھلکتا ہے اور جس خوبی و خوبصورتی اور

فنی مہارت سے وہ اسے سجاتے ہیں، سنوارتے ہیں اور [illegible]

کے پیکر میں ڈھالتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سیدھے

دل میں اتر جانے والی چیز ہوتی ہے اور پڑھنے والا اس

کی گہرائی و گیرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ غزلوں پر ان کی گرفت

نہ صرف مضبوط ہے بلکہ استادانہ مقام پر پہنچا [illegible]

اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز و نمایاں کرتی ہے۔

"آبشارِ فکر" پر بھی ان کی گرفت مضبوط [illegible]

اور وہ اپنے احساسات و افکار کو نہایت خوبی [illegible]

اور مہارت سے نظموں میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جاذب ہے۔ قطعات اور رباعیات کی دلربائی
بھی گوہر صاحب کی مہارت اور سلیقہ کی نشاندہی کرتی
ہے۔

مختصر یہ کہ "آبشارِ فکر" گوہر صاحب کا اپنے
قارئین کے لئے ایک حسین تحفہ ہے اور دعوتِ ذوق دیتا
ہے۔

کتاب کی کتابت، طباعت اور سائز البتہ
معمولی ہے۔ نظموں کے عنوانات نہایت بھدے
اور موٹے حروف جیسے معلوم پڑتے ہیں۔ قیمت ۲۵؍ روپے
ہے اور خود گوہر صاحب سے دستیاب ہے۔
سرورق البتہ عمدہ اور جاذب نظر ہے۔

سید عبدالاحد آزاد، گیا

نام کتاب :۔ صدائے فاران (نعتیہ کلام کا مجموعہ)
مولف :۔ محمد ریاض الدین امین بھاگلپوری
پتہ :۔ اصلاحی بک ڈپو رحمت نگر مسجد [illegible]
قیمت :۔ بارہ روپے

نعت اصنافِ سخن کی ایک نازک صنف ہے جس کے لئے عشقِ رسول اور حبِ رسول میں تڑپتا دھڑکتا ہوا اور حبِ رسول سے سرشار و سرمست دل ہونا لازمی ہے۔ اسے اہلِ حق کا درجہ بھی حاصل ہے نعت کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر افسوس کہ فی زمانہ نعت گو شعراء محض بے راہیوں کے شکار ہیں جس کی وجہ سے حسن و جاذبیت نعت معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

فاران نے اس طرف خلوص دل سے توجہ دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں انہیں کامیابی بھی ملی ہے۔ "صدائے فاران" میں حمد، نعت، سلام، منقبت، نذرانۂ عقیدت کے علاوہ دیگر عنوانات کا ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں اس کے قاری کو اپنے ذوق کی چیزیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ فاران کے نعتیہ اشعار میں جہاں ایک طرف آمد کی بے پناہ کیفیت ہے وہیں عشقِ رسول، حبِ رسول اور فراق میں ان کی دلی تڑپ اور دیگر کیفیات دل بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام قابلِ تحسین اور فنی لحاظ سے کامل و اکمل ہے۔ ان کے کلام میں سلاست روانی اور خودرفتگی ہے۔ قاری ان کے مطالعہ کے بعد اس کے پس منظر میں کھو جاتا ہے۔ اور اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زبان صاف شستہ پاک اور سلیس ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار

مجھے حور و غلماں سے کیا واسطہ
مری سمت ہو اک نظر یا محمد

طور تک کوئی کوئی چوتھے فلک تک پہنچے
عرش تک کون گئے کون سے ہے

دیارِ ہند میں طیبہ کی آرزو لے کر
تڑپتا رہتا ہے کوئی غلام کب سے آقا

جدائی تیری مجھ کو کھلنے لگی ہے
کبھی خواب میں بھی تو آ میرے آقا

چھپائی قابلِ قبول سرورق عنوان کی مناسبت سے ہے کتاب کی قیمت آج کی ہوش ربا گرانی کے مقابلے میں بہت کم ہے ایسا لگتا ہے کہ فاران نے [illegible] جذبے سے ہٹ کر اسے منافع عام اور اپنے عقیدتمندوں کے [illegible] کیا ہے [illegible]

منتخب اوراق [illegible]

مرتبین :- راہی فدائی، نظام الحق عابد

ماخذ دستیابی :- جاوید ایڈمنسٹریشن، چامراج محلہ میسور

57/313 پن کوڈ

راہی فدائی ابوالحسنات اکاڈمی 6/64 برہان الدین

اسٹریٹ کڈپہ - 516001

قیمت :- ۵۰ روپے

خطوط کسی بھی نوعیت کے ہوں ان کی اپنی افادیت اور اہمیت ہوتی ہے۔ یہ شخصی مکاتیب کی صورت میں مکتوب الیہ دل جذبات و احساسات، خیالات اس کے فکر و عمل، اس کے فطری رجحانات و میلانات پسند و ناپسند، حالات حاضرہ پر اس کے خیالات اور افکار و نظریات، اس کے علمی و ادبی رجحانات و میلانات، سماجی و مذہبی امور سے متعلق اس کے نقطۂ نظر وغیرہ کے عکاس ہوتے ہیں۔ نجی مکتوبات مکتوب الیہ کی زندگی کے مختلف مخفی و عیاں پہلوؤں کے آئینہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ خطوط کھلے دل اور دماغ سے لکھے جاتے ہیں اس لئے ان میں مرصع و مرقع عبارت سازی کا لطف تو نہیں ملتا مگر کچھ [illegible] کر ان مکاتیب کو مطبوعہ جانب نظر ثانی دیکھے ہیں اور ان میں انشا پردازی کا لطف قاری کو ملنے لگتا ہے۔ نجی مکاتیب [illegible] سیاسی، سماجی، معاشرتی پہلوؤں کے [illegible]

نجی خطوط [illegible]

اربابِ علم و فضل [illegible] حکیم نور الحق جاوید کے نام [illegible] ہیں۔ اس منتخب مجموعہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید سلیمان ندوی، بہادر یار جنگ، مولانا عبدالماجد دریابادی، غلام حسنین [illegible] نظامی، [illegible] مولانا ماہر مشتاقی، فخر الدین علی احمد، مولانا عبدالوحید صدیقی، جسٹس ہدایت اللہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا مفتی کفایت اللہ وغیرہم کے نجی خطوط شامل ہیں۔ یہ تمام خطوط مختلف ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور دینی امور پر ان حضرات کے دو ٹوک اور قیمتی آراء کے عکاس ہیں۔ ان کی عبارت صاف ستھری، سلیس اور رواں دواں ہے۔ زبان شستہ اور لسانی [illegible] سے پاک ہے۔ تحریر میں بے ساختگی ہے جس سے [illegible] کا احساس ہوتا ہے۔ واقعات کے بیان کرنے یا رائے کے اظہار میں تعصب و تنگ نظری سے گریز [illegible] ہے۔ دلائل و شواہد باوزن ہیں، رفتار اور [illegible] مختصر ہیں۔ خطوط سے صاحب مکتوب کے علمی، ادبی [illegible] ان کی حدود [illegible] اور [illegible] یہ خطوط قوم کے لئے سرمایہ [illegible] مینارۂ روشنی ہے۔ ان کا مطالعہ [illegible]

[illegible]

جناب محمد اعظم جمیل آسی [illegible]

[illegible]

خطیب مسجد [illegible] ۲۰ [illegible]

[illegible] ۲۳

[illegible] بیگم [illegible]

[illegible] ۲۰۰۰-۳

[illegible]

پہنچا۔ خطیب محمد اعظم جمیل آسی کی غزلیں پڑھنے کے
لیے جو خوبیاں ان کا کلام "مشاہدات عقیدت" میں
ہمارے سامنے ہے، جسے دیکھ کر ان کی شاعرانہ عظمت
خصوصیت، انتادگی، مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی
ملک و ملت کے تئیں ان کی درد مندی کا [illegible] ہمیں ہوتا
ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خوف خدا، حب رسول، قومی و
ملی درد، ملت کی زبوں حالی کا احساس [illegible] انہیں اپنے
درخشندہ ماضی اور گہن آلودہ حال کا احساس دلا کر
انحطاط اور فسردگی کے ماحول سے نکلنے کی تدبیر بتانا اور
ان کے احساس خفتہ کو بیدار کر کے ان میں خود شناسی و خود
اعتمادی پیدا کرنا بھی ان کے اشعار میں مقبول ہے اپنی
اپنی صلاحیت و فنکارانہ جبلت کے ساتھ رنگ
تغزل، فکری لطافت اور تمام ترفنی، صوری اور معنوی
لوازمات کو آمد کی بے پناہ کیفیت کے ساتھ برتتے ہوئے
اپنی فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے
ہم عصروں میں ممتاز و منفرد مقام حاصل کیا ہے
مختصر یہ کہ تمام [illegible] اور [illegible] کا ایک
ایک شعر [illegible]

[illegible]

[illegible]

سہیل عثمانی صاحب! شکریہ

ایک اچھا خاصا ادبی پرچہ اپنی کتابت اور طباعت کے سبب پھیکا ہو گیا ہے۔ ادھر توجہ دیجیے۔

نسیم بن آسی کا "ناگ پھنی کا جنگل" پڑھا۔ سہیل کے ساتھ ہی "پاسبان" (حیدرآباد) شمارہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں بھی یہ افسانہ شائع ہوا ہے عنوان بدل کر۔ سب کچھ خراب کر دیا گیا ہے تھوڑی سی تبدیلیاں اور کی گئی ہیں۔ وہی [illegible] وہی [illegible] [illegible]

کریں۔ جن [illegible] دہلی سے مجھ کو کسی [illegible] قرۃ العین حیدر کی بات ہے [illegible] کوئی تخلیق [illegible]

وہ ایک خاص طبقہ کی [illegible] اور [illegible] چلتا۔ ان کے کردار بہت [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] کے لیے مستقل [illegible]
[illegible] ہے۔

مقبول [illegible] سلیس سادہ کلام ہے۔ الفاظ [illegible] دلکش اور [illegible] [illegible] [illegible] استعمال [illegible] گیا ہے۔ الفاظ [illegible] اشعار میں ایک جادو [illegible] اثر اور [illegible] کیفیت ہے۔ یہ قاری کے دل و دماغ پر دیر تک اس کا اثر برقرار رکھتے ہیں۔ سوز و گداز [illegible] اکثر [illegible] سکتے ہیں۔ [illegible] اس کتاب [illegible] صرف [illegible] پڑھتا ہے بلکہ قاری کو [illegible] معلومات بھی بہم [illegible] آسانی سے اس کا مطالعہ کر سکتے [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کو علم ہو گا کہ آپ نے از راہ عنایت سوانح [illegible] میں شامل فرمایا [illegible] [illegible] تو اس [illegible]

[illegible] صاحب کا نام نامی ایک عرصے [illegible] تھے۔ اگرچہ اس وقت یہ نام اکثر [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

سُہیل گیا

ماہنامہ

فہرست

مجلس مشاورت ———

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر

- ایڈیٹر :- جمیل منظر
- اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی

معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

▲ کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی ▲

- شمارہ ۱۱ جلد ۵۲
- ـ بدل اشتراک ـ
- فی شمارہ ——— ۵ روپے
- زر سالانہ ——— ۵۰ روپے
- لائف ممبری ——— ۱۰۰۰ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

۔ ماہنامہ سہیل گیا

ریلوے سائیڈ روڈ، گیا-۸۲۳۰۰۱

• فون نمبر ۲۱۵۷۳ •

نمود

اتنی عجلت کیوں ہے؟

آج کے ادبی اور تخلیقی ماحول و مزاج میں جو بات بہت نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے نئے ادبا و شعرا عجلت کے شکار ہیں۔ وہ کم سے کم وقت میں اور شائد کم سے کم محنت میں زیادہ سے زیادہ مشہور ہو جانا چاہتے ہیں۔ یہ بات خوردان کے لئے جتنی نقصان دہ ہے اسی قدر شعر و ادب کے معیار کے لئے بھی ضرر رساں ہے۔

عجلت پسندی کی اس صورت حال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج ہمارے بیشتر فن کاروں کے پیش نظر خدمت ادب سے زیادہ حصول شہرت کا جذبہ کارفرما ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اچھی ادبی تخلیق مطالعے، مشاہدے، انہماک و ارتکاز، ترک و انتخاب، چھان پھٹک اور تدقیق و تفتیش کی متقاضی ہے۔ کسی فوری اور ناپختہ احساس کو جیسے تیسے الفاظ کی گرفت میں لے آنا تو آسان ہے مگر یہ بات طے ہے کہ کسی شعلۂ مستعجل سے کوئی ایسا چراغ جلانا ممکن نہیں جو ہمیں روشنی دے سکے۔

ہمارے متعدد نئے فن کار ایسے ہیں جو صرف اپنی مختصر سی خداداد صلاحیت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اچھے ادب پارے کی تخلیق کے لئے اسی کو کافی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فطری صلاحیت تخلیق کے لئے خام مواد کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان و اظہار پر مکمل دسترس اور بہترین شعری سرمائے کے مطالعے نیز فکر و احساس کی پختہ کاری کے بغیر اگر اس صلاحیت کا استعمال کیا جائے تو صحیح معنوں میں یہ جوہر اصلی بھی خس و خاشاک بن جاتا ہے۔

یہ تو [illegible] جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے شعر و ادب کے سرمائے میں

بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال پہلے طباع اور تخلیقی ذہن کے حامل اہل قلم کو اتنے دبیز سرمایہ ادب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ شعری و ادبی سرمائے کا اضافہ ہم سے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے ادب کے سابقہ خزانے کے خوب و زشت کا جائزہ بھی لیں اور اس کی روشنی میں اب جو کچھ کہیں یا لکھیں وہ پہلے کے مقابلے میں معیار کی حیثیت سے آگے ہو۔ اس طرح ہماری ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔ اب ادب کو ایک شوق گاہ گاہ کے طور پر نہیں برتا جا سکتا۔ اس میں زیادہ سنجیدگی اور متانت کی ضرورت ہے۔ DELIBERATION کے بغیر اچھا کارنامہ سامنے نہیں آسکتا۔ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں مقابلے اور مسابقت (COMPETITION) میں شدت پیدا ہو گئی ہے اسی طرح ادبی معیار کو برقرار رکھنے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اب زیادہ مسابقت کی ضرورت ہے لیکن اس کے برخلاف منظرنامہ کچھ یوں ہے کہ ہم حصول شہرت کے لئے مسابقت تو کرتے ہیں مگر ادبی تخلیق کے معیار سے بے نیاز ہیں۔ ادب کو ایک سہل الحصول شے سمجھ کر جب تخلیقی فضا بنائی جائے گی تو لازماً کمتر درجے کا ادب وجود میں آئے گا۔ یوں آج ہمارے اہل قلم حضرات پر دوہری ذمے داری عائد ہو جاتی ہے ایک تو یہ کہ ہم اپنے سرمائے کو خس و خاشاک سے بچائیں اور دوسرے یہ کہ ہمارے فن پارے سابقہ نمونوں سے بہتر ہوں۔ زیادہ لکھ کر شہرت حاصل کرنے کے جذبے سے باز آئیں۔ بخلاف اس کے کم لکھ کر پائیدار وقعت حاصل کریں اور ادبی معیار کی حفاظت کریں اگر ہم نے اس کا خیال نہ کیا تو ہم تیزی سے اپنی ابتدا تک پہنچ جائیں گے ——— اور ظاہر ہے کہ یہ الٹا سفر ہمارے شعر و ادب اور فکر و آگہی کے لئے سم قاتل ہوگا۔

——— مسعود منظر

آپ اندھیرے سے اُجالے میں آجائیں گے

شمس کنول کا ——— افق تا افق

ملاحظہ فرمائیں ——— جو ایک انسان دوست رسالہ ہے۔

براہ راست خریدار بنئے! ——— سالانہ قیمت ۱۰۰/- روپے

UFAQ TA UFAQ Monthly - Salaamah 4/10-D, Darulins Compound,

آپسی میل۔ ایکتا اور ہم آہنگی
قوم کی اصل طاقت ہے

زبان، ذات پات اور مذہب سے اوپر اٹھ کر

ہم سب ایک ہیں

ہمارا ملک۔ نہ کسی خاص فرقہ کا ملک ہے نہ کسی خاص مذہب کا
یہ سبھی فرقوں، زبانوں، مذہبوں اور تہذیب وتمدن کا ملک ہے۔ ہندو، مسلمان،
سکھ، عیسائی وغیرہ سبھی کے تانے بانے سے بنا ہے۔ کونذر، رابندر، قاضی
نذرالاسلام یا دنکر اور اقبال سبھی نے اس کے گیت گائے ہیں۔ تلسی اور
کبیر کے گیت سبھی گاؤں گھروں میں گائے جاتے ہیں۔

کثرت میں وحدت ہماری خصوصیت ہے۔ یہ
آج نہیں صدیوں کی ہماری روایت ہے۔

آیئے — ہم سب مل کر قابل فخر روایت کو اور مضبوط بنائیں

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جاری کردہ۔ محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ، بہار
154 210 (2-56)94-95

گیان چند
لکھنؤ

مرقع دہلی

مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم

مرقع دہلی نواب درگاہ قلی خاں کی مشہور کتاب ہے۔ مصنف نظام الملک آصف جاہ کے ساتھ جون ۱۷۳۸ء میں حیدر آباد سے دلی گئے اور جولائی ۱۷۴۱ء میں دکن واپس چلے آئے۔ اس طرح یہ قیامتِ نادری کے وقت دلی میں موجود تھے۔ مرقع دہلی اس زمانے کی دلی کے طبقۂ بالا کی ایک اہم دستاویز ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے لیکن اس کے مطبوعہ ایڈیشنوں میں اردو ترجمہ بھی دے دیا جاتا ہے۔ اب سے کچھ پہلے تک تین ایڈیشن آچکے تھے جن کی تفصیل ڈاکٹر خلیق انجم نے دی ہے۔ انہوں نے چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں بااحسن الوجوہ شائع کیا۔ اس کی ابتدا میں ۱۲۸ صفحوں کا ایک عالمانہ مقدمہ ہے جس میں کتاب کا تہذیبی اور ادبی جائزہ، نواب درگاہ قلی خاں کے سوانح کتاب کے ایڈیشنوں کی تفصیل اور مختصر حواشی ہیں۔ اس کے بعد فارسی متن اور اردو ترجمہ ہے۔ آخر میں ۲۶ صفحوں کے تعلیقات ہیں جن میں افراد اور عمارتوں کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد حواشی ہیں جو دراصل اختلافات نسخ ہیں۔ آخر میں اشاریہ اور کتابیات پر اختتام ہوتا ہے

ڈاکٹر خلیق انجم کی فراہم کردہ معلومات سے اس کتاب کے مخطوطات اور مطبوعات کی تفصیل معلوم ہوئی۔ اب تک اس کے چار مخطوطے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو سالار جنگ لائبریری حیدر آباد میں ہیں۔ فہرست میں ایک سفرناموں کے تحت اور دوسرا ادبی نثر کے تحت درج ہے۔ تیسرا ملا فیروز لائبریری بمبئی میں اور چوتھا برٹش میوزیم میں ہے۔ ملا فیروز لائبریری بمبئی کی فہرست سے میں نے اپنی کتاب، اردو کی نثری داستانیں، میں استفادہ کیا ہے۔ خلیق صاحب

بمبئی گئے تو معلوم ہوا کہ اب بمبئی میں اس نام کی کوئی لائبریری موجود نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بتایا کہ یہ لائبریری بند ہو گئی ہے۔ اور اس کی کتابیں آر۔ کے۔ کاما اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ [illegible] صاحب کسی نہ کسی طرح چاروں مخطوطوں کا عکس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی مخطوطے میں کتاب کا نام نہیں دیا۔

خلیق صاحب سے پہلے اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ میں پہلا ایڈیشن سرورق پر کتاب کا نام "دہلی بارہویں صدی ہجری میں" اور اندرونی ٹائٹل پر "مرقع دہلی" درج کیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرقع دہلی انہیں کا دیا ہوا نام ہے۔ خلیق صاحب نے اسی نام کو اختیار کر لیا۔ اپنے ایڈیشن میں حکیم صاحب نے طویل مقدمے میں مصنف کے مفصل حالات لکھے۔ یہ ایڈیشن محض ایک مخطوطے کی بنا پر کیا گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن پروفیسر نورالحسن انصاری نے سالارجنگ کے دونوں نسخوں کی مدد سے تیار کیا جو شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے متن اور اردو ترجمے میں کئی فاش غلطیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے طباعت کے فوراً بعد یہ ایڈیشن واپس لے لیا گیا۔ اب کسی کتب فروش کے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ملتی۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی نے لاہور سے ۱۹۸۲ء میں تیسرا ایڈیشن شائع کیا۔ اس میں صرف ڈیڑھ صفحوں کا مقدمہ ہے جس میں یہ تک نہیں بتایا کہ متن کی بنیاد کس قلمی یا مطبوعہ نسخے پر ہے۔ خلیق صاحب نے دریافت کیا کہ یہ حکیم مظفر حسین کے متن کی حرف بہ حرف نقل ہے۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر چندر شیکھر اور شما مترا چنائے نے ۱۹۸۹ء میں دہلی سے شائع کیا۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں۔ ڈاکٹر چندر شیکھر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے استاد ہیں۔ خلیق صاحب نے مقدمہ میں ص ۹ پر انہیں اپنا چھوٹا بھائی اور ص ۱۰ پر برادر خورد لکھا ہے۔ اس سے میں بڑی الجھن میں پڑا۔ خلیق صاحب نے ایک ہندو خاتون سے شادی کی ہے جس سے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں ڈاکٹر چندر شیکھر خلیق صاحب کے برادر نسبتی تو نہیں۔ خلیق صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کی چندر شیکھر سے کوئی عزیزداری نہیں۔ وہ انہیں بھائی جان کہتے ہیں جس کے جواب میں خلیق صاحب نے انہیں اپنا چھوٹا بھائی لکھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک تحقیقی کتاب میں الفت کا یہ اظہار غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔

بشیتر کے تینوں ایڈیشنوں میں کسی نے تدوین متن کے اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ اس لئے ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کو ان اصولوں کے مطابق چار نسخوں سے مرتب کیا۔ ابتدا میں تفصیلی اور سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کے موضوع کا تاریخی اور معاشرتی پس منظر دیا، اقتباسات کے ساتھ مشتملات کا تعارف ہے اور ان پر تہذیبی اور ادبی اعتبار سے تنقید ہے۔ بیانات کے نمونے اور تنقید اتنے سیر حاصل ہیں کہ انہیں پڑھ کر کتاب سے مکمل واقفیت ہو جاتی ہے۔ درگاہ قلی خاں کے سوانح مرتب کرنے کے لئے انھوں نے مرتب اول کے مقدمے کے علاوہ چھ مزید ماخذ سے مدد لی ہے۔ متن اور

اردو ترجمہ کے بعد تعلیقات ہیں۔ ان میں اول ان عمارتوں کی تفصیل ہے جن کا متن میں ذکر آیا ہے۔ دوسروں کے لئے اس موضوع کے لئے بہت کھکھیڑ اٹھانی پڑتی لیکن خلیق انجم دلی کے آثار قدیمہ کے ماہر ہیں۔ عمارتوں کے بعد افراد کا تعارف ہے۔ ان غیر ادبی شخصیتوں کے حالات دریافت کرنا کافی مشکل تھا لیکن خلیق صاحب نے مختلف مآخذ کو کھنگال کر یہ کام قابل اطمینان طریقے پر انجام دیا۔ عمارت ہو یا فرد، ہر اندراج کے بعد دیانت داری سے اپنے مآخذ کا اظہار کر دیا ہے۔ چاروں نسخوں کے اختلافِ نسخ کو انھوں نے حواشی کے نام سے بیان کیا ہے۔

تدوین کی خوبیوں کی مزید شرح کئے بغیر میں اپنے چند مشاہدات پیش کیا چاہتا ہوں

۱۔ مقدمہ ص ۱۶ اور ۱۷ پر سلک کے کارخانوں کا ذکر ہے۔ اردو میں سلک کے بجائے ریشم لکھنا بہتر ہوتا۔

۲۔ صفحہ ۱۹-۱۸ پر رضا لائبریری رام پور کے ایک مخطوطے، رقعۂ حقیقت بر آمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد، کا ذکر اور اقتباسات ہیں۔ اس نادر غیر معروف کتاب کی شہادت معلومات افروز ہے لیکن ص ۲۱ پر جو یہ لکھا ہے۔

"انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک ناقص الاول بیاض ہے۔"

انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر دہلی میں ہے انجمن کے جنرل سکریٹری کے قلم سے ۱۹۹۳ء میں علی گڑھ لکھنا حیرت کی بات ہے۔ مرتب نے حواشی ص ۲۴۷ پر صراحت کر دی ہے کہ انھوں نے مقدمے میں اپنی کتاب مرزا محمد رفیع سودا کے سیاسی پس منظر کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دیا ہے۔ جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع شدہ اس کتاب میں ص ۱۲ پر انجمن ترقی اردو علی گڑھ، لکھا ہے جو اس وقت کے لحاظ سے درست تھا۔ زیر نظر کتاب میں یہ حصہ نقل کرتے وقت علی گڑھ کو بدل کر دلی کر دینا چاہئے تھا۔

۳۔ درگاہ قلی خاں نے اپنی کتاب میں دلی کی سیرگاہوں اور درگاہوں کے بیان پر توجہ کی، طبقۂ عوام اور تاریخی واقعات کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ خلیق صاحب نے مقدمے میں لکھا ہے کہ حملۂ نادر شاہ کا ذکر صرف دو لفظوں، سانحۂ نادر شاہ، میں کیا ہے۔ (مقدمہ ص ۲۲)۔ فارسی متن ص ۱۰۹ پر یہ فقرہ، سانحۂ نادر شاہی، ہے۔

۴۔ مقدمے میں درگاہ قلی خاں کے سوانح بھی رہے ہیں ص ۱۲ پر سطر ۱۹ اور سطر ۲۰ میں نواب آصف جاہ کے ورودِ دلی کا مہینہ جون ۳۸ء لکھا ہے لیکن سطر ۱۶ میں دلی سے بھوپال جانے کا زمانہ دسمبر ۱۷۳۷ء درج کیا ہے۔ یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ دسمبر ۱۷۳۸ء ہونا چاہئے۔

۵۔ کتاب کے فارسی متن ص ۱ اور اردو متن ص ۱۱۵ کے آغاز میں لکھا ہے کہ "جب نواب درگاہ قلی خاں، نظام الملک آصف جاہ کے ساتھ دلی گئے تو وہاں کی خصوصیات قلم بند کر لیں۔ انہیں بیان کیا جاتا ہے۔"

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کتاب کے راوی درگاہ قلی خاں نہیں، کوئی اور شخص ہے ... مجھے مزید

۵ــ بہ فارسی ص ۶۴ کے فقرے ' حضرت نواب صاحب ما'
اور ص ۶۵ کے آخر میں ' فقیر ' اور بندگان نواب صاحب،
کے الفاظ سے ہوا کہ یہاں نواب صاحب سے مراد
درگاہ قلی خاں اور فقیر سے مراد پہلے پیرا گراف کا راوی
ہے۔ ایک حل یہ سمجھ میں آتا تھا کہ نواب صاحب سے
مراد نظام الملک آصف جاہ ہوں۔ میں نے اپنا شبہہ
خلیق صاحب کے سامنے رکھا۔ انھوں نے زور دے
کر کہا کہ کتاب درگاہ قلی خاں ہی کی لکھی ہوئی ہے اور
اس میں نواب صاحب سے مراد آصف جاہ ہی ہیں۔

۶ــ فارسی میں ۶۳ اور اردو میں ۱۳۰ پر اس
دور کے شاہ غلام محمد داول پورہ کا ذکر ہے۔ خلیق
صاحب نے تعلیقات میں ۲۰۴ پر مرتب اول کے
حوالے سے انہیں دکن کا شاہ داول قرار دیا ہے جو راست
نہیں۔ شاہ داول سولہویں صدی عیسوی کے شاہ
برہان الدین جانم کے مرید تھے۔ دلی کے عہد محمد شاہی
کے شاہ غلام محمد داول پورہ مختلف شخصیت ہیں۔

۷ــ تعلیقات میں ۲۱۲ پر نعمت خاں بین
نواز کا لقب ،صدا رنگ، دیا ہے۔ میری رائے میں
اس کا املا ' سدا رنگ ' ہے۔ میرے لئے یہ اطلاع بھی
نئی ہے کہ وہ بین نواز تھا۔ میں تو اسے زبانی گائکی
کرنے والا اور خیال کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کے مصنفہ
خیالوں میں یہ بول اکثر ملتا ہے۔

محمد شاہ تھے سدا رنگیلے

یہاں " سدا " سے مراد ہمیشہ ہے۔ فی الوقت
میری رسائی میں موسیقی کی کوئی کتاب نہیں لیکن
.... انصاری کے مرتبہ مجموعے خسرو شناسی (دہلی ۱۹۷۵ء)

میں عظمت حسین خاں سبکش دل رنگ مرحوم کا مضمون
" ہندوستانی گائکی میں خیال کا چلن " شامل ہے۔ اس
میں ص ۳۱۹ پر وہ ان کا نام " میاں نعمت خاں سدا
رنگ " ہی لکھتے ہیں۔

۸ــ کتابیات ص ۲۵۱ کے آخری اندراج میں
کریم الدین کے تذکرے کا نام ' طبقات الشعرائے ہند '
درج ہے۔ صحیح ' طبقاتِ شعرائے ہند ' ہے

اب فارسی متن اور اس کے اردو ترجمے سے
متعلق کچھ مشاہدات

۱ــ فارسی متن میں لکھا ہے

اللّٰہم اغفر وارحم (یا اللہ ان کی مغفرت فرما
اور ان پر رحم کر) ص ۶۴

لیکن اردو ترجمے میں لکھا ہے

اللّٰہم اغفر و ارحم اے میرے پروردگار مجھے معاف
کر اور میرے اوپر رحم فرما۔

میں نے ایک عربی داں سے رجوع کیا۔ معلوم ہوا کہ
پہلا ترجمہ صحیح ہے۔ دوسرا غلط

۲ــ شاہ یا الصمد من کے بیان کا آخری حصہ ہے
سبکساری گردنش موقوف بہ درانہ کشیدن است۔
خدا کند کہ نصیب شود۔ ص ۶۴
اتفاق سے اردو کے ص ۱۳۲ پر اس جملے کا ترجمہ
حذف ہو گیا ہے۔

۳ــ فارسی متن میں ص ۶۷ پر ذکر سلطان
شمس الدین غازی کے آخر میں ایک عربی فقرہ ہے اور
قوسین میں اس کا اردو ترجمہ دیا ہے جبکہ اردو میں
ص ۱۳۵ پر عربی فقرہ تو ہے اس کا اردو ترجمہ نہیں۔

ہیل لیا

۴۔ ذکر کیفیت کسل پورہ کے سلسلے میں اردو
لکھتے ہیں۔
دامنِ شہوت کو خیارک اور سوزاک (جیسی
)سے بھرتے ہیں۔ ص ۱۴۶
خیارک اجنبی لفظ ہے۔ مجھے اس کے معنی معلوم
رتب کو اس کا اردو ترجمہ دینا چاہئے تھا —
مطابق یہ ران کی جڑ کا ایک پھوڑا ہوتا ہے جسے
بد کہتے ہیں۔ پلاٹس کی لغت کے مطابق اس
آتشک سے ہے۔

۵۔ فارسی میں ۹۴ پر دو موسیقاروں کو "از
سین" لکھا ہے۔ اردو ص ۱۶۴ پر اس کا ترجمہ
ین کے نواسے" دیا ہے۔ غیاث اللغات میں
معنی میں لکھا ہے۔
فرزند زادہ عموماً بمعنی پسر زادہ خصوصاً گا ہے
را نیز گویند۔ از برہان و رشیدی و جہانگیری۔
و نبیرہ کے معنی پوتے اور نواسے دونوں کے
ترجیح پوتے کو ہے۔
کتاب جس اہتمام سے چھپی ہے وہ اردو میں
اس لئے ہم ایسی کتاب سے توقع رکھتے ہیں۔
عنوانات کو صحیح مقام پر صحیح طور سے لکھنے
توجہ کی جائے گی لیکن ہر جگہ یہ حسب دلخواہ
سکا۔ اس کی ذمہ داری مصنف سے زیادہ
کے مذاق صحیح پر ہے۔ کتاب میں دوسرے معمولی
بتے بھی دکھائی دیتے ہیں چنداں اہم نہیں۔ الغرض
جو میری نظر میں آگیا اس کی شرح کر دی تا
دوسرے ایڈیشن میں انہیں درست کر دیا
جائے۔

۱۔ مقدمہ ص ۲۶ اور اردو ترجمہ ص ۱۲۶ پر اپنے
خوش نصیبوں" لکھا ہے۔ "اپنی" چاہئے۔
۲۔ مقدمہ ص ۳۱ سطر ۱۹ کے ایک اقتباس
میں "خیافت کے اسباب" درج ہے جب کہ فارسی
متن ص ۵۸ اور اردو ترجمہ ص ۱۲۴ پر صحیح لفظ
خباثت" دیا ہے۔
۳۔ فارسی متن میں ص ۶۸ سطر ۳ پر ایک عنوان
سطر کے بیچ میں یوں چھپا ہے۔

مقدمۃ الجیش وجد و مال شاہ کمال

اس میں دو قباحتیں ہیں۔ وجد سے پہلے لفظ
"معرکہ" چھوٹ گیا ہے جو اردو ترجمے میں دیا ہے۔
دوسری قباحت یہ ہے کہ یہ ذیلی عنوان ہے اس
لئے سطر کے وسط میں نہیں بلکہ سطر کے دائیں سرے
سے شروع ہونا چاہئے تھا انگریزی میں اسے side
heading کہتے ہیں۔ اردو میں ص ۱۳۵ پر اس
سے اوپر کا بڑا عنوان "ذکر مشائخ محذوف ہو گیا ہے
۴۔ فارسی میں ۶۹ پر اعظم خاں پسر فدوی خان
کے بعد دوسرے پیرے میں مرزا منو کا بیان ہے۔
اس سے پہلے عنوان میرزا منو چاہئے۔ یہی اردو
میں ۱۳۸ کے دوسرے پیرے میں درکار ہے۔
۵۔ فارسی میں دو سطروں میں ایک عنوان یوں
دیا ہے۔ واوین میں نے لگائے ہیں۔

" ذکر سازان محافل صاحب کمال و معنی
طرازان مجامع شیریں مقالی مرزا جان
جاناں " ص ۱۴۸

اردو میں بھی عنوان تین سطروں میں ہے۔ پہلی اور تیسری سطر جلی ہے۔ دوسری سطر تمام متن کی طرح یعنی "ذکر سخن سازانِ محافل۔

صاحب کمالے و معنی طرازانِ مجامع شیریں

مقالے مرزا جان جاناں" ص ۱۴۶

ظاہر ہے کہ فارسی میں لفظ 'سازان' سے پہلے 'سخن' چھوٹ گیا ہے۔ دراصل پوری عبارت جلی حروف میں لکھی جانی چاہیے۔ پہلے فصل کا بڑا عنوان ہے۔

ذکر سخن سازانِ محافل، صاحب کمالے و معنی طرازانِ مجامع شیریں مقالے۔ اس کے نیچے دائیں سرے میں ذیلی عنوان، مرزا جان جاناں، لکھنا چاہیے جیسا کہ اردو ترجمے میں ہے۔

۶ فارسی میں ۸۰ پر عنوان میں نام' سراج الدین علی خاں آرزو' لکھا ہے جب کہ فہرست میں ۲ نیز اردو ترجمہ ص ۱۵۱ پر محض 'سراج الدین خاں آرزو' دیا ہے ظاہر ہے کہ اردو ترجمے میں فارسی متن میں مندرجہ پورا نام نقل کرنا چاہیے۔

۷ فارسی ص ۹ میں اول فصل کا عنوان ہے، ذکر ارباب طرب، اس کے نیچے سطر کے وسط میں 'نعمت خاں بین نواز' لکھا ہے۔ یہ ذیلی عنوان ہے اس لئے سطر کے دائیں سرے سے شروع ہونا چاہیے تھا۔ اردو ص ۱۶ پر ایک ہی سطر میں دائیں سرے سے 'ذکر ارباب طرب نعمت خاں بین نواز'

لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں دو عنوانات کو ملا دیا ہے اول سطر کے وسط میں فصل کا عنوان، ذکر ارباب طرب' لکھنا چاہیے تھا۔ پھر دوسری سطر کے شروع میں ذیلی عنوان نعمت خاں بین نواز

۸ فارسی ص ۹۵ پر سطر ۸ کے بعد یہ عنوان درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

سوادخاں المشہور بہ کولہ و سوادہ

یہ اردو ص ۱۶۶ پر موجود ہے

۹ ص ۱۷۸ بھینا سے فیل سواز کے لئے لکھا ہے 'طائفہ داروں کے سردار ہیں، چونکہ یہ ایک خاتون ہیں اس لئے 'کے' نہیں 'کی' چاہیے۔

۱۰ ص ۱۸۹، سطر ۷ 'دنیا کے مختلف زبانوں' یہاں بھی 'کی' کا مقام ہے۔

۱۱ کتابیات ص ۲۵۰، اندراج ۳۵ پر ذکا کے تذکرے کا نام معیار الشعرا درج ہے جو بالیقین سہو کاتب ہے۔ عیار الشعرا چاہیے۔ ص ۲۵۱ پر اندراج ۵۱ میں سرور کے تذکرے کا نام محض 'منتخبہ' درج ہے اور اس کے پہلے ایک لفظ کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے یعنی کاتب مصنف کے مسودے میں یہ لفظ پڑھ نہ سکا۔ محذوف لفظ 'عمدۂ' تھا تاکہ تذکرے کا پورا 'عمدۂ منتخبہ' برآمد ہو سکے۔ ص ۲۵۲ پر ۶۸ کے بعد آخری اندراج ۷۰ درج ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۶۹ ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مصنف کے مسودے میں ۶۹ پر کوئی اور کتاب رہی ہو جو کتابت میں چھوٹ گئی۔ اور ۷۰ کے بعد ۷۰ لکھ دیا گیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم دلی کے اہل زباں ہیں، اور یہ عالم میں ایک قصباتی ہوں پھر بھی ان کے بعض الفاظ اور فقروں کی ساخت کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت

ہوں ۔

۱ مقدمہ ص ۱۰ " اردو کے صنف اول کے افسانہ
ناول نگار جناب رام لعل " ۔ یہاں افسانہ و ناول
لکھنا چاہیے تھا یا افسانہ نگار اور ناول نگار ۔

۲ مقدمہ ص ۱۱ سطر ۹ " سب ہی ۔ سطر ۱۳
ہی "
یہ مسلم کہ یہ دونوں ترکیبیں درست ہیں لیکن
"ہی" یہی، فصیح تر ہیں۔ دیکھیے رشید حسن خاں کی
کتاب "اردو املا" (دہلی ۱۹۷۴ء) ص ۹۷-۲۹۶

۳ مقدمہ ص ۴۶ ۔ " وہ فنکار جن کا تعلق بادشاہ
دربار سے متوسل ہوتے تھے "
لگتا ہے کہ مصنف نے جملے کو شروع کرتے وقت
ذہن میں اس کی یہ شکل قائم کی
" وہ فنکار جن کا تعلق بادشاہ کے دربار سے تھا "
جملے کو ختم کرتے وقت ذہن میں یہ شکل آئی ۔
" وہ فنکار جو بادشاہ کے دربار سے متوسل ہوتے
"
اوپر کا جملہ دونوں کا مجموعی ملغوبہ ہے۔

۴ ص ۴۴، سطر ۶ " نہ ہی اس کا متن مرتب
کر کے شائع کیا تھا۔
مجھے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بتایا تھا کہ "ہی"
کا استعمال "نہ" کے بعد نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جملے
میں کسی دوسرے متعلقہ لفظ کے ساتھ ۔ ان کا یہ
بیان درست ہے۔ اردو والوں میں "نہ ہی" لکھنا
عام ہے ۔ یہ انگریزی کے NOR کا ترجمہ ہے۔
تفصیلی ہی کو اس کے صحیح تر لفظ کے بعد لانا چاہیے۔
مثلاً مندرجہ بالا جملے کو یوں لکھا جا سکتا تھا ۔ "
نہ اس کا متن ہی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۵ صمصام الدولہ کے بھتیجے شاہ باسط، جو خود
کو فقرا میں شمار کرتے ہیں، کی خانقاہ میں ہر ہفتے اتوار
کے دن خاص محفل منعقد ہوتی ہے " ص ۲۳، سطر ۴-۱
مضاف الیہ اور حرف اضافت میں کبھی فصل نہیں
ہونا چاہیے۔ شاہ باسط اور "کی" کا بُعد ناپسندیدہ ہے۔
مندرجہ بالا جملے کو یوں لکھا جا سکتا تھا ۔
صمصام الدولہ کے بھتیجے شاہ باسط کی خانقاہ
میں، جو خود کو فقرا میں شمار کرتے ہیں، ہر ہفتے ۔۔ الخ
فارسی جملہ یوں ہے ۔ " در خانقاہ شاہ باسط کہ
برادر زادۂ صمصام الدولہ اند و خود را در فقرا
محسوب می کنند، در ہر ہفتہ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ "
اسے اردو میں یوں بھی کہہ سکتے تھے ۔" شاہ باسط
کی خانقاہ میں، جو صمصام الدولہ کے بھتیجے ہیں اور خود کو
فقرا میں شمار کرتے ہیں، ہر ہفتے ۔۔۔۔ الخ "

۶ ص ۱۹۷ پہلی سطر " شیخ محمد غوث گوالیاروی "
گوالیار کے آخر میں ہائے مختفی یا "ی" نہیں۔ اس کی
صفت نسبتی میں "واؤ" لانا زائد ہے۔ گوالیاری کہیں
گے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شہر کا نام گوالیر ہے،
گوالیار نہیں۔ معلوم نہیں فارسی اور اردو میں گوالیار
کیوں لکھا جاتا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں خلیق انجم صاحب کو
گوالیری لکھنا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ چند اختلافی مشاہدات غیر اہم نکات
سے متعلق ہیں۔ ان سے ہرگز یہ تاثر قائم نہیں ہونا
چاہیے کہ میرے نزدیک یہ تدوین اعلیٰ سے کم معیار کی

ڈاکٹر سعید عارفی
بہرائچ

غزل کا ایک تازہ کار شاعر: اظہار وارثی

اظہار وارثی کا تعلق شعراء کی اس نسل سے ہے جو ۱۹۵۰ء کے بعد ابھری اور اپنی بقاء و شناخت کی جدوجہد میں لگ گئی، یہ اردو ادب کا وہ دور ہے جب ہر طرف ترقی پسندی کا دور دورہ اور غلبہ تھا۔ ترقی پسندانہ نظریات و خیالات سے ہٹ کر کسی چیز کو قبول کرنا اور اسے سند و اعتبار کا درجہ حاصل ہو پانا نہایت دشوار امر تھا اس دور میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی جو نسل تیار ہوئی اس نے اپنی جدوجہد، فکر و شعور، تجربات و مشاہدات ادبی رویے اور کوششوں سے آخر کار ترقی پسندی کے اس جادو کو توڑ ہی ڈالا۔ اظہار وارثی کو بھی انہیں مراحل سے گذرنا پڑا۔

اظہار وارثی کی شاعری اپنے لب و لہجے، زبان و بیان، اسلوب، اندازِ فکر اور اظہار و ابلاغ کی سطح پر منفرد تازہ اور جدید ہے، مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان کی شاعری کو وہ مقبولیت اور شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق ہے۔ اس میں کچھ اظہار وارثی کی کم آمیزی، کم گفتاری، انکساری اور گوشہ نشینی کا دخل ہے۔ اگر انہوں نے اپنی شخصیت کے اس حصار کو توڑ دیا ہوتا تو ان کا شمار یقینی طور پر موجودہ عہد کے چند اہم ترین شعراء میں کیا جاتا اور آنے والی نسل ان کی شاعری سے استفادہ کرتی۔ اظہار وارثی کا شعری وجود اس چراغ کے مانند ہے، جس سے نکلنے والی شعاعیں بہت تابناک اور روشن تو ضرور ہیں لیکن اگر چراغ ایک کمرے کی محدود فضاؤں سے نکال کر اور آزاد فضا میں رکھ دیں تو اس کی روشنی بہت دور تک جائے گی اور ادبی ماحول پر چھائی ہوئی دھند ہٹا کر اسے اور بھی زیادہ منور و تابناک بنا دے گی۔

آج اردو کی غزلیہ شاعری کا جب ہم گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر غزلیں اپنے اندازِ بیان اور لب و لہجے کی سطح پر

ارہ سہیل گیا
انیت اور یک رنگی کے جال میں جکڑی ہوئی ہیں۔
کہیں تو خیال اور فکر کی منزلوں پر بھی یہ مماثلت
نکار ہیں۔ اس رویے نے شاعر اور شاعری کی شناخت
روح کیا ہے اور ہمیں اچھے برے کے فرق میں بھی
اریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس رویے اور
ز کے فروغ کی وجہ سے آج ہلکی اور سستی شاعری
بولیت اور شہرت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور
رے سنجیدہ و گہری فکر والی شاعری عوامی حلقوں
ٹ کر صرف علمی اور ادبی حلقوں تک محدود ہو کر رہ
۔ اظہار وارثی کی غزل گوئی کا تعلق بھی شعراء کے اسی
کی شاعری سے ہے جو عوامی حلقوں میں تو قبول عام
ند نہ پا سکی مگر علمی و ادبی حلقوں میں اپنی اچھی
چھاپ چھوڑتی ہے۔

اظہار وارثی نے غزل، نظم، رباعی، قطعہ،
اور دوہے وغیرہ کہے ہیں۔ اور ان میں اپنے
انہ کمالات کے جوہر دکھائے ہیں مگر میں یہاں اپنی
صرف ان کی غزل گوئی تک محدود رکھنا چاہتا
کیونکہ ان کی غزلیں عصری شعری ادب کی دنیا
نے لب و لہجے، انداز بیان، رنگ و آہنگ اور
ے کے اعتبار سے اپنی ایک الگ شناخت بناتی
آج جب غزل گوئی یک رنگی اور یکسانیت کی
ناموں جکڑی ہوئی ہے مشاعروں کی بھیڑ بھاڑ
اور حقیقی شاعر کی انفرادیت و شناخت گم ہوتی
سے اور لہجے کی کرختگی ذوق سماعت کو مجروح
سے اظہار وارثی کی غزلیں ہمیں شگفتگی اور انبساط
ناہیں۔

آج ایسی شاعری کم دیکھنے کو ملتی ہے جس میں شاعر اور شاعری کی بالکل مختلف جہت اور شخصیت سامنے آتی ہے۔ یہاں مختلف ہونے سے مراد یہ ہے کہ شاعر نے ایک خاص قسم اور انداز کی زبان اختیار کی ہو۔ اور ایسے شعری رویے پر عمل کیا ہو جو مروجہ اردو شاعری سے الگ ہو۔ اظہار وارثی کی غزلوں کی زبان اور لہجے میں انفرادیت ہے اور شعری رویہ بھی مختلف ہے، وہ اپنے اس عمل میں کامیاب ہیں۔ اظہار وارثی اپنی غزلوں میں الفاظ کی چیخ دھاڑ سے گریز کرتے ہیں اور جہاں بھی الفاظ کا آہنگ تیز اور تلخ ہونے لگتا ہے وہیں وہ ایک ایسے سکوت کی فضا پیدا کر دیتے ہیں جو ان کے لہجے کی تیزی اور تلخی کو کم کر دیتی ہے۔ ان کا یہ عمل ممکن ہے جدت پسند اور ترقی پسندانہ نظریات کے حامل ناقدوں، ادیبوں اور شعراء کو پسند نہ آئے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی کبھی سکوت آمیزے میں جو تپش ہوتی ہے وہ شور اور ہنگامے کی گرمی پر غالب آجاتی ہے۔ اور اظہار وارثی کی شعر گوئی اسی سکوت آمیزے کی تپش کی تلاش کی سمت ایک مسلسل سفر ہے۔

اظہار وارثی اپنی غزلوں میں سکوت آمیزے کی آنچ کو پیدا کرنے کے لئے اس پر ہنگامہ دنیا اور ماحول سے کسی بھی لمحہ فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ اسی شور و ہنگامے کے درمیان ان لمحات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو سکوت کی ایک فضا تعمیر کرتے ہیں۔ یہی فضا ہنگاموں اور شور کے درمیان ان کے تخلیقی عمل کا سرچشمہ بنتی ہے یہ عمل ایک مشکل اور دشوار عمل ہے۔ کسی بھی شاعر کے لئے یہ منزل ایک خطرناک ترین منزل ہوتی ہے۔ یہاں اس

بات کا بھی خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی باتیں اتنی مبہم، غیر مرئی اور غیر واضح بھی ہو سکتی ہیں کہ انہیں کسی قدیم شعری روایت سے جوڑ کر اس پر معمولی اور بے جا اسی ہونے کا اطلاق کر دیا جائے اور اس بات کا بھی اعلان کر دیا جائے کہ شاعر کے تخلیقی عمل میں داخلی حرارت کی کمی ہے، وہ کچھ کہنا نہیں چاہتا بلکہ صرف الفاظ سے کھیلنے اور لفظی بازیگری دکھانے کے عمل سے دوچار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اظہار وارثی اپنے شعری وجود کو ان الزامات سے بچائے جاتے ہیں پوری طرح کامیاب ہیں کیونکہ اس خیال کی شہادت آپ کو ان کے اشعار سے پوری طرح مل جائے گی۔ کیونکہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں ہر منزل پر تخلیقی حرارت کو قائم رکھتے ہیں۔

دنیا مٹا سکی نہ مری سربلندیاں
میں قتل بھی ہوا ہوں تو نیزے پہ سر گیا

ڈس رہے ہیں آستینوں کے مکیں
وضعداری ہے کہ دامن گیر ہے

چہرے کی اداسی کو تبسم میں چھپا دیں
سوکھی ہوئی ٹہنی پہ ہری بیل چڑھا دیں

کل یہی آگ اجالوں کی پیمبر ہوگی
آج جلتا ہے مرا گھر تو ہوا دی جائے

اب کے فصلیں کٹیں گی جسموں کی
بیج نفرت کے بو رہے ہیں لوگ

اک بے وفا کے غم نے وفا کی تما
ٹوٹا کبھی نہ سلسلۂ اعتبار

لہو غریب کا پی کر امیر جیتے ہیں
یہ ظلم وہ ہے جو رک کے نہیں رکا اب تک
سمجھ رہے ہو شہنشاہِ روشنی جس کو
نہ جانے کتنے ستارے نگل چکا اب تک

اظہار وارثی اپنے شعری سفر میں
اور پر شور لمحوں کے درمیان جو سکوت کی م
کر لیتے ہیں یہ کیفیت ان کے تخلیقی عمل میں
غیر شعوری طور پر پیدا ہوئی ہے۔ پر شور ا
ماحول اور لمحات میں خاموشی و سکوت کی کیفیت
سرشت قدرت کی مظہر ہے، اظہار وارثی نے
وہیں سے حاصل کیا ہے، قدرت سے اپنے
وابستہ رکھنا ہمارے بشری وجود کا خاصہ
اظہار وارثی اپنے اشعار میں ہر لمحہ اسی لبند
فطرت کی لے کو گرفت میں لینے کی جد و جہد کر
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں، وہ اس مزاج
کی تلاش میں فکر کی گہرائیوں میں اتر جاتے
کی سچائیاں و حقیقتیں اس منزل پر ان کی آ
سامنے بالکل عریاں ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہر نفس اک آرزو لیکن بہ قید بے لب
اس کے آگے زندگی کی داستاں کچھ بھی نہ

دھڑکنیں بھی مٹ گئیں دل کی جلوا چھپا
اب ہمارے اور تمہارے درمیاں کچھ بھی نہ

اس نے اپنا لیا تو ٹھہرا میں
وہ سمندر ہے اور دریا میں
کوئی حسرت نہ جستجو نہ امید
بن دوالنون کا ایک صحرا میں
ہر نفس پر مرے اثر تیرا
تو مری رت ہے میں شجر تیرا

تا دیر ٹوٹتے رہے تارے فضاؤں میں
مفلس نے کوئی خواب جو دیکھا تو یہ ہوا

بے کسی کامیاب کیا جانے
تیرگی آفتاب کیا جانے

لرزاں ہے قتل گاہ لہو کی پکار سے
انصاف ہو رہا ہے کسی بے خطا کے ساتھ

اظہار وارثی کی غزل گوئی کا ایک بنیادی وصف یہی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے فطری جذبے اور مزاج کو بھی اپنے تخلیقی عمل میں پوری طرح سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس منزل سے نہایت کامیابی سے گذر جاتے ہیں وہ ہر انسانی جذبے کو اس کے پورے سچے، حقیقی اور فطری رنگ میں ہی اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ وہ دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح فطری مناظر سے نہ تو حیرت زدہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مضطرب۔ وہ انہیں علامت بھی نہیں بناتے بلکہ ہر بات واقعے اور سانحے کو ایک نقطہ تصور کر کے اس کے ارد گرد اپنے خیالات و فکر کے تانے بانے تیار کرتے ہیں اور اپنے تخلیقی سفر پر چل پڑتے ہیں۔

مجھ سے بچھڑ کے رہ گئی پہچان بھی مری
اک اجنبی کو اپنا بنایا تو یہ ہوا

اک ریت کی لکیر ہے اب ساحلوں کے بیچ
دریا خود اپنی پیاس میں ڈوبا تو یہ ہوا

تشنگی تشنہ خراب سہی
تشنگی کو شراب کیا جانے

اعتبارِ خلوص بھی نہ رہا
مہربانوں کی مہربانی سے

ہم اپنا دل جلا کر بھی نہ روشن کر سکے گھر کو
چراغوں کو بجھا دو روشنی دیکھی نہیں جاتی

مدت ترے فراق کی کم ہی سہی مگر
یہ مختصر سے دن بھی کٹے ہیں پہاڑ سے

باقی وفا کا نام رہے گا جفا کے ساتھ
اک رابطہ ہے چراغ کو ظالم ہوا کے ساتھ

جو پڑھ سکو تو پڑھو بے زبان چہروں کو
خطِ شکستہ میں لکھی ہوئی ہیں تحریریں

دمِ رخصت یہ تحمل یہ تبسم تیرا
اب نہ آئیں گے کبھی آنکھ میں آنسو جیسے

اظہار وارثی کی شاعری میں کسی بھی قسم کی ہیجانی کیفیت دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ ایک طرح کا ارتعاش پایا جاتا ہے۔ یہ ارتعاش بالکل اسی طرح کا ہے جیسے کسی بند برتن

میں پانی کھولایا جارہا ہو اور برتن کا ڈھکن پانی کے ابلنے سے پیدا ہونے والی بھاپ سے رہ رہ کر متحرک ہوا اٹھتا ہو۔ ان کی شاعری ایک پرکیف دھوپ اور ایک پرسکون چاندنی جیسی ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے مختلف خدوخال، ذہنی کیفیت، جذبے اور مسائل وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ یہ ایک سچی اور اچھی شاعری کی پہچان ہے وہ ہر لمحہ اپنے وجود اور ذات کو اس دنیا سے جوڑے رکھتے ہیں انہیں اس بات کا بھی خوف رہتا ہے کہ کہیں یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو ان کی شناخت ختم ہو جائے گی اور ذات کی شناخت و بقا کا مسئلہ اس عہد کی زندگی کا ایک بڑا المیہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پوری شاعری میں کسی بھی مقام پر جذباتی نہیں ہوتے بلکہ عقل و ہوش کے دامن کو اپنے ہاتھوں سے تھامے رہتے ہیں۔ ان کے لہجے میں توازن ہے اور وہ انہیں خطوط پر سوچتے ہیں جنھیں ان کا دل و دماغ قبول کرتا ہے۔ اسی لئے اظہار وارثی کی شاعری افراط و تفریط سے بچ گئی ہے اور بکھراؤ سے بھی۔ ہمارے چاروں طرف اور ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس سے وہ اپنی آنکھیں بند نہیں رکھتے بلکہ زندگی کی نیرنگیوں اور سماجی کج ادائیوں پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔

ان کے چولھوں کا حال جانے کون
جن کے چہرے دھواں دھواں ہیں بہت

زہر، آتش، صلیب، تلواریں
صبر والوں کے امتحاں ہیں بہت

سونپ کر خاموشیوں کو دل کی بیتابی کا حال
مصلحت رکھا ہے میں نے اپنے افسانہ

پھول روندے گئے ہیں قدموں سے
گیسوؤں کا گلاب کیا جانے

میں نے دیکھا پھر وہی پھولوں کا خواب
زخم دل جس خواب کی تعبیر ہے

اظہار وارثی کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ا[illegible] پائی جاتی ہے اور یہ اشاریت ان کی شاعری کو بھی خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت کو بڑھا دیتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کو چونکانے کے عمل سے مکمل طور پر دور رکھتے ہیں بلکہ اس میں اثر اور [illegible] کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جہاں ان کی شاعری ہمارے ذہن کو متاثر کرتی ہے وہیں دل کے نہاں خانے بھی اس سے منور اور معطر ہو جاتے ہیں۔

موجودہ عہد میں حالات نے زندگی کو جس موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور ہماری فکر جس نہج پر گامزن ہے اس کے پیکر بھی اظہار وارثی کی غزلوں میں دیکھتے ہیں۔ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی تصویریں بھی اپنے اشعار کے ذریعہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اظہار وارثی کی غزلوں کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اپنی کسی بات اور واقعے سے حیرت زدہ، بے چین اور مضطرب ہونے کے بجائے ان عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ سب کچھ

ہو رہا ہے۔ یہ ایک اچھے اور سچے شاعر کی شناخت
ہے۔

اس کا وعدہ قریب ہے لیکن
کیا کریں گر نہ اعتبار کریں

دستکیں دے رہی ہے صبح کی دھوپ
بند کمرے میں سو رہے ہیں لوگ

اس سے پہلے کہ ہوا تیز ہو بجھ جائیں چراغ
صبح کے بند دریچے پہ صدا دی جائے

ہے لبوں پر دوسروں کے یوں مرے لب کی ہنسی
پھول گلدانوں میں جیسے شاخ سے ٹوٹے ہوئے

بہتر ہے آؤ جنگ سے پہلے یہ سوچ لیں
ہم دشمنوں میں خون کا رشتہ نہ ہو کہیں

اپنا ٹوٹا ہوا آئینہ دل لے کے چلو
اس کی صورت تو ذرا اس کو دکھا دی جائے

اظہار وارثی کی غزلیں پڑھتے ہوئے ہمیں احساس کی مختلف سطحوں سے گذرنا پڑتا ہے اور احساس ہمیں کبھی خارجی دنیا سے جوڑتے ہیں تو کبھی انسان کی داخلی کیفیات سے قریب تر کر دیتے ہیں اسی طرح زبان و بیان پر بھی انہیں بڑی قدرت اور کمال حاصل ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اظہار وارثی غزلوں میں جو زیریں لہریں موجزن ہیں وہ انہیں میر تقی میر سے قریب کر دیتی ہے۔ میر کی ہی طرح ان کی شاعری میں نشتریت، تلخی، اور خاموشی ہے اندر ہی اندر ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل بھی ہے۔ یہ باتیں اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ میر سے بے حد متاثر ہیں۔ کسی بڑے اور اہم شاعر سے متاثر ہونا کوئی عیب نہیں ہے، ہر عہد میں اور ہر فنکار کسی نہ کسی عظیم فنکار سے ضرور متاثر ہوتا ہے اس لئے اگر اظہار وارثی میر تقی میر سے متاثر ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اردو کا کون بڑا شاعر ایسا ہے جو میر سے متاثر نہ ہو۔ مگر اظہار وارثی نے الفاظ کے انتخاب اور شعری رویے کو میر سے قریب نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر طور پر ان کے اپنے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کام انہوں نے شعوری طور پر کیا ہو اور یہی عمل ان کی انفرادیت بن جاتا ہے۔

میرے فن کا یہ سلسلہ ہے بس
تجھ کو سوچا تجھے لکھا ہے بس

زندگی میں تیری یادوں کو بھلا دوں کیسے
رات باقی ہے چراغوں کو بجھا دوں کیسے

یہ گیسوؤں کے اندھیرے یہ چشم بادہ فروش
بہک گئی ہے کوئی رات بادہ خانے کی

پھر وہی میں ہوں وہی یادیں وہی تنہائیاں
شام کو سب لوٹ آئے صبح کے بھولے ہوئے

ہم سمجھتے تھے کہ جیسے اپنی رگِ جاں کا لہو
ہاتھ آیا جو ترے، رنگ حنا کا نکلا

ظلم کرنا تھا اسے ظلم کیا تو اس نے
میرا دشمن مرے احباب سے اچھا نکلا

اظہار وارثی کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں ہر لمحہ ایک مخصوص قسم کی تازگی اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا تخلیقی سرچشمہ انتہائی خاموشی کے ساتھ مسلسل کشت غزل کو سیراب کر رہا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے جہاں زبان و بیان کی سطح پر غزل کو ندرت اور نیا پن عطا کیا ہے وہیں غزل کے فکری اور معنوی پس منظر کو بھی وسعت عطا کی ہے۔ اظہار وارثی کی غزل گوئی نہ تو جدت پسندی کے رویئے کا شکار ہے نہ ہی قدامت زدہ۔ ان کا لہجہ پرسوز ہے اور غم کی دھیمی دھیمی آنچ ان کے لہو کو آبدار بنا دیتی ہے۔ غم ذات میں غم دوراں کی تمازت بھی ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں زندگی کے عصری تقاضوں کو کسی بھی لمحہ نظر انداز نہیں کرتے اسی لئے ان کی غزلیں عصری معنویت سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ یہ تمام خوبیاں اظہار وارثی کی غزل گوئی کو اور بھی وقیع بنا دیتی ہیں۔ میں یہاں یقین اور اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے موجودہ شعری ادب میں اظہار وارثی کی غزلیں ہوا کے ایک تازہ اور پرکیف جھونکے کی طرح ہیں۔

ف۔س

● پرنٹر پبلشر ایس منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا۔

بقیہ:- مرقع دہلی

ہے۔ میری رائے میں اس متن کو جملہ مخطوطات کی بنا پر اس صحت کے ساتھ مرتب کرنا، اس کا قابل اعتماد ترجمہ کرنا، اس پر وقیع مقدمہ لکھنا اور تعلیقات میں عمارتوں اور غیر معروف اشخاص کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچانا ڈاکٹر خلیق انجم کا قابل قدر کارنامہ ہے۔

یہ کتاب فخر الدین علی احمد کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ اس کے ناشر خود خلیق انجم ہیں۔ تقسیم کار انجمن ترقی اردو ہند۔ ۲۵۲ صفحات، قیمت ۱۶۰ روپئے جو کتاب کے حسن ظاہر کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں۔

ف۔س

آزادی کے بعد الوت محل سے
اردو میں شائع ہونے والا
نئی نسل کے نمائندہ شاعر
منصور اعجاز
کا اولین شعری مجموعہ
چاندنی کا درد
قیمت صرف پچاس روپے
ہم سے طلب کریں
(۱) منصور اعجاز، راشد اسٹوڈیو۔ الوت محل ۸۴۵۰۰۱
(۲) مکتبہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

علامہ خضر یزدی مرحوم

غزل

بڑی کش مکش میں حیات ہے کبھی جی اُٹھے کبھی مر گئے
یہ مزاجِ عشق کی برہمی کہ حدوں سے اپنی گذر گئے

نہ خیالِ موجِ بلا رہا نہ ہے حادثات کا ڈر کوئی
یہ جنونِ شوق کی ہے لگن کہ ندی کے پار اُتر گئے

ہے ادا و ناز سے برہمی وہ جھٹکنا زلفِ دراز کا
یہ کمالِ حسن تو دیکھئے وہ بگڑ گئے اور سنور گئے

کوئی مدعا ہے نہ آسرا، گئے اس کے کوچہ میں لوٹ کر
پڑی در پہ اپنی جو اک نظر تو تمام جلوے بکھر گئے

وہیں چاندنی وہیں زندگی وہ جہاں سے گذرے کبھی خضر
جہاں ان کی اپنی نظر گئی در و بام تک بھی نکھر گئے

کرشن موہن
دہلی

اجنبی اشعار

مچھلیاں ڈھونڈتے موتی بھی میسر ہوں گے
گھوم دریاؤں میں بے باک مچھیرا بن جا

زخمی ناگن کی طرح مارتی ہے پھن دنیا
اس سے بچنے کے لئے ایک سپیرا بن جا

البیلی کامنی کہ نشیلی گھڑی ہے شام
سرمستیوں کی سیج پر ننگی پڑی ہے شام

مدت سے یاتری کو ترستی ہے مورتی
سنسان کوہسار کا مندر اداس ہے

ستم کہ اہلِ محبت بھی رہ گئے ناکام
سمجھ نہ پائے جمالِ ہزار پہلو کو

یہ کامنا ہے کہ جوگن کوئی مچلتی ہے
جو اپنے روپ سے چھلتی ہے من کے سادھو کو

اتارا عمر گریباں کے رستے جوگی نے
ہمارے سر سے کئی جوگنوں کے جادو کو

رؤف خیر، حیدرآباد

بین السطور

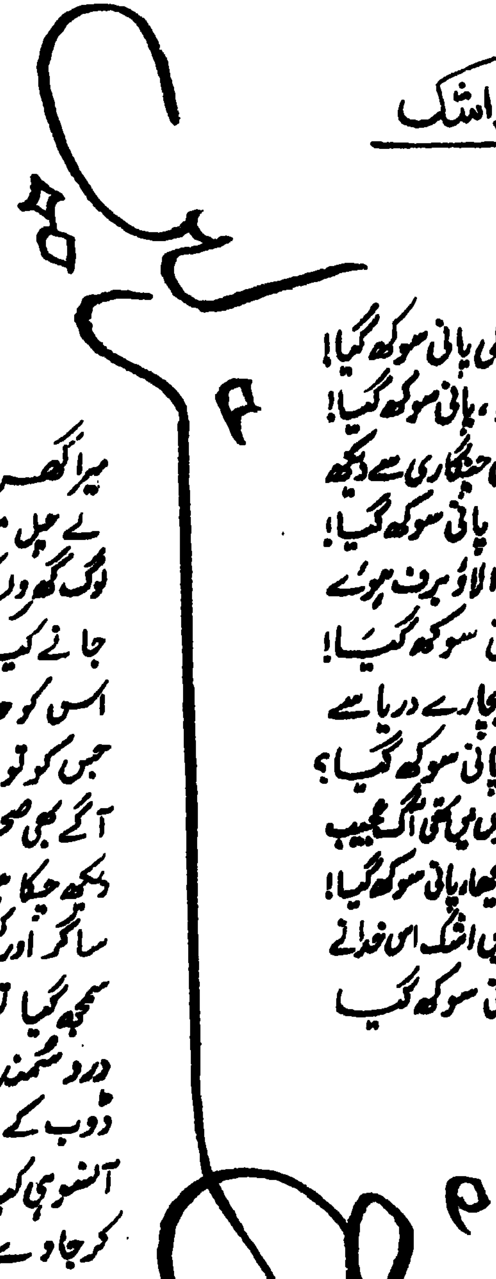
ابھی ہے زینۂ اول پہ آفتاب ہنر
میں چل رہا ہوں ادھورا اگر ہے میرا سفر
ہزار جال بچھے ہیں زمیں کے سینے پر

جگہ جگہ ہیں کمیں گاہیں آسماں میں بھی
عجیب طرح کی لذت ہے امتحاں میں بھی
بلا کا جوش بڑا حسن ہے اڑان میں بھی

میں اڑ رہا ہوں کہ پرواز نامکمل ہے
نیاز ادھورا ہے اور ناز نامکمل ہے
پہنچ نہ پائے تو آواز نامکمل ہے

شکستہ سطروں میں عبارت ضرور ہوتی ہے
جو بات ہوتی ہے بین السطور ہوتی ہے

پروین کمار اشک



دھوپ ذرا سی چمکی پانی سوکھ گیا!
شعلہ ندی میں اترا، پانی سوکھ گیا!
مچھلی! تیرے لہو کی چنگاری سے دیکھ
گاؤں کے ہر تالابوں کا پانی سوکھ گیا!
سردی کی رت آئی الاؤ برف ہوئے
موسم گرما آیا، پانی سوکھ گیا!
خیر! گھٹا تو خفا ہے بچارے دریا سے
برف! ترا بھی سارا پانی سوکھ گیا؟
میری پیاس کی آنکھوں میں تھی آگ عجیب
جھیل میں جھانک کے دیکھا پانی سوکھ گیا!
اب کے "عشق چناب" میں اشک اس خدا نے
اتنا زہر ملایا، پانی سوکھ گیا

میرا گھر ہے دریا پار!
لے چل میرا بیڑا پار!
لوگ گھروں کو چھوڑ گئے
جانے کیا رکھا تھا پار!
اس کو جا کر دیکھ کبھی
جس کو تو نے بھیجا پار!
آگے بھی صحرا ہی ہے
دیکھ چکا ہوں صحرا پار!
ساگر اور کشتی کا کھیل
سمجھ گیا تو بیڑا پار!
درد سمندر تجھے سلام
ڈوب کے پایا تیرا پار!
آنسو ہی کیا تیر ہے اشک
کر جاوے ہے سینا پار!

غزلیں

فرحت قادری، گیا

لاکھ چاروں اور ہنگامہ رہا
دل کی دنیا میں تو سناٹا رہا

میں کسی کی یاد میں کھویا رہا
اور دریچہ میرا منہ تکتا رہا

میری تنہائی پہ دروازہ مرا
رات بھر پٹ کھول کر ہنستا رہا

رہنما تھا میرا جلتا آشیاں
اک زمانہ روشنی پاتا رہا

میں ازل سے ہوں اجالوں کا نقیب
میرا ہی ہر دور میں چرچا رہا

سخت مشکل تھی گزرگاہِ انا
میں ہی تھا جو سب سے بیگانہ رہا

شعلہ انفاس! تیرا شکریہ
دشت میں بھی میں غزل گاتا رہا

سنتے سنتے سب ستارے سو گئے
کہنے والا داستاں کہتا رہا

کیا کریں کوئی بات ہم یارو
ہر طرف گھٹ رہے ہیں ہم یارو

مل ہی جائے گا، جو ہے قسمت میں
کیوں کریں بے بسی کا غم یارو

چشم بھی وا ہے، دل بھی ہے بیدار
درد کتنا ہے محترم یارو

سمٹ آئے ہیں وہ نگاہوں میں
اور کیا شے ہے جامِ جم یارو

کیا کریں نذرِ دستِ قاتل کو
جان دینے دو کم سے کم یارو

ساری دنیا سے کر دیا ہے الگ
کیسے بھولوں گا یہ کرم یارو

بے نیازی کی شان، کیا کہنے!
اب ستم بھی نہیں ستم یارو

لاکھ غم ہوں، مگر یہ فرحت ہے
اس کی آنکھیں نہ ہوں گی نم یارو

شروَن کمار ورما

امرتسر

دل پہ جو گزری سو گزری، بھول جاؤ، چپ رہو
اب گلے، شکووں سے کیا حاصل رہا؟ چپ رہو
زندگی مانگے کبھی گر تم سے "ہونے" کا ثبوت
آندھیوں کے سامنے شمعیں جلاؤ، چپ رہو
دل کے دروازے پہ دستک دے رہا ہے پھر کوئی
چند لمحوں کی رفاقت پر نہ جاؤ، چپ رہو
ایک خوبی ہی سہی سچ بولنا، سچ بول کر
اب زمانے بھر کو مت دشمن بناؤ، چپ رہو
لب پہ آجائے تو اپنا حسن کھو دیتی ہے بات
لفظ کی حرمت کو ایسے مت گنواؤ، چپ رہو
دل بہت دکھتا ہے، یہ ماضی کے قصے پھر سہی
درد میں ڈوبی ہوئی، غمگیں ہواؤ، چپ رہو
پوچھ لے گر کوئی ورما اس اداسی کا سبب
ٹال دو، دامن بچاؤ، مسکراؤ، چپ رہو

رات تو بیت گئی، رات کا ڈر باقی ہے
آگے منزل پہ یہ کھلا ہے کہ سفر باقی ہے
آپ کے آنے سے پہلے تو یہاں بستی تھی
دور تک اب کوئی دیوار نہ در باقی ہے
یہ مقدر ہے مرے دور کے انسانوں کا
بھیڑ میں رہ کے بھی تنہائی کا ڈر باقی ہے
باغباں، کیا یہی تعمیر چمن ٹھہرے گی
اب کوئی پھول نہ سایا نہ شجر باقی ہے
قافلے والو، چراغوں کو جلائے رکھنا
رات کے بعد جو آنی تھی سحر، باقی ہے
راہ بر ہے نہ ستارہ نہ کوئی نقش قدم
"کس سے پوچھیں کہ ابھی کتنا سفر باقی ہے"
میرے قاتل پہ، کبھی مجھ پہ یہ ہنستے ہے ورما
یہ جو شانوں پہ مرے آج بھی سر باقی ہے

بس

غزلیں

اختر شاہجہاں پوری

شاہجہاں پور

تو یقیں ہے تو گماں ہوں میں بھی
تیری عظمت کا نشاں ہوں میں بھی

ملتفت جب سے ہوا وہ مجھ پر
اپنی جانب نگراں ہوں میں بھی

یہ مہ و مہر ہیں تیرے پر تو
سنگ ریزوں سے عیاں ہوں میں بھی

تو نہیں ہے جو مرا زندانی
قید میں تیری کہاں ہوں میں بھی

ڈال جاتے ہیں جہاں سب نیکی
کیا کوئی ایسا کنواں ہوں میں بھی

تیر ہونے پہ نہ اترا اتنا
تجھ کو معلوم کماں ہوں میں بھی

موجۂ گل سے ہے وہ مانا اختر
ایک دریا سا رواں ہوں میں بھی

صابر فخرالدین

یادگیر

کوئی دیوار ہے نہ در باقی
نام کا ہی سہی ہے گھر باقی

جسم تو ہار پا چکا خود سے
روح کا ہے ابھی سفر باقی

کیا وہ پتھر کو بھی خدا کر دیں
جن کے ہاتھوں میں ہو ہنر باقی

جنگ ہوتی رہے گی دولتوں میں
رہے باہم جو خیر و شر باقی

کارزارِ حیات میں اب بھی
ہیں کئی ایک نامور باقی

جان دے کر چکا دو صابر جی
جسم و جاں کے ہوں قرض اگر باقی

غزلیں

جمال اویسی
دربھنگہ

دستک مجھے دے رہا ہے کوئی
دل تک مرے آچکا ہے کوئی
لمحات عجیب ہو رہے ہیں
جذبوں میں سما رہا ہے کوئی
میں خود میں عظیم ہو رہا ہوں
مجھ میں مجھے ڈھونڈتا ہے کوئی
تم راز کی بات کر رہے ہو
ہر گل میں سنور رہا ہے کوئی
جو جہت بدل رہا ہے ہر دم
وہ میں نہیں دوسرا ہے کوئی

نثار احمد نثار، سمستی پور

نہ سائبان نہ دیوار و در کے سائے میں
وجود اس کا ہے میری نظر کے سائے میں
جلاتی رہتی ہے نامہرباں دھوپ مجھے
یہ اور بات کہ میں ہوں شجر کے سائے میں
کہیں وہ دور خلاؤں میں چھپ گیا ہوگا
ہے عکس اس کا ابھی تک نظر کے سائے میں
نشاط و کیف کے نغمے سنائی دیتے ہیں
ٹھہر گیا جو کسی بھی کھنڈر کے سائے میں
نثار اشک کے قطرے ہی رنگ بھر دیں گے
بناؤ خاکہ کوئی چشم تر کے سائے میں

ایس. ایم. ابوبکر، نئی دہلی

دیکھ کر زخم مسکراتے ہیں
ہم بھی غم کہاں چھپاتے ہیں
خون سے کر کے نم زمیں اپنی
ہم خزاؤں میں گل کھلاتے ہیں
جب سے دیکھا ہے پُرکشش چہرہ
میرے آنکھوں میں خواب آتے ہیں
تیر نظروں کے پہلے چبھتے ہیں
دل میں تب زخم مسکراتے ہیں
سُن کے اشعار بکر کے یارو
رات بھر اشک وہ بہاتے ہیں

ہندی:۔ شیو مورتی

• پہلی قسط

ترشول

(ناولٹ)

اردو ترجمہ:۔
تمنا مظفر پوری

[ترشول کی کہانی کا پس منظر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کا انہدام اور اس کے بعد ملک گیر سطح پر ہندو مسلم فساد ہے۔ اس پورے وقوعے میں ہندوستان کی فسطائی طاقتوں کے ساتھ اقتدار کے ڈھکے چھپے تعاون سے جو ہولناک صورت حال سامنے آئی ہے اور ہندوستان کے سیکولر ذہنوں کو جو ناقابل تلافی ضرب پہنچی ہے اس کی پوری داستان شیو مورتی کے ناولٹ "ترشول" میں موجود ہے۔

اس منصف مزاج سیکولر اور قوم پرست فنکار کی یہ تخلیق جب اوّل اوّل ہندی ماہنامہ ہنس (دہلی) کے اکتوبر ۱۹۹۲ء کے شماروں میں شائع ہوئی تو فرقہ پرستوں نے بڑا ہنگامہ کھڑا کیا اور مصنف کی ہر طرح تذلیل کی۔ لیکن اس آزاد قلم فنکار نے اخلاقی اور انسانی قدروں کی خاطر رجعت پرستوں کے واویلے کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ ہر دور کا ادب اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدروں کی ایک دلکش دستاویز ہوتا ہے۔ ترشول جیسی تاریخی دستاویز اگر ایک طرف ہندوستان میں سر اٹھاتی ہوئی فسطائی قوتوں کی کارستانیوں کو بے نقاب کرتی ہے تو دوسری طرف اس سرزمین میں پیدا ہونے والے بے ریا، جری اور صاف ذہن فنکاروں کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ شری شیو مورتی نے بالاستفادہ اس کے اردو ترجمے کی اشاعت کی اجازت دی ہے۔ ہم ان کو ہدیہ تشکر پیش کرتے ہوئے اس گراں پایہ تخلیق کے لئے انہیں خراج تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہم شکر گذار ہیں جناب تمنا مظفر پوری کے بھی جنہوں نے اس ہندی ناولٹ کا اردو ترجمہ کرکے ایک اچھا کام کیا ہے۔

مسعود منظر]

محمود کی یاد میں۔ جو آج نہ جانے کہاں ہوگا

● کہاں سے شروع کروں محمود کی کہانی ؟
وہاں سے جب پولس اسے گھر سے گھسیٹ
لے جا رہی تھی ....
— چوراہے پر لاٹھی سے پیٹ رہی تھی اور محلے
کوئی آدمی اسے بچانے کے لئے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔
— یا ..... اس چوراہے سے جب لوگ اس
چھاتی سے ترشول سٹا کر مجبور کر رہے تھے "بول
سالے : جئے شری رام ....؟"
— وہاں سے کیوں نہیں ؟ جب بڑی مسجد کے
حلقے میں بھیڑ اسے گھیرے کھڑی تھی اور یہ طے نہیں
پا رہی تھی کہ آگے کیا کرنا چاہئے ؟
— جاڑے کی کہرے سے اندھی آدھی رات —
چھت کی پتیوں سے ٹپ ٹپ ٹپکتا پانی۔ تھانے کے
اندر سے رہ رہ کر آتی چیخ ۔
— اور سنسان سڑک پر ٹھنڈک میں ٹھٹھرتے
مجبور کھڑے لوگ ۔
— شبنم اور کہرے سے تر ہوتے ہم ....
لیکن کیا یہ صرف محمود کی کہانی ہے ؟
تب شروع سے ہی کیوں نہیں ؟

O

سورج مشرق سے چمکتا ہوا طلوع ہو
رہا ہے ۔
محمود لان میں دہلیا کے پودے لگا رہا
ہے ۔ میں ان پودوں میں پانی دے رہا ہوں کہ یکایک
گیٹ کھول کر شاستری جی داخل ہوتے ہیں۔ ان کے
ہاتھوں میں آج کا تازہ اخبار ہے ۔
" پال صاحب ! کچھ سنا آپ نے۔ وزیر اعلیٰ
نے تو اجودھیا پری کرما (طواف) پر روک لگا دی ہے۔
ذرا یہ دیکھئے ۔
شاستری جی اخبار کا پہلا صفحہ دکھلاتے ہیں۔
محمود دوڑ کر اندر سے دو کرسیاں نکال لاتا
ہے ۔
" لگے روک ۔ جب روک نہیں تھا اس وقت
کبھی میں کہاں پری کرما کرنے دوڑا جاتا تھا ۔
" بیٹھئے " میں کہتا ہوں
وہ غیر مطمئن سے بیٹھ جاتے ہیں ۔
• سوال کسی ایک کے جانے یا نہ جانے کا نہیں
ہے جناب ۔ سوال ہزاروں سال کی روایت کو بلا
وجہ توڑے جانے کا ہے ۔ لاکھوں عقیدتمندوں کے
ایمان کو ٹھیس پہنچانے کا ہے کتنے ایسے لوگ ہیں
جو بیسوں سال سے یہ پری کرما کرتے آرہے ہیں اور
تاحیات کرنے کی نیت کئے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے
اقتدار کے نشے میں اندھے ہو کر ان کے عقیدے کو
چوٹ پہنچائیں گے "
دیکھ رہا ہوں، رام جنم بھومی۔ بابری مسجد
کا مسئلہ جیسے جیسے گرماتا جا رہا ہے، شاستری جی
بے چین ہوتے جا رہے ہیں۔ میں بے اعتنائی کا جملہ بول

گیا تھا پھر بات کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں کسی کے مذہبی جذبات سے کھیل کرنا اچھی بات نہیں۔"

شاستری جی اخبار میں ڈوب گئے۔

شاستری جی میرے سب سے قریبی پڑوسی ہیں۔ بائیں جانب ٹھیک بغل میں مکان ہے ان کا۔ تجارت پیشہ ہیں۔ سکولوں، کلبوں اور بہت سے دوسرے تعلیمی و سماجی ادارے کی کمیٹی میں کسی نہ کسی عہدے پہ فائز ہیں۔ سب کے دکھ درد میں شامل ہونے میں آگے آگے رہتے ہیں۔

پانچ ماہ قبل جب میں ٹرانسفر ہو کر اس شہر میں آیا تو مجھے سرکاری کوارٹر نہیں ملا۔ اور مجھے اس محلے میں آنا پڑا۔ اس وقت میں نے کچھ دقتیں محسوس کی تھیں کیونکہ سرکاری کوارٹر کی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے۔ وہاں کا ایک الگ ماحول ہوتا ہے۔ وہاں سبھی سال دو سال پہلے آئے ہوتے ہیں اور سال دو سال میں جانے کے لئے ذہن کو تیار رکھتے ہیں۔ فطری طور پر بنجارے کی طرح پڑوسی سے نہ زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور نہ بگاڑ کا موقع ملتا ہے۔ جتنا چاہئے جس سے تعلقات بنائے رکھئے اور اور جتنا چاہے الگ تھلگ رہئے۔ جبکہ عام رہائشی محلے کا اپنا روائتی ماحول ہوتا ہے سوچ سمجھ کا اپنا مقامی و قدیمی انداز و رواج۔

اس محلے میں رہنے کے بعد پتہ چل رہا ہے کہ حقیقت میں پڑوسی سے ملنے والی مسرت اور اپناپن

کسے کہتے ہیں۔

سامان سے لدے دونوں ٹرک سامنے آکر رکے تو پڑوسی گھروں سے مہا ماسٹرائن وغیرہ لپنے اپنے برآمدے میں بچے ٹرکوں کے ارد گرد گھومتے ہوئے لدے سامانوں کا معائنہ کرنے لگے۔ انہوں نے پہلے محلے والوں کو خبر دی کہ ایک ٹرک گائے اور اس کا چھوٹا بچھڑا ہے۔

"اتنی بڑی گائے۔ مگر ہے بڑی نیک گائے دیکھ کر ہی فیصلہ سنا دیا پڑوسی نے۔ "کوئی بھلا آدمی آیا ہے۔ خود بھی د گائے جیسا سیدھا سادہ ہے۔"

اسی وقت پہلی بار آئے تھے شاستری اپنے آٹھ سالہ پوتے کے ساتھ۔ بچے کے ہاتھ تھالی بھی تھی۔ پہلے شاستری جی نے خود سے روٹی گائے اور بچھڑے کو کھلائی پھر اپنے پوتے سے کھلوائی اور برآمدے میں میرے قریب آکر اپنا تعارف کرایا۔

مجھے شاستری کہتے ہیں۔ آپ کا بہت آبھاری ہوں۔ گائے پالنے کا بہت بہت شکریہ۔

"ارے اس میں کیا خاص بات ہے؟"

ہاتھ جوڑ دیا۔

"کیوں نہیں صاحب! گائے پال کر آپ ہندو کا دھرم نبھاہ رہے ہیں۔ گئو برہمن کی (خدمت) ہے۔ آپ کو دیکھ کر ہی لگتا ہے آپ آستھاوان و کیتی (عقیدہ مند آدمی) ہیں۔ اور

...ت عقیدہ ہے۔"

وہ مجھے لے کر گائے کے پاس چلے آئے اور
...نظر سے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر پوچھا۔
"دودھ کتنا دیتی ہے؟"
"یہی پندرہ سولہ لیٹر۔"
"ارے واہ! تب تو پوری کام دھینو ہے
...ے کا دودھ امرت ہے۔"
"آئیے بیٹھئے۔"
"اجی ابھی جانے دیں۔ کئی ضروری کام ہیں۔
...س کا حق ادا کرنے کے لئے آدھی رات
...ر جائیں گے۔ جب جس لائق آپ سمجھئے۔"
...بتائیے اس محلے میں نہ آیا ہوتا تو شاستری
...ایسا آدمی کہاں ملتا! بعد میں انہیں شاستری
...پر میں نے علی الصباح ٹہلنا شروع کیا۔
...شاستری جی کی پہلی صدا صبح پانچ بجے آتی۔
...کبھی پکڑ میں آگیا تو تمام راستے ٹہلنے کے
...تے ہیں اور مرے عقیدے کے منہدم ہوتی
...پشتہ دیتے رہتے ہیں۔

محمود دو کپ چائے رکھ جاتا ہے۔
...شاستری جی اخبار سے دھیان ہٹاتے
...چپ چاپ چائے پینے لگتے ہیں۔ شاستری
...کی چائے پیتے رہیں۔ خیر یہ بھی جانتی ہیں۔
...جس دن صبح سویرے شاستری جی کی آواز
...جواب نہیں ملتا اُس دن واپسی میں
...قات محمود سے ہوتی ہے۔ پہلے وہ اسے

آواز دے کر جھبوا کے متعلق پوچھتے ہیں۔ وہ اگر کھلا ہوتا ہے تو وہ اسے باندھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں، جھبوا کی شاستری جی سے بالکل نہیں پٹتی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑے ہوتے ہیں تبھی وہ سونگھ لیتا ہے اور بھونکنے لگتا ہے۔ کھلا رہا تب تو لگتا ہے ان پر چڑھ ہی جائے گا۔ اس کے بندھ جانے کے بعد ہی وہ اندر آتے ہیں۔

محمود گائے کو چارہ پانی دے رہا ہوتا ہے تو اس کے پاس چلے جاتے ہیں۔ "کیا حال ہے جی گئو ماتا کا؟" چھوٹے بچھڑے کو بھی شاستری جی خاص آدمی لگتے ہیں۔ ناٹے موٹے جسامت کے سانولے رنگ والے لمبے بال۔ اس پر سفید کرتا۔ دھوتی اور ہاتھ میں چھڑی سیاہ و سفید کا سنگم۔ وہ ہودی (ناد) میں منہ ڈالنا بھول جاتا ہے۔ بچوں کی طرح اچھل کود کرتے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر دیکھتا ہے۔ پاس آنے پر پیر سے کمر تک بالترتیب سونگھتا ہے۔ اس کی ماں شروع شروع میں ضرور بھڑکتی تھی لیکن اب نظر انداز کر جاتی ہے۔ کھڑی کھڑی پاگر کرتی رہتی ہے۔ نظر تک نہیں اٹھاتی۔

محمود کو وہ چیلا کہتے ہیں۔

"چیلا۔ تمہارے صاحب جگے یا نہیں؟"

محمود سن کر خوش ہوتا ہے۔ ہنستا ہے۔ سلام کرتا ہے۔

بہت پیار جاگا تو چیلوا۔ "چیلوا! مالکن سے پوچھ چائے ملے گی؟"

چیلوا کرسی صاف کرکے احترام سے انہیں...

بٹھاتا ہے۔ وہ اس سے لان میں لگے ہوئے پھول اور
پودوں کے متعلق تحقیقات کرتے ہیں۔ خالی کپ
اسٹول پر رکھتے ہوئے پوچھتے ہیں۔
"کیا لگا رہے ہو چیلا!"
"دہلیا ہے گروجی۔ کل شام کو لایا تھا۔"
"اچھا اچھا وہ بڑے بڑے لال پھولوں
والا۔ سورج مکھی جیسا نا!
محمود اثبات میں سر ہلاتا ہے۔
"میرے لئے نہیں لائے بچہ!"
"کل لا دوں گا۔"
سنو۔ تین گملے منگوائے ہیں میں نے بھی۔
اس میں مٹی بنا کر بھرنا ہے۔ کیسے بناتے ہو؟ ایک
حصہ بالو اور ایک حصہ گوبر کی کھاد ..."
محمود شاستری جی کا پکا چیلا بن چکا ہے
وہ کہتا ہے "میں بنا کر بھر دوں گا۔"
"نہ ہو تو اس میں بھی دہلیا ہی لگا دو لا کر۔"
"لگا دوں گا۔"
"لیکن گوبر کی کھاد بالکل نیچے سے نکالنا
بیٹا۔ خوب اچھی طرح سڑی ہوئی۔ اور وہ جو گیندے
کے پودے لگائے تھے برسات میں۔ ان میں بھی
کھاد ڈال دینا۔ بہت کمزور ہیں۔"
"ڈال دوں گا۔"
شاستری جی واپس جا رہے ہیں لیکن واپسی
پر ان کے چہرے پر روز جیسی بشاشت نہیں ہے۔
میں نے شاستری جی کا مونچھوں کے اندر ہمیشہ ہلکا
ہلکا تبسم چھپا ہوا دیکھا ہے۔ [illegible]

نہیں پایا۔ شاستری جی کی مونچھ مرزا پور
کی مونچھ کی یاد دلاتی ہے۔ اس لئے تعلق
مجھے اور بھی مشفق اور اپنے لگتے ہیں۔ میں کہتا
"میری کرما (طواف) کے بارے میں کچھ
بات ہے اگر آپ کو کوئی تکلیف ...."
وہ رک جاتے ہیں۔ بیٹھ جاتے ہیں۔ "
پوچھنا چاہتا ہوں۔ جاننا ضروری ہے۔ آپ
ہیں یا ناستک (آپ بھگوان کو ماننے والے
ہیں)
یہ کیا پوچھ لیا شاستری جی نے! ایسا
سیدھا آر پار کر دینے والا سوال۔ میں شاستری
آہستہ آہستہ سمجھنے لگا ہوں۔ اس لئے
ہوں۔ ہاتھ جوڑ لیتا ہوں۔ "شاستری
مجھے بہت عزیز ہیں۔ کہتے ہیں بحث دوری
ہے۔ بدظنی ہوتی ہے۔ میں کسی بحث و مباحثہ
عقیدے اور نظریئے کے چکر میں پڑ کر آپ
نہیں چاہتا۔ اس لئے اس طرح کے سوال
الجھنا نہیں چاہتا۔"
وہ ہنستے ہیں۔ "دلیل کوئی بری چیز
کو تحقیق ہی سے نکلتا ہے۔ تعلقات مضبوط
اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو
جان لیا جائے۔ آستک یا ناستک
"آستک۔ اگر اس لفظ کو صرف
اصطلاحی معنی میں ہی مخصوص نہ کر دیا۔"
"کچھ خلاصہ کیجئے۔"
" [illegible]

استھل گیا

ی طاقت ہے لیکن یہ نہیں مانتا کہ یہ طاقت اجودھیا

رام چندر جی مہاراج ہیں یا تھے۔"

"کیوں ؟"

کیونکہ ایسا ماننا ایشور کی قوت اور قدرت

کر کے دیکھنا ہے۔"

" کیسے ؟"

" جانے دیجئے۔ بات بڑھ جائے گی۔"

" بڑھنے دیجئے مگر کہئے۔"

" مختصر یہ کہ مرے تصور کا ایشور صرف ہندوؤں

یشور نہیں ہے۔ وہ سبھی مذہب والوں کا ہے۔ مختلف

ہب کے پیدا ہونے سے قبل سے تھا اور ان کے نہ رہنے

بی رہے گا یعنی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

ملف برانڈ کے مذہب کے ایشور خالق نہیں۔ انہیں

نے اپنی ضرورت اور غرض کے مطابق تخلیق کیا

۔ اس لئے اسکیموں کا ایشور خط استوا والوں

ایشور سے مختلف ہے۔ کالے کا ایشور گورے

مختلف ہے۔ اگر گائے بیل کا ایشور ہوگا تو

شیر اور باگھ کے ایشور سے مختلف ہوگا۔ آبی

نوروں کا پرندوں سے مختلف ہوگا۔ ویسے ہمارا

اج اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی ہوشیار رہا

ہے۔ جہاں دنیا کے دوسرے خطے کے لوگوں نے اپنے

اج کو کنٹرول کرنے کے لئے اس کی بہتری کے لئے

ک ایشور بنا لیا وہیں ہم نے اپنا ایشور تخلیق

ہے اپنے ہی بھائیوں کا استحصال کرنے کے

لئے۔ حرام کی کمائی کھانے کے لئے۔ ہمارا ایشور جتنا

ـ دھان ہے عملاً اتنا ہی سیاہ۔ ورنہ جس سماج

کا بھگوان مساواتی نظریے کا ہے اسی سماج میں

ذات پات اور چھوا چھوت کی شکل میں اتنا فرق

نہیں ہوتا جس سماج میں ایشور کو پتیتا (گری

ہوئی عورتوں) کا نجات دہندہ کہا گیا ہے اس کے مندر

میں دیوداسیوں کی شکل میں پتیتا بنانے کے کارخانے

نہ ہوتے اتنا ہی نہیں۔ ہم نے اپنے بھگوان کو بھی

استحصال کرنے سے نہیں بخشا۔ اسے کورٹ کچہری

تک گھسیٹا ہے۔ مختلف عدالتوں میں شری رام

چندر سنگھ ولد دسرتھ سنگھ بنام اسٹیٹ یا

شری ہنومان ولد نامعلوم بنام نگر نگم مہا پالیکا مقدمے

چلتے ہیں۔ وہ انکروچمنٹ کے جرم میں وانٹیڈ ہوتے

ہیں۔"

شاستری جی آنکھیں موندے سر ہلاتے سن

رہے ہیں۔ میں ان کا ردعمل جاننے کے لئے رکتا ہوں۔

وہ آنکھیں کھول کر بولتے ہیں

" بولتے رہیے۔ بولتے رہیے۔"

" ہم نے ایک فرقہ کے بھگوان کو کس طرح دوسرے

فرقہ کے خلاف کھڑا کر دیا ہے اسے سمجھنے کے لئے ایک

مثال پیش ہے ــــ"

اس درمیان میں شریمتی جی دو کپ چائے

پھر بھجوا دیتی ہیں۔ ہم لوگ اپنی کرسیاں دھوپ

سے سائے میں کھینچ لیتے ہیں۔ محمود گائے دوہنے لگا

ہے۔

" کچھ دنوں پہلے اخبار میں کچھ اس طرح کی خبر

پڑھنے کو ملی تھی کہ دو بھائی ہیں ان کے ماں باپ بھیا

بال بچے ہیں۔ خاندان بڑا ہو جانے پر ایک ساتھ کھانا

پینا نہیں چل سکا۔ آپس میں نہیں نبھ سکا۔ دونوں
بھائی الگ ہو گئے۔ لیکن اس بٹوارے کے دوران میں
گانو کے ناردوں (لگائی بجھائی کرنے والے) کی وجہ سے
دونوں میں ایک دوسرے کے دلوں میں میل آ گیا۔
دولت کے ساتھ ساتھ ماں باپ کا بھی بٹوارہ
ہو گیا۔ ایک کے حصے میں پچھتر سال کا باپ آیا اور دوسرے
کے حصے میں پینسٹھ ماں۔ پھر انہیں بہی خواہوں کی کوشش
سے آپس میں کھینچا تانی اتنی بڑھ گئی کہ ماں کے حصے
والے بھائی نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ اس
کا چھوٹا بھائی جس کے حصے میں باپ ہے حقیقت اس
کے باپ کی اولاد نہیں بلکہ ناجائز اولاد ہے۔ جب ماں
کے پیٹ میں وہ آیا اس وقت اس کا باپ روزی روٹی
کے چکر میں پردیس گیا ہوا تھا۔ گانو کے بہی خواہ گواہی
دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس نے ماں کو ڈولی کھٹولی
میں لٹایا اور شہر لے جا کر حلف نامے پر انگوٹھے کا
نشان لگوا دیا۔ ساتھ میں یہ گذارش ہے کہ ایسی ساری
جائداد کا وارث تنہا وہ ثابت ہوتا ہے اسے دلوائی جائے"

" ارے غضب ۔! شاستری کی آنکھیں پھیل
گئیں۔ " ایسا ؟"

" جی ہاں "

" پھر "

پھر کیا۔ بہی خواہوں نے چھوٹے بھائی کی
بھی مدد کی۔ اس کے حق میں گواہ تیار ہو گئے۔ اس نے
بھی اپنے باپ سے حلف نامہ دلوا دیا کہ لڑکا اپنے باپ
کا اپنا بیٹا نہیں ہے وہ اپنی ماں کے ساتھ گوہن لگوا
کر آیا تھا۔ شادی کے پہلے ماں کے پیار کی نشانی ہے
اس لئے خاندانی جائداد کا واحد وارث وہ خود بن
بیٹھا ہے ـــــ

اب دونوں بھائی اپنے اپنے حصے کے ماں
باپ کو لاد کر آئے دن تاریخ پر شہر لے جاتے ہیں اور
ایک دوسرے کے خلاف گواہی دلواتے ہیں۔

میرے خیال میں رام جنم بھومی۔ بابری مسجد
تنازعہ میں دونوں فریقوں کے بھگوان اسی طرح
دونوں فریقوں کے استعمال کے کٹہرے بنے ہوئے
ہیں۔"

" ہا ہا ہا ...! شاستری جی ٹھہاکا لگا کر ہنسنے
لگے ہیں۔ وہ چائے پیتے ہوئے سرک گئے ہیں برآمدے
میں بیٹھا جھبوا بھونکنے لگا ہے۔ بھوں۔ بھوں۔
کیا معاملہ ہے ؟"

وہ گلا کھکھارتے ہوئے کہتے ہیں " آپ تو
بالکل دقیانوسیوں جیسی بات کرتے ہیں۔ خیر آپ کا
بھگوان کے بارے میں کیا تصور ہے ؟"

شاستری جی کی ہنسی سے میں تھوڑا لاجواب
سا ہو جاتا ہوں۔ پھر بھی بات جاری رکھتا ہوں۔
پھر بھی بات جاری رکھتا ہوں

" جیسے ہمارے سنتوں نے مانا ہے۔ الوانیم۔
ذرے ذرے میں وہ ہے۔ سائنس کی زبان میں
ڈی این اے میں سمائے خوبیوں کی شکل میں جس
میں چھوٹے سے چھوٹے ذرے میں سمایا رہتا ہے۔
انسان کی پوری نسل کا وجود گن اور دھرم۔ اس لئے
ہستو جیاتی دنیا میں مساوانی ہیں ؟"

شاستری جی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ

ہے ۔ وہ رخصت لیتے ہوئے کہتے ہیں ۔" سچ مچ
ے ہیں آپ ۔ کتنا صاف ہے آپ کا دل ۔ آپ
کورا کاغذ ہے ہم اس پر اپنے عقیدے کی
ت لکھیں گے ۔"

میں ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا
بھی محمود تازہ تازہ ببول کی داتنون لا کر انہیں
ہے اور مسکراتا ہے ۔

" واہ چیلوا واہ ۔" داتنون پا کر خوش ہو جاتے
استری جی ۔" بہت ہی گنی بہت ہی پیارا لڑکا
۔ جب سے آیا ہے مجھے ببول کی کانٹوں سے
را مل گیا ہے ۔ کہاں پایا آپ نے یہ رتن ؟"
پھر گیٹ تک پہنچ کر رکتے ہیں ۔" ارے چیلوا !
یسا ایک لڑکا میرے لئے بھی کھوج کر لا دے ۔"

لا دوں گا گرو جی ۔"

کون ذات کا ہے رے تو ۔"

سنئی " وہ ہنس کر کہتا ہے اور جھٹ سے کپ
ندر چلا جاتا ہے ۔ ایسے بیرا آدمی کا ایسا
سوال ، میں ڈوبنے لگتا ہوں ۔

مصرا جی آئے ہیں ۔" محمود اندر آ کر بتاتا ہے
یتی جی کی طرف دیکھ کر ہنستا ہے ۔ شریمتی
طرف دیکھ کر مسکراتی ہیں ۔

میں پوچھتا ہوں " کیا بات ہے ؟ یہ معنی خیز
یوں ؟"

وہی بات " شریمتی جی راز کھولتی ہیں ۔" مصرا
ے اسی لئے تو انہیں دیکھتے ہی یہ اندر بھاگ

آیا ہے ۔"

محمود کہتا ہے ۔" میں چائے وائے لے کر ابھی
جاؤں گا ان کے پاس ۔"

میں ابھی ابھی دفتر سے لوٹا ہوں ۔ تھوڑا آرام
کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن باہر نکلنا پڑا ۔ خیر خیریت کے بعد
وہ پوچھتے ہیں ۔" چیلوا کہاں ہے ؟ شاستری جی
کی دیکھا دیکھی دوسرے پڑوسی بھی محمود کو چیلوا کہنے لگے
ہیں ۔ محمود کا نام صرف شریمتی جی اور بچوں تک
ہی محدود رہ گیا ہے ۔

" یہیں کہیں ہوگا ۔ کیا بات ہے ؟"

" کچھ کام ہے ۔"

بیٹھئے ۔ چائے پیجئے تب تک آ جائے گا ۔ اور
سنائیے آج کل کس کالنو کو چر رہے ہیں ۔"

مصرا جی بیٹھتے ہی باسی اخبار اٹھا لیتے ہیں اور
اس پر نظر جمائے ہوئے بولتے ہیں ۔" ہم لوگ اب
کیا چریں گے بھائی صاحب ۔ چرنے کھانے کا پاور تو
اوپر والے سمیٹ کر اپنے ہاتھ میں لیتے جا رہے ہیں ۔"

بیالیس پینتالیس کے دوہرے بدن والے
مصرا جی بہت ہی خوش مزاج اور ملنسار ہیں ۔ محکمہ چکبندی
میں ترقی کر کے جونیئر افسر ہو گئے ہیں ۔ سڑک اس پار
سے کر سامنے والے مکان میں کرایہ دار ہیں ۔ ہنسی مذاق
میں ان کا کوئی ثانی نہیں ۔ اپنے محکمے پر اور خود اپنے
پر بھی ہنسنے سے پرہیز نہیں کرتے ۔ زردہ پان سے نیم
سیاہ دانت اور گھنی کھچڑی مونچھیں ۔ مٹن جیسی گول
گول اندر کی طرف دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی کجری آنکھیں
جو ہنستے ہوئے بالکل بند ہو جاتی ہیں ۔ اور جب کبھی

دانت کھل جاتے ہیں۔

کلب میں مہینے والی شام کی بیٹھک میں سرگرمیں آجانے پر سابق زمینداروں اور بڑے کسانوں کے کمینے پن اور جعلسازی کے ایسے ایسے قصے، اپنے محکمے کے کئی افسروں کے اوچھے پن کا ایسا ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ سننے والا ٹھوکھو کرنے لگے۔ خود لینا دینا حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنے بڑے افسر کے چپراسی کا حوصلہ یہ مثال دیتے ہوئے بڑھاتے ہیں کہ بھگوان رام کے دربار کی دربانی کے دوران ہنومان جی خود کہتے تھے۔ بابا نے ہنومان چالیسہ میں خود اس کا ذکر کیا ہے۔

"ہوت نہ آگیا بن پیسہ رے"

بغیر پیسے کے اجازت نہیں۔ اور یہ قول ان کے چپراسی نے آنے والوں کو سمجھانے کے مقصد سے ایک کاغذ پر لکھ کر اپنے بیٹھنے کی اسٹول کے پاس اوپر دیوار میں چپکا دیا تھا۔ اتفاق سے اس کاغذ کے تھوڑا اوپر حاکم کا نیم پلیٹ بھی تھا۔ اور غلطی سے حاکم نے اسے اپنے لئے چپکائی گئی سمجھ لیا تھا۔ اسی وجہ سے اس سال مصراجی کو خلاف معمول ترقی مل گئی تھی۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔

میں کلب بہت کم جاتا ہوں۔ لیکن جس دن یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آج مصراجی اور داروغہ جی دونوں پہنچ رہے ہیں تو موقع نکال کر پہنچ جاتا ہوں۔ ان دونوں کی موجودگی میں لوگوں کو کسی دوسری تفریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

داروغہ جی دس بارہ سال قبل ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ جسم کی نقاہت تو ان کی خضاب لگی مونچھ سے چھپی ہے گلے کی بلندی برقرار ہے اور گالیاں تو ایک بھی نہیں بھولے ہیں۔ مصراجی کے ہلکے طنز کا مقابلہ وہ اپنی اسی کھنکتی آواز کے ساتھ اپنے زمانے کے شاطر چوروں، اچکوں اور طوائفوں کے آخری انجام کی کہانیوں سے کرتے ہیں۔

بہت دنوں سے وہ مصراجی کے محکمے پر مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دیتے آرہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں —

"جس علاقے میں چکبندی شروع ہو جاتی ہے وہاں چوری ڈکیتی بند ہو جاتی ہے"

"لیکن چوری ڈکیتی کا چکبندی سے کیا تعلق؟"

"تعلق ہے" داروغہ جی مونچھوں کے اندر مسکراتے ہیں۔ "دراصل جن گاؤں میں چکبندی شروع ہو جاتی ہے۔ انہیں چکبندی والے چر کر ایسا ٹھونٹھ کر دیتے ہیں کہ چور ڈاکوؤں کو مجبوراً دس پندرہ سال کے لئے اس علاقے کو چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اور چوری ڈکیتی کے بند ہونے کا سیدھا اثر پولس وبھاگ کی چستی اور مستعدی پر پڑتا ہے۔ واردات کے نہ ہونے سے وہ سست اور کاہل ہو جاتے ہیں"

مصراجی ان سے متفق نہیں ہوتے۔ ان کے مطابق یہ چکبندی والے ہی ہیں جن کی بھلائی ہوئی ہے۔ جھگڑے کی فصل یعنی فوجداری کو پولس والے کاٹتے ہیں اس کے لئے داروغہ جی کو چاہئے کہ مصرا کے لئے ایک شاندار عورت کا اہتمام کریں۔"

منجھلی لڑکی چائے کا ٹرے لے کر آتی ہے۔"

"نمستے انکل"

" نمستے بیٹا ! ارے چیلوا کہاں گیا آج ؟ تمہیں
ائی چھوڑ کر چائے لانی پڑی ۔"

" وہ کام کر رہا ہے انکل ۔"

" ذرا اسے باہر تو بھیجو بیٹا ۔"

" اچھا انکل ۔" واپس جاتے ہوئے لڑکی
راتی ہے ۔ اسے بھی پتہ ہے کہ محمود کا باہر آنا
ائن کے حق میں ٹھیک نہیں ہے ۔

مصرائن محلے کی عورتوں کی نیتا ہیں ۔ قد و قامت
ہی نہیں مزاج سے بھی مردانہ سمجھئے ۔ مصراجی پر
رہتی ہیں ۔ دو ڈھائی گھنٹے تک پوجا پاٹھ کرتی
ور ہفتے میں دو تین دن برت (فاقہ) ۔ کوئی اولاد
ہونے کی وجہ سے سارا پیار سارا دلار مصراجی پر ہی
تی ہیں ۔ اس عمر میں بھی ہفتے میں دو دن اپٹن
تی ہیں ۔ بس ایک ہی عادت رہی ہے جسے انہیں
جی سے چھپانا پڑتی ہے ۔ عادت تو عادت ہے
ے نہیں چھٹتی ۔

مصراجی کو شاید پتہ چل گیا ہے کہ ان کی
جودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مصرائن نے ایک
چوری چوری دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اسے
ت کرنے کے لئے چیلوا کی گواہی ضروری ہے ۔
اور چیلوا ہے کہ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں
رہا ہے ۔

کیا کرے چیلوا ، کس کس کی سُنے ؟ صبح
بجے سے شروع ہوتا ہے اس کا کام گائے
ے کو چارہ پانی دینا ۔ ان کا گوبر جھاڑو کرنا ۔
پنی حالت ضروری پوری کرنا ۔ تب تک دو لہن

چھوٹے بچے کے اسکول جانے کا وقت ہو جاتا ہے ۔
اسکول سے واپس آکر گائے کا دودھ دوہنا ، گھر
کے چھوٹے موٹے کام کرنا اور آنے جانے والوں کو چائے
ناشتہ پہنچانا ۔ گائے بچھڑے کو نہلانا اور خود غسل
کرنا ۔ ناشتہ کرنا ۔ بچوں کو اسکول سے واپس لانا
وغیرہ ۔

ادھر جب سے پتا جی گانو سے آگئے ہیں
اس کا کام ڈیوڑھا ہو گیا ہے ۔ ان کا تیل مالش
کرنا ، نہانے کے لئے پانی رکھنا ۔ پوجا کی جگہ جھاڑنا پوچھنا
گنگا جل چھڑکنا ، آسن بچھانا ، ان کے تانبے پیتل
اور اسٹ دھاتو کے آدھا درجن بھگوانوں کو جھاڑنا ،
صاف کرنا پوچھنا اور آئے دن نیمبو یا دہی سے رگڑ
رگڑ کر چمکانا ۔ کالے سے گورا بنانا ۔ ان کے ہاتھ روم سے
نکلتے ہی پوکھی پترا ، آگ لوبان ۔ بھگوان کی منجوسا ،
رحل ۔ رامائن ، اگرو ، چندن ، سنکھ ، سلوٹی کھڑیا ،
اگربتی وغیرہ پوجا کی جگہ پر رکھنا ۔ کوئی بچہ نہ رہا تو دوسرے
کام چھوڑ کر گھنٹہ بجانے کی ڈیوٹی اسی کی ہے ۔ اگر
کبھی تیسرے پہر ان کی پکڑ میں آگیا تو رامائن یا
باجنے کی ڈیوٹی بھی اسی کی ہی ۔ وہ سنتے کم غصہ زیادہ
کرتے ہیں ۔ کان کے پاس منہ سٹا کر زور زور سے
بولنے کی گھنٹے بھر کی کسرت ۔ اس کام کے لئے گھر کا کوئی
بچہ پکڑ میں کبھی نہیں آتا ۔ سبھی جان بچا کر بھاگتے ہیں ۔
اتنا سب کام کرتے ہوئے شام ہو جاتی ہے ۔ شام
کو ساگ سبزی لانے بازار جانا ہے ۔ لوٹ کر گائے کو
کھلانا ۔ دوہنا اور سب کے سو جانے کے بعد گھنٹہ
بھر اپنے پیر کی سٹری ہوئی انگلیوں [illegible]

سینکائی کرنا۔ زیادہ پانی کے استعمال اور خون کی خرابی کی وجہ سے اس کے پیر کی انگلیاں سالوں بھر سڑتی رہتی ہیں۔

لیکن یہ تو ہوئی اس کی گھریلو مصروفیت۔ اس سے بڑھ کر مصروفیت ہے اس کی عوامی خدمت میں لگے رہنا۔ محلے میں ہم لوگوں کے آنے کی مدت جیسے جیسے بڑھ رہی ہے اس کی خدمت گذاری کا حلقہ بھی بڑھ رہا ہے۔ مصراجی کا گھر میرے دائیں پڑوس میں ہے۔ لال صاحب کا گھر ان کے بغل میں۔ اکیلی رہنے والی ماسٹرائن کے گھر بجلی کا فیوز ٹھیک کرنے کے لئے اس کی بلاہٹ ہوتی ہے۔ ان گھروں کی عورتوں کے استعمال کی زنانی چیزیں بازار سے لانے کا کام بھی دھیرے دھیرے اس کے ذمہ ہوتا جا رہا ہے۔ روزانہ استعمال کی گھریلو ضروریات کے علاوہ لال بہو کو روز دوپہر میں گول گپے کھانے کی چاٹ پڑی ہے۔ لال صاحب ڈیلی پسنجری کرتے ہیں۔ جس دن ساڑھے سات بجے والی ٹرین سے نہیں لوٹتے اس دن دس بجے کی ٹرین سے لینے کے لئے ان کا اسکوٹر اسٹیشن پہنچانا محمود کا کام ہے۔ اس بے کاری کے لئے لال بہو محمود کو دیور تک کہنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتیں۔ ماسٹرائن کا گیس کا سلنڈر بھرانے شاستری جی کے گملوں کی دیکھ بھال اور ان کے کلب کا رجسٹر ممبروں کے درمیان گھمانے کا کام بھی گاہے گاہے محمود کے ذمہ پڑنے لگا ہے۔ شریمتی جی ان دنوں محمود کی اس خدمت خلق سے اس قدر تنگ آ چکی ہیں کہ آئے [illegible] اور بھنبھناتی رہتی [illegible]

نوبت الگ۔

دراصل مصرائن سرجو پار کی ہیں۔ ان کا مائیکہ سرجو ندی کے اتر بستی گورکھپور یا دیوریا ضلع کے کسی انچل میں ہے۔ جہاں کے برہمنوں میں گوشت خوری عام ہے۔ مصرائن کو بچپن سے ہی مچھلی کھانے کی چاٹ پڑ گئی ہے۔ ادھر مصراجی ٹھہرے سرجو اور گنگا کے بیچ والے علاقے کے جہاں برہمنوں میں گوشت خوری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم گھر میں کھلے عام تو ہرگز نہیں۔ اس خطے کے چوتھے طبقے کے کٹر گوشت خور بھی اجودھیا جا کر رام رام سن لیتے ہیں تو کنٹھی دھاری بھگت ہو جاتے ہیں۔ اور گوشت خوری بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ مصراجی ٹھہرے نرے سبزی خور۔ مصرائن کہتی ہیں۔ ان کے مائکے والے مصراجی سے زیادہ برتر برہمن ہیں۔ جیت پاون پتیتہ پاون (پاک من والے غریبوں کو سہارا دینے والے) انہیں مچھلی کھانے سے پاپ نہیں لگتا۔ مصرائن کیا کر سکتی ہیں۔

اگر مصراجی کے پرکھوں نے لالچ میں پڑ کر اپنی شان گنوا دی۔ بہت پہلے کی گئی ہے یہ غلطی۔ راجہ دسرتھ کے زمانے میں۔ راجہ دسرتھ کو شرون کمار کے قتل سے برہم دوکھ (پاپ) لگا تھا اور اس سے نجات پانے کے لئے انہوں نے برہم بھوج دیا۔ سرجو کے اتر والے برہمنوں نے اس دعوت میں کھانے سے انکار کر کے اپنا تیج (رعب) بچا لیا۔ لیکن دکھن والے دکشنا (خیرات) میں ملنے والے سونے کے سکے کی لالچ میں آ گئے اور لالچ میں [illegible] رعب و [illegible]

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مچھلی کھانے کے حق سے محروم رہ گئے۔ پاپڑ پڑے گانا۔

مصراتن پھنسی ہیں تو اپنے وچن کے پھندے میں۔ جب وہ سہاگ رات میں اپنے پتی کو مچھلی نہ کھانے کا وچن دیا تھا۔ تب وہ اس چٹخارے کا اندازہ نہیں لگا سکی تھیں اور اب موقع ملنے پر اس وچن کو توڑ دیتی ہیں۔ گھر میں پکا نہیں سکتیں۔ اس لئے کبھی کبھی محمود کے معرفت ہوٹل سے منگوا کر کھا لیتی ہیں۔ مصراجی اس معاملے میں محمود کی گواہی چاہتے ہیں۔ محمود پر ان کو اعتماد ہے۔ کچھ بھی ہو وہ لڑکا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ لیکن مصراتن بھی مطمئن ہیں۔ کچھ بھی ہو لڑکا کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ "چاند سڑے سورج سڑے" اور سچ بولنے کے ڈر سے چھپتا رہا اور بھاگتا رہا محمود۔

مصراجی کے تیسری بلاہٹ پر محمود کے بجائے شرمیتی جی آتی ہیں تولئے سے ہاتھ پوچھتی ہوئی ہنستی ہوئی۔

"کیا ہے بھائی صاحب؟ کب سے چیلوا چیلوا کی رٹ لگائے ہیں؟ میاں بیوی کے جھگڑے میں چیلوا کو کیوں لاتے ہیں۔ آپ مصراتن سے چوری چھپے چیلوا سے کلب میں دارو کی بوتل منگوا کر پیتے ہیں تو کیا وہ مصراتن کا گواہ بنتا ہے۔ تب آپ کا گواہ وہ کیوں بنے گا؟ جیسے مصراتن آپ کا منہ سونگھ کر جان جاتی ہیں ویسے ہی آپ ان کا منہ سونگھ کر جان لیجئے۔"

(جاری)

● پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائڈ روڈ گیا سے شائع کیا

▲ بقیہ تبصرہ... علیم اللہ حالی ▲

چاندنی کے خطوط غزل کی اکتا دینے والی فضا میں ایک خوشگوار حصہ ہے۔ گوشۂ امن بلا خانۂ زنجیر میں ہے۔

اردو غزل کی تنہا اور مستحکم آواز

دہلیز پر اُترتی شام

منصور سبزواری کا تازہ شعری کارنامہ

آفسیٹ ڈیمائی سائز

قیمت: ۸۰ روپے

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج، دہلی

علم العروض پر

گوہر شیخپوری

کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف

گوہر عروض و بلاغت (شائع ہو چکی)

پتہ: گوہر شیخپوری ۲۸/۴۸ تلیا باغ، بنارس

گنجینۂ عرفاں

صابر آروی کے عقیدتمندانہ کلام کا مجموعہ

قیمت صرف ۶۰ روپے

پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴

براہ کرم ڈاک ٹکٹ ضرور روانہ کریں

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے

نام کتاب :- گنجینۂ عرفاں (شعری مجموعہ)
تخلیق کار :- صابر آروی
ضخامت :- ۹۶ قیمت :- ساٹھ روپے
پتہ :- صابر آروی۔ ایل ۲/۱۰ شری کرشنا پوری
ساؤتھ بورنگ روڈ، پٹنہ - ۸۰۰۰۰۱

جناب صابر آروی کا نام اردو دنیا بالخصوص اردو کے شعر و سخن کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک مدت سے گیسوئے اردو سنوارنے اور سجانے میں مصروف ہیں۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو اپنی علمی اور ادبی خدمات کے لئے مشہور ہے۔ متاع سخن انہوں نے وراثت میں پائی۔ مگر اپنے بزرگوں کی صحبت میں گوناگوں تجربات و مشاہدات اور عمیق مطالعہ سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اس میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ایک بڑا مفید کام یہ کیا کہ میری اور بہت سے دوسرے دوستوں کی خواہش اور سب کے زبردست اصرار پر اپنے کلام کا ایک انتخاب "سرمایہ احساس" کے نام سے خوبصورت طور پر شائع کیا۔ اس مجموعہ میں کچھ غیر ضروری چیزیں بھی شامل ہو گئیں مگر ان کا وہ تمام اچھا کلام جو رومانی اور ترقی پسند نظموں، غزلوں، رباعیات و قطعات کی شکل میں بکھرا پڑا تھا، یکجا ہو گیا اور اس مجموعہ کلام کو ادبی حلقوں سے پذیرائی نصیب ہوئی۔

مقام مسرت ہے کہ صابر آروی نے بہت جلد شائقین ادب و شعر کو ایک اور خوبصورت تحفہ عنایت فرمایا ہے۔ ان کے عقیدتمندانہ کلام کا مجموعہ گنجینۂ عرفاں ابھی کچھ دنوں پہلے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔ گنجینۂ عرفاں کا شاعر سرمایۂ احساس کے شاعر سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ ... میں اس کے جذبات و احساسات بڑے مقدس اور مہذب ہیں۔ نقاش نے فی الواقع نقش ثانی کو بہتر بنایا ہے۔ اور صرف ۹۶ صفحات کی یہ کتاب "بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر" کی مصداق ہے۔ اس کتاب میں

جو نظمیں ہیں وہ سبھی سب Devotional poems ہیں۔ ایک عدد حمد باری تعالیٰ اور ایک نعت سرور کائنات صلعم بھی اس میں شامل ہے۔ مگر ان دونوں کا انداز بھی عقیدہ کا ہے، بہر دو سے منظومات میں صابر نے اپنے عقیدے کے مطابق فخر مسیح امام آخرالزماںؑ کی آمد اور ان کے ورود مسعود کی طلب و تمنا عہد حاضر کی فتنہ طرازیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ وہ حضرات جن کا مسلک ان سے مختلف ہے، ان کے انداز بیان اور اظہار کی جابکدستی کی داد تو ضرور دیں گے۔

قصیدہ اور منقبت کا فن بڑا مشکل فن ہے کم ہی دیکھا گیا ہے کہ قصیدہ اور منقبت کے لئے کسی شاعر نے مسدس کا فارم اپنایا ہو۔ مگر صابر آروی کو اس چھ مصرعے والی طرز اس قدر پسند ہے اور ان کو اس پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ انہوں نے قطعات و رباعیات کے علاوہ وہ تمام تر قصائد و مناقب مسدس میں کہتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔ ان میں لطف زبان و بیان بھی ہے اور فکر و خیال کی رعنائیاں بھی۔ یہ فن بڑا مشکل ہے اور برسوں کی مشق سے آتا ہے۔ جناب صابر آروی واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک نہیں کئی ایک اچھے قصائد ہمیں عطا کئے اور متعدد مشقیتں بھی۔ ان تمام قصائد و مناقب کا تعلق ایسی پاکیزہ اور بلند و بالا شخصیات سے ہے کہ جن کے متعلق سوائے حرف خیر زباں سے کچھ نکل ہی نہیں سکتا اور ان کی جس قدر اور جتنی بھی تعریف و توصیف لکھی جائے کم ہے۔

مرثیہ یوں تو کسی ایسے شخص کے انتقال پر لکھا جا سکتا ہے اور لکھا بھی گیا ہے جس سے لکھنے والے کو محبت ہو اور اس کی رحلت پر اس کا دل رو رہا ہو۔ مگر اردو میں مرثیہ کا مطلب و معنی ہوتا ہے ان نظموں سے جو خاص طور پر سیدنا حضرت امام حسین رضؓ اور ان کے ساتھیوں کی کربلا میں شہادت سے متعلق ہوں۔ واقعہ کربلا ایک ایسا دلدوز و دلخراش سانحہ ہے کہ آنسو بہانے والے اس پر تا حشر آنسو بہاتے رہیں گے۔ گنجینۂ عرفاں، کے مصنف جناب صابر آروی نے اس سلسلے کو بڑی کامیابی سے آگے بڑھایا ہے اور اس کے لئے وہ ارباب نقد و نظر کی توجہ اور تحسین کے حقدار ہیں۔

صابر آروی کو رباعی سے بھی خاصی شغف ہے اور وہ دو بیتی کے فن شریف سے بھی بخوبی واقف ہیں اس کا ثبوت ان کی وہ رباعیات پیش کرتی ہیں جو گنجینۂ عرفاں میں شامل ہیں۔ بارہ رباعیاں حضرت علیؓ کی شان میں ہیں اور چھ عدد رباعیاں امام عالی مقام حضرت حسینؓ کی شان میں۔ شاعر نے چار چار مصرعوں میں بھی اپنے عقیدت مندانہ خیالات بہ طریق احسن پیش کئے ہیں۔ ان کے قطعات میں بھی یہی خوبی ہے۔ گنجینۂ عرفاں، میں جابجا حسن سخن کے لعل و گہر بکھرے پڑے ہیں۔

کتاب میں نثرہ شاد حضرت نقی احمد ارشاد مدظلہ العالی اور جناب پروفیسر نادم بلخی صاحبان نے تفصیل کے ساتھ فن مرثیہ نگاری اور صابر آروی کے عارفانہ کلام کا جائزہ لیا ہے جو قاری کے لئے نہایت کارآمد، مفید اور معلومات افزا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے

کہ جناب صابر آروی کا یہ تازہ ادبی تحفہ دنیائے ادب میں پسند کیا جائے گا اور ناقدین حضرات ان کی کاوش کی بھرپور داد دیں گے۔

▲ حفیظ بنارسی، بنارس

نام کتاب :- **چاندنی کے خطوط**
نوعیت :- غزلوں کا مجموعہ
تخلیق کار :- پروین کمار اشک
ضخامت :- ۱۱۲ ● قیمت :- پچاس روپئے
پتہ :- کرشنا اسٹریٹ، پٹھانکوٹ - ۱۴۵۰۰۱ (پنجاب)

غزل کے شور شرابے اور ہجوم بیکراں سے جب کوئی چہرہ روشن ہونے لگتا ہے تو اس صنف سخن کے سلسلے میں ایمان پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ پروین کمار اشک کا چہرہ نہ صرف اس بھیڑ میں روشن ہے بلکہ یہ نئی غزل کو روشن کرنے کا وعدہ بھی کر رہا ہے۔

اشک کی غزلیں تجربے سے شروع ہوتی ہیں اور ایک روایت بن جانے کی توانائی و جمال کی حامل ہو جاتی ہیں۔ غزل میں ہیئتی اور اسلوبیاتی سفر کو روانہ ہونے والے بیشتر افراد وہ ہیں جو تجربات کی بھول بھلیاں میں گم ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ کہیں کہیں کچھ چنگاریاں پیدا کر دیتے اور شعلۂ مستعجل کی طرح دیکھتے دیکھتے سرد ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی TRADITION نہیں بنا پاتے۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ان کے برخلاف پروین کمار اشک نے وہ طاقت، توانائی اور جمال فن حاصل کر لیا ہے جو ہمیں تجربات کا احترام کرنا سکھاتے ہیں۔ اشک کے لہجے کے استحکام کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ جب میں تجربے کو روایت کا درجہ بخشنے کی بات کر رہا ہوں تو ان کی ان تخلیقات کو منہا کر رہا ہوں جو آزاد غزلیں کے عنوان سے مجموعے کے آخری حصے میں شریک ہیں کمار اشک کی غزلیں فطرت کا حسن سمیٹنے کی پروردہ ہیں۔ آس پاس ہی نہیں دور دراز کے مناظر خاص طور پر وہ مناظر جہاں فطرت چھپ چھپ کر اپنے جلوے دکھاتی ہے اشک کی شاعری میں رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک گونہ فرحت بخش بلکہ بہت حد تک ماورائی کیفیات سے دوچار کرتی ہے۔ ایک اطمینان بھرا سناٹا، ایک SOLITUDE، ایک متصوفانہ جذب، کائنات کی تحسین و تفہیم کا ایک دلکش VISION یہ ساری خصوصیات پروین کمار اشک کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اشک نے اندرون اور بیرون کے جھگڑے مٹا دیئے ہیں ان کے یہاں داخل کا حسن خارجی مناظر و ماحول میں منتقل ہونے لگتا ہے اور کائنات کی وسعتیں داخل میں اتر کر نغمہ ریزی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان نغموں کی آواز مبہم اور لایعنی نہیں بلکہ صاف، واضح اور دل نشیں ہے۔ اشک طبیعات سے مابعد الطبیعات تک پہنچنے کی پرخلوص کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کی شاعری میں کبھی کبھی جن بے نام اور اجنبی سمتوں کا پتہ چلتا ہے انہیں اگر تناظر میں دیکھا جائے تو اس محاکمے کی توثیق بھی کی جا سکتی ہے اور اشک کے لہجے کی گرفت بھی ہو سکتی ہے۔

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی | ۴ | بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

فہرست

مجلسِ مشاورت

○ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
• ڈاکٹر قمر رئیس
○ اصغر علی انجینئر
• قیصر عثمانی
○ شاہد احمد شعیب
• ڈاکٹر محمد مثنیٰ
○ ڈاکٹر نعیم اللہ حالی
• سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
○ ایڈیٹر :- جمیل منظر
اعزازی ایڈیٹر :- خورشید ہاشمی
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

جلد ۵۴ شمارہ ۱۲

○ بدل اشتراک •
• فی شمارہ ...... ۵ روپے
○ زرِ سالانہ ...... ۵۰ روپے
• لائف ممبری ...... ۱۰۰۰ روپے

• خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ •

ماہنامہ سُہیل
ریور سائیڈ روڈ، گیا
فون نمبر ۲۱۵۷۳

نمود

تخلیقی رویہ

ہر عہد میں فنکاروں کا تخلیقی رویہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی اکثر و بیشتر سست رفتار ہوتی ہے اس لئے مختصر زمانی مدت میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا مگر کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد اس سفر کا جائزہ لینا ممکن ہے۔ یہ تخلیقی رویہ متعدد عوامل سے متاثر ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیاسی، سماجی تغیرات، اقتصادی تبدیلیاں، سائنسی انکشافات وغیرہ وہ خاص عناصر ہیں جو ہمارے فنکاروں میں تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں ان کے علاوہ وہ تمام چھوٹے بڑے عوامل ہیں جو کہیں نہ کہیں سے ان بنیادی عناصر سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس طرح اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تخلیقی رویئے کی تشکیل اور تغیر میں اضطراری صورت حال اہمیت رکھتی ہے۔ فن کار کو فکر اسلوب، لہجے اور لغات کی دولتیں بظاہر ماحول سے حاصل ہوتی ہیں حالات کی وجہ سے فنکار پیدا ہوتے ہیں اور انہیں حالات میں انکی تخلیقات کے خد و خال تیار ہوتے ہیں۔

لیکن اسے ایک کلیے کے طور پر اپنایا نہیں جا سکتا ہے۔ تخلیق کا عمل اضطراری ہوتے ہوئے شعوری اور اختیاری بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک عہد، ایک ماحول اور صورت حال میں کسی مخصوص خطۂ ارض کے تحت لکھنے والوں میں میکانیکل یکسانیت ہوتی ــ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ خارجی عوامل ایسی کبھی اضطراری فضا پیدا نہیں کر سکتے کہ انسان بالکل بے بس ہو جائے۔ عہد و حالات تکیہ بنانے کے آلات ہوتے تو ہر تخلیق کار ایک جیسا ہوتا اور ادب تکرار اظہار کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

لہٰذا تمام پابندیوں کے ساتھ انسان آزاد بھی ہے۔ فن کار اپنی انفرادی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں خارجی عوامل کو منفرد انداز میں استعمال کرتا ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ عوامل و عناصر کے اثرات میں بوقلمونی پیدا کرے اس لئے انفرادی تخلیقی رویے کی یافت دشوار سہی مگر یہ تخلیق کار کی حدود میں ہے۔ کامیاب فن کار وہی ہوتا ہے جو معاصر عہد کی تخلیقی کاوشوں میں ایک نئی راہ پیدا کرے۔

اس روشنی میں ہمارے فن کاروں کو خود احتسابی سے کام لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنے معاصرین سے کتنے یکساں ہیں یا مختلف ہیں ـــــ یاد رکھئے اختلاف ہی آپ کی پہچان بن سکتا ہے۔

مسعود منظر

محمد حسن

غالب اور اقبال ۔ قربتیں اور فاصلے

سر عبدالقادر نے بانگ درا پر دیباچہ لکھتے اقبال کی شاعری میں غالب کے دوسرے جنم کی آہٹ محسوس کی تھی۔ حالانکہ غالب غزل گو تھے اور اقبال نے زیادہ تر نظموں کی بدولت شہرت پائی۔ عبدالقادر نے یہ مماثلت شروع ہی سے محسوس کرلی بعد کو ان دونوں میں یہ رنگ اور بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اقبال کی شاعری نے آگے چل کر جو موڑ لیے انھوں نے غالب سے انہیں اور بھی قریب تر کردیا۔

چند باتیں تو سامنے کی ہیں دونوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی اور عظیم شاعری کی دوسرے یہ کہ دونوں کا شاعرانہ رنگ کلاسیکی ہے اور اپنے سے قبل کے اساتذہ کے اعلیٰ ترین شعری کارناموں سے دونوں نے اثر قبول کیا تیسرے یہ کہ دونوں شاعر ایک عظیم تہذیبی ورثے سے خود کو جوڑتے تھے یہ اور بات ہے کہ غالب کی نظریں ماضی کی طرف لگی ہوئی تھیں اور اقبال کی نگاہیں مستقبل کی تشکیل پر اپنے طرز پر کرنے پر۔

یہ بھی درست ہے کہ ان دونوں کے لہجے کی پرداخت میں فارسی کے کلاسیکی رنگ کو بہت کچھ دخل تھا۔ اقبال نے تو بانگ درا کے دور میں فارسی کے متعدد شاعروں کے شعروں پر پوری نظمیں لکھ کر ان کی تضمین کرڈالی تھی۔ اور غالب اردو کے عظیم ترین شاعر ہونے کے باوجود اپنے فارسی کلام ہی پر ناز کرتے رہے۔

لیکن یہ مماثلتیں یہیں ختم نہیں ہوجاتی ہیں۔ عبدالقادر کی سوجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انھوں نے ساز چھیڑا اور آگ بوجھا کے طرز پر اس مماثلت کو اقبال کے ابتدائی کلام میں ہی پہچان لیا بعد کو تو مماثلت ایسی نمایاں ہوئی کہ صاف نظر آنے لگی مگر ابھی اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔

اور اس کی کئی وجہیں ہیں۔ غالب کی زندگی غزل کہتے گزری اقبال نے نظم گو کی حیثیت سے شہرت پائی غزل میں کوئی کتنا ہی مربوط اشعار کیوں نہ کہتا ہو

ہیں اس کے فکری آہنگ تک پہنچنا آسانی نہیں ہوتا نظم میں یہ دشواری کم ہے اور اگر شاعر خود بھی فلسفیانہ ذہن رکھتا ہو اور اپنے فکری سلسلوں اور ان کے ماخذ کی طرف اشارے کر سکتا ہو تو یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے دونوں کے زمانے میں بھی بڑا فرق تھا اور زمانے ہی نہیں مزاجوں میں بھی اختلاف تھا۔ غالب کا مزاج کھلنڈرے پن کی طرف راغب اقبال کا مزاج سنجیدہ دانشوری اور اپنے دور کی گتھیاں سلجھانے کی طرف مائل حد یہ ہے کہ سیاسی مسائل کی عقدہ کشائی کی طرف متوجہ مگر ان سطحی اختلافات کے باوجود دونوں کی شاعری کا مزاج بڑی حد تک ایک سا ہے۔ نفس مضمون اور لب ولہجے کے اعتبار سے۔

نفس مضمون کو لیجئے تو اقبال کی شاعری کا نفس مضمون ایک لفظ میں بیان ہو جائے گا اور وہ لفظ ہے "خودی"۔ اقبال نے اس لفظ کو اصطلاح بنایا اور آپ کی شاعری کی پہچان یہی لفظ بن گیا مطلب اس کا مختلف ہو گیا خودی سے مراد ہے 'تمنا' خواہش، لگن۔ اقبال نے اسی کو انسان کی پہچان قرار دیا بلکہ انسان میں زندگی کی علامت بتایا کہ اس کی بنا پر انسان عمل کی طرف راغب ہوتا ہے دنیا کی ساری چہل پہل ہے تو اسی عمل سے ہے۔ اقبال فلسفی تھے اسی لئے اس تصور کو غلط معنوں میں استعمال نہ ہونے کی غرض سے اس کی تعریف کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے 'بے خودی' سے اسے الگ کیا۔ اور خودی کے مدارج اور نوعیتیں مقرر کیں۔ لیکن اصطلاح کی معنی میں صرف 'تمنا' آدمی کے دل میں خواہش ہے تو اسے پورا کرنے کی غرض سے وہ ہاتھ پیر بھی مارے گا یعنی عمل بھی کرے گا گویا عمل کی بنیاد ہے تمنا اور صرف 'تمنا'۔ اگر کسی کا سینہ تمنا ہی سے خالی ہے اسے کسی چیز کی چاہت ہی نہیں ہے تو وہ پھر عمل سے بھی دور دور بھاگے گا۔ لیکن اگر اس کا دل تمناؤں سے آباد ہے تو پھر وہ عمل کے لئے مجبور ہوگا اور یہی اقبال کے نزدیک زندگی کی علامت ہے۔

اب ذرا غالب کے کلام پر نظر ڈالئے تو یہی لفظ 'تمنا' غالب کے دیوان میں مرکزی لفظ قرار پائے گا۔ آپ چاہیں تو اسے اصطلاح بھی قرار دے سکتے ہیں۔

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غالب کے کلام کی جتنی دل کشی اور دل نوازی ہے وہ اسی 'تکرار تمنا' کی بدولت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اچھے غزل گو کی طرح وہ بھی مختلف نفسیاتی مرحلوں سے گزرے ہیں اور ان میں ایسے مرحلے بھی آئے ہیں جب امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور بے اختیار پکار اٹھے ہیں۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

لیکن اس کے باوجود خواہش یا تمنا سے مکمل طور پر دامن کش ہونے کی منزل کبھی نہیں آئی۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

یہی نہیں غالب کی غزلوں میں ان دونوں کیفیتوں کے درمیان غالب بار بار تمنا کی طرف واپس آتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے غالب کی غزلوں میں لفظ 'پھر' کے

یھیل لیا

مال سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ غم دوراں کے
غم جاناں کی طرف بار بار واپسی کی طرف اشارہ
ہے گویا تمنا کی بازآفرینی ظاہر کرتا ہے۔ غالب
یوان کو سرسری طور پر پڑھا جائے تو بھی تمنا کی
ت یابی ہر صفحے پر راستہ روک لے گی۔ غالب
یوان کو یہی خصوصیت غالب کی تمنا اور اقبال
دی کو ایک ہی تصور کی دو اصطلاحیں ثابت
کافی ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

احمد فیض نے غالب کے کلام کی آرزومندی کی
پہلو پر زور دیتے ہوئے ایک اور لفظ کے بار بار
ستعمال ہونے کا ذکر کیا ہے اور وہ لفظ ہے سہی۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

سری غزل ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی ہی سہی
امتحاں اور بھی باقی ہوں تو یہ بھی نہ سہی

چھڑ اور سہی کے الفاظ بار بار آرزو اور تمنا کی
لادستی کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور غالب کے یہاں
ی قدر کو ظاہر کرتے ہیں جس سے اقبال کا تصور
ودی اگر ماخوذ نہیں تو متاثر ضرور ہے۔

اب آئیے شاعرانہ لب و لہجے کی طرف۔ سو غالب
نے کبھی فارسی کے کلاسیکی طرز کو اختیار کرنے کو راز
نہیں رکھا اور ان کے کلام میں ظہوری، نظیری اور حافظ
طرحوں میں غزلیں عام طور پر ملیں گی یہی نہیں ان کے کلام

کلام پر بھی انہی اساتذہ کے کلام کی پرچھائیاں مختلف
زاویوں سے پڑتی اور نکھرتی ہیں۔ اس طرح اقبال نے
فارسی شاعروں کے کلام سے اپنے فکر و فن کی شمعیں روشن
کی ہیں بانگ درا گو اردو کلام کا مجموعہ ہے مگر اس میں
صائب، طالب آملی وغیرہ کے اشعار پر اردو میں تضمینیں
شامل ہیں اور اس انداز سے شامل ہیں کہ فارسی کے
شعر سے ایک معنوی ربط پیدا ہو گیا ہے۔ نپولین پر
ان کی نظم حافظ کے اس مصرعہ پر ختم ہوتی ہے
جو پوری نظم کی روح کو سمیٹ لیتا ہے۔

عاقبت منزل، وادیٔ خاموشاں نیست
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

اس کے علاوہ اردو میں دونوں شاعروں کا انداز بیان فارسی
اساتذہ کے طرز ہی پر ہے گو اقبال حافظ کے قائل نہیں اور ان
کی رندی اور قلندری میں صوفیوں کی سی سپردگی دیکھتے ہیں اور
اس پر اعتراض کرتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ اقبال کے فارسی کلام
میں حافظ کا گہرا اثر موجود ہے۔

غرض غالب اور اقبال دونوں میں فکری لہجے اور
شاعرانہ انداز بیان دونوں سطحوں پر بہت کچھ مماثلتیں
پائی جاتی ہیں اور انہی کی بنا پر اس شاعرانہ وراثت کی تعمیر
ہوئی ہے جس سے اردو شاعری جانی پہچانی جاتی ہے۔
دونوں شاعروں میں فکر و فن دونوں اعتبار سے
قربتیں بھی ہیں اور فاصلے بھی سوال انداز نظر کا ہے۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

اور اسی بات کو اقبال کا لہجہ مل جائے تو اس انداز سے بھی نظم
کیا جا سکتا ہے۔

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

عبد المنان
کلکتہ یونیورسٹی

رسالہ حجت القوی ۔ ایک جائزہ

حجّت القویٰ پر طوالت کے ساتھ خامہ فرسائی کے لئے اردو نثر کے چند ناگزیر نمونوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ تاریخ میں جو اردو نثر کے ابتدائی نمونے جگہ پا چکے ہیں، انہیں چند صوفیائے کرام کے ملفوظات کے علاوہ قصہ مہر افروز و دلبر، کربل کتھا، سودا کا دیباچہ، چند علما کے کلام پاک کا ترجمہ کے علاوہ رسالہ حجت القوی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک زمانے تک اس رسالے کا ذکر ادب کی تاریخ میں نہیں آیا۔ راقم نے اسے دریافت کیا ہے اور منظر عام پر لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حجت القوی کا سن کتابت ۱۱۹۰ھ ہے۔ ظاہر ہے یہ کتاب اس سے قبل لکھی گئی۔ اس کے کاتب اور خالق سید احمد قادری ہیں۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھا ہوا ہے۔

" رسالہ سید احمد قادری موصوم بر حجت القوی بزبان ہندی در نثر "

کتاب کا آغاز یوں ہوتا ہے: —

اشہد اللہ لا الہ الا اللہ۔ بتحقیق شہود ان لا موجود حقیقت سورۃ الصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد لامنہ محل نظر من العلم المخصوص وعلیٰ الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔ اما بعد حمد و نعت کے فقیر و حقیر اضعاف عباد اللہ سید احمد حسین القادری میانپری مدد سیں خاص اس حق تعالیٰ کے ہور یاری میں اس کی کچھ یک کہا ہے۔ دوہرہ —

احمد بات نبات ہے تیری توں بات کرے جس سات
جن اس بات کوں پائے او کھو یا حق سو ہیہات

پس جکدی عارف باللہ ہیں ان کوں بیش لازم ہے کہ گوش ہوش رکھ کر سننا ہور سمجھنا ہور اگرچہ تو او ت ہوئے تو صلاۃ دینا واسطے ہدایت کے تا کہ عالم طرف ظلالت اور گمرہی کے نجات ہیں۔ باللہ توفیق و اعانتہ یعنی توفیق سیں خاص اس حق تعالیٰ کے اور عنایت کیں اس کی موافق رسالہ حجت القوی کے خاص اس حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا فرض ہے۔ اہر تمام عالم موخلص

ا رحق تعالیٰ پیدا کیا ہے۔ خاطر کیتی واسطے اپنی پہچانت کے حدیث قدسی کنت کنزاً مخفیاً فاحببت یعنی تھا میں گنج مخفی۔ پس پیدا کیا خلق کیتی واسطے اپنی پہچانت کے جنوں کیتی دعویٰ ہے ایمان ہور اسلام میں۔ الوکتیں لازم ہے ہور فرض ہے کہ خاص اس حق تعالیٰ کی معرفت پیدا کرنا ہے"

اختتام ۔۔۔ تمام شد۔ حجت القوی برائے مطالعہ حقائق و معرفت آگاہ مقبول قلوب عارف باللہ زین العابدین سلمہ اللہ مبین بتاریخ دوئم شہر رجب المرجب روز یکشنبہ بوقت ظہر ۱۱۹۰ھ مقدس تحریر یافت۔

اس کتاب کے سرورق پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مہر لگی ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فورٹ ولیم کالج کی ملکیت تھی اور وہاں کے کتب خانے میں موجود تھی۔ فورٹ ولیم کے اندر کئی تذکرے لکھے گئے اس لئے اس کا ذکر لازمی تھا لیکن اس دور کے تذکرے خاموش ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ظاہر ہوتی ہے کہ بیشتر تذکرے شعرائے ریختہ سے متعلق ہوتے تھے اور نثر نگاروں کی حیات و خدمات کے بارے میں لب کشا نہیں ہوتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ رسالہ اتنا مشہور نہیں تھا کہ بیشتر مورخ اور تذکرہ نگار اس کے ذکر کے بغیر اپنی تخلیق ادھوری سمجھتے۔ ظاہر ہے کوئی گمنام شئے روشنی کی محتاج رہتی ہے اور کوئی محقق بڑی کاوش کے نتیجے میں منظر عام پر لاتا ہے۔ یہ کام جنوں صفت کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ اب جب کہ یہ کتاب منظر عام پر آئے گی (راقم ایڈیٹ کرکے منظر عام پر لائے گا) بقیہ نثری ادب کی تاریخ میں ایک اضافے کی مثال سمجھی جائے گی۔

یہ کتاب ۴۵ ورق پر مشتمل ہے۔ کہیں کہیں تلیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس لئے بعض الفاظ پڑھے نہیں جاتے ہیں۔ حجت القوی تصوف سے متعلق ایسی کتاب ہے جس میں حقیقت کے مسائل بالخصوص اور معرفت کے مسائل بالعموم پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان و بیان کے لحاظ سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ ابتدائی نثر کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے اعتبار سے بہت ساری کمزوریاں ہو سکتی ہیں لیکن اس تصنیف کے دور کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان تشکیلی دور میں تھی۔ ہر زبان تشکیلی دور میں اس انداز کی کمزوریاں رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں ارتقائی صفت آتی ہے۔ آج جب کہ اردو زبان ترقی کے اس منزل پر ہے جہاں دوسری زبانوں سے آنکھیں لڑا سکتی ہے تو تاریخی لحاظ سے ان نمونوں کا منظر عام پر آنا ضروری ہے جو ارتقائی کڑیاں جوڑنے میں معاونت کر سکتی ہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کتاب کی کتابت ۱۱۹۰ھ میں ہوئی ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۱۹۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس اعتبار سے یہ 'نوطرز مرصع' سے قبل کی تصنیف سمجھی جائے گی۔ اس کی اہمیت لسانی اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ اس میں پنجابی، برج اور دکن کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ہور بمعنی اور بیشتر استعمال کیا ہے۔

سیں بمعنی سی = الوکتیں۔ ان کے لئے

نجاویں = نہ جائیں =

آپس کتیں = آپس میں

او۔ وہ = توں۔ تو

(بقیہ ۳۶ پر)

ماہیے

ساون کا مہینہ ہے
احساس کے ماتھے پر
شدت کا پسینہ ہے

انداز نرالا ہے
اس دور کے مجنوں کا
جھولی ہے نہ کاسہ ہے

برسات یقینی ہے
سوکھی ہوئی دھرتی پر
یہ دور جشنی ہے

اے مونس تنہائی
آنے سے ترے گھر میں
پھر فصل بہار آئی

پھولوں سی ہتھیلی پر
اک قطرۂ تبسم کا
رکنا بھی ہوا دو بھر

سجنی کو شکارے پر
اس وقت بٹھا لینا
جب آئے کنارے پر

ہے زور ہواؤں کا
منجدھار میں کشتی ہے
رخ سمجھو ہواؤں کا

آغوش کو وا رکھنا
پردیس سے آئے گا
دروازہ کھلا رکھنا

بہتی ہوئی صدیوں کا
آئینہ دکھانے سے
اب کس کا بھلا ہوگا

اس وقت چلے آنا
جب موت ہو بالیں پر
ڈھارس تو بندھا جانا

تم یاد بہت آئے
جب دھوپ کھلی گھر کی
دیوار پہ بیٹھے سائے

چمپا ہے چمیلی ہے
یہ زیست مری یارو
بچپن کی سہیلی ہے

جینا ہے نہ مرنا ہے
اک وقت مقرر تک
سانسوں کو گزرنا ہے

ضیا الانجم
جبلپور

نشتر اکبرآبادی

پونہ

کتنا لہو بہاؤ گے دھرتی کے واسطے
کتنے سہاگ لوٹو گے دلی کے واسطے

کعبہ کے واسطے تھی۔ نہ کاشی کے واسطے
اپنی تو صرف جنگ تھی روٹی کے واسطے

جب بھی ملے گا نذر کروں گا اسے ضرور
نوحہ لکھا ہے گھر کا پڑوسی کے واسطے

اپنی چھتوں کا لوگوں کو کتنا ملال ہے
خیموں میں مل کے روتے ہیں بستی کے واسطے

اے بمبئی وقار ترا ختم کر دیا ——!
اب کے فسادیوں نے تباہی کے واسطے

یہ کیا ہوا کہ لوگوں نے اپنے ضمیر کو
نیلام پر چڑھا دیا کرسی کے واسطے

دو گھروں کے درمیاں پہچان روشن کر گئی
قہقہوں کی روشنی دالان روشن کر گئی

اس کی اک اک بات مرے ذہن میں محفوظ ہے
تربیت اس کی مرا ایمان روشن کر گئی

حسن کی معجز نمائی عشق کے دربار میں
ظل سبحانی کے سب فرمان روشن کر گئی

فکر کی گہرائی غالب کا مقدر بن گئی
عشق کی تو میر کا دیوان روشن کر گئی

تشنگی ٹیگور کی لے آئی ساحل پر مجھے
علم کی کم مایگی ارمان روشن کر گئی

آئینہ سچ کا دکھا کر داستان کربلا
بزدلوں پر موت کا عنوان روشن کر گئی

غزلیات

گوہر شیخپوری[۵۱]

بنارس

مضطرب کیوں ہے ماں، دیکھنا سوچنا
کیا ہے بیٹی جواں، دیکھنا سوچنا

قافلے میں سبھی لوگ تھے معتبر
کیوں لٹا کارواں، دیکھنا سوچنا

پھر فضاؤں میں رونے کی آواز ہے
جب جل گئے کیا مکاں، دیکھنا سوچنا

ساس کے گھر میں کیسے بہو جل گئی
یہ ہے کار زیاں، دیکھنا سوچنا

کل ہمیں راہ بر تھے مگر آج کیوں
ہو گئے بے نشاں، دیکھنا سوچنا

کیوں کٹھن ہو گیا زندگی کا سفر
اے مرے مہرباں دیکھنا سوچنا

ایک مٹھی زمیں بھی ہماری نہیں
ہم ہیں کیوں بے اماں، دیکھنا سوچنا

[illegible] "شیخ پورہ" کو گوہر مگر
تیرا کیا ہے وہاں، دیکھنا سوچنا

غزلیں

دیدۂ تر قہقہے دیکھا کئے
ہم تو مالک کی رضا دیکھا کئے

اس نے تاروں پر کمندیں ڈال دیں
اور ہم حرف دعا دیکھا کئے

ہم فقیر بے نوا تا زندگی
لطف شاہ اغنیا دیکھا کئے

ہم تو غالب کی غزل کے ساتھ ہی
میر کا بھی مرثیہ دیکھا کئے

جو لٹیرے ہیں انہیں کے جسم پر
پارسائی کی قبا دیکھا کئے

اپنے بچوں کی شرارت مرحبا
گھر میں ہر دم زلزلہ دیکھا کئے

اجگروں کے شہر میں گوہر میاں
روز سہمی فاختہ دیکھا کئے

۵۱ وطن شیخ پورہ، ضلع مونگیر، بہار

غزلیں

شفیع اللہ خاں راز امباوی
امباوہ

دہک رہے ہیں تعصب کے خواب لہجوں میں
گھلی ہے آتش نفرت جناب لہجوں میں
ستم ہے اس کی زباں پر لگی ہے پابندی
وہ جس کے دم سے ہے بوئے گلاب لہجوں میں
خدا پرست ہیں صحرا میں مائل گفتار
مہک رہے ہیں بہاروں کے خواب لہجوں میں
نہ جانے کتنی زبانیں ہیں راہ ہستی میں
بھٹک نہ جائیں کہیں آنجناب لہجوں میں
جو ایک بوند بھی چکھ لی تو رند بہکے گا
عداوتوں کی گھلی ہے شراب لہجوں میں
بشر تو کیا ہے فرشتے بھی غمزدہ ہو جائیں
ہر اک سوال کا وہ ہے جواب لہجوں میں
نہیں ہے گلشن طرز بیاں اندھیرے میں
کہ ضو فگن ہیں سے ماہتاب لہجوں میں
وہ ریگ زار تکلم میں کھو نہ جائیں کہیں
دہک رہے ہیں طلسمی سراب لہجوں میں
غم جہاں نے تھپک کر سلا دیا ہے راز
وہ شادماں ہے مگر خواب خواب لہجوں میں

دلکش غازیپوری
دالمنڈی، بنارس

انگلیاں لوگ رکھ لیں کانوں میں
اتنی تلخی نہ ہو زبانوں میں
اب حقیقت نظر نہیں آتی
اتنا ہم کھو گئے فسانوں میں
جانے کب حملہ در ہو فوج عدو
تیر جوڑے رہو کمانوں میں
ایسے لوگوں میں ہم بھی ہیں جن کی
روٹیاں بند ہیں خزانوں میں
روح بے روح ہو گئی تو کیا؟
دیدہ زیبی تو ہے مکانوں میں
جانے کیا گذرے اگلی منزل پر
کوئی بوڑھا نہیں جوانوں میں
میری بیتی نے کیا سنا کل شب
رات مجھ سے نہ [illegible] کانوں میں
چلئے اب ان سے کہہ دیں [illegible]
آپ [illegible] باتوں میں

ڈاکٹر آفاق فاخری

جلال پور

پئیں گے اپنا لہو وہ مزاج کر دے گا
ہر ایک شخص کو پاگل اناج کر دے گا

کسی سے اپنی حکایات خوں چکاں نہ کہو
کوئی سنے گا تو دل احتجاج کر دے گا

یہ سچ ہے اب کے اگر میں نے سچ کہا تو مری
زبان کاٹ کے گونگا سماج کر دے گا

جلیں گے روز یونہی گھر تو دیکھنا اک دن
زمانہ اس کو بھی رسم و رواج کر دے گا

اگر کرو گے زبان و منصب کا سودا
تو وقت تم کو بھی بے تخت و تاج کر دے گا

کسے خبر تھی کہ آفاق اب کے موسم گل
ہر ایک شہر میں شعلوں کا راج کر دے گا

بیتاب جے پوری

پرتاپ گڑھ (یو۔ پی)

ہر زاویے سے اک نیا منظر تلاش کر
جس کا ہو ربط آنکھ سے وہ سحر تلاش کر

انساں کو قتل کرنے سے پہلے ہے لازمی
اس میں چھپا نہ ہو ترا پیکر تلاش کر

یہ حادثوں کی دھوپ اور تنہا ترا سفر
سایہ کرے جو تجھ پہ وہ چادر تلاش کر

جو ان میں زندگی کی نئی روح پھونک دے
پتھر ہیں بے شمار تو آزر تلاش کر

آثار پھر نمایاں ہیں منظر کے دہر میں
تو اس سے پیشتر کوئی لشکر تلاش کر

تو اس کو ڈھونڈنے کہاں جنگل کو چل پڑا
بیتاب اس کو اپنے ہی اندر تلاش کر

غزلیں

شاہد کلیم
آرہ

اس شہر میں کیوں موسم خوں ریز نہیں ہے
لگتا ہے یہاں کوئی بھی چنگیز نہیں ہے

آنکھیں تو برستی ہیں مگر گل نہیں کھلتے
مٹی ہی مرے جسم کی زرخیز نہیں ہے

سرحد میں مری آئے گا کیسے وہ غبارہ
اس وقت ہوا بھی تو بہت تیز نہیں ہے

یہ جام جو محفل میں قطاروں میں سجے ہیں
رنگیں ہیں مگر کوئی بھی لبریز نہیں ہے

اے یار! مری آنکھوں سے کیوں نیند ہے غائب
اس رات فضا بھی تو شر انگیز نہیں ہے

شاہد مری فطرت ہے جو پیتا ہوں شب و روز
انساں کے لہو سے مجھے پرہیز نہیں ہے

خاموشیٔ زنداں کو تقدیر سمجھتے ہو
کیوں پاؤں کے گھنگھرو کو زنجیر سمجھتے ہو

چیخوں پہ مری تم نے کیوں قید لگا دی ہے
خاموش ہوں تو مجھ کو تصویر سمجھتے ہو

اس درجہ ہو لرزیدہ، اس درجہ ہراساں کیوں
اب شاخ شجر کو بھی شمشیر سمجھتے ہو

بچوں کی طرح اس نے کھینچی ہیں ہتھیلی پر
تم ہو کہ لکیروں کو تحریر سمجھتے ہو

بیکار کا وعدہ ہے بیکار کی باتیں ہیں
کیوں شور مسلسل کو تقریر سمجھتے ہو

اب صبح جو ہو گی تو کیا ہوگا کہو شاہد
تم خواب شکستہ کی تعبیر سمجھتے ہو

تہنیت

فردوس گیاوی

کیا

قصور اس کا ہے خود کو مگر سزا دوں گا
یہ حوصلہ کبھی زمانے کو میں دکھا دوں گا
ابھی نہ چھیڑ خدارا خموش رہنے دو
پڑا جو وقت تو اے زندگی صدا دوں گا
ستم نہ دوں گا تجھے اس کا ہے ملال مجھے
میں بانجھ نخل سہی پھر بھی آسرا دوں گا
کبھی شکستہ کھلونے سے دل کو بہلا لے
بڑا ہوا تو کھلونا تجھے نیا دوں گا
خدا کے واسطے مجھ سے نہ رکھ خوشی کی امید
بس ایک غم ہے بجز اس کے اور کیا دوں گا
کبھی تو اترو میرے دل میں چاند کی صورت
تمہاری مانگ ستاروں سے میں سجا دوں گا
اب آرزو نہیں فردوس زندہ رہنے کی
جو زہر دے گا مجھے میں اسے دعا دوں گا

غزلیں

پہلے گھر میں تو ایک شب ٹھہرو
پوری کر دوں گا ہر طلب ٹھہرو
موت کے بعد تم چلے جانا
دیکھو جب تک ہوں جاں بلب ٹھہرو
کیوں خفا ہے وہ ان دنوں مجھ سے
پوچھ لیتا ہوں میں سبب ٹھہرو
میرا دل اب نہیں ہے دل میرا
گھر تمہارا ہے چاہے جب ٹھہرو
کس طرح کس سے بات کی جائے
سیکھ لینے تو دو یہ ڈھب ٹھہرو
پیاس سب کی بجھائی جائے گی
ٹھہرو ٹھہرو اے تشنہ لب ٹھہرو
روشنی ہے کہ تیرگی ہر سو
دھند ڈھاتی ہے کیا غضب ٹھہرو

غزلیں

حنیف ترین سنبھلی
سنبھل

نکلو ہوا کے خول سے کہتی ہے یہ زمیں
لگتی ہے آسماں سے ہر شے بڑی حسین
اپنی شکست کا مجھے احساس ہو گیا
جب سرسرائی جنگ میں خود میری آستیں
پہونچیں اب اس مقام پہ جنگی عداوتیں
سالم ہیں بستیاں مگر اک بھی نہیں مکیں
خواہش کے جنگلوں میں نکلتے ہیں کالے ناگ
تنہائی چھیڑ دیتی ہے جب نیم شب میں بین
سولی پہ روز لٹکے ہے اپنے خیال کی
وہ شخص جو بلا کا ہے حساس اور ذہین
منظر جہت جہت کے ہوئے ہیں عیاں حنیف
آئی ہے جب نگاہ کے ہاتھوں میں دوربین

نوشاد احمد کریمی
بتیا

شب تاریک میں دن کے اجالے ڈھونڈ لیتے ہیں
جو ناممکن ہے وہ بھی تو جیالے ڈھونڈ لیتے ہیں
چھپا کر میں جنہیں رکھتا رہا تنقید کے ڈر سے
مرے احباب وہ سارے رسالے ڈھونڈ لیتے ہیں
شرافت کے ہیں پیہم معترف دشمن مرے، لیکن
مجھے بدنام کرنے کے حوالے ڈھونڈ لیتے ہیں
مہذب لوگ بھی اکثر یہاں جذبات میں آ کر
ذرا سی بات پر تیغ اور بھالے ڈھونڈ لیتے ہیں
ہو دل جو صاف تو ہر موڑ پر اک آستانہ ہے
کہ شہر اولیا میں ہم شوالے ڈھونڈ لیتے ہیں
جنہیں معلوم ہے نوشاد مصرف دست و بازو کا
وہ ریگستاں میں بھی اپنے نوالے ڈھونڈ لیتے ہیں

ہندی :- شیو مورتی

قسط ۲

اردو ترجمہ :- تمنا مظفرپوری

ترشول

رام وادی پارٹی کے رتھ والے نیتا کے
رتھ چھین لئے جانے کے بعد پارٹی کے لوگوں کا رخ جارحانہ
ہو گیا تھا۔ لوگوں کے گلے میں رام نامی گمچھے (رام رام چھپا
ہوا کپڑے کا ٹکڑا) اور سواریوں پر کیسریا جھنڈے
نظر آنے لگے تھے۔ ادھر کئی دنوں سے شاستری جی سے
ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ خبر ملی تھی کہ وہ بھگتوں کو اجودھیا
بھیجنے کی مہم میں جٹے ہیں۔ اجودھیا جانے کے لئے پکا ارادہ
کئے ہوئے خاص کر نیتا لوگ اچانک گرفتاری کے خوف
سے اپنی پہچان چھپائے رکھنے کی کوشش میں لگے تھے
جو رام وادی پارٹی کے رنگ میں رنگ نہیں پائے تھے۔ وہ
رام وادیوں کی حرکت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ رام بہت
بڑے اور پرانے پارٹی والے تھے۔ ایک زمانے سے عوام پر
ان کے نام کا دبدبہ تھا اس لئے مخالفت میں ...
آنے والے لوگ کم تھے۔ جلسے، بازار کی دکانوں، ہر سمت میں

رعایتی دام میں مہیا کرائے گئے جذبات کو بھڑکانے والی
تقاریر کے کیسٹ بج رہے تھے۔ بھیڑ اس کا لطف
اٹھا رہی تھی۔

یہ ہفتوں پہلے کی بات ہے۔

پھر ابھی تین دن پہلے دن بھر فکرمند رہنے کے
بعد شام کو خبر ملی کہ کچھ غنڈے رام بھگتوں نے ڈھانچے
کی گنبد پر چڑھ کر کیسریا جھنڈا لہرایا اور دیوار کو نقصان
پہنچایا۔ سماج میں اس طرح کی جان کی قربانی دینے والے
خودکشی دستہ کی ذہنیت کو لے کر میں دکھی تھا کہ اچانک
شاستری جی کے گھر سے گھنٹہ گھڑیال اور سنکھ کی گونج سنائی
پڑتی ہے۔ شریمتی جی اور بچے باہر چلے جاتے ہیں۔ تھوڑی
دیر بعد شریمتی جی لوٹتی ہیں اور میرے ہاتھ میں لڈو کا ...
دیتے ہوئے کہتی ہیں۔ "شاستری جی گھر میں ہیں۔ لڈو بانٹ
رہے ہیں۔"

" کس لئے ؟"

" ان کی پارٹی نے مسجد پر کیسریا لہرا دیا اس کی خوشی میں بہت خوش ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ مکھ منتری ہوش میں آگیا ہوگا۔ کہتا تھا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اور بھی کئی لوگ ہیں محلے کے لڑکے ہیں۔ شاستری جی ہو ہو کرکے ہنس رہے ہیں۔ ایک بار ہنستے ہنستے ان کی دھوتی کھل گئی۔"

" یہ کوئی ہنسی کی بات ہے۔" میں ہاتھ میں لیا ہوا لڈو کا چورن ان کی طرف لوٹا دیتا ہوں۔ " لو رکھو"

" کھا لیجئے بھگوان کا پرساد ہے۔"

" ایسے پرساد کی ایسی کی تیسی بھاگو یہاں سے۔"

میں غصے میں انہیں ڈانٹتا ہوں۔ مجھے شاستری جی کی اس حرکت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آدمی پہچاننے کی رتی بھر صلاحیت نہیں ہے۔"

" محمود کو بھیجیئے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

" اسے تو شاستری جی نے لڈو بانٹنے کے کام میں لگا دیا ہے۔ محلے کے جن گھروں کے لوگ ان کے ہاں نہیں پہنچ سکے انہیں لوگوں کے گھر لڈو پہنچانے گیا ہے۔"

" اس الو کے پٹھے کو کیا پڑی تھی لڈو بانٹنے کی۔"

" لائیے میں سر دبا دیتی ہوں۔"

" نہیں تم جا کر لڈو کھاؤ۔ مجھے بس ایک کپ چائے بھیج دو۔"

رات دیر تک نیند نہیں آتی۔ تقریباً بارہ بجے شریمتی جی آکر بتاتی ہیں۔

" باہر کئی لوگوں کے ساتھ شاستری جی آئے ہیں۔

میں کہتا ہوں۔" جا کر کہہ دو طبیعت خراب ہے سو گئے ہیں۔"

سویرے پتہ چلا کہ وہ لوگ مٹھائی کے نام پر شریمتی جی سے اکیاون روپئے لے کر ہی ٹلے تھے۔ شریمتی جی نے شام کو یہ سوچ کر مجھے نہیں بتایا کہ میں دینے نہیں دوں گا۔

..... اور آج سویرے شریمتی جی جگا کر بتاتی ہیں۔

" شاستری جی آئے ہیں میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔"

پھر صبح صبح شاستری جی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ لیکن بچنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں آنکھ ملتے ہوئے آتا ہوں ان کے ہاتھ میں تازہ اخبار ہے۔

" حد ہو گئی جناب — دیش جل رہا ہے — اجودھیا جل رہا ہے اور آپ اطمینان سے سو رہے ہیں۔" میں انہیں دھیمے لہجے میں اطمینان دلاتا ہوں

" مجھے پورا یقین ہے کہ اس کام کے لئے آپ اور آپ کے لوگ ہی کافی ہیں۔"

پتہ نہیں وہ کیا سمجھتے ہیں اور اس بات میں مطمئن سر ہلاتے ہیں۔

" سو تو ہے۔ لیکن ایک ہی دردناک خبر ہے۔ شاید آپ کو ابھی تک نہیں معلوم۔ اجودھیا میں مکھ منتری نے کارسیوکوں پر گولی چلوا دی ہے — سینکڑوں لوگ مارے گئے ہیں۔ ہزاروں گھائل ہیں۔ ہائے ویلا مچا ہے۔ ذرا اخبار تو دیکھئے۔

کارسیوکوں نے بھی تو اندھیر کر رکھا ہے شاستری جی۔ اس دن مسجد پر چڑھ گئے اور اب اسے توڑنے، بم سے اڑانے کی قسمیں کھا رہے ہیں — کوئی سرکار کب تک برداشت کرے گی اور کون تو آپ لوگوں

نے خود جلوائی ہے۔ تمہیں تاریخ کو اتنا آفت مچا کر پیٹ نہیں بھرا جو آج تک وہاں گھیرا ڈالے پڑے ہوئے ہیں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے مسجد نہیں مندر کہئے۔"

"کچھ بھی کہہ لیجئے لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا وہ آپ لوگوں اور مقامی دو چار اخباروں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ جتنا زہر اگل سکتے ہیں آپ لوگ مل کر اگل رہے ہیں۔ ایسے میں گولی نہیں چلے گی، خون خرابہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ سرکار کی نظر میں تو ہندو اور مسلمان دونوں برابر ہیں۔ وہ تو دونوں کی ہے۔"

"کیوں ہے دونوں کی۔" شاستری جی اچانک طیش میں آجاتے ہیں۔ "جب مذہب کے نام پر ان مسلمانوں نے دیش کی چھاتی چیر کر دو ٹکڑے کر دیا تو پھر یہاں کیا کرنے کے لئے رہ گئے۔ اپنی ایسی تیسی کرانے۔"

ٹھیک اسی وقت محمود ہم دونوں کے درمیان میں چائے کا کپ رکھ رہا ہے۔

اگرچہ شاستری جی کا میرے گھر آنا جانا پچھلے چار پانچ مہینوں سے ہے لیکن کبھی انہوں نے محمود کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ایک بار خواہش بھی کی تھی تو اس کی ذات جاننے کی۔ میرے 'محمود' مخاطب کرنے پر بھی کبھی غور کیا ہوتا تو جان سکتے تھے کہ روزانہ ان کے لئے دوڑ کر کرسی لانے والا۔ مسکرا کر استقبال کرنے والا۔ ببول کی داتون دینے اور نیبوں کی چائے پلانے والا۔ یہ لڑکا بھی مسلمان ہے۔ تب بھی یقیناً وہ اس کے منہ پر اس طرح گالی گلوچ کی زبان نہ بار بار نہ کرتے۔ میں محمود کا چہرہ دیکھنے لگا جو میبل پر گرد ہوئی چائے جھک کر صاف کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات سے عاری ہے۔ کوئی رد عمل نہیں کیا یہ بہرا ہے؟ تب؟ گالی سن کر بھی کوئی اس طرح بے تعلق رہ سکتا ہے؟ شاستری جی اپنے رو میں بہے جا رہے ہیں۔ "میں تو کہتا ہوں ابھی بھی وقت ہے کہ ان کٹوؤں کو کھدیڑ کر پاکستان بھیج دیا جائے۔ ورنہ پچاس سال بعد کیا ہوگا جانتے ہیں؟"

شکر ہے کہ محمود اندر جا چکا ہے۔

"ایک ایک مسلمان چار چار شادی کر رہا ہے اور ایک ایک سے چودہ بچے پیدا کر رہا ہے۔ خاندانی منصوبہ ان کے لئے حرام ہے اور یہی رفتار رہی تو پچاس سال بعد دیش کی دو تہائی آبادی مسلمانوں کی ہو گی تب دو تہائی کی اکثریت سے ملک کا آئین بدلا جائے گا اور بھارت ورش اسلامک کنٹری گھوشت ہوگا (قرار دیا جائے گا) ملک کے سارے مندروں کو توڑ کر مسجد بھی بنائی جائے گی۔ ہزاروں ہزار بابری مسجد بنا بھارت ماتا زار زار روئے گی۔ مجھے یہ صاف نظر آ رہا ہے۔ یہ ملک پھر بابر کی اولادوں کی غلامی میں چلا جانے والا ہے۔"

"تو کیا آپ کی پارٹی برسر اقتدار آئے گی تو سچ مسلمانوں کو دیش نکالا کر دے گی؟ مسجدیں نیست نابود کر دی جائیں گی؟"

"بالکل کر دی جائیں گی۔ آپ نے ہمارے نیتا کا اعلان نہیں سنا؟ اپنی مسجدیں یہ کٹوے جہاں چاہیں

جائیں۔ اپنی سمسیا کے "اس" میں ڈال دیں لے جاکر
نہیں ڈالتے تو ہم ڈال دیں گے۔ ہم اور ڈائنامائیٹ
اٹھاکر۔ ہمارا خودکشی دستہ تیار بیٹھا ہے۔ جنم بھومی
بلیدان مانگ رہا ہے۔ ہم قربانی دینے اور لینے کے لئے
عہد ہے:"

بلیدان (قربانی) لینے کو۔ اس دکھ کی گھڑی میں
میرے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ جاتی ہے ـــــ
ستری جی بلیدان دینے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے بغیر
قربانی دیتی ہے لیکن بلیدان لینا؟ کیسے؟ کس سے؟
کے گھر میں سبزی کاٹنے کی چھری کے علاوہ دوسرا کوئی
ملے گا ڈھونڈنے پر؟"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہماری نفسیاتی قوت
ہیئے۔ ہمارا اتنا عظیم اتنا منظم اپنا جان سپرد کر دینے
ہندو سماج دیکھئے:"

"عظیم سمجھ میں آیا لیکن منظم؟ یہی رہا ہوتا تو اتنی
غلامی کی روایت پر فخر کرنے کے لئے ہم ہی تھے ساری
میں۔"

"ماضی کو بھول جائیے جناب۔ حال کو دیکھئے ــــ
میں کھول کر دیکھئے۔ اس وقت رام کے نام پر پوری
کے ہم پچاس فیصد ہندو ایک جھنڈے کے نیچے آ رہے
۔۔۔۔"

اس وقت ہماری باتیں سن کر پتا جی ڈرائنگ
روم میں آجاتے ہیں۔ شاستری جی انہیں پرنام کر کے بیٹھ جاتے
اور نئے سرے سے اجودھیا میں ہوئے اندھیر واقعہ
تے ہیں۔

پچاس فیصد کے ایک جھنڈے تلے آنے کی بات پر

مجھے کچھ دن قبل ایک ریزرولیشن حامی ریلی میں سنی ہوئی
کسی کی تقریر یاد آتی ہے۔ وہ ایک جم غفیر کو للکار رہا تھا۔

" ـــــ ریزرولیشن کے خلاف سڑکوں پر اترنے
والے لوگ دغاباز ہیں۔ وہ چناؤ میں ہمارے ساتھ
اس لئے آئے تھے کہ ہمارے سہارے اقتدار میں آسکیں
اقتدار پاتے ہی اپنی والی پر اترنا تھا اتر آئے۔ دغابازی
نئی چیز نہیں ہے۔ ہزاروں سال سے ان کے خون میں
رچی بسی ہے۔ پہلے بھی ہماری بازو کے سہارے منتھن
میں ملے امرت کے بٹوارے میں انہوں نے دغابازی کی تھی۔
سمندر منتھن کا واقعہ آپ لوگ ابھی بھولے نہیں ہوں
گے۔ ہمارے آبا و اجداد کو کیا ملا تھا؟ ہلاہل زہر۔ ہمیں
بے عزت کرنے کے لئے ہمیں کیا نام دیا تھا؟ انہوں نے
راکشش، سور، امرت والی صف میں بیٹھے ہمارے
دو بھائیوں راہو اور کیتو کا کیا حشر ہوا تھا؟ سر قلم۔
آج پھر برسوں کے منتھن کے بعد ہمیں ہمارا امرت ریزر
ولیشن ملا ہے تو اسے چھیننے کے لئے وہ لوگ آگ پانی میں
کودنے کو تیار ہیں۔ ہمیں اس سے نصیحت لینی ہے اور
آئندہ ان کے ساتھ مل کر منتھن کرنے سے توبہ کرنا ہے۔
ورنہ ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو اس چوہے کا ہوا تھا۔
سانپ اور چوہے کی کہانی سنی ہے آپ؟

"ـــ نہیں ـــ" شور اٹھتا ہے۔

"ـــ سننا چاہتے ہیں؟"

"ضرور ـــ ضرور سنائیے" کمل گھوش

"تو سن لیجئے:"

مقرر نے گلا صاف کر کے شروع کیا تھا ـــ ایک
سانپ اور ایک چوہا تھا۔ دونوں ایک لکڑی کے

صندوق میں بند ہو گئے تھے۔ چوہے نے سانپ کو دیکھا — اور سانپ نے چوہے کو۔ چوہا ڈر گیا۔ آنکھ بند کر کے انتظار کرنے لگا کہ سانپ اسے نگلنے کے لئے کب جھپٹتا ہے لیکن سانپ اس سے مذہب کی بات کرنے لگا۔ عاقبت اور بہشت کی باتیں۔ بھگوان کی باتیں کرنے لگا۔ مساوات اور بھائی چارے کی باتیں کرنے لگا۔ بولا۔ زمانہ اتحاد اور اتفاق سے رہنے کا آگیا ہے۔ میں تمہیں نہیں کھاؤں گا۔ بلکہ ہم دونوں مل کر اس لکڑی کے بکس میں سوراخ کریں گے۔ تم لکڑی کو دانت سے کاٹ کر سوراخ بناؤ گے اور میں دُم ڈال کر ناپتا جاؤں گا کہ باہر نکلنے بھر جگہ بنی یا نہیں۔ یہی کیا گیا — جب سانپ نے ناپ کر دیکھ لیا کہ باہر نکلنے کے لائق سوراخ بن گیا ہے تو چوہے کو غٹ کر گیا — تو آپ سمجھ گئے۔"

وہ ہمارے لئے سانپ ثابت ہو رہے ہیں۔ ہم انہیں گمنامی کے اندھیرے سے اقتدار کی روشنی میں لائے۔ وہ ہمیں ہی نگلنے کی سازش کر رہے ہیں۔ یہ ہم پچاس فیصد پسماندوں کے ساتھ دھوکا ہے۔ کیا اب بھی آپ سانپ سے دوستی قائم رکھیں گے؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔" مجمع کا شور

" ان کے جھانسے میں آکر اپنی جان گنوائیں گے؟"

"کبھی نہیں۔"

" ہوشیار۔ ان سے کوس بھر دور رہنا ہوگا۔ وہ اتر جاتے ہیں تو ہمیں دکھن جانا ہوگا — وہ پورب جاتے ہیں تو ہمیں پچھم جانا ہوگا۔ ہمارا ان کا میل جول —

حرام ہے — مجمع کا شور

" اٹھنا بیٹھنا۔"

" حرام ہے"

" کھانا پینا"

" حرام ہے"

اور بھی کیسی کیسی بہت سی باتیں۔

تو کیا شاستری جی کو سماج میں پھیل رہی علیحدہ پسندی اور لوٹنے کا یہ عقیدی مرض کا علم نہیں ہے۔ جو وہ پچاس فی صد آبادی کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک پچاس فی صد اُن کا اور پچاس فی صد اِن کا۔ ہو سکتا ہے اس حقیقت کی انہیں جانکاری ہو جائے تو ان کی سوچ و فکر میں تبدیلی آجائے۔ لیکن کیسے؟ جب تک شاستری جی کی ذات کا صحیح علم نہ ہو جائے۔ آج کل بغیر کسی کی ذات جانے خاص کر ریزرویشن سے جڑے مدے پر اپنی بیباک رائے دینا خطرے سے خالی نہیں۔ بیسوں سال کی دوستی میں دراڑ پڑ سکتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ڈاکٹر لوہیا نے نام سے ذات بتانے والا سرنیم ہٹانے کی مہم چلائی تھی۔ ذات پات توڑنے کا اندولن چلایا تھا۔ لیکن آج اگر آپ پچھڑوں یا اچھوتوں کہی جانے والی ذات سے ہیں اور نام میں ذات والا سرنیم نہیں لگاتے ہیں تو ہم ذات کہیں گے۔ سالا ذات چھپاتا ہے۔ دوغلا ہے — اگر فارورڈ مانے جانے والے ذات سے تعلق رکھتے ہیں تو بھی ہم ذات کہیں گے بڑا ترقی پسند بنا پھرتا ہے بڑا پاکھنڈی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ناموں

ینے ذات کی پہچان کے لئے لقب ضرور لگائیں تاکہ
ھل کر اپنوں سے مل سکیں اور منظم ہو کر پرایوں
ھو دسکیں۔

میرے دو سنگھ دوست تھے۔ میں نے انہیں
یں متعارف کرایا لیکن ایک طویل مدت تک
ے دوسرے سے گھل مل نہ سکے۔ بالآخر ایک
ں کی۔ اس نے بات بات میں بالتوں کی دُم اس
نیتھی کہ اپنی طرح سنگھ ہوگا تو خوشی سے جھوم
تا۔ اگر دوسری طرح کا ہوگا ری ایکٹ کرے گا۔
دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہوا۔ دونوں پہلے ایک
ر کو جان لینا چاہتے تھے۔ میں نے مدد کی۔ میں
تھا کہ دُم کے نیچے درازیں ایک ہیں۔ میں نے دونوں
ٹھا کر ایک دوسرے کو دکھلا دی۔ دونوں خوشی
م اٹھے۔ ایک دوسرے سے لپٹ گئے — تو ایسا
ہے — شاستری جی کی دُم کے نیچے کیا ہے یہ ابھی
اہر نہیں ہوا ہے — شاستری جی کے اطوار کو
ہوئے لگتا نہیں ہے کہ وہ اپنی دُم اٹھانے دیں
یسے شریمتی جی کو یہ کام سونپ دیں تو وہ پتہ میں
یں پتہ چلا کر بتا سکتی ہیں۔

آج کل اپنی برادری کے معزز اور ... ت
میں اپنی نسلی تنظیم کے جلسے کی افتتاح یا صدارت
کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ شاستری جی
ے دراز میں بڑے دعوے ہیں دعوت نامے الٹ
لئے جائیں تو ایک دو اس طرح کے ضرور مل جائیں

ہے شاستری جی کا نام ذات لقب سنہرے حرفوں میں
گا۔ لیکن ضرورت کو ابھی سے۔ شاستری جی کے نیاز مند یا
کہ ہوتی مناسبت سے مجھے پیڑے کرنا ہے کہ ان تقریروں

سے سماجی انتشار کے لئے انہیں ہوشیار کرنے اور کون
سی دلیل کس طرح کی ترمیم کے ساتھ دیا جانا ٹھیک
ہوگا۔ اس درمیان میں شاستری جی کو اپنی اونچی آواز
کا فائدہ پہنچتا ہے۔ انہوں نے پتا جی کو اپنی کسی بات
سے متفق کر لیا ہے۔ وہ اقرار میں سر ہلاتے ہیں۔

شاستری جی میری طرف مخاطب ہوتے ہیں —
"میں کچھ پوسٹر اور اسٹیکر لایا تھا۔ سوچا تھا آپ
کو دیدوں گا آپ اپنے آفس میں آنے والی گاڑیوں پر
چپکوا دیں گے لیکن بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ
میں ابھی تک آپ کے اندر اپنی خواہش کے مطابق
عقیدہ پیدا نہیں کر سکا۔ کمی میری ہی ہے۔ لیکن جاتے
جاتے ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں۔ اس دن آپ
نے کہا تھا کہ ہم نے اپنا بھگوان اپنی غرض کے لئے تخلیق
کر لیا ہے اور اس کا غلط استعمال کیا ہے۔ استعمال
کیا ہے۔ مان لیتے ہیں۔ ایک لمبے عرصے میں اچھے سے
اچھے نظام میں بھی خامی آجاتی ہے لیکن ہمارا اصل
مقصد ہمیشہ عقیدے اور خوف کی راہ سے سماج کو
منظم کرنا ہی رہا ہے۔ اب جس خاص شیئے سے جس
خاص مقام سے ہمارے عوام کا عقیدہ جڑ گیا ہے اس
کی بے عزتی ہوتی ہے تو معتقدان اس میں سیدھا
اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔ آپ متھرا جا کر
دیکھئے کس طرح مندر کی چھاتی پر چڑھ کر مسجد مونگ
دل رہی ہے۔ اس متھرا میں سکندر لودھی نے
مندر کو توڑ کر مورتیوں کے ٹکڑے سے قصائیوں
کے بٹکھرے بنوا دیئے تھے۔ ہمارے اس عبادت
گاہ پر حملہ آور دن کو ... لگا ... کیا ضرورت

تھی؟ اگر یہ زیادتی ہوئی ہے تو اسے درست کیوں نہیں کیا جاسکتا ہے؟

لیکن یہ تو پرانی بات ہے۔ چار پانچ سو سال پرانی۔

"جناب کسی زندہ قوم کی تواریخ میں چار پانچ سو سال گذرتے ہوئے کل کی طرح ہی تازہ ہوتے ہیں"

شاستری جی جوش میں آگئے ہیں۔

"میں کہنا چاہتا ہوں کہ تواریخ کی زیادتیوں کا تدارک کرنے چلیں گے تو اس کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اپنے شودر (ڈوم) راجا برودرتھ کا سر قلم کرکے راجا بنے۔ برہمن سپہ سالار پشیہ متر شنگ نے چونسٹھ ہزار بودھ وہاروں کو ملیامیٹ کیا تھا۔ آج کے نہ جانے کتنے مندروں کے نیچے مسمار بودھ وہاروں کے باقیات دبے ہیں۔ اگر بودھ حضرات آج اپنے مسمار بودھ وہاروں کا تعمیر نو انہیں گرجا گھروں میں کرنے کی ضد کرنا شروع کردیں تو......

ساڑھے چار سو سال پرانی غلطی کا سدھار ہوا ہے تو لگے ہاتھوں اکیس بائیس سو سال پرانی غلطی بھی سدھار لی جائے۔ یہ بھی طے ہو جانا چاہئے کہ کن کن اور کب کب کی غلطیوں اور زیادتیوں کا سدھار کیا جائے گا۔ لیکن شاستری جی کا طیش دیکھ کر یہ بات پچا جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں لیکن اپنے کو روکتے روکتے بھی منہ سے نکل جاتا ہے۔

"جب سے منڈل کمیشن کی سفارشیں لاگو کئے جانے کا اعلان ہوا ہے اس کے حامیوں اور مخالفوں کی شکل میں پورا ہندو سماج دو حصوں میں بٹتا جارہا ہے ایسے میں آپ کا پچاس فیصد لوگوں کا ایک جھنڈے کے نیچے آنے کی بات سوچنا......؟

شاستری جی ہنستے ہیں۔ ان کا غصہ ختم ہوجاتا ہے۔" دیکھئے جناب یہ ڈر جھوٹا ہے۔ یہ بٹوارہ نقلی ہے۔ ہمارے ساتھ فارورڈ بھی ہیں اور بیک ورڈ بھی۔ دلت بھی ہیں پنڈت بھی، آدی واسی بھی ہیں ون واسی بھی۔ اجودھیا میں گولی کھانے والے بھی تقریباً سبھی دلت یا پسماندہ طبقے کے ہیں۔ وہ رام کے ساتھ آج سے تھوڑے ہی ہیں؟ عہد قدیم سے ہیں۔ اپنے آبا بندر اور ریچھ بھالوؤں کی شکل میں۔ ان کے من سے رام کو الگ کرنے والا کوئی مائی کا لال ابھی تک تو پیدا نہیں ہوا۔"

وہ پھر ہنستے ہیں۔ تھوڑی دیر تک مجھے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ پھر محمود کو پکارتے ہیں۔" چیلوا۔ ارے چیلوا"

محمود اندر سے نکل کر آتا ہے۔

"یہ لو بچہ" شاستری جی جھولے سے اسٹیکر کا ایک پیکٹ اور پوسٹر کا بنڈل نکال کر محمود کو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔" پوسٹر محلے میں چاروں طرف چپکانا ہے اور یہ اسٹیکر اسکوٹروں، کاروں، بسوں پر۔ سب سے پہلے اپنے صاحب کے اسکوٹر سے شروع کرنا" وہ جانے لگتا ہے تو کچھ یاد کرکے بولتے ہیں۔

"بچہ! میرے گملے نہیں بھرے تم نے!

"بھر دیا" آج محمود کی آواز مری ہوئی ہے۔

"اس میں پودے لگانے تھے نا؟"

"لگا دیا"

" کب رہے ؟"

" تیس کو ہی آپ نہیں تھے ۔"

" ارے واہ چیلوا ۔ شاباش "

محمود چلا جاتا ہے ۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں ۔ جھولا اور اخبار سنبھالتے ہیں ۔ پھر چلتے چلتے کہتے ہیں ۔

" آج کل اپنے ذمہ یہی کام لے رکھا ہے ۔ داڑھی مونچھ رکھ لیا ہے ۔ اب ان پر مندر تعمیر کے بعد ہی چھرا چلے گا ۔"

" وہ چلے گئے ہیں لیکن مجھے بہت ڈرا گئے ہیں ۔

ادھر جب سے مندر مسجد مسئلہ گہرایا ہے آنے والوں کی گفتگو کا مرکز گھوم پھر کر یہی مدا بن جاتا ہے ۔ پھر اس کی حمایت اور مخالفت میں گرما گرم بحث چھڑ جاتی ہے ۔ زیادہ تر لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں — مسلمانوں کو برا بھلا کہنے پر اتر آتے ہیں ۔ اس وقت محمود ہی انہیں چائے پانی دے رہا ہوتا ہے ۔ اپنے مذہب اپنی برادری کے نام پر گالی کھاتے ہوئے گالی دینے والے کی خاطر مدارات خاموشی سے کرتا ہے کتنا تکلیف دہ ہے ۔ آج تک ایسی بیہودہ گالی تو کبھی سننے کو نہیں ملی تھی اسے ۔ انہیں دنوں بار بار یاد کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے ۔ آنے والے دن لگتا ہے اور زیادہ پریشانیاں لے کر آئیں گے ۔ میں ایسی بحثوں میں سامعہ ہی بنا رہنا چاہتا ہوں ۔ کیا ہوگا ایک مردے معاملے پر بحث کر کے ۔ اپنے موجودہ مسائل اور چیلنج کی طرف سے آنکھ موند کر کے ہم سولہویں صدی کے دفنائے ہوئے مسئلہ پر خواہ مخواہ اپنی نیند حرام کر رہے ہیں ۔ میرا بس چلے تو میں مندر مسجد دونوں کو زمین دوز کرا کر وہاں بچوں کے کھیلنے کیلئے پارک بنوا دوں ۔ لیکن میری سنے گا کون ، لوگ بحث اور کٹھ حجتی کرتے ہیں ۔ جذباتی ہو جاتے ہیں ، چلاتے ہیں ۔ دہاڑتے ہیں اور میں ڈرنے لگتا ہوں ۔ میری آنکھوں کے سامنے معصوم بچوں کی چیخ چلاہٹ ۔ الاؤں کی بیخ اور لپلپاتے ہوئے شعلوں میں دھوں دھوں کر کے جلتے گاؤں نظر آنے لگتے ہیں ۔

پھر صبح کو شاستری ٹہلنے کے لئے جگانے آئیں گے اور راستے پھر مسلمانوں کو اس دیش سے باہر نکلنے کے لئے دلیل پیش کریں گے یہ سوچ کر میں دل ہی دل میں خوف زدہ ہونے لگتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ دن گئے جب افواہ پھیلانے کا کام ہوا اصلاتی نظام کے بغیر دور دراز کے ان پڑھ دیہاتی کرتے تھے ۔ ان کے لئے افواہیں خبروں کی کمی پوری کرتی تھی ۔ اب یہ کام بھی اخبار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے ۔

اجودھیا سے لوٹنے والے رام بھگت اجودھیا کے سانحے کا بغیر دیکھے آنکھوں دیکھا حال سنا رہے تھے ۔ اور چائے پان کی دکان پر لوگ جمع ہو کر عقیدت سے سن رہے ہیں ۔ انہیں چائے پان کراتے جا رہے ہیں ۔ ان بھگتوں کے مطابق بھارت پاک تقسیم کے وقت بھی ایسا خوفناک خون خرابہ ہوا ہوگا جیسا اجودھیا سے لوٹنے کے راستے میں دیکھتے ہوئے آ رہے ہیں ۔ راستے میں پڑنے والے مندر

ٹوٹ ۔ ۔ ۔ مورتیاں ناپاک کی جا رہی تھیں مسلمان

دنگائی رات میں انہیں توڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ دن میں مسلمانوں کے گاؤں میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ ہی چار دن میں وہ لوگ یہاں تک پہنچ جائیں گے تیموری سینا۔

جو اجودھیا نہیں گئے لیکن اپنے تخیلاتی پرواز کے زور پر ان کا اجودھیا کا منظر پیش کرنا تو اور بھی حیرت انگیز اور خون کھولا دینے والا ہے ان کے مطابق پتہ نہیں کتنے رام بھگتوں کو مکھ منتری نے خود اپنے سامنے ٹرک میں لوڈ کروایا اور سرجو کے پل پر لے جاکر بیچ لہر میں پھینکوا دیا۔ پھینکے گئے لوگوں کے جوتے اور چپل پل پر پڑے ہیں اور کچھ پانی میں تیرتے دیکھے گئے ہیں۔ ان کے انگوچھے اور جھولے پل کے ریلنگ میں پھنسے لٹک رہے ہیں۔

ان افواہوں پر جو یقین نہیں کرتے وہ چپ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں کیونکہ افواہ پھیلانے والا طبقہ نہ صرف طاقت ور اور منظم ہے بلکہ ان کی آنکھوں میں قتل و غارت گری کے ارادے جوش مار رہے ہیں۔

اجودھیا میں ہوئے حادثے کے رد عمل میں بنگلہ دیش اور پاکستان میں مندر توڑے جانے، ہندوؤں کی دکانیں اور گھر لوٹنے اور جلانے والے، بچوں کو آگ میں جھونکنے، عورتوں کی آبرو لوٹنے جانے کی خبریں آ رہی ہیں۔ ان کو افواہوں کی چاشنی میں ڈبونے کے بعد بد تصویریں ابھر رہی ہیں اس سے خوف بے یقینی اور دہشت کا ماحول گہرا رہا ہے۔ لمبی دوری کے سفر منسوخ ہو رہے ہیں۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی تصویر جانی دشمنی کی شکل میں ابھاری جا رہی ہے۔ دفتر میں میں کام کرتے ہوئے مسلمان ملازمین کی حاضری گھٹ رہی ہے جو آ رہے ہیں وہ بھی بہت سہمے اور ڈرے ہوئے ہیں۔ وہ اجودھیا مسئلہ پر کچھ بھی بولنے سے پرہیز کر رہے ہیں۔ لوگ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ لاتعلق بنے سُن لیتے ہیں۔ کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

میں دفتر سے تھوڑا جلدی آگیا ہوں چھت پر ٹہل رہا ہوں کہ بیٹا دوڑتا ہوا آتا ہے۔ دہشت زدہ ہے اور ہانپ رہا ہے۔ تقریباً گود میں سماتے ہوئے بتاتا ہے۔ "پاپا۔ آج ہمارے اسکول میں مسلمان آئے تھے۔" بولتے ہوئے اس کی آنکھیں خوف سے پھیل رہی ہیں۔

"اچھا۔ کیسے پتہ چلا؟"

"اسکول کے چپراسی نے بتایا۔ وہ سب گیٹ کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن چپراسی نے پہچان لیا۔ فوراً گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔ ہمارے بچے ڈر گئے تھے ایک آدھ رونے بھی لگے تھے۔"

"مسلمان کون ہوتے ہیں بیٹا؟"

"بچے پکڑنے والے، آگ لگانے والے۔"

"کس نے بتایا؟"

"سبھی بچے جانتے ہیں۔"

"انہیں کس نے بتایا؟"

"پتہ نہیں۔"

"تم نے کس کو بتایا؟"

"محمود کو"

"اس نے کیا کہا؟"

"وہ ہنس رہا تھا۔"

میں ہنس کر کہتا ہوں۔ "بیٹا، مسلمان تو محمود بھی ہے۔"

"نہیں پاپا۔" بیٹا خوف زدہ ہو کر کہتا ہے۔ "وہ تو بھائی جان ہے۔"

میں محتاط ہو جاتا ہوں۔ یہ ضروری ہے کہ محمود اس کی نظر میں بھائی جان ہی بنا رہے۔ مسلمان نہ ہو جائے۔ مسلمان کے ساتھ اسکول جانے سے وہ انکار بھی تو کر سکتا ہے پھر دقت ہو جائے گی۔ میں چپ رہ جاتا ہوں۔

مسلمان کے نام پر ہمارے محلے کے چوراہے پر ایک حجام کی جھونپڑی ہے۔ ہنومان مندر کے بغل میں فٹ پاتھ پر۔ جس میں باپ درزی کا کام کرتا ہے اور بیٹا نائی کا۔ اس کے زیادہ تر گاہک ہندو ہیں۔ دیوالی، دسہرہ کے موقع پر کام اتنا بڑھ جاتا ہے کہ بیٹا بھی بال کاٹنا چھوڑ کر سلائی میں باپ کی مدد کرنے لگتا ہے۔ ان کا گھر پاس کے گاؤں میں ہے۔ بیٹا کسی وقت جا کر گھر سے ٹفن کیریر میں دونوں فرد کا کھانا لے آتا ہے اور کام کرتے کرتے تھک کر دونوں اسی جھونپڑی میں ہی سو جاتے ہیں۔

لیکن ان دنوں وہاں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ باپ بیٹے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ شاید داڑھی بنانے والے اندر ہی اندر نائی کی نیت پر شک کرنے لگے ہیں۔ کہیں داڑھی بناتے بناتے گلے پر ہی استرا نہ پھیر دے۔ ذرا سا ہاتھ ہلانے بھر کی دیر لگے گی۔ جب اندر نفرت اور غصہ بھرا ہو تو کیا نہیں ہو سکتا؟

بغل میں ہنومان مندر میں حاضری دینے والے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ فٹ پاتھ پر مندر کے باہر آرتی کے وقت لوگوں کے کھڑے ہونے کے لئے جگہ تنگ ہو جاتی ہے بھیڑ درزی کی جھونپڑی کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔

اب آرتی شروع ہونے سے پہلے سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی بیٹا سائیکل لے کر گاؤں چلا جاتا ہے اور صبح نو دس بجے لوٹتا ہے۔ باپ بھی اندھیرا ہونے کے ساتھ ساتھ جھونپڑی کا دروازہ بند کر لیتا ہے اور صبح کا رکھا کھانا کھا کر روشنی گل کر کے لیٹ جاتا ہے۔

لوگوں کو ان کا محلے کے داخلے پر ہی اس طرح جما رہنا پریشان کرنے لگا ہے۔ باپ بیٹا شبہے کی نظر سے دیکھے جانے لگے ہیں۔ لوگوں کو شک ہے کہ سب کے سو جانے کے بعد رات کے اندھیرے میں ندی پار کے مسلمان محلے کا بھید لینے درزی کی جھونپڑی میں آتے ہیں۔ تاکہ جب کبھی بھی وہ حملہ بولیں تو ہر گھر کے اندرونی حالات سے اچھی طرح واقف رہیں۔ ہنومان مندر کے پجاری نے بھی خبر دی ہے کہ ایک رات جب وہ پیشاب کرنے اٹھا تو دیکھا کہ درزی کی جھونپڑی سے نکل کر تین آدمی اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ضرور اس کا لڑکا بھی یہاں سے نکل کر مسلمانوں کے محلے میں بتاتا ہوگا۔ ہم لوگوں کے بھید دیتا ہوگا۔

مردوں کے ... پر چلے جانے کے بعد محلے کی عورتیں کسی کے ... یا چھت پر جمع ہو جاتی ہیں اور طرح طرح کے خوفناک واقعہ کا تصور کر کے رو دھو کر کھڑی کرتی رہتی ...

دوپہر میں چھت پر شریمتی جی، مصرائن اور لال بہو بیٹھی ہیں۔ دھوپ تیز ہو جانے پر کسی سائے میں چارپائیاں کھینچ لیتی ہیں۔ مصرائن کا آج کوئی برت ہے۔ وہ دہی لینے آئی ہیں۔ لال بہو شریمتی جی کو کوئی نئی ڈیزائن بنانے آئی ہیں لیکن یہ سب صرف ظاہری بہانا ہے دراصل مقصد ہے مختلف ذرائع سے سنی گئی افواہوں کا تبادلہ خیال کرنا۔ گفتگو کا مستقل موضوع خوف اور نفرت ہے۔ دونوں ہی مسلمانوں کے لئے ہے۔

لال بہو بتاتی ہیں کہ سڑک کے کنارے پر پی ڈبلیو ڈی کی آٹھ دس ٹرک گٹی کل راتوں رات مسلمانوں نے ڈھو کر اپنی چھتوں پر جمع کر لیا ہے کرفیو میں پولس اور پی اے سی پر پتھراؤ کرنے کے لئے۔

مصرائن بتاتی ہیں کہ آج سویرے وہ گومتی اشنان کرنے کے لئے جا رہی تھیں۔ تین عورتیں تھیں۔ بہت اندھیرا تھا اور راستہ سنسان لگتا تھا ابھی ابھی کسی کھائی یا کھنڈ سے مسلمانوں کی جماعت نکلے گی اور دبوچ لے گی۔ اس وقت گھو گھو کر کے گھگھوا بول پڑا تو ہمت جواب دینے لگی۔ ڈر کے مارے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ ہم تینوں عورتیں بغیر غسل کئے راستے سے واپس لوٹ آئیں۔ ایسے میں چور بدمعاش کہاں چھپے بیٹھے ہوں۔ کہا نہیں جا سکتا۔ چرچا چوریوں، ڈکیتیوں اور رہزنی کی طرف کبھی مڑ جاتا ہے۔ ہم ادھر ادھر سے آ جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہم بتاتا تو مسلمانوں کے لونڈے ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نکلتے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے کبھی ایک جیب سے مسالہ نکالا اور دوسرے جیب سے کاغذ شتلی اور لپیٹ کر پھینک دیا دھڑام سے۔

جتنی چوریاں ڈکیتیاں اس وقت ہو رہی ہیں سب مسلمان کر رہے ہیں۔ چوری کی چرچا سے شریمتی جی کو ایک حادثہ یاد آیا۔ جوان کی ہوشیاری سے ہوتے ہوتے ٹل گیا تھا۔

" بات پچھلے مئی مہینے کی ہے۔ ہم لوگ مرزا پور میں تھے۔ پیچھے والے مکان میں ایک انجینئر صاحب رہتے تھے۔ ہم لوگوں کا آنگن ایک ہی تھا۔ بیچ میں قد سر کے برابر اونچی دیوار تھی :" شریمتی جی بتاتی ہیں۔" جمہ کا روزہ چل رہا تھا۔ اسے مجبوراً چار بجے سحری دینے کے لئے تین بجے ہی چولہا جلانا پڑتا تھا۔"

" روزہ ؟" مصرائن ٹوکتی ہیں۔" کس کے روزہ نماز کی بات کر رہی ہو؟"

" اسی اپنے محمود کی۔ گائے دیکھنے والا لڑکا ہے"

" او مسلمان ہے"

" لو۔ آپ کو ابھی تک یہ نہیں معلوم۔"

تھوڑی دیر تک خاموش رہتی ہیں۔ اس درمیان میں محمود کچن سے مصرائن کے گلاس میں دہی لا کر ان کے سامنے رکھ جاتا ہے۔

" شریمتی جی آگے کہتی ہیں :" ہاں تو کیا کہہ رہی تھی میں ؟ ہاں دیکھا کہ انجینئر صاحب کے آنگن میں پُرم پُر بار رہے ....."

لیکن درمیان میں مصرائن الزام لگانے کے انداز میں بولتی ہیں۔" یہ بات چھپا کر آپ اچھا نہیں کیا۔" شریمتی جی کو سمجھنے میں تھوڑی تاخیر ہوتی ہے۔" کون سی بات۔"

" یہی کہ آپ کا نوکر مسلمان ہے۔"

" اس میں چھپانے کی کونسی بات ہے۔ شریمتی جی تھوڑی سی ناراضگی دکھاتی ہیں۔" روز تو آپ کے سامنے بیسوں بار اس کا نام لے کر بلایا جاتا تھا۔ محمود، محمود۔ آپ سنتی نہیں تھیں کیا؟"

" پتہ نہیں۔ مجھے تو منگو سنائی دیتا تھا۔" لال بہو آئی گئی کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔" لڑکا ہے تو صاف ستھرا، مزاج کا بھی اچھا ہے۔"

" مزاج سے کیا ہوتا ہے جی۔ مزاج اچھا ہے تو چوکے میں گھس جائے گا۔ ملیچھ ہو کر برتن بھانڈا چھوئے گا۔ سب کچھ بھرشٹ کر کے رکھ دیا۔"

" ہوٹل میں تو پتہ نہیں کون کس ذات کا چھوا آجکل کھا رہے ہیں۔ لال بہو پھر ٹھنڈا چھینٹا مارنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن مصرائن کا منہ تمتمایا ہوا ہے۔"

" کیا ہوٹل کی بات چوکے میں چلے گی۔ اتنا تنگ دل ہو گئے ہیں ہم لوگ؟"

" اپنی اپنی ماننا ہے" لال بہو ذرا اٹک کر لوٹیں۔

" ہمارے گھر میں تو نہیں مانا جاتا یہ سب۔"

" آپ لوگ کیوں مانیں گی۔ آپ لوگ تو خود ہی آدھے مسلمان ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارا خاندان تو سرجو پاری ہے۔ اور اجودھیا میں رام للا کی جنم بھومی کو بھرشٹ کرنے والے کون ہیں؟ اس وقت چاروں طرف آگ لگانے والے کون ہیں؟ اس کے باپ دادے تو ..... جانے بھی دیجئے۔ کھری کھوٹی سناتی ہوئی مصرائن کہتی ہیں۔" آپ نے دھرم بھرشٹ کروا کر چھوڑا۔ ہمیں بھی اپنی برابری میں اتار کر چھوڑا۔"

" اہں! لگتا ہے آخری بات سے شریمتی جی کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگتی ہے۔

" تو ہم لوگ بہت گرے ہوئے ہیں۔" وہ بھو بھر کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔" جب آپ کے مصرا جی ملیچھ سے چوری چوری کلب میں دارو منگوا کر پیتے ہیں تب آپ کا دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا ہے؟ جب ایک ملیچھ سے آپ چوری چوری ہوٹل سے مچھلی منگوا کر کھاتی ہیں تب آپ کا دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا؟" کہاں بیٹا کے پاس پہنچ چکی مصرائن کو یاد دلاتی ہیں۔

" اپنی گلسیا لیتی جائیے۔"

" گلسیا (گلاس) تو رکھیے روزہ کھولنے کے بدلے۔" مصرائن بغیر مڑے کہتی ہیں۔ اور دھم دھم کر سیڑھیاں اتر جاتی ہیں۔ لیکن شریمتی جی کا پھینکا ہوا آدھا بھرا ان کا گلاس اس انداز سے نشانہ لے کر پھینکتی ہیں کہ مصرائن کے گھر پہنچنے کے پہلے وہ سڑک پار کرتا ہوا ان کے برآمدے کی سیڑھی پر گر کر خالی ہو جاتا ہے۔

لال بہو دیر تک شریمتی جی کو یقین دلاتی ہیں کہ اس جھگڑے میں بلاشبہ جیت ان کی ہوئی ہے۔

—— جاری —— رہے

● نوٹ

ترشول کی افتتاحی قسط میں نوٹ کے تحت سہواً کہانی کا پس منظر ۱۹۹۲ء لکھا گیا ہے۔ دراصل کہانی کا پس منظر ۱۹۸۹ء ہے جب رام رتھ پورے ملک میں گشت کرنے نکلا تھا اور بابری مسجد پر کیسریا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ مسجد کو نقصان پہنچانے والے شرپسندوں پر ملائم سنگھ سرکار کی پولیس فائرنگ ہوئی تھی۔ قارئین اسی پس منظر میں ترشول

سہیل جامعی
دربھنگہ

حکایت

" توبہ کرو، کیونکہ توبہ قبول ہوتی ہے ؟
پھر اس کے بعد روئے زمین پر صرف بدکار اور شریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کے مانند سبک رو و تیز رفتار اور درندوں کے مانند مضبوط و سخت ہوں گے، وہ نہ تو بھلائی سے واقف ہوں گے اور نہ برائی و بدکاری سے اجتناب کریں گے ۔"

" میری باتیں کچھ سمجھ میں آرہی ہے دوستوں ۔"

" نہیں ۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے ؟ "

" یعنی لوگ برائی و بدکاری کے کاموں اور جنسی خواہشات کی تکمیل میں اس طرح سبک رو اور تیز رفتار ہوں گے جیسے پرندے ہوتے ہیں اور ظلم و تشدد کرنے فتنہ و فساد پھیلانے اور لوگوں کے جان و مال کو ہلاک و برباد کرنے میں اس طرح سفیع القلب اور سخت مزاج ہوں گے جس طرح درندے ہوتے ہیں ۔ بس اس جملے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ علم و دانائی، حلم و اخوت اور دوسرے انسانی و اخلاقی اوصاف سے بالکل خالی ہوں گے بلکہ ان کے دل و دماغ اور مزاج و طبیعت پر ظلم و سخاوت، دست درازی، وحشت درندگی اور ہلاکت خیزی کا غلبہ ہوگا ۔

" تو دوستو ! اب تو توبہ کرو ۔ کیونکہ توبہ کرنے سے گناہیں معاف ہوتی ہیں ۔" پھر آگے ایک وقت آئے گا جب وہ تم سے پوچھے گا ۔" اے بندے ! کیا میں نے تجھے فضیلت و شرف نہیں بخشا تھا، کیا میں نے تجھے تیری بیوی عطا نہیں کی تھی جو میں نے تیری ہی جنس اور تیری ہی نوع سے پیدا کی تھی اور پھر تیرے اور اس کے درمیان انس و محبت اور پیار کا رشتہ قائم کیا تھا

" بے شک ایسا ہی ہوا تھا یعنی تو نے اپنے جن انعامات کا ذکر فرمایا وہ سب مجھے دنیا میں حاصل تھی

" تو کیا تجھے یہ خیال تھا کہ ایک دن تو مجھ سے ملے

" مجھے یہ خیال نہ رہا اور میں ایسی غفلت میں پڑ

گیا تھا کہ اس بات کو بھول ہی گیا۔"

" تو جا میں نے بھی تجھے فراموش کر دیا جیسا کہ تو نے دنیا میں میری اطاعت اور میری یاد کو فراموش کر دیا تھا"

پھر ایسا ہی دوسرے سے بھی پوچھا گیا اور وہ صاف اپنے اعمال سے مکر گیا۔" میرے پروردگار! میں تجھ پر، تیری کتاب پر اور تیرے پیغمبروں پر ایمان لایا تھا، میں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے اور صدقہ دیا، زکوٰۃ ادا کئے اور جس قدر ہو سکا اپنی نیکیاں گنوادیں۔

" تو یہیں ٹھہر، ہم بھی تیرے بارے میں گواہ پیدا کئے دیتے ہیں۔ یعنی تو نے اپنی نیکیوں کے بارے میں دعویٰ کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تو نے میری نعمتوں کی شکر گزاری میں اپنی دنیاوی زندگی کو اعمالِ خیر سے معمور کر رکھا تھا تو ذرا ٹھہر جا ہم گواہوں کے ذریعہ ابھی بتائے دیتے ہیں کہ تو اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے۔

یہ سُن کر وہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ بھلا اس وقت میرے خلاف کون گواہی دے گا۔ پھر جب اس کے اعمال اس کے سامنے آگئے تو وہ منافقوں کی صف میں جا پہنچا۔

تو دوستو! توبہ کرو۔ کیونکہ توبہ کرنے سے گناہیں معاف ہوتی ہیں۔

تو دوستو! اب تک میں تمہیں حکایتیں سنا رہا تھا، اب چلو میں تمہیں دوسری طرف لے چلتا ہوں۔ سننا اور غور سے سننا۔ ایک دن دو شخص میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ کو زمینِ مقدس کی طرف لے چلے

ایک جگہ پہنچ کر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا کھڑا اور اس کے ہاتھ میں لوہے کی زمبور ہے اور وہ اس بیٹھے ہوئے کے کلّے کو اس زمبور سے چیر رہا ہے۔ پھر دوسرے کے ساتھ یہی معاملہ کر رہا ہے جب دوسرے کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے تو اس وقت تک پہلے کا کلّہ بالکل درست ہو جاتا ہے اور وہ پھر اس عمل کو دہرانے لگتا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ دونوں شخص بولے آگے چلو، آگے چلو، ہم آگے چلے، یہاں تک کہ ایک ایسے شخص کے پاس سے گزر ہوا جو لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر پر ایک شخص بڑا بھاری پتھر لئے کھڑا ہے۔ وہ اس پتھر کو پوری طاقت سے لیٹے ہوئے شخص کے سر پر دے مارتا ہے پتھر لڑھکر دور جا گرتا ہے۔ جب وہ اس کو اٹھانے کے لئے جاتا ہے اور لوٹ کر اس کے پاس آنے نہیں پاتا کہ اس کا سر پھر اچھا خاصا جیسا تھا ویسا ہی ہو جاتا ہے اور پھر اس کو اسی طرح مارتا ہے۔

میں نے پوچھا۔" یہ کیا ہے ؟"

وہ دونوں بولے۔" آگے چلو، آگے چلو،" ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک غار میں پہنچے اس میں آگ جل رہی تھی۔ اور اس میں بہت سے ننگے مرد اور عورت بھرے پڑے تھے۔ جس وقت وہ آگ اوپر اٹھتا اس کے ساتھ ہی سب اُٹھ جاتے۔

میں نے پوچھا:" یہ کیا ہے ؟"

وہ دونوں بولے۔ آگے چلو، آگے چلو۔ یہاں تک کہ ایک خون کی نہر پر پہنچے۔ اس کے بیچ ایک شخص کھڑا ہے اور نہر کے کنارے پر ایک

شخص کھڑا ہے اور اس کے سامنے بہت سے پتھر پڑے ہیں۔ وہ نہر کے اندر والا شخص نہر کے کنارے کی طرف آتا ہے جس وقت نکلنا چاہتا ہے کنارے والا شخص اس کے منہ پر ایک پتھر اس زور کا مارتا ہے کہ وہ اپنی پہلی جگہ پر جا پہنچتا ہے۔ پھر جب وہ نکلنا چاہتا ہے اسی طرح پتھر مار کر اسے اس کی جگہ پر پہنچا دیا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا: کیا ہے؟

وہ بولا۔ آگے چلو۔ آگے چلو۔ یہاں تک کہ ایک ہرے باغ میں جا پہنچے۔ اس باغ میں ایک بہت بڑا پیڑ ہے اور اس کے نیچے ایک بزرگ آدمی اور بہت سے بچے بیٹھے ہیں اور پیڑ کے پاس ایک اور شخص بیٹھا ہے اس کے سامنے آگ جل رہی ہے اور وہ اس کو دھونک رہا ہے۔ پھر وہ دونوں مجھ کو چڑھا کر پیڑ کے اوپر لے گئے جہاں پیڑ کے بیچ میں ایک نہایت عمدہ گھر بنا ہوا تھا پھر اس گھر کے اندر لے گیا۔ میں نے ایسا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا اس میں مرد، بوڑھے، جوان اور عورتیں دیکھے بہت سے تھے پھر اس سے باہر لا کر اور اوپر لے گئے تو وہاں ایک گھر پہلے گھر سے بھی عمدہ تھا۔ اس میں لے گئے۔ اس میں بوڑھے، جوان تھے۔

میں نے ان دونوں شخصوں سے کہا کہ تم نے مجھے تمام رات گھمایا اب بتاؤ یہ سب کیا [illegible] تھا؟

انہوں نے کہا کہ وہ شخص جو تم نے دیکھا تھا کہ اس کے کلے چیرے جاتے تھے وہ شخص جھوٹا ہے اور جھوٹی باتیں کرتا تھا اور وہ باتیں جہاں میں مشہور ہو جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور جس کا سر پھوڑے جا رہے تھے وہ شخص ہے جس کو اللہ پاک نے قرآن پاک کا علم دیا، وہ رات کو اس سے غافل ہو کر سو رہا اور دن کو اس پر عمل نہ کیا، قیامت تک اس کے ساتھ یہی ہوتا رہے گا۔ اور جن کو تم نے آگ کے غار میں دیکھا وہ زنا کرنے والے لوگ ہیں اور جس کو خون کے نہر میں دیکھا وہ سود کھانے والا شخص ہے اور پیڑ کے نیچے جو بوڑھا شخص تھا وہ حضرت ابراہیمؑ تھے اور ان کے ارد گرد جو بچے دیکھے وہ لوگوں کی جائز اولاد ہے اور جو آگ دھونک رہا ہے وہ مالک، داروغہ دوزخ کا ہے۔ اور پہلا گھر جس میں آپ داخل ہوئے عام مسلمانوں کا ہے اور یہ دوسرا گھر شہیدوں کا ہے۔ میں جبرئیلؑ ہوں اور یہ میکائیلؑ، پھر بولے: "سر اوپر اٹھاؤ" میں نے سر اوپر اٹھایا تو میرے اوپر ایک سفید بادل نظر آیا۔ بولے: "یہ تمہارا گھر ہے۔"

میں نے کہا: "مجھے چھوڑ دیں، میں اپنے گھر میں داخل ہوں"

بولے: "ابھی تمہاری عمر باقی ہے، پوری نہیں ہوئی"

تو دوستو! توبہ کرو کیونکہ توبہ کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں!

بس قصہ بیان کر تو کہ فکر وہ کرے!!

کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ و بچار کریں ؟؟

● براہ کرم اپنے مضامین اور دیگر تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں ——— (ادارہ)

منظر مظفرپوری
مظفرپور

انٹرویو

"صنف افسانہ کو میں اظہار کا 'POWERFULL MEDIA' تصور کرتا ہوں!" ——— مشرف عالم ذوقی

منظر — سب سے پہلے آپ اپنا مختصر تعارف بتائیں؟

ذوقی — میرا اصل تعارف میری کہانیاں ہیں۔ بچپن میں ماں باپ نے جو نام دیا وہ مشرف عالم تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہی تھا۔ تب شاعروں میں مجھے ذوق کا کلام بے حد پسند تھا۔ جب مسرور ہوتا تو ذوق کا کلام بلند آواز میں گنگنانے لگتا۔ ابا حضور جناب مشکور عالم بصیری نے اسی ذوق پسندی کی وجہ سے میرا تخلص ذوقی کر دیا۔ تب سے میرے نام میں ذوقی کا اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ اپنے والد محترم کا میں شکر گذار ہوں۔ بہت چھوٹی سی عمر میں میری تخلیقات رسائل کی زینت بننے لگیں۔ تب سے ابتک ادب میں ایک بہت لمبا سفر طے کر لیا ہوں۔

منظر — آپ کا ادبی و تخلیقی سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

ذوقی — تخلیقی سفر کی پہلی شروعات بچوں کا رسالہ "پیام تعلیم" سے ہوئی۔ پہلا افسانہ ممبئی سے نکلنے والا رسالہ "کہکشاں" میں ۷۵ء میں شائع ہوا۔

منظر — کیا ادیب کو کسی نظریئے سے منسلک ہونا چاہئے؟ یا وہ آزاد رہ کر بھی اچھا ادب تخلیق

کرسکتا ہے ؟

ذوقی ــ ادیب آزاد رہ کر ہی اچھی تخلیق کرسکتا ہے۔ نظریہ یا کسی ISM سے منسلک ہونے کو آج لوگوں نے غلط طرح سے PROPA-GATE کر رکھا ہے۔ ایک خاص نظریہ یا ٹھہراؤ کا مطلب ہے، کہانی کو سمت عطا کرنا۔ مذہب بھی ایک خاص طرح کی پابندی کا نام ہے کہانی یا ادب بھی اس پابندی کا قائل ہو تو اس میں اختلاف کیسا ؟

منظر ــ دلی جذبات کے لئے آپ نے صنفِ افسانہ کو ہی منتخب کیوں کیا ؟

ذوقی ــ افسانہ یا ادب دلی جذبات یا روحانی تسکین کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ ادب اظہار بیان کا وسیلہ ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ادب میں صنف افسانہ کو میں اظہار کا — POWER-FULL MEDIA — تصور کرتا ہوں۔ اس میں افسانہ نگار ہی نہیں، بلکہ میں ناول کے میدان میں بھی اترا۔ چیخوف، موپاساں، اور ایسے کچھ بہت اہم نام کو چھوڑ دیں تو بہت اچھا لکھنے والوں کی جو فہرست مرتب ہوگی وہ ناول نگار کی ہی ہوگی

منظر ــ آپ کی افسانوی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کیسے کیسے واقعات حصہ لیتے ہیں ؟

ذوقی ــ میری کوئی افسانوی شخصیت نہیں ہے کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ ہاں، ادب لکھنے والے کے لئے سب سے اہم چیز کمٹمنٹ کے لئے وہ محنت کرتا ہے، مطالعہ کرتا ہے۔ اس مطالعے سے وہ اپنے وژن کو ایک ٹھہراؤ دیتا ہے۔ یہی ٹھہراؤ آگے چل کر اس کی ادبی نشوونما میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

منظر ــ کیا یہ ممکن ہے کہ افسانہ نگار معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی لا سکتا ہے ؟

ذوقی ــ بیشک، افسانہ نگار تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ چاہے وہ معاشرے کی بدعنوانیاں ہوں یا کوئی عالمگیر مسئلہ۔ انقلاب کو اگر محدود معنوں میں استعمال نہ کریں تو چیز اسے کھٹکتی ہے۔ سماج میں اور ہر جگہ، وہ وہاں تغیر دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی تگ و دو میں اس کا ادب پھلتا پھولتا ہے۔ معاشرے پر ادب کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ آج جس نوع کی کہانیوں کی ضرورت ہے ویسی لکھی جائیں تو ہم خوبصورت تبدیلیوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔

منظر ــ آج کل ادب میں مختلف اسکول آف تھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ گروہ بندی ہے، جدید ادبی اسٹیج کے لئے یہ فن کتنا صحیح ہے ؟

ذوقی ــ اسکول آف تھاٹ، گروہ بندی، سب الگ الگ چیزیں ہیں۔ گروہ بندی مغالطے میں ڈالنے والا لفظ ہے۔ جبکہ اسکول آف تھاٹ ادب کے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ لکھنے والا اس کا جواب اسکول آف تھاٹ کے وسیلے سے سوچتا

[illegible]
ساتھ افسانہ تجریدیت کی شکل میں چلا گیا ہے جو ادب کا سنجیدہ المیہ ہے۔ ہاں اگر دوسری سطح نے کبھی ادب کو فائدہ نہیں پہنچایا۔ الگ رہ کر گوشہ نشیں ہو کر لکھتے رہنا زیادہ بہتر ہے۔

— تجریدی افسانے کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

— ایبسٹرکٹ پینٹنگس [ABSTRA-ACT PAINTINGS] ہو سکتی ہیں — ادب نہیں۔ تجریدی افسانے نے اردو ادب کو بہت دنوں تک دھوکے میں رکھا اور نقصان پہنچایا۔ ایسے افسانوں کا سر ہوتا تھا نہ پیر۔ اب دیکھئے وہ لوگ جو تجریدی افسانے لکھ رہے تھے کہاں گم ہو گئے۔

— ہمارے ادب میں قدامت پسندی کا جو احساس ابھرا ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

— قدامت پسندی کسی بھی ادب کے لیے مضر ہے۔ آج ہم سائنس سے پیچھے ہیں [illegible]

ذوقی — کوئی زبان [illegible] پہچان نہیں بن سکتی [illegible] زبان کا [illegible] سب سے [illegible] نہیں ہو سکتی۔ اردو کو [illegible] کے لئے ہم سب کو ساتھ مل کر بیٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہاں! اگر آپ اردو زبان سے الگ ادب کی بات کر رہے ہیں تو پچھلے ایک دو سالوں نے یہ خوشگوار تاثر دیا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ خاص کر فکشن میں صغیر رحمانی، زیب اختر [illegible] دستخط کئے ہیں جو روشن امکان کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ شاعری میں کچھ زیادہ نیا نہیں ہے۔ سب سے اہم بات ناول بھی لکھے جا رہے ہیں۔ [illegible] ناولوں کی شمولیت نے اردو ادب کے مستقبل کو روشن کر دیا ہے۔

منظر — اگر آپ نے اپنے پسندیدہ افسانوں کی کوئی فہرست تیار کی ہو تو اس میں آپ [illegible] کہانیوں سے افسانے شامل کریں گے؟

ذوقی — [illegible] ہوتا ہے [illegible] لئے ممکن ہی نہیں ہے [illegible] لکھنے اور خوب لکھنے پر عمل کرتا ہوں [illegible]

منظر — ہمارے ملک میں زبان و ادب کی خدمات کے لئے سرکاری و غیر سرکاری سطح سے دیئے جانے والے انعامات و اعزازات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ذوقی — انعام و اعزازات جینوئن تخلیق کار کے قد کو کبھی بڑا نہیں کرتے۔ چھوٹے سرکاری یا غیر سرکاری اعزازات کی بات رہنے دیں، نوبل پرائز اور بک ایوارڈ تک نے اب مایوس کر دیا ہے۔ ادیب اور اچھے ادیب کے لئے ضرورت ہمیشہ اچھی تخلیق کی رہی ہے، نہ کہ انعام و اعزاز کی۔

منظر — کچھ رسالے ایسے ہیں جو تخلیق کا معاوضہ نہیں دیتے اور نہ ہی اعزازی کاپی بھیجتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

ذوقی — یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسے ہر لکھنے والا خود کو شاعر یا افسانہ نگار سمجھ بیٹھتا ہے۔ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا اور انہیں ادب سمجھنے کا کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ایک تو شائع ہی نہیں کرنا چاہیے — دوسرے شائع کیا جائے تو معاوضہ کیا ضروری ہے۔ جہاں ایسے بیکار لکھنے والے ہیں وہاں ایسے بیکار پرچے بھی ہیں۔ جو اچھا لکھتے ہیں وہ معاوضہ بھی پاتے ہیں۔

منظر — آپ کن کن افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں؟

ذوقی — سریندر پرکاش، اقبال مجید، شوکت حیات، شموئل احمد، صغیر رحمانی، زیب اختر وغیرہ متاثر کرتے ہیں۔ ویسے دوستوئسکی میرا آئیڈیل ہے۔ اپنے ادبی سفر میں سب سے زیادہ متاثر دوستوئسکی سے ہی ہوں۔

منظر — آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟

ذوقی — میرا کوئی سیاسی نظریہ نہیں ہے — ہاں! ادب کے لئے سیاسی بصیرت کو ضروری سمجھتا ہوں۔

منظر — اور آخر میں قارئین کے لئے کوئی پیغام

ذوقی — پیغام کیا؟ زندگی کو سمجھنا ہی سب سے اہم شئے ہے۔ صرف ایک زندگی ہمیں ملتی ہے جینے کے لئے اور ہم اسے بھی بے کار کاٹ دیتے ہیں۔ زندگی محض کاٹنے کی چیز نہیں۔ زندگی کو صحیح طور پر سمجھنے کا نظریہ اچھا ادب فراہم کرتا ہے۔

دہلی

بقیہ ۔۔ رسالہ حجت القوی

چیزاں - چیز کی جمع (دکنی اور پنجابی)

بوجنا - بوجھنا (وجہی نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے)

ناوانگی - نادانی (باغ و بہار میں بھی استعمال ہوا ہے)

کہیں کہیں سلاست ایسی ہے کہ موجودہ عہد سے لگا کھاتی ہے جب زبان تشکیلی مراحل سے گذرتی ہے تو اس میں اسی انداز کی تبدیلی آتی ہے۔ زبان ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے بیان کی سرحد سے قریب تر ہو کر ادبی روپ اختیار کرتی ہے تو اس میں ارتقا کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ بہت ساری کمزوریاں زائل ہو جاتی ہیں۔ اگر آخری صفحوں پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہو کہ زبان و بیان بتدریج ارتقائی سفر اختیار کر رہی ہے

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے دو جلد کتابوں کا آنا لازمی ہے)

نام کتاب :۔ **مولانا باقر آگاہ ویلوروی کے ادبی نوادر**
(نثری تخلیق)

مصنف **علیم صبا نویدی**

مراکزِ دستیابی :۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ رانی منڈی الٰہ آباد
تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز 26 امیر النسا بیگم اسٹریٹ
مدراس ۔

اسّی روپے

کتاب ہذا علیم صبا نویدی کی عرق ریز تحقیقی کاوشوں اور محققانہ صلاحیت کا گراں قدر سرمایہ ہے تحقیق کا کام بڑا ہی صبر آزما، جانگسل، دشوار کن اور عرق ریز ہے۔ اس میں ذہنی یکسوئی کے ساتھ ساتھ مطالعہ عمیق اور زبردست قوتِ فیصلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ صبا اپنی اس کامیاب ترین تحقیقی کاوش کے لئے قابل صد آفریں ہیں۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ پیش لفظ، شناخت و تعارف اور مقدمہ پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ بہ مغز اور افادی معلومات کا حامل اور اس کتاب کی روح ہے۔ علیم صبا نویدی کا مقدمہ سب سے اہم اور سیر حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی تفصیلی تحریر میں دکن میں اردو کی ترویج و اشاعت، دکنی اردو کی ماہیت و مقام زندگی کے مختلف گوشوں کی تفصیل اور ان کے ہم عصروں میں ان کا مقام جیسے اہم اور توجہ طلب نکات پر مفصل روشنی ڈال کر نہ صرف آگاہ جیسے عظیم المرتبت مگر گمنام شاعر کو شہرت دوام بخشی ہے بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کا بھی لوہا منوا لیا ہے۔ دوسرا حصہ آگاہ کے کلام کے نمونہ اور تیسرا حصہ ان کے دیباچوں پر مشتمل ہے۔

اردو زبان نے مختلف خطوں میں اپنی علاقائی زبانوں اور بولیوں کا بھرپور اثر قبول کیا اور اسی تاثر کی نسبت سے اسے اس کے علاقائی ناموں جیسے لکھنوی اردو، دکنی اردو اور اردوئے معلیٰ وغیرہم سے منسوب کیا گیا۔ رسل و رسائل کی دقت کے سبب ان کی علاقائی تصنیفات اور تخلیقات محض اپنے خطے میں پروان چڑھتی رہیں اور کل ہند پیمانہ پر ان کے ادبا و شعرا بہت دنوں تک پردۂ خفا میں رہے۔ آگاہ اور ان کی تخلیقات

کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

آگاہ کو اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، برج، تلگو اور اروی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں میں ان کے فکر و فن کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے اور بقول صبا کے آگاہ اردو کے اولین ناقد بھی ہیں جیسا کہ ان کے دیباچوں سے ظاہر ہوتا ہے جو قدیم فارسی دیباچوں کی نہج پر لکھے گئے ہیں۔ مگر ان کی زبان اتنی صاف و شستہ، آسان و عام فہم، سیدھی سادی اور رواں دواں ہے کہ ان پر آج کی زبان کا گمان ہوتا ہے۔ یہ گنجلک پن اور فارسی آمیزی سے پاک و مبرا ہے۔ اظہار بیان میں ندرت، چاشنی، سلاست اور کشش ہے۔ یہ دیباچے آگاہ کی علمی بصیرت، فنی ادراک اور زبان و بیان پر ان کی قدرت کے آئینہ دار ہیں۔

جہاں تک آگاہ کی شاعری کا تعلق ہے۔ انہیں فن شاعری اور اصناف سخن پر مکمل ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شاعری پر تصوف کا غلبہ ہے۔ رموز و معرفت کی باتیں ان کے کلام کا خاصہ ہیں۔ ان کے علاوہ ندرت خیال، سلاست روانی، جذبات و احساسات کی پاکیزگی اور حسن و عشق کے نقوش تابندہ بھی ملتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے ہمعصروں کی فارسی آمیز اردو سے ہٹ کر انہوں نے مشترکہ ہندوستانی زبان میں شاعری کی ہے۔ اسی امتیازی خصوصیت اور دکنی زبان کے غلبہ نے انہیں اپنے عہد میں بے پناہ عوامی مقبولیت سے ہمکنار اور اپنے ہمعصروں میں بالاقدری بخشا۔ ملاحظہ ہو مشتے از خروارے۔

کب شعلۂ راز عشق کا دل تاب لا سکے
ذرّے میں آفتاب کہاں ہے سما سکے

مشرب عاشق بے تمام و نشاں میں آگاہ
لامکاں عین مکاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سرسبز نت رکھیں گے انہیں میرے اشک و آہ
اے نوبہار حسن جو چاہے چمن لگا

اس زلف کو اپنا یار کر مت
ناگن کا کچھ اعتبار مت

اس کتاب کی طباعت، کتابت اور کاغذ عمدہ ہے سرورق جاذب نظر ہے۔ قیمت اس کی افادیت اور گرانی کے لحاظ سے مناسب ہے۔ شائقین ادب و شعر کے لئے اس کا مطالعہ کافی سودمند ہے۔ نوعمر محققین ادب صبا کی اس گرانقدر پیش کش سے مستفیض ہو کر تحقیق کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارا اور اردو اداروں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم اپنے اپنے وسائل و طریقہ سے علیم صبا کی ہمت افزائی کریں تاکہ ان کا یہ تحقیقاتی سفر اپنی پوری تابندگی سے جاری رہے۔

ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی

شہرِ خیال

اس شمارے میں نمود میں اہلِ قلم کی توجہ جس نکتے کی طرف آپ نے مبذول کروائی ہے وہ ادب کی ضرورت بھی ہے اور وقت کی بھی۔ کاش اس پر دھیان دیا جائے۔ مشمولات بہتر ہیں۔ خصوصاً جناب نعمان شوق کی نظم "یہاں سب خیریت ہے" بہت پسند آئی۔

اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس بار کتابت کی اغلاط نہ ہونے کے برابر ہیں یہ بات الگ ہے کہ کاتب صاحب نے سارا حق کتابت میرے مقطع کے مصرع ثانی میں صرف کر دیا اور مصرع یوں لکھا گیا۔

" داستانیں بہار لکھوں میں "

صحیح مصرع یوں ہے۔

داستانِ بہار لکھوں میں

براہ کرم تصحیح شائع کر دیجیے۔

● سید احمد سحر، شاہجہانپور

سہیل کا شمارہ ۹ پیش نظر ہے۔ اس میں شہرِ خیال کے تحت شمارہ ۸ سے متعلق جناب ناشاد اورنگ آبادی کے خیالات شائع ہوئے ہیں۔ مراسلے میں میرا نام تسلیم انجم درج ہے جو کتابت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ فاضل مکتوب نگار نے اپنا خیال یوں ظاہر کیا ہے۔ "تسلیم انجم (تسلیم نیازی) کا رباعیات خارج الوزن ہیں کسی میں دو مصرعے بروزن ہیں۔ کسی میں تین مگر چاروں میں خامیاں ہیں"۔ اگر موصوف نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا ہوتا تو مجھے جوابی مراسلے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ "سہیل" کے تمام قارئین ان کیا اوزان و بحور سے بے بہرہ نہیں، مجھے یقین ہے۔ کوئی نہ کوئی ان کی تشکیک یا غلط فہمی ضرور رفع کرتا۔ المیہ یہ ہے کہ انہوں نے حکم بھی صادر کیا ہے۔" امید ہے موصوف وضاحت کریں گے"۔

لیجئے صاحب، وضاحت پیش ہے۔

صنف رباعی کے چوبیس مقبول عام اوزان ہیں مقبول عام اس لئے لکھا کہ اس کے مزید کئی اوزان ایسے ہیں جنہیں ہنوز شرف قبولیت مطلوب ہے۔ مثلاً رکن سوم کی جگہ پر فاعلن، در مفاعلن رکھ کر غلام محمد عشق آبادی نے رباعی کے بارہ اوزان کی تشکیل کی ہے۔ رکن اول کی جگہ پر فاعلن رکھ کر ڈاکٹر زار علامی نے بارہ اوزان

ترتیب دیئے ہیں۔ وغیرہ.... وغیرہ
ایک ہی رباعی کے چاروں مصرعے
مذکورہ چوبیس اوزان میں سے کسی ایک میں،
بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی چار مصرعے چار مختلف
اوزان میں ہو سکتے ہیں۔ اب بلا تمہید اپنی رباعیوں
کے وہ مصرعے جو موصوف کو بے وزن لگے درج کرتا
ہوں۔ اور ان کے ساتھ ان کے اوزان بھی۔ تقطیع
وہ خود کر لیں۔

ع اندر لیکن وہ بے قابو ہو کر
ع دن بھر وہ سڑکوں پر گھستا ہوگا } مفعولن
مفعولن مفعولن فع

ع جذبات کے پیالے میں چھنتا ہوگا
ع حالات کی چکی میں پستا ہوگا } مفعول
ع ہر روز نئے سپنے بنتا ہوگا
مفاعیلن مفعولن فع

ع سینے کا غم آنکھوں سے رستا ہوگا ۔ مفعولن
مفعول مفاعیلن فع

ع ہاتھوں میں کھلی کتاب رکھی ہوگی
ع پلکوں سے مرا خیال چنتا ہوگا } مفعول
ع تنکے کی زمیں پر ٹپکتا ہوگا
مفاعلن مفاعیلن فع

ع اس کے وجدان میں لپکتا ہوگا ۔ مفعولن
فاعلن مفاعیلن فع

• تسلیم نیازی، آسنسول ۱۵
سہیل کا شمارہ ۵ اور جلد ۱۲ کے حوالے سے
آپ کی بزم میں آپ سے تقریباً ایک دہائی کے بعد مخاطب
بھی ہو رہا ہوں اور شریک بھی! اس کی اصل وجہ مسلسل
خرابی صحت، بے شمار رسائل اور وسائل کی کمی ہے ورنہ آپ
لوگوں کی خدمات اور سہیل کے نئے رنگ و آہنگ سے میں باخبر
نہیں تھا۔ آپ لوگوں نے بھی اس طویل مدت میں نہ کسی مراسلت
کا ذریعہ نکالا نہ کوئی تخلیق طلب کی اور نہ کوئی شمارہ ہی
ارسال کیا۔ بہرکیف! دلی تمنا ہے کہ سہیل کی نئی آن بان میں
ہر طرح اضافہ ہو۔

فی الوقت میں یہ خط ہسپتال سے لکھ رہا ہوں۔
جہاں ۲۴ نومبر سے داخل ہوں۔ ایک کار سے میں شدید
زخمی ہوا تھا۔ نئی زندگی لے کر موجود ہوں۔ سر اور بائیں آنکھ
میں شدید ضرب تھی۔ کمر میں فریکچر بھی ہوا۔ ابھی سنبھلنے میں
کافی وقت لگے گا۔ دعاؤں کا محتاج ہوں۔

برادر ذی قدر جناب شہاب دائروی یہاں ایک
تقریب کے سلسلے میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرا حال
معلوم ہوا تو اہلیہ کے ساتھ عیادت کے لئے آئے۔ پھر ان
سے اکثر ملاقاتیں اور خوشگوار باتیں ہوتی رہیں۔ میرے
اپنے ذخیرہ رسائل اور کتب کے باوجود انہوں نے سہیل
کا تازہ شمارہ عنایت کیا۔ ان کا شکر گزار ہوں کہ اس
کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی دیگر ذمہ داریاں
اور مصروفیات کے پیش نظر ترتیب و تزئین برادر محترم
عالی جناب علیم اللہ حالی کی مرہون منت ہے۔ اس
انکشاف سے مزید مسرت ہوئی۔ اور نئے سال میں پہلا خط
آپ سبھوں کو لکھ کر نئے باب کا آغاز ہوا۔ "سال نو"
پر آپ سبھوں کو مبارکباد۔

اس شمارہ میں آپ کا اداریہ بہت مختصر ہے لیکن
اپنی معنیاتی سطحوں پر بے حد بسیط ہے۔ اس کے علاوہ

گو نے اپنی بھرپور شناخت اور انفرادیت کے عامل
جی خوش ہو گیا۔ "فقیر انکل" کے تناظر میں جس طرح
م سید احمد قادری نے جناب کلام حیدری کے متعلق پردہ
کیا ہے۔ اس سے بے حد مضمحل ہو گیا ہوں۔ یقین نہیں
تا کہ وہ بھی مرحوم ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا بھی
مضمون آزاد ہند، کلکتہ کے ہر مارچ میں آیا تھا
آپ لوگ ان پر ایک یادگار نمبر نکالئے۔

بزرگ قلم کار اور معزز تارا چرن رستوگی کی مسلسل
طویل علالت میں بھی ان کے لیے سبھی سے بے حد رنجیدہ
۔ ہر سطح پر ان کو عملی تعاون کے فوراً اور شدید ضرورت
ہے۔ ان کے مخلصوں سے میری گزارش بھی ہے کہ اس طرف
راً توجہ دیں۔

"فرحت نمبر" کے متعلق جان کر دلی مسرت ہوئی۔ وہ
ہت پہلے سے ہی اس کے حقدار تھے۔ اس کی کیا قیمت ہے
رجسٹری ڈاک سے کیا خرچ پڑے گا۔ مطلع کریں تو
یک کاپی حاصل کرنے کی کوشش کر سکوں۔

● ظفر ہاشمی، جمشید پور

تازہ شمارہ میں میری دونوں غزلیں ایک
ساتھ شائع ہوئیں۔ آپ کا شکریہ۔ خدا کرے
قارئین کو پسند آجائے۔ مزید دو تازہ غزلیں اور
یک طنزیہ نظم ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے قلمبند کر کے
ارسال کر رہا ہوں۔ ڈاکٹری اور سائنس کے کمال
میں انسانیت کی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ اخلاقی
حس یا روحانی حس، جمالیاتی حس کی ہی ارتقائی
شکل ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اعلیٰ فن یا آرٹ
کی تخلیق کس طرح ممکن ہے۔ آپ کے اداریئے اس
المیہ کا ماتم کرتے آرہے ہیں۔ اور فنکاروں کو چیلنج کر
رہے ہیں۔ مگر جب آج کے فنکار جمالیاتی، اخلاقی
اور روحانی سطح پر sterile بن چکے ہیں تو ان
سے کلاسیکل ٹائپ کی تخلیقات کی امید بیکار ہے
برادرم اب تو اردو زبان کی بقا معرض خطر ہے۔

● ظفر حمیدی، مظفر پور

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ اسی طرح ایک ہی
سانس میں ختم کیا۔ جس طرح ایک ہی سانس میں
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے رواں دواں قلم نے محترمہ
فریدہ زین کی کہانیوں کا احاطہ کیا ہے۔ آنجہانی
شانتی رنجن بھٹاچاریہ نہ صرف اچھے انسان دوست
تھے بلکہ اردو دوست بھی تھے۔ اسی دوستی کا جوہر
"جوہر غازی پوری" میں پوری طرح جلوہ گر ہے ——
خورشید طلب کی نظم کے علاوہ، دیپک قمر، ظفر
حمیدی اور عبدالمتین نیاز کی غزلیں پسند آئیں ——
ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا "برنداون" پر تبصرہ کوزہ
میں سمندر دکھائی دیتا ہے۔ بے پناہ مصروفیت کے
باوجود ڈاکٹر صاحب کا مختصر مگر جامع تبصرہ مخلصانہ
ہی نہیں رہبرانہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعہ
سے توقع تھی کہ ان نظموں کی جانب بھی اشارہ کرتے
جس کی جانب آج تک کسی اردو شاعر نے توجہ نہیں،
نہ ماضی میں نہ حال میں، نہ شمال میں نہ جنوب میں جیسے
"برنداون"، "دسہرہ" اور "سور داس" جن میں دیومالائی
حوالوں کے علاوہ وطن کی مٹی کی ہلکی سی مہک بھی پائی
جاتی ہے۔

آپ کا "سہیل" ہمارے ہاتھوں میں آتے ہی
ہو جاتا ہے۔ ایک ہی نشست میں ختم کرنے تک
ں سے جدا نہیں ہوتا۔ آپ اور آپ کے دست و
رکباد کے مستحق ہیں۔ صحت پہلے سے بہتر ہے۔
ماہ کے بعد قلم پھر ہاتھ میں آگیا ہے۔

● عبدالقادر ادیب، بنگلور

تازہ سہیل باصرہ نواز ہوا۔ چاندنی کے خطوط
اکٹر علیم اللہ حالی صاحب نے انتہائی ادبی بصیرت
یانداری کے ساتھ میرے فن کا حقیقتوں کو اجاگر
ر رکھ دیا ہے۔ ایسے دیانت دار نقاد اگر ہندوستانی
ادب کو نصیب ہو جائیں تو یقین جانئے ہماری
کا کوئی بھی ادبی یزیدہ کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ تبصرہ
شاعت کے لئے علیم اللہ حالی صاحب کا اور آپ کا
ممنون ہوں۔ میری غزلیں بھی آپ نے محبتوں کے
ساتھ شائع فرمایا۔ مگر بھائی جان مصرع غلط
ت ہو گئے۔ براہ کرم تصحیح شائع فرما دیں۔

غلط دھوپ ذرا سی چمکی پانی سوکھ گیا
صحیح سورج ذرا سا چمکا پانی سوکھ گیا
غلط گاؤں کے ہر تالابوں کا پانی سوکھ گیا
صحیح گاؤں کے ہر تالاب کا پانی سوکھ گیا
غلط اب کے عشق جناب میں اشک اس خدا نے
اتنا زہر ملایا پانی سوکھ گیا
صحیح اب کے "عشق جناب" میں اشک اس دنیا نے
اتنا زہر ملایا پانی سوکھ گیا
غلط آنسو ہی کیا تیرے ہے اشک
کر جاوے ہے سپنا پار
صحیح آنسو بھی کیا تیر ہے اشک
کر جاوے ہے سپنا پار

● پروین کمار اشک

اردو کے ایک اہم

دانشور 12-5-75 11.9.91
افسانہ نگار
اور صاحب طرز صحافی

کلام حیدری

کی شخصیت اور فن پر ایک عظیم اور باوقار پیش کش

ماہنامہ سہیل کا کلام حیدری نمبر

۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک وقیع مجلہ

ہندو پاک کے نامور قلم کاروں سے تعاون کی اپیل ہے

منیجر ماہنامہ "سہیل" گیا

منصور اعجاز

کا اولین شعری مجموعہ

چاندنی کا درد

قیمت ۱۵

منصور اعجاز، راشدہ اسٹوڈیو، ایوت محل - ۴۴۵۰۰۱

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس
شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائڈ
روڈ گیا سے شائع کیا

1, P. & T. Gy.-12/94 R. N. I. Regd. No. 3520/73
The SOHAIL Monthly River Side Road, Gaya - 823001
...vrs of Publication Phone : 21573

With Best Compliments from

ARSHI LEATHERS

Manufacturer of Quality Gloving Leather

office : 2- J Radha Govinda Saha Lane

CALCUTTA–700017

Factory : 47, South Tangra Road

CALCUTTA–46